فقہ و اجتہاد — عہد و آرا

رئیس احمد جعفری (ندوی)

جعفر بن محمد الصادق

رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی

انتساب

مسٹر اختر حسین

سابق گورنر مغربی پاکستان کے نام

رئیس احمد جعفری

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

طابع: شیخ نیاز احمد

مطبع: غلام علی پرنٹرز

جامعہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

ISBN - 969 - 31 - 0065 - 4

مقامِ اشاعت:

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز،

۱۹۹- سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲ /۵۴۰۰۰

ملاحظات

استاذ ابوزہرہ کی متعدد کتابوں کا ترجمہ کرنے کا شرف مجھے حاصل ہے۔ آج اس شرف میں ایک گراں بہا اضافہ اور ہو رہا ہے۔

استاذ ابوزہرہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، تحقیق و تفحص کا حق ادا کر دیتے ہیں، ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ طائفیت اور تحزب سے بالا رہتے ہیں۔ تعصّب کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج سے اختلاف ممکن ہے، لیکن ان پر یہ الزام ہرگز نہیں لگایا جا سکتا کہ اپنے مزعومات ثابت کرنے کے لیے انھوں نے کتب کا حوالہ کا رُخ موڑ دیا ہے۔

یہ موضوع جس پر استاذ ابوزہرہ نے داد تحقیق دی ہے بہت نازک ہے اور بلاشبہ اس سے وہ خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

اہل علم کے حلقے، خواہ وہ اہل سنت والجماعت پر مشتمل ہوں یا اصحاب تشیع پر ہو سکتا ہے، کہ ابوزہرہ کے بعض افکار و تصورات اور نتائج تحقیق سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ اور یہ بات ہر محقق کے ساتھ پیش آسکتی ہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ فاضل اجل مصنف پر فکری بددیانتی کا الزام عائد کیا جا سکے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے نزعی اور اختلافی مسائل پر بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بحث کی ہے اور اپنی طرف سے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس حقیقت کو ہر پڑھنے والا محسوس کرے گا۔

عنوانات	صفحہ نمبر
امام ابوحنیفہ کس گروہ میں شامل تھے؟	۴۹
امام جعفر صادق کا تعلق کس گروہ سے تھا؟	۵۰
معتزلہ کا ایک تحقیق طلب دعویٰ	
سیاسیات عصر اور عترت نبویؐ	۵۱
امام زید کی شہادت اور اس کے اثرات	۵۲
امام جعفر صادق کے افکار سیاسی	//
اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ	//
الامام جعفر الصادق	۵۳
بیت علوی نور وعرفان کا مرکز	۵۴
آستانہ امام زین العابدین و امام باقر	//
ایک علمی مناقشہ کا مرقع	۵۵
امام باقر اور صحابہ کرام	۵۶
امام باقر قرآن کے بہت بڑے مفسّر تھے۔	۵۷
کبر و غرور کس دل میں بسیرا لیتا ہے؟	//
ولولسل سؤلا بیه	//
امام باقر کی وفات	۵۸
امام جعفر صادق کا خاندان	//
قاسم بن ابی بکر آپ کے نانا تھے	۵۹
مرکز فیض و ہدایت سرچشمہ علم و فضل	//
مولد اور نشو و نما	۶۰
امام جعفر صادق کی تعلیم و تربیت اور تحصیل علم کی داستان	//
آل محمد کا چشمۂ صافی	//
سال ولادت ایک مختلف فیہ مسئلہ	//

عنوانات	صفحہ نمبر
امام جعفر صادق کی مرکزی شخصیت	۶۱
امام جعفر صادق خلیفہ منصور اور امام	//
ابوحنیفہ امور سہ گانہ	۶۳
(۱) امام جعفر صادق علم میں غیر متعصب تھے	//
(۲) امام جعفر صادق مجتہد و مستقل تھے	//
(۳) امام جعفر صادق اختلاف فقہا کے عارف تھے	//
امام جعفر صادق اور علم کونیات	۶۵
امام ہمام کی تحصیل و کسب علم اور سعی و جہد کا بیان	//
ذوق و شوق علم	//
امام صادق علم کونیات کے ماہر تھے	۶۶
امام صادق کی ایک جامع و مانع اور فصیح و بلیغ تحریر	۶۷
فن نجوم اور فن بروج سے واقفیت تامہ	۶۹
علوم فلسفہ سے دلچسپی	//
علم جفر اور امام صادق	۷۱
کیا امام صادق کی طرف یہ نسبت صحیح ہے؟	//
حصول علم کی سعی و کوشش	
علم جفر کی تعریف	//
علم جفر کی قدامت	۷۲
علم جفر غیب پر مشتمل ایک کتاب تھی	۷۳
ملاحظات سہ گانہ	۷۴
(۱) نسبت کیوں صحیح نہیں ہو سکتی۔	//

عنوانات	صفحہ نمبر
(۲) یہ روایات کیوں ناقابل قبول ہیں ؟	۷۵
(۳) کبار علمائے شیعہ کا بیان	//
کیا یہ فرقہ خطابیہ کی جدت ہے ؟	۷۶
امام جعفر صادق کا دائرہ علم و فضل	۷۷
اس چشمۂ صافی سے سیراب ہونے کے لئے	//
تشنگان علم کا ہجوم	//
امام صاحب کا نور و حکمت	//
سفیان ثوری بارگاہِ امام میں	//
امام صادق سے امام مالک کا استفادہ	۷۸
حلیۃ الاولیا کی ایک روایت	۷۹
امام جعفر صادق اور سیاست	۸۱
امام زید اور نفس زکیہ کے خروج سے عدم وابستگی	
شہرستانی کا بیان	//
امام صادق نے خلافت کے لئے منازعت	//
نہیں کی۔	//
امامیہ اور اہل بیت کی اساس اختلاف	۸۲
امام صاحب نے اپنی دعوت نہیں دی	۸۳
حکام وقت آپ سے بدگمان رہتے تھے	//
عباسی حکومت کا رویہ	۸۴
سیاست سے علیحدگی کیوں اختیار کی ؟	//
امام صاحب کے سیاسی افکار و آراء	//
سیاسی افکار و آراء کی نفی نہیں ہو سکتی	۸۵
کیا امام صاحب کی سیاسی رائے معروف تھی ؟	//
خلیفہ منصور کے اندیشہ ہائے دور و دراز	۸۶
خلیفہ منصور کی وضع احتیاط	۸۶
خلیفہ منصور اور امام جعفر صادق	۸۷
کوفہ میں امام صاحب کی طلبی	//
یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہو سکتا	۸۸
خلیفہ منصور اور امام صادق کی گفتگو	//
تہمت لگانے والے کا حشر	۸۹
امام صاحب کے اعتزال اور گوشہ نشینی	
کے اسباب	۹۰
مسئلہ خروج اور امام صادق	۹۲
امام زید کے واقعہ سے استشہاد	//
امام زید کے قتل کے نتائج	۹۳
امام صادق اجتماع ہاشمین میں	۹۴
ابوجعفر منصور کی بیعت نفس زکیہ میں سبقت	//
منصور امام صاحب کو صادق کیوں کہتا تھا	۹۵
روایات مختلفہ کا جائزہ اجمالی	۹۶
امام صادق کا فتویٰ نفس زکیہ کی تائید میں	۹۷
امام صادق کا موقف کیا تھا ؟	۹۸
انصار نفس زکیہ اور امام صادق	//
انصار نفس زکیہ سے امام صادق سے گفتگو	//
امام صادق نے نفس زکیہ کی بیعت کیوں کی ؟	۱۰۱
غلو پسند طبائع کی انتہا پسندیاں	۱۰۲
دعائم الاسلام کا بیان	۱۰۳
ایک ناقابل فہم عبارت	۱۰۴
امام جعفر صادق فقیہ مجتہد تھے۔	۱۰۵

عنوانات	صفحہ نمبر
مدینۃ الرسول میں امام صادق کی اقامت	۱۰۶
زید بن علیؓ کی امام صادق نے نشاندہی کی	//
شجر نبوت کا ثمر شیریں	۱۰۷
امام صادق کا بابرکت سفر عراق	۱۰۸
امام جعفر اور تنقیہ عقائد مسلمین	//
معتزلہ سے امام ہمام کے مناظرات	//
وفات	۱۱۰
کیا امام ہمام کی وفات زہر خورانی سے ہوئی	//
اسلام کا مجاہد اعظم	//
صبر آزما جہاد مسلسل	//
منصور امام صادق سے مرعوب و متاثر تھا	۱۱۱
دوست اور دشمن الصادق کہتے تھے	۱۱۲
امام صاحب کا شمار صدیقین و ابرار میں تھا	۱۱۳
علم و فضل	۱۱۴
امام جعفر صادق کے پایۂ علم و عرفان پر ایک نظر	//
علمائے اسلام کی متفقہ تائید	//
امام جعفر صادق اور علم کلام	۱۱۵
امام صادق اور اخلاقیات	//
امام صادق کی وصیت اپنے فرزند کو	//
بارگاہ امام ہمام کے حاضر باش	۱۱۷
امام صادق کے جوامع الکلم سے خوشہ چینی	۱۱۸
الہام و کسب، علم امام صادق میں	//
امام صادق کا علم الہامی تھا یا کسبی	۱۱۹
ایک معصوم معتبر شریعت کی ضرورت	۱۲۰

عنوانات	صفحہ نمبر
امام کا خطا اور غلطی سے معصوم ہونا ضروری ہے	۱۲۰
مذکورہ مقدمات کے نتائج	۱۲۱
امام صادق کا اشراق روحی	//
(۱) نصوص استنباط احکام	//
(۲) فروعات میں اختلاف	۱۲۲
(۳) امام محکوم کا اجتہاد ضروری ہے یا نہیں	//
(۴) آنحضرتؐ کا اجتہاد	۱۲۳
(۵) صحابہ کرام کا اختلاف فقہی	//
(۶) اختلاف فقہا پر جناب امام کی نظر	۱۲۴
سلسلۂ بحث سے متعلق دو اہم امور	۱۲۵
دراست و مطالعہ ائمہ مذاہب	//
صفات عالیہ	۱۲۶
شخصیت۔ سیرت۔ کردار	//
امام ہمام کی شکل و شمائل	//
حقائق و معارف کی طلب و جستجو	۱۲۷
(۱) امام مالک کا بیان حضرت امام صادق	
کے بارے میں	۱۲۸
(۲) زہد و ورع اور تقدس	//
(۳) امام ہمام کی سب سے بڑی خصوصیت	۱۲۹
نفاذ بصیرت اور قوت ادراک	۱۳۰
برجستگی اور بدیہہ گوئی	۱۳۱
صبر و تحمل اور ضبط نفس	۱۳۲
بذل و عطا اور جود و سخا	۱۳۳
امام ہمام کا حلم اور سماحت	۱۳۴

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
امام صادق کی شجاعت و بسالت	۱۳۵	حضرت امام جامع علوم مختلفہ و متفرقہ تھے	۱۵۱
فراست اور فہم و دانش	۱۳۷	قرآن اور تفسیر قرآن کا علم	۱۵۲
وقار و ہیبت اور دبدبہ و صولت	۱۳۹	فلسفہ یونان کی محشر طرازیاں	״
امام جعفر صادق کے صفات و ملکات	״	منحرف العقائد اور منکرین خدا	״
شیوخ و اساتذہ	۱۴۲	حضرت امام تفکیر علمی کے داعی تھے	۱۵۳
امام جعفر نے کن کن اکابر سے تعلیم حاصل کی۔	״	مناظرات میں حضرت امام کی شرکت	״
		ایک بہت بڑا مناظرہ زندیق سے	״
سیرت امام ہمام کا نکھار	״	دو قابل غور امور	
امام صادق کے تین اساتذہ	״	(۱) فلسفہ اور مناہج فلسفہ کا دقیق علم	۱۵۶
(۱) امام علی زین العابدین بن حسین	״	(۲) زنادقہ کے سوالات کی یکسانیت	״
(۲) حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ	۱۴۳	وحدانیت اسلام پر اعتراض	״
(۳) قاسم بن محمد بن ابی بکر یکے از فقہاء سبعہ	۱۴۵	ملحد ابوشاکر دیصانی اور امام جعفر صادق	״
اختلاف بین العلماء کا علم تام	״	علم کلام میں حضرت امام کی بصیرت	۱۵۷
آل بیت علوی مصادر علم اور منبع فیض تھا	۱۴۷	امام ہمام فرقہ اور گروہ کے تصور سے ماوراء تھے۔	״
حضرت علیؓ کا علم ان کی ذریت میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔	״		
امام جعفر صادق کا علم تمام نواحی پر محیط تھا	۱۴۸	شہرستانی کا رسالہ الدلائل والمسائل	۱۵۸
علم اور صرف علم	״	جابر بن حیان کی شخصیت اور خصوصیت	״
امام جعفر صادق کا علم کی طرف شغف و انہماک تام	۱۴۹	مدار شمس و قمر و نجوم سے واقفیت تام	۱۵۹
ایک عالم کی خصوصیت	״	دراست نفس انسانیہ کی طرف التفات	״
امام صادق کی سبق آموز مثال	״	اس سلسلہ کا سوال، مرشد کا جواب	۱۶۰
دعوائے خلافت سے اعراض اور علم کی طرف انصراف	۱۵۰	حضرت امام کا زہد تقشف نہیں تھا	״
		ایک متقشف جماعت سے سوال و جواب	۱۶۱
	״	حضرت امام کی تلقین و توضیح	۱۶۲
		روح کی سربلندی کے لئے تعذیب جسم ضروری نہیں	۱۶۴

عنوانات	صفحہ نمبر
حدود کے اندر مال و دولت کا حصول ناجائز نہیں۔	۱۶۵
حضرت امام کے دلائل و براہین کی نوعیت	//
وہ حقیقت جو روز روشن کی طرح واضح ہے	//
حضرت امام کو طلب صرف علم کی تھی۔	۱۶۶
حضرت امام کی عملی سیاست سے بے تعلقی	//
امام جعفر صادق کا عہد	۱۶۷
علم قرآن، علم سنت اور تخریجات فقہیہ کا عہد	//
موثرات تفکیر و تاثیر	۱۶۹
ایجابی تاثیر	//
امام جعفر صادق کے احوال و شئون	۱۷۰
مسائل اعتقادیہ	//
علوم عقلیہ و فلسفیہ اور عقل و فکر میں ٹکر	//
سلبی تاثیر	۱۷۱
ادلۂ باطلہ کا ازالہ ادلۂ حق کی تقویت	
امام جعفر صادق کا تبحر علوم کون و طبائع میں	//
سیاسی اور اعتقادی فرقوں کی تشکیل	//
عہد امام جعفر صادق کی سیاست	۱۷۲
اس دور اور اس کے ماسبق اور مابعد حالات کا مورخانہ تجزیہ	//
امام باقر کے ارشادات	۱۷۴
امام باقر اور شیخین	//
ملوک بنو امیہ کی بدعت	۱۷۵
ابوبکر اور معاویہ کے اقدام کا واضح فرق	//
حضرت حسن بصری کی رائے معاویہ کے بارے میں	۱۷۶
یزید نے جنگ بدر کے اموی مقتولین کا انصار سے انتقام لے لیا	۱۷۷
امویوں کا نامۂ اعمال	//
بیعت سفیانی کا غم و غصہ	۱۷۸
عمر بن ہبیرہ کی داستان	۱۷۹
افکار و آراء پر اموی مظالم کے آثار	۱۸۰
علیؓ کے خلاف دشنام طرازی کا نتیجہ	۱۸۱
قتل حسین کا اثر افکار اسلامی پر	//
اثر قتل حسین	۱۸۲
مختار ثقفی کی تحریک اور اس کے اثرات و نتائج	
مختار ثقفی کے دعوے	//
محمد بن حنفیہ کی طرف سے اعلان برأت	//
قاتلین حسین کا عبرت انگیز انجام	۱۸۳
فرقہ کیسانیہ اور اس کے عقائد	//
عمل صالح میں سیئات کی آمیزش	۱۸۴
آراء منحرفہ کا دور	۱۸۵
پہلی صدی کے آخری اور دوسری صدی کے آغاز کے فتنے	//
زمین دوز تحریکیں	//
مختلف فکری مکاتب	
بیان بن سمعان تمیمی، داعی خلق قرآن	//
مغیرہ بن سعید، تجسیم الٰہی کا دعویٰ	۱۸۶
تین قابل غور و فکر باتیں	//

عنوانات	صفحہ نمبر
فرقہ خطابیہ	١٨٧
ابوالخطاب کے عقائد کا تجزیہ	
امام باقر اور امام جعفر صادق کے متعلق اقدامات	١٨٨
کچھ فرقہ اسماعیلیہ کے بارے میں	
فتنہ پسندوں کی طرف سے اللہ کی جانب غلط انتسابات	١٨٩
خوارج	١٩٠
اس فرقے کے عقائد اور میلانات و رجحانات	
ابوحمزہ الشاری	"
عربی عصبیت میں غلو	
شیعی اور خارجی فکر و نظر کا فرق	"
ضرورت خلافت کا انکار	١٩١
خوارج کی طرف سے اہل ذنوب کی تکفیر	
ظاہر قرآن پر عمل درآمد	
فرقہ خوارج اور اہل تشیع میں فرق	"
خوارج کی شوکت و سطوت	
ابوحمزہ خارجی کا اہل مدینہ سے خطاب	"
امام صادق نور مبین، ہادی حق۔	١٩٢
خطبہ ابوحمزہ کے نکات و اشتمالات	
امویوں کے خلاف اہل بادیہ و اہل مدائن متفق تھے۔	١٩٣
خلیفہ منصور عباسی اور امام جعفر صادق	"
منصور اور امام صادق میں رد و کد	١٩٥

عنوانات	صفحہ نمبر
فلسفہ و اعتقاد کے متنوع گوشے	١٩٦
نئے نئے بدعتی فرقوں کی نمود اور ان کا ظہور	
مرجعیت عامہ	"
مسئلہ قدر اور مسئلہ مرتکب کبیرہ	"
مرتکب گناہ کبیرہ اور خوارج	١٩٧
افکار و آراء مضطربہ	"
مسلک اعتزال، معتزلہ کا دعویٰ	١٩٨
فرقہ جبریہ یا جہمیہ	١٩٩
ارادۂ انسان اور مشیت خداوندی کا باہمی تعلق	
انسان مختار مطلق ہے یا مجبور محض	
جبریہ کا مسلک	
اس فرقے کا موجد جعد تھا یا جہم؟	"
جہم بن صفوان کے آراء منحرفہ	٢٠٠
جہم کی دعوت اور دعایت	"
فرقہ قدریہ	٢٠١
قدریہ اور معتزلہ کے افکار و آراء میں کہاں تک ہم آہنگی تھی؟	"
عبدالقادر بغدادی کا خیال	"
سراج العیون کا بیان	"
غیلان کا پندنامہ عمر بن عبدالعزیز کو	٢٠٢
حضرت عمر بن عبدالعزیز کا رد عمل	"
نیکی اور بدی کے الگ الگ خدا	"
غیلان اور امام جعفر صادق	٢٠٣

* * *

عنوانات	صفحہ نمبر
معتزلہ	٢٠٤
ذات باری تعالیٰ اور قرآن اور عقائد سے متعلق فکر جدید	//
معتزلہ اور فرقہ قدریہ میں ربط فکر	
بانی فرقہ معتزلہ واصل بن عطا	//
واصل کے افکار و آراء کا موازنہ	
مرتکب گناہ کبیرہ فاسق ہے	
تمام قوتوں کا مرجع ذات الٰہی ہے	//
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب	٢٠٥
کیا واصل اور امام صادق کی ملاقات ہوئی تھی ؟	//
مرجیہ	٢٠٦
ابو بکر کی ایک حدیث اور اس کے فرقے کے عقائد	
ایک سیاسی فرقہ	
ابن شاکر کا بیان	//
ایمان کے ساتھ معصیت بے ضرر ہے۔	
بنیادی تعلیمات اسلام سے انحراف	//
مرجیہ کی طرف بعض اکابر کی غلط نسبت	//
عہد امام صادق کا مدینہ	٢١٢
علم رسول اللہ کا گہوارہ نشیمن	//
آثار نبویہ	
عہد خلافت راشدہ میں علی کے فیصلے	//
صحابہ کرام مدینے سے باہر	//
صحابہ کرام پھر مدینے میں	٢١٣
مدینہ علم و افتاء کا مرکز	//

عنوانات	صفحہ نمبر
عمر بن عبدالعزیز کا اقدام	٢١٣
سنت نبوی کے آثار فراواں	٢١٤
زید بن ثابت رضی اللہ عنہ	٢١٥
علیؓ کی زندگی فقہ و دین کے لئے وقف رہی	//
آثار علیؓ کو چھپانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی	٢١٦
روایات علی کا مرکز بیت علیؓ	//
آل بیت کے پاس سب کا علم تھا	٢١٧
مدینہ عہد امام جعفر صادق میں	//
مدینے کے فقہائے سبعہ	٢١٨
جنہوں نے سنت رسول اور آثار نبیؐ کی حفاظت کی	//
فقہاء سبعہ کون تھے ؟	//
علم فقہاء سبعہ کے علاوہ دوسروں کے پاس بھی تھا	//
حضرت سعید بن المسیب	٢١٩
عروہ بن زبیر	٢٢٠
ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث	٢٢١
عبیداللہ بن عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود	
سلیمان بن یسار	
خارجہ بن زید بن ثابت	٢٢٢
فقہاء سبعہ کی شہرت	٢٢٣
مدینہ اور فقہ رائے	٢٢٤
امام جعفر صادق کا فقہاء سبعہ سے اخذ و تاثر	//

عنوانات	صفحہ نمبر
رائے اور حدیث	۲۲۵
فقہ اسلامی کا ایک مہتم بالشان نزاعی مسئلہ	//
شہرستانی کے تصریحات	//
صحابہؓ نے رائے کا استعمال کیا	//
تابعین اور رائے کا استعمال	۲۲۶
عہد تبع تابعین میں فقہا کا اختلاف	//
شاہ ولی اللہ کے نزدیک رائے	۲۲۷
فقہ مدنی اور فقہ حجازی میں کوئی خاص فرق نہیں	
فقہ عراقی اور فقہ مدنی کا اختلاف کن امور پر منحصر ہے؟	۲۲۸
جہاں فقہ وہاں رائے	//
دو غور طلب امور	//
امام جعفر صادق اور اجتہاد	۲۲۹
خلاصۂ احوال عصر امام صادق	۲۳۰
جدل و نظر، بحث و درس اور تحقیق و تفحص کا دور	//
تدوین علوم کی ابتداء	//
مناہج مختلفہ اور آرائے مختلفہ	//
علوم کونیہ اور علوم فلکیہ کا آغاز	۲۳۱
علوم اسلامیہ کی تدوین	//

عنوانات	صفحہ نمبر
حصۂ دوم	
امام جعفر صادق کے افکار و آراء	۲۳۳
مذہب، سیاست اور اعتقادی مسائل سے متعلق افکار و آراء	//
اپنے عہد کے احوال و کوائف پر امام صادق کے اثرات	۲۳۵
قول فیصل	
وہ مسائل جن پر امام صادق نے غور کیا	//
علوم کون میں عالمانہ اور مجتہدانہ دسترس	//
سیاسی معاملات پر رائے	
فقیہہ عالم اور مجتہد	۲۳۶
افکار و آراء ثابتہ کا استخلاص	//
امام جعفر صادق کے سیاسی افکار	۲۳۷
حکومت وقت کے اقدام و عمل اور طرز و منہاج سے متعلق	//
عملی سیاست سے کنارہ کشی	//
امام صادق کے متبعین	//
اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ	//
ایک اہم فکری تجزیہ	۲۳۹
آل الکاشف کی تصریح	
عصمت امام کا مسئلہ	۲۴۰
حضرت امامیہ کے ادلّہ	//
نبی اور امام میں فرق	۱۴۱
خواص ائمہ سے متعلق خیالات	//

عنوانات	صفحہ نمبر

امام ظاہر اور مشہور بھی مخفی اور مستور بھی ٢٤٢
حضرت امام باقر کا ارشاد //
وصایت کی تشریح
امامت بذریعہ وصایت الٰہی ٢٤٤
امامیہ کے اصول امامت //
اس رائے کا تجزیہ اور تبصرہ ٢٤٥
امامیہ کا استدلال احادیث جمہور سے //
عترت یا سنت ٢٤٦
عترت والی روایت متواتر ہے //
سلبی موقف سے گریز ٢٤٧
کتب معتبرہ شیعہ و اہل سنت سے استفادہ
حلیۃ الاولیاء کا بیان
ایک خاص واقعہ مرویہ
اشخاص معین کے لئے خلافت کا مسئلہ
ہاشمیوں کے اجماع سے استدلال
کیا یہ واقعہ سرے سے غلط ہے؟ ٢٥٠
وصایت پر بحث وجدل
کلینی کے بیان پر گفتگو //
امامت کے بارے میں امام صادق کی رائے ٢٥١

حکومت کے خلاف خروج ٢٥٢
حیات اسلامیہ کے ایک اہم ترین مسئلے پر امام کی رائے //
ائمہ اہل بیت اور عملی سیاست

عنوانات	صفحہ نمبر

بنوامیہ کے بارے میں امام صادق کے خیالات

صحابۂ کرام ٢٥٤
امام جعفر صادق کے افکار وآراء
صحابہ کے خلاف طعن وقدح
امام زین العابدین کی ایک عراقی سے گفتگو //
امام باقر کا ارشاد گرامی
اہل بیت رضوان اللہ
اثنا عشریہ اور سب شیخین
کبار صحابہ پر بعض طعن کی مذمت

شرائط امامت ٢٦٠
افکار امام جعفر صادق کا استنباط
جمہور مسلمین کا مسلک //
امامت صرف قریش میں

مسائل اعتقادی سے متعلق ٢٦٣
امام جعفر صادق کے افکار وآراء اور دلائل وبراہین
تقدیر اور ارادہ انسان //
واصل بن عطا اور امام صادق //
معتزلہ اور ائمہ اہل بیت
قرآن وسنت کی روشنی میں ٢٦٤
مسئلہ قدر اور ارادۂ انسان
مسئلہ زیر بحث کے مالہ وماعلیہ پر گفتگو ٢٦٥
خدا اور ارادہ

عنوانات	صفحہ نمبر
امامیہ اور معتزلہ	
القمی کی روایت پر تبصرہ	
ایک بہت ضروری انتباہ	۲۶۸
ناقابلِ قبول اور قابلِ قبول کا معیار	
انسان مرتبہ خلق و ابداع پر فائز نہیں	
جبر اور تفویض کا فرق	
امر، ارادہ، رضا	۲۷۱
ایک اہم ترین اور معرکہ آراء بحث	//
اللہ کے امر و نہی کے مضمرات	//
علم اور مشیت کا تعلق	//
اللہ اور بندے کا فرق	/
امور سہ گانہ	۲۷۳
کیا اللہ کا ارادہ اور علم لازم و ملزوم ہیں	//
روایات ابوجعفر کی نوعیت	//
تاویلات و توجیہات	//
چند غور طلب امور	۲۷۶
ضعف اسناد	
حدیث کے عموم معنیٰ کا قصر	//
روایت امام جعفر	//
روایت آل بیت	//
امام صادق کے تلامذہ اور معاصر فقہاء	//
نہ جبر درست ہے نہ تفویض	
شہرستانی کی تصریحات	۲۷۸
حق صرف جبر اور اختیار کے مابین ہے	

عنوانات	صفحہ نمبر
مرتکب گناہ کبیرہ	۲۷۹
کیا گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا کافر اور دوزخی ہے۔	//
ایک ہنگامہ خیز مسئلہ	//
حضرات امامیہ کا مسلک	۲۸۰
اللہ کے عدل کا اقتضاء	//
ایمان و اخلاص کا صلہ مغفرت	۲۸۱
ایک مجمع علیہ مسئلہ	
معتزلہ اور امامیہ کے مسلک میں مماثلت	
صفت باری تعالیٰ	۲۸۳
مسئلہ بداء	//
امور تکوینی میں ناسخ و منسوخ کا تصور	
بداء کی تعریف	۲۸۸
بداء مختار ثقفی کی ایجاد ہے	
بداء کی مثالیں	۲۸۹
علم الٰہی کی دو قسمیں	//
بداء اور عقیدہ اسلامی	
رجعت	۲۹۳
عقائد اسلامی کا ایک مہتم بالشان مسئلہ	//
دو خاص عقیدے	//
اساسی اور بنیادی فکر	
تناسخ ارواح اور رجعت	

عنوانات	صفحہ نمبر
تقیہ	۲۹۷
کب اور کن حالات میں تقیہ جائز ہے؟	
ایک مذہبی مصلحت	//
اثبات تقیہ کی بنیاد	
امام صادق سے مرویات	۲۹۹
تقیہ کی دو قسمیں	
حسبِ موقع اور حسبِ مصلحت	
قابل غور بات	
علم طبیعیہ اور کوثیہ	۳۰۲
امام صادق کی دانشگاہ علوم مختلفہ وکثیرہ میں	
طب اور دیگر علوم	
مسلمان مورخین کا اتفاق خیال	//
رسائل جابر بن حیان	۳۰۵
تفقہ اور اجتہاد	۳۰۷
امام جعفر صادق کے خصوصیات فکر و نظر	۳۰۸
فقہ صادق	//
امام صادق کے خصوصیات و ممیزات فقہ	
سب سے بڑے فقیہ	//
امام بخاری اور امام صادق	//
امام صادق سے سنیوں کی روایت	۳۱۰
فقہ امام صادق نزد اصحاب تشیع	۳۱۲
احادیث سے مراد احادیث نبوی اور اقوال ائمہ ہیں۔	//

عنوانات	صفحہ نمبر
فقہ امامیہ اثنا عشریہ	
کتب حدیث وفقہ نزد امامیہ	۳۱۶
کتب فقہ و روایت کی جامعیت	
تفریعات فقہ	//
الاستاد محمد جواد کے افکار عالیہ	۳۱۸
مذہب جعفری کی کتب اصول	۳۱۹
کتب مدونہ معروف السدیا روایات غیر مدونہ	۳۲۱
امام صادق کا منہاج و اصول	۳۲۲
نقطہ نظر کا اختلاف	//
سنیوں اور شیعوں کا فکری اختلاف	۳۲۳
مرویات غیر مدونہ املا کی صورت میں	
علامہ سیوطی کے خیالات	۳۲۴
ناسخ و منسوخ سنت میں بھی قرآن میں بھی	
امامیہ کی تاریخ اصول فقہ	۳۲۶
علم اصول فقہ پر امامیہ علماء اور فقہا کی کتابیں	
اصول فقہ کی تدوین و تبویب	//
اصحاب تحقیق کے مؤلفات و مصنفات	
متکلمین اہل قلم و اہلِ علم	۳۲۹
فقہا و فروع کا دور	//
قیاس پر داؤد ظاہری کے حملے	
علم اصول کا غیر معمولی عروج و زوال	۳۳۰
(۱) غیبت امام	
(۲) اکثر امامیہ کے نزدیک باب اجتہاد مفتوح ہے	۳۳۱

عنوانات	صفحہ نمبر
السید شریف المرتضٰی	۳۳۱
موسوعات فقہیہ کا عصر	//
شیخ طوسی کی ہمہ گیر شخصیت	//
محمد بن علی الجمعی	۳۳۲
آیت اللہ علامہ جمال الدین المنظہر	//
امامی فقہ کا تاریخی جائزہ	//
اصول فقہ امامیہ	۳۳۳
کتاب وسنت اور عقل واجماع پر تکیہ	//
آل کاشف الغطاء کا بیان	//
روایات ضعیفہ وقویہ کی موجودگی	۳۳۴
ہر دو مناہج کا فرق	۳۳۵
اخباریوں کے نزدیک اجتہاد کی اہمیت	//
امامیہ حضرات اور فرقہ ظاہریہ	//
امام صادق اور قیاس واجتہاد	۳۳۶
تقلید کی ممانعت اجتہاد کی دعوت	//
نفی قیاس کے بارے میں الکافی کا بیان	//
التہذیب کا بیان	۳۳۷
امام صادق کی طرف سے اجتہاد کا حکم	۳۳۸
القرآن	۳۳۹
جس کی حجیت پر عامۃ المسلمین کا اجماع ہے	
دستاویز شریعت	//
قرآن میں ہر چیز کا شافی بیان موجود ہے	//
قرآن جملہ احکام کلیہ پر مشتمل ہے	۳۴۰

عنوانات	صفحہ نمبر
سنت کی قوت احتجاج قرآن سے	۳۴۰
شاطبی کا بیان الموافقات میں	
قرآن شریعت سے متعلق تمام چیزوں پر مشتمل ہے	//
علم قرآن اور اس کا بیان	۳۴۳
امام جعفر صادق کا ارشاد مسئلہ زیر بحث میں	//
الصافی کا بیان	//
فہم قرآن کے لئے امور سہ گانہ	//
صاحب الصافی کا ارشاد مزید	۳۴۴
ائمہ قرآن کے ظاہر و باطن کے عالم ہیں	//
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک روایت	۳۴۵
قرآن کے دو پہلو، ظاہر و باطن	
(۱) فہم عبارت	۳۴۶ ۳۴۷
(۲) فہم اشارہ وغایات بعیدہ	
(۳) باطن کے دروازے پر دستک	//
قرآن کا باطن اور باطن کے باطن کا باطن	//
قرآن کی تفسیر بالرائے نزد امامیہ	۳۴۹
(ا) آثار نبویہ سے استدلال	//
(ب) امام صادق کی روایت	
(ج) امام باقر کا ارشاد	۳۵۰
تفسیر بالرائے	//
تفسیر بالرائے سے اختلاف کے وجوہ	//
افکار غزالی سے ہم آہنگی	۳۵۱
قرآن کریم میں	
نہ کوئی نقص ہے نہ کوئی تبدیلی ہوئی ہے	//

عنوانات	صفحہ نمبر
خبر آحاد مفید علم قطعی ہے	
امامیہ کے نزدیک خبر آحاد قابلِ قبول ہے	۳۷۶
معالم الدین کا بیان	۳۷۷
طوسی کی رائے	//
کیا طوسی شریف مرتضیٰ کے خلاف ہیں؟	
امامیہ اور اہل سنت کا اتفاق	۳۷۸
قول فاسق میں مقدار صدق کی تلاش	۳۷۹
خبر آحاد کے قبول پر اجماع	//
(۱) پہلا دور علم قطعی کا دور ہے	۳۸۰
(۲) دورِ ثانی بعد از ائمہ	//
امامیہ کی طرف سے خبر آحاد کا ثبوت	۳۸۱
امامیہ کے دلائل	//
قرینۂ عقلی بھی ضروری ہے	۳۸۲
امامیہ کی طرف سے تعدد کی شرط	//
حضرت علیؓ کا مسلک	۳۸۳
امامیہ کی طرف سے راوی کے لئے شرط	//
غیر اثنا عشری کی روایت	۳۸۴
امامیہ کے ہاں شروط روایت یہ ہیں	//
جہت اشتراط اسلام کا تعلق	۳۸۶
ایک نازک سا فرق	۳۸۷
ابوالمعالی کی رائے	
کیا یہ امام صادق کا منہاج ہے	۳۸۸
طوسی اور کلینی کی رائے کا فرق	۳۹۱
عدم قبول روایت کے اسباب	//

عنوانات	صفحہ نمبر
(۱) یہ نسبت کیوں غلط ہے؟	۳۹۱
(۲) امام صادق اور فقہ امصار	۳۹۲
(۳) ابوحنیفہ کی روایت امام صادق سے	
(۴) تاریخ اور روایت کا تصادم	//
عدالت راوی	۳۹۳
جس کے بغیر روایت حدیث نامقبول ہے	
عدالت کی تعریف	//
شرط روایت کا اصول کیا ہے؟	//
متقدمین اور متاخرین کا اختلاف	۳۹۴
طوسی کے ایک قول پر گفتگو	//
مجہول الحال راوی	//
مجہول الحال راوی کی روایت قابل قبول ہوسکتی ہے	
مجہول الحال راوی کی روایت نہ قبول کرنے کے اسباب	۳۹۶
سنی کی روایت	۳۹۷
امامیہ کے ہاں کیا قبول کی جا سکتی ہے؟	//
مخالف کی روایت	
سنی بھی یہی کرتے ہیں	//
ائمہ کرام کا مسلک کیا تھا؟	۳۹۸
زیدیہ کا مسلک	۳۹۹
کردار اور سیرت کے بجائے فرقہ کیوں؟	
الضبط	۴۰۰
خبر آحاد کی شرط قبول کا امامیہ و اہل سنت کے ہاں اشتراک	//

عنوانات	صفحہ نمبر
قرآن متواتر ہے	۳۵۲
اتحاد مسلمین و اسلام کی کوشش	//
کلینی کی روایت امام صادق سے	۳۵۳
قرآن میں حذف کثیرہ کا دخل	۳۵۴
تنقید مذہب اثنا عشری	۳۵۸
امامیہ کا تواتر قرآن پر اتفاق ہے	//
سیوطی کا اعتراف "اتقان" میں	۳۵۷
قرآن میں عام اور خاص	۳۵۸
مناہج فقہاء و ائمہ مجتہدین کے دو اہم منہاج	
امام جعفر صادق سے انتساب	
عام کی دلالت اور اس کی قطعیت اور ظنیت	۳۵۹
فقہاء سنت کے دو معروف منہاج	
امور سہ گانہ	۳۶۰
(۱) عام قطعی الدلالت ہے	//
(۲) عام کی قطعیت منتشر ہوتی ہے	//
خبر آحاد عام کی تخصیص بذاتِ خود نہیں کرتی	
جمال الدین الحلی کی رائے	//
قیاس اور عام	//
امامیہ کی طرف سے قیاس کی نفی	۳۶۱
عام کا خاص سے تعارض	//
خاص عام کی تخصیص کب کرے گا؟	//
امامیہ اور حنفیہ کا اتفاق	//
بیان قرآن	۳۶۳
قرآن شریعت اسلامیہ کا بیان کلی ہے	//

عنوانات	صفحہ نمبر
بیان قرآن کے اقسام	۳۶۳
(۱) بیان مفصّل	//
(۲) قرآن تفسیر کا محتاج ہے	//
اختلاف فکر دو امور میں	۳۶۴
مجمل کا بیان صرف سنت کر سکتی ہے	
عام از روئے لغت مجمل ہے	
بیان عام کی تاخیر جائز ہے	
عام شوکانی کا بیان	۳۶۷
السنّت	۳۶۸
جس میں نبیؐ کا قول و فعل اور آثار ائمہ شامل ہیں	
تعرف احکام کے دو منہاج	//
متواتر اور غیر متواتر کی تقسیم	
سنت متواترہ	۳۷۰
تواتر علم قطعی کا موجب اور حجت ہے	//
علم قطعی کے شرائط	
تواتر کی دو قسمیں	//
امامیہ اور جمہور کے تواتر میں فرق	۳۷۱
افادۂ تواتر کی نوعیت میں علماء کا اختلاف	۳۷۲
تواتر سے مستفاد علم ضروری ہے یا استدلالی	//
خبر واحد	۳۷۳
کیا غیر متواتر حدیث سے حجت لانا جائز ہے	//
خبر واحد کی تعریف	۳۷۴
اخبار آحاد مشہورہ و مستفیضہ	
(۲) ظنی احادیث	

عنوانات	صفحہ نمبر
انشراح قلب اور اطمینان کی صورت	۴۰۱
امامیہ کے ہاں ضبط کی تعریف	
تعدیل رواۃ	۴۰۴
تعدیل رواۃ شرط واجب ولابدی ہے	
عدالت اور ضبط کی معرفت	//
تین اہم سوال	۴۰۵
(۱) صاحب معالم الدین کا ارشاد	//
(۲) امر دوم، یعنی کیا مزکی کو امامی ہونا چاہیئے	//
(۳) تیسرا امر ہے طریق تزکیہ	۴۰۶
شہادت عدالت سے جرح زیادہ اہم ہے	
(۱) نفی علم عدم وجود کی مقتضی نہیں ہے	۴۰۷
(۲) جرح و تعدیل میں اختلاف	
قبول روایت میں شرط تعدد	۴۰۸
طوسی کے نزدیک شرط تعدد لازمی ہے	
صحابہ کرام کا مسلک	//
روایت حدیث بالمعنیٰ جائز ہے	//
مسئلہ زیر بحث میں دو اہم آراء	
اخبار آحاد اور قرآن و قیاس	۴۱۱
علت منصوص علیہ پر جو قیاس مبنی ہو وہ قابل تسلیم ہے	
اصول فقہ کا استیفاء	۴۱۱
جب حدیث قرآن سے متعارض ہو	//
عدم نص کی صورت میں حکم عقل واجب ہے	۴۱۲

عنوانات	صفحہ نمبر
حدیث متصل اور حدیث منقطع	۴۱۴
روایت حدیث کی سند نبی ﷺ سے ہونی چاہیئے	//
سند امام کے بارے میں امامیہ کا مسلک	//
القا کے دو مرتبے ہیں	//
اجازے کی مختلف صورتیں	
اتصال سند و انقطاع سند	۴۱۶
قبول مرسل کے بارے میں جمہور فقہا کا اصول	۴۱۷
دو اہم حقیقتیں	
مراتب اخبار نزد امامیہ	۴۲۲
راویوں کی روایت کب اور کس طرح قبول کی جاسکتی ہے؟	//
حدیث کے اقسام اربعہ	
شیخ حسن زین العابدین کا بیان	۴۲۳
حدیث موثق کی تعریف	
ضعیف حدیث کی تعریف	۴۲۵
اقسام اربعہ ضابطہ	
تعارض حدیث	۴۲۶
احادیث میں تعارض کتب اخبار سے ثابت ہے	//
"الکافی" کی تصریحات	//
زرارہ کی روایت امام باقر سے	۴۲۷
امور مستفادہ	
تعدد مجلس نہ ہو تو۔۔۔	۴۲۸
امام شافعی کا ارشاد	

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
شیخ الطائفہ طوسی کی رائے	۴۲۹	ایک دوسری کتاب: التوحید!	۴۴۲
امامیہ کے استنباطات معمول بہا	۴۳۱	چند اہم مباحث	
حدیث اور اصول حدیث کی تدوین	″	مقصد تشکیک نہیں۔	″
السید حسن الصدر کی تصریحات	۴۳۲	"التہذیب" اور "الاستبصار"	۴۴۴
تدوین سب سے پہلے شیعوں نے کی	″	کتب اصول امامیہ کی آخری دو کتابیں	″
جمہور مسلمین کا نقطہ نظر	۴۳۳	شیخ طوسی کی شخصیت	″
امام علی کرم اللہ وجہٗ کا صحیفہ	″	فقہ مقارن پر طوسی کا عبور	″
عہد صحابہ میں اہل تشیع کی کثرت روایت	″	طوسی کے روایات	۴۴۵
الکافی	۴۳۵	طوسی پر ایک اعتراض	۴۴۷
امامیہ کی کتب اصول میں سب سے پہلی کتاب	″	موضوعی طور پر استفادہ	″
السید حسن الصدر کی رائے		طوسی کے رجال پر بحث	۴۴۸
الکافی پر ایک موضوعی نظر	۴۳۶	الاستبصار کے بعض مباحث	۴۴۹
بخاری کے روایات کی تحقیق	″	کیا یہ دونوں کتابیں ایک ہیں؟	″
الکافی میں ائمہ تک سند متصل ہے	۴۳۷	**الفہرست**	۴۵۰
اثبات سند کا التزام	″	ایک نہایت اہم اور معرکہ آرا کتاب	″
امامیہ مرسل حدیث کو رد کرتے ہیں		طوسی کے گراں بہا خدمات	″
الکافی میں بغیر کسی خلل کے سند موجود ہے	″	طوسی کے مجاہدانہ کمالات	۴۵۰
المستد کتب اربعہ کی جامع ہے	۴۳۸	رسائل ابی المعالی کی ایک عبارت	
ایک تحقیقی نظر	۴۳۹	**الاجماع**	۴۵۲
من لا یحضرہ الفقیہ	۴۴۰	ایک مختلف فیہ فقہی مسئلہ	
کتب اصول امامیہ کی دوسری اہم کتاب		اجماع کی حیثیت	″
ابو جعفر محمد بن موسیٰ قمیؒ	″	امام شافعی اور اجماع	۴۵۳
مؤلف کتاب کا مرتبہ		کیا اجماع دین میں حجت ہے؟	″
مراسیل کی تضعیف		اہل السنت کا مسلک	″

عنوانات	صفحہ نمبر
زیدیہ کے ہاں اجماع کا مقام	۴۵۴
کیا امامیہ کے ہاں اجماع حجت ہے؟	۴۵۵
امام نہم قرآن میں قطب کی حیثیت رکھتا ہے	″
ارکان اجماع	″
امام شافعی کی داستان مناظرہ	″
امامیہ کا حجیت اجماع پر اتفاق	″
اقسام اجماع	۴۵۸
اجماع صریح	″
اجماع سکوتی	″
اجماع کی تیسری قسم	۴۵۹
اجماع کے ہر سہ انواع معتبر ہیں	۴۶۰
ایک سے زیادہ اقوال پر اجماع	۴۶۱
اجماع اور علم یقینی	″
سند اجماع	″
زیدیہ اور جمہور کا اتفاق	۴۶۲
امامیہ کے ہاں اجماع کے لئے سند ضروری ہے	۴۶۲
صاحب "القوانین" کا ارشاد	۴۶۳
سند اجماع، عقل بھی ہو سکتی ہے	″
تفریع و استنباط اور تخریج جائز ہے	″
اجماع سکوتی منعقد ہو جاتا ہے	۴۶۴
اجماعات سابقین کی معرفت	
اجماع سابقین کا اثبات کس طرح ہوتا ہے؟	″
اجماع مشاہدے اور تواتر سے ثابت ہوتا ہے۔	۴۶۵

عنوانات	صفحہ نمبر
زیدیہ کے مراتب قبول	
مرتبہ اولی	۴۶۵
مرتبہ ثانیہ	۴۶۶
تواتر کے ساتھ نقل	۴۶۷
فقہ امامیہ کی ایک نادر اور یگانہ خصوصیت	
نسبت استنباط کا حکم	
عقل کے دو مرتبے	
مرتبہ اولی	″
مرتبہ ثانیہ	۴۶۸
طریق نقل کے دو منہاج	″
عقل ہی حسن و قبح کا حکم لگاتی ہے	۴۶۹
اشیاء کی تقسیم سہ گانہ	″
امام عقل ہی مطلوب ہیں	۴۷۰
شرع میں سب کچھ ہے	″
اللہ تعالیٰ نے علم کا حکم دیا ہے	″
واللہ نے اپنے منصوص میں عدل و احسان کا حکم دیا ہے	″
امامیہ کا منہاج	″
مذاہب سہ گانہ	″
مذہب معتزلہ	۴۷۳
دوسری رائے ماتریدیہ کی	″
تیسری رائے اشاعرہ اور محدثین کی	
تلخیص آراء	″

عنوانات	صفحہ نمبر
وجوہ اربعہ	۴۷۴
دلائل کی تنقیح	۴۷۶
حکم عقل رائے امام کا کاشف ہے	۴۷۷
احکام کی تین قسمیں	۴۷۹
ادراک عقل کی تقسیم	۴۸۱
قسم واجب کی تصریح	//
مندوب قسم کیا ہے؟	//
وہ قسم جو حرام ہے	۴۸۲
مکروہ قسم کا بیان	//
مقتضیات عقل	//
اصول استنباط اور مصلحت	۴۸۳
تخریج عقلی کی دو انواع	//
استصحاب	۴۸۴
فقہ امامیہ کا ایک مہتم بالشان مسئلہ	//
استمرار بقا کا حکم	//
غیر منصوص ادلہ پر اعتماد	//
استصحاب کا وجود	//
استصحاب کی چار قسمیں	۴۸۹
استصحاب براءۃ	۴۹۰
تعریف وبیان	//
دلیل تحریم ضروری ہے	//
اقوال اربعہ	۴۹۱
استصحاب ملک	۴۹۵
بقاء ملکیت	

عنوانات	صفحہ نمبر
استصحاب حکم	۴۹۸
حکم کا استمرار	//
ضروری مثالیں	//
استصحاب حال	۵۰۰
استصحاب وصف یا موضوع	
فقہاء کا اختلاف	//
ثمرۂ اختلاف	
شافعیہ اور حنابلہ کی رائے	
فقہاء اثنا عشریہ	
استصحاب اجماع	۵۰۲
حکم مستمر کب ہوگا؟	
علماء جمہور کے مابین وجہ نزاع	//
ظاہریہ کا اسراف اور زیادتی	
القیاس	۵۰۶
فقہ امامیہ میں قیاس کی تعریف	//
ثبوت حکم کی علت	//
قیاس سے متعلق اقوال کتب سنت سے منقول ہیں	۵۰۷
امامیہ کی دلیل کا رد	۵۰۸
قیاسیوں سے اختلاف رکھنے والے دو گروہ	//
حجیت قیاس	۵۰۹
علت مذکورہ بیان کے اعتبار سے منتصل ہوتی ہے	
امامیہ کا ظاہر کلام	//
تطبیق کی صورت	//

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
قیاس اولی	۵۱۳	**مجتہد کی حیثیت**	۵۲۸
دلالت الفاظ		مذہب امامیہ اثنا عشریہ میں	//
قیاس جلی	۵۱۴	مجتہدین کی چار قسمیں	//
الاستحسان والمصالح	۵۱۵	مرتبہ اجتہاد مطلق	
ابواب فقہی میں ایک اہم اور بنیادی مسئلہ	//	مجتہد فی الفروع	
استحسان کی تعریف	//	تیسری قسم اجتہاد	
ضروری مثالیں	//	چوتھی قسم اجتہاد	
مصلحت مرسلہ	۵۱۶	امامیہ کے شروط اجتہاد	۵۲۹
مصلحت اور امامیہ	//	عربی زبان پر عبور	//
مصلحت مرسلہ پر عمل کی نفی	۵۱۷	علم کلام سے واقفیت	//
مذہب جعفری میں	۵۱۸	کتاب اللہ کا علم	//
اجتہاد اور اس کی نشو و نما کے مراحل		طرق استنباط کا درک	۵۳۰
ہمہ پہلو حیثیت	//	مسائل اجماعی کا علم	
منہاج اصولیین	۵۱۹	ذہانت اور فطانت ضروری ہے	//
باب اجتہاد مفتوح ہے		مواضع اختلاف سے واقفیت	//
نہی تقلید کا اقتضاء		مجتہد کو امامی ہونا چاہئے	
مواضع استدلال کی معرفت	۵۲۱	مستقل مجتہد کون ہو سکتا ہے	//
امامیہ کے ہاں تقلید کب جائز ہے؟	//	**مذہب اثنا عشری کا نمو**	۵۳۲
مفتی اور طبیب	۵۲۲	نشو و نما کے تین مراحل	//
تقلید میت کا مسئلہ	۵۲۳	باب اجتہاد کا مفتوح ہونا	//
تقلید صرف فروع میں جائز ہے	//	مشکلات کا حل	
وجوب تقلید کی دلیلیں	۵۲۴	مذہب جعفری میں کثرت اقوال کی نعمت	۵۳۳
جواز تقلید پر علماء امامیہ کا اختلاف	۵۲۵	اقالیم مختلفہ	//
صرف دلیل سبیل ایمان ہے	//	علماء کی کثرت امامیہ میں	۵۳۴

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
بلاد و اقالیم	۵۳۵	شاہان دولت صفویہ	۵۳۸
جہاں مذہب اثنا عشری داخل ہوا	//	اعیان الشیعہ کی تصریحات	۵۳۹
اماکن مختلفہ		شیعیت کا ماضی اور حال	۵۴۰
ایران	//	شیعہ اقلیت	//
عراق	۵۳۶	شیعہ لبنان اور شام میں	//
نجف	//	قم کا ذکر	۵۴۲
کربلا	//	مذہب شیعہ ہند و پاکستان میں	۵۴۴
کاظمیہ	۵۳۷	بلاد وسط افریقہ	//
سامرا	//	ملک یمن کی اکثریت شیعہ ہے	//
ایک حقیقت کی طرف اشارہ	//	دو اہم امور	۵۴۵
دعوت شیعیت	//	خاتمہ کلام	

افتتاحیہ

اس کتاب کو میں نے دُوسری کتابوں سے موخر کیوں کیا؟

اے میرے رب میں تیرا سپاس گزار ہوں تیری نعمت ہائے فراواں اور بے پایاں پر صرف تیری ہی ہستی سزاوار شکر و ستائش ہے کہ توفیق کا توشہ تیری ہی بارگاہ سے عطا ہوتا ہے اور ہدایت کا راستہ وہی ہے جو تیری طرف لوٹتا ہے۔

میں درود و سلام بھیجتا ہوں تیرے رسول محمدؐ نبی امی پر۔
جنھیں تو نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔
جنھیں تو نے نبوت، اور کتاب اور حکمت مرحمت فرمائی۔
جن کے وجود سے تو نے مومنین کا تزکیہ کیا۔
جن کی پیروی سے تو نے متقین کو راہ یاب کیا۔

میں درود و سلام بھیجتا ہوں تیرے نبیؐ کی آل اور عترت اطہارؓ اور صحابۂ ابرارؓ پر اور ان لوگوں پر جنھوں نے ان کی پیروی کی۔

اما بعد

اللہ کی توفیق و امانت کے بھروسہ پر ہمارا عزم تھا کہ امام جعفر صادق پر ایک کتاب ضبط تحریر میں لائیں۔ اس سے قبل ہم سات ائمہ کرام کے حالات و سوانح پر کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔

لیکن اس کتاب میں تاخیر کا سبب یہ نہیں تھا کہ اس کا موضوع اس طرح کی کسی دوسری کتاب سے کمتر تھا، بلکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ دوسرے ائمہ پر یہ امام جعفر صادقؓ کو تفوق اور فضیلت حاصل ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ امام جعفر صادقؓ سے روایت کرتے ہیں، اور انھیں اختلاف فکر و نظر کا سب سے بڑا عالم قرار دیتے ہیں اور فقہا میں سب سے زیادہ ہمہ گیر اور وسیع النظر

تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح امام مالک، امام جعفر صادق کے حضور میں کسب علم اور تحصیل فن کی نیت سے حاضر ہوتے ہیں۔ امام جعفر صادق کا یہ فضل بھی کتنا گراں مایہ ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک جیسی یگانہ ہستیوں کے محترم استاذ ہیں۔

پھر کون ہے جسے ان پر فضیلت دی جاسکے؟

اور سب سے بڑھ کر جو فضیلت انھیں ممتاز اور یگانہ بناتی ہے یہ ہے کہ وہ امام زین العابدین کے پوتے ہیں، جو اپنے زمانہ میں فضل و شرف اور علم و دین کے اعتبار سے سید اہل مدینہ تھے جن کے شاگردوں میں ابن شہاب زہری اور بہت سے تابعین شامل ہیں۔

یہ امام جعفر صادق، امام محمد الباقر کے صاحبزادے تھے، جو علم کا دریائے ناپیدا کنار تھے جن کی ذات کو اللہ تعالےٰ نے مجموعۂ شرف بنا دیا تھا۔ شرف ذاتی اور شرف اضافی کرامت نسب، قرابت ہاشمیت اور عترت محمدیت کے باعث۔

اس کتاب کی تحریر میں جو تاخیر ہوئی اس کا سبب وہ ہیبت ہے جو امام جعفر صادق کی اعلیٰ وارفع ہستی کے تصوّر سے پیدا ہوتی ہے۔

امام جعفر صادق کی ذات گرامی کے بارے میں لوگ افراط و تفریط سے باز نہ رہ سکے۔

کچھ وہ لوگ ہیں جنھوں نے بہت زیادہ غلو سے کام لیا، کچھ وہ ہیں جنھوں نے جادۂ انحراف پر قدم رکھا، بعض ان کی الوہیت کے قائل ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ قریب قریب مرتبہ نبوت پر سرفراز ہیں۔

لیکن امام جعفر صادق کے معاصرین علماء اور بعد کے علماء انھیں گروہ علما کا سرتاج اور سرخیل مانتے ہیں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ فقہ دین میں وہ مرتبہ امامت پر فائز ہیں۔ وہ ایسے مجتہد ہیں جن کی تقلید کی جاتی ہے اور جن سے کسب علم و فیض کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ائمۂ اعلام نے ان سے فیض بھی حاصل کیا اور علم بھی، اور ان تمام باتوں سے بالا، ان کا شرف نسب اور علم و امامت ہے۔

ہم ان لوگوں میں ہیں جو امام جعفر صادق کو فقہ میں امام یگانہ تسلیم کرتے ہیں۔ ہماری فکر و نظر کی عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے، وہ صاحب منہاج امام تھے، انھوں نے اکابر صحابہ و تابعین سے علم حاصل کیا۔ خاص طور پر اہل بیت کرام سے۔ اور بالخصوص اپنے والد امام باقر اور دادا امام زین العابدین سے انھوں نے اپنے زمانہ سے حاصل بھی کیا، اور اپنے زمانہ کو دیا بھی، جیسے وقت کا ہر عبقری (جینیس) اپنے عہد سے لیتا بھی ہے اور اسے عطا بھی کرتا ہے وہ اپنی نسل کا نتیجہ اور بعد میں آنے والی نسلوں کا مقدمہ ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق کو فضل اجتہاد بھی حاصل تھا اور فضل بحث و تحری بھی، جو لوگ امام صاحب کو مرتبہ اجتہاد سے بلند منصب پر فائز کرتے ہیں یعنی جہاں علم وصیت سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ اجتہاد سے ہمارا جہاں تک تعلق ہے ہم بھی امام صاحب کی قدر و تکریم میں ان سے پیچھے نہیں ہیں۔

اگر امام صاحب کے علم و فضل کی پہنائی کا اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ قومی و محکم منہاج فقہیہ کے حامل تھے۔ وہ ان اعلیٰ مراتب علم پر فائز تھے جو صرف سعی و کوشش، عزم و ارادہ اور بذل مجہود سے حاصل ہو سکتے ہیں اور جو کچھ عزم و ارادے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق فضل و کرامت حاصل ہوتی ہے اور جو کچھ عطیہ اور موہبت سے حاصل ہوتا ہے، تو فضیلت اسے حاصل ہوتی ہے جو دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ صوفیہ اللہ تعالیٰ سے الحاح و زاری کے ساتھ دعا کرتے ہیں جیسا کہ انھیں کرامت کے بجائے استقامت عطا کی جائے اس لئے کہ استقامت میں شرف طاعت ہے اور کرامت، صاحب کرامت سے شکر نعمت کی طالب ہوتی ہے۔ اور کون ہے جو نعمت کرامت پر شکر ادا کرنے کی تاب و تواں رکھتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت زیادہ عبادت کیا کرتے تھے، جب ان سے بعض صحابہؓ نے عرض کیا۔

"اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف کر دی ہیں، پھر آپ اتنی زیادہ عبادت کیوں کرتے ہیں؟"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا۔

"کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟"

اس بنیاد پر کہ امام جعفر صادق بہت بڑے مجتہد تھے ہم اللہ کی عون و توفیق سے، ان کے علم و فضل اور فکر و نظر کا مطالعہ کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم ان کے عہد و عصر کا مطالبہ بھی کریں گے تاکہ بیان ہر اعتبار سے کامل اور مکمل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ جو کچھ بھی لکھیں، وہ اس کی مدد سے صحیح اور درست ہو دشواری راہ ہم پر آسان ہو جائے کیوں کہ اگر اس کی توفیق و معونت شامل حال نہ ہو، تو پھر ہم کوئی کام بھی صحیح اور درست طور پر انجام نہیں دے سکتے

وانہ - سبحانہ الموافق والھادی الی سواء السبیل۔

محمد ابو زہرہ

امام جعفر صادق

حصّہ اوّل

حضرت امام جعفر صادق کے
احوال و سوانح، تعلیم و تعلّم، وعظ و ارشاد
دعوت و تبلیغ اور عزیمت و استقامت
کی داستان

تمہید

خصومت دینی شک اور نفاق کا سبب بن جاتی ہے

حضرت امام جعفر صادق کی گفتار حکیمانہ

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک موقع پر فرمایا:۔

"خبردار خصومت دینی سے بچنا کیونکہ وہ شک کو جنم دیتی اور نفاق پیدا کرتی ہے۔

اسی طرح کا ایک قول امام صاحب کے والد امام باقر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک کلمۂ حکمت ہے جس میں گفتار نبوت کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ حکمت کی یہ بات آل بیت میں **ایک** امام سے دوسرے امام کی زبان پر رواں رہی۔ اور کوئی شبہ نہیں یہ بہت بڑی حقیقت ہے، خصومت سے حقائق کے بارے میں تشکیک پیدا ہوتی ہے اور تشکیک کا نتیجہ اضطراب نفس ہوتا ہے اور اس سے نفاق پیدا ہوتا ہے کیونکہ منافق کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتا وہ ایک اضطراب دائمہ اور اضطرار مستمر میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کی عقل کو ٹھہراؤ نہیں حاصل ہوتا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"منافق کی مثال اس بکری کی طرح ہے جو ریوڑ کے ٹکڑوں کے درمیان ہو، اور اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کدھر جائے۔

استقامت فکر کے لئے اخلاص ضروری ہے

علاوہ ازیں جدل فی الدین کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سے غلبہ اور تفوق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور جہاں غلبہ اور تفوق کا جذبہ پیدا ہوا حقائق نے منہ موڑا اور رخصت ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک جدل فی الدین سے منع فرمایا کرتے تھے۔

حق کی اگر طلب ہے تو وہ ذات حق کے لیے ہونی چاہیئے۔

فکر میں استقامت نہیں پیدا ہو سکتی ہے جب تک قلب دولت اخلاص سے مالامال نہ ہو۔

اور قلب میں اخلاص کا جذبہ نہیں پیدا ہوسکتا جب تک نفس پورے طور پر طلب حقیقت کے لیے وقف نہ ہوجائے، اور کوئی روک اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے اسے بالکل خالی الذھن ہونا چاہیئے نہ فکر سابقہ اس کا دامن پکڑے۔ نہ رائے سابق اسے الجھائے کیوں کہ یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو راہ حقیقت میں قدم فرسائی کو مانع ہوتی ہیں۔ یہ ایسے بادل کی طرح ہیں جو عقل کے لیے حجاب بن جاتا ہے، جو انسان کی بصیرت اور بینائی پر ایک طرح کا پردہ ڈال دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب خصومات ابھرتے ہیں اور حریف مقابل کو ہر قیمت پر شکست دینے اور اس کے قول کو رد کردینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو حق روپوش ہوجاتا ہے کیونکہ اس فضا میں غور اس پر نہیں کیا جاتا کہ حق اور صواب کیا ہے، بات صرف یہ سوچی جاتی ہے کہ حریف کو نیچا کس طرح دکھایا جائے۔

حقائق کے بارے میں اور خاص طور پر دین کے معاملات میں خصومت ایک بہت بڑی آفت اور مصیبت ہے، اقوام وملل کے لئے ۔ عہد قدیم میں بھی اور عہد جدید میں بھی،

عہد شیخین یعنی ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور میں مسلمان امن اور ایمان کی حالت میں زندگی بسر کررہے تھے لیکن حضرت عثمان ذی النورین کے دور میں خصومات نے سر اٹھانا شروع کیا اس کی ابتدا شک سے ہوئی اور شک کے ساتھ ہوا وہوس اور نفسانیت کے آثار بھی ہویدا ہوئے۔

پھر امام ہدیٰ اور خدا کی شمشیر برہنہ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہ، کے بعد خلافت بنوںیہ جاہ پرست بادشاہوں میں منتقل ہوگئی۔ پھر سفاک سلاطین میں جو مستبد اور قہار تھے۔ پھر ان بھاری بھرکم نام والے ملوک میں جنھوں نے مسلمانوں کو ہلاکت وبربادی کا نشانہ بنایا۔

پس امام ہاشمی علوی، فاطمی کا یہ کلمہ حکمت حقائق بالا کی تصویر کامل ہے، وہ ایسا نور ہے جو غیب کے پردوں سے چھن چھن کر آرہا ہے۔

دینی خصومت اور اختلاف فکر ونظر

لیکن ضروری ہے کہ ہم اس بات کا فرق محسوس کرلیں کہ دینی خصومت دوسری چیز ہے۔ اور استنباط احکام کے سلسلہ میں فقہاء کا اختلاف ان مسائل سے متعلق جو منصوص نہیں ہیں، دوسری چیز ہے اس اختلاف کو خصومت فی الدین نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ اختلاف طلب حق کے لیے ہے جس میں اخلاص کارفرما ہے نہ کہ وہ تعصب مذہبی کا نتیجہ ہو اور اس طرح کا متعصبانہ اختلاف نہ کیا، مجتہد یہ ہر دور میں بسلسلہ استنباط فقہی موجود تھا نہ بعد کے آنے والے علماء اور فقہا کے عہد میں۔

بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ استنباط مسائل کے سلسلہ میں فقہی اختلاف حیات فکری کی دلیل ہے،

لہٰذا یہ ہرگز صحیح اور بجا نہیں ہوگا اگر استنباط احکام کے سلسلہ میں ہم صحابہ اور تابعین کے اختلاف کو خصومت فی الدین قرار دیں، یہ اختلاف تو صرف منہج فکر کا اختلاف تھا، جو تفسیر نصوص کے سلسلہ میں نمایاں ہوا کرتا تھا۔ اور تخریج مسائل تک محدود تھا۔ چنانچہ وہ خود اپنے افکار و آراء کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔

"اگر یہ حق ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے الہام اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے

اور اگر باطل ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر اور شیطان پر ہے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد گرامی

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دینی اخلاص رکھنے والے بزرگ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ صحابہ کرامؓ کے مابین استنباط احکام و مسائل سے متعلق اختلاف موجود رہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے:

"تمام مسائل میں اگر ایک ہی رائے ہوتی تو لوگ ضیق اور تنگی میں مبتلا ہو جاتے۔ چنانچہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختلاف فکری میرے نزدیک سُرخ اونٹوں کے گلے سے زیادہ مسرت بخش ہے۔"

ائمہ کرام اور مجتہدین عظام کے اختلافات فکری

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہؓ اور تابعین و بعد کی جلیل القدر ہستیاں امام زید بن علی، امام باقر، امام جعفر صادق اور ائمہ مثلاً ابو حنیفہ، مالک، اوزاعی لیث بن سعد، اور ان بزرگوں کے بعد شافعی وغیرہ نے استنباط احکام و مسائل کے سلسلہ میں اختلاف کیا۔

صرف یہی نہیں بلکہ ائمہ فقہیہ کے شاگردوں نے آپس میں بھی اور اپنے استاذ سے بھی اختلاف کیا۔ مثال میں ہم اصحاب مالک اور اصحاب ابو حنیفہؒ کو پیش کر سکتے ہیں۔

یہ اختلاف ظاہر ہے خصومت دین نہیں تھا۔ نہ ایمان اور عقیدے کا اختلاف تھا، بلکہ اسے ایمان صادق کے مظاہر میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ معانی اسلام کے ادراک حقیقی کا آئینہ دار تھا، اصول دین کا جہاں تک تعلق ہے فکر و نظر میں نہ تباین تھا، نہ اختلاف، نہ تضاد، اختلاف جو کچھ تھا فروعات میں اور اگر کسی مسئلے سے متعلق نص قطعی موجود نہ ہو تو فکر و نظر کا ایک دوسرے سے متعلق نہ ہونا بالکل قدرتی چیز ہے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں حکومت کے قوانین کی تعبیر و تفسیر میں بھی بڑے بڑے مقننین کے درمیان اختلاف رائے ہوتا رہتا ہے۔ بشرطیکہ نص قانون قطعی نہ ہو، یا سرے سے نص ہی موجود نہ ہو۔ اس صورت میں قیاس اور تخریج سے کام لیا جاتا ہے۔ اور قواعد عدالت میں تطبیق پیدا کی جاتی ہے تاکہ فساد کا خاتمہ ہو، اور وہ چیز بروئے کار آئے جو مصلحت سے قریب تر ہو۔ ہر قانون کی یہی

غرض ہے اور ہر نظام کا یہی مقصد ہے۔

چنانچہ فقہا کے اخلاص کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے اختلاف فکر و نظر کے بارے میں فرمایا کرتے تھے

"ہم جس چیز کو صواب سمجھتے ہیں اس میں خطا کا احتمال ہے اور دوسروں کی جس رائے کو غلط خیال کرتے ہیں وہ صحیح اور بجا بھی ہو سکتی ہے۔"

اس سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ خصومت فی الدین ان فروعی مسائل سے متعلق، جن کی تائید و توثیق نص قطعی سے نہ ہوتی ہو، نہیں ہے۔ یہ اختلاف تو آئینہ دار ہے حریت فکر کا اور حریت فکر آئینہ دار ہوتی ہے اس مخلص ذہن کی جو حق کا متلاشی اور سچائی کا جویا ہوتا ہے۔ اگرچہ انداز نظر اور اسلوب فکر میں توافق نہ ہو۔

اس کے برعکس خصومت تعصب سے پیدا ہوتی ہے اور تعصب جانب داری کا نام ہے اور جس فکر و نظر کی بنیاد جانب داری پر ہو، وہ صرف ایک ہی جانب دیکھتی ہے اور دوسری جانب سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

اختلاف فکر و نظر سے حریت فکر پیدا ہوتی ہے

امر واقعہ یہ ہے کہ خصومت نام ہے افتراق کا، کیوں کہ ہر فریق صرف اپنی ہی جانب کا لحاظ رکھتا ہے اور اس کے ساتھ تعصب رکھتا ہے۔ اسے صرف ایک ہی فکر ہوتی ہے، یہ کہ وہ غالب رہے، اس طرح وہ افق فکری کی تنگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی نظر محدود ہو جاتی ہے، نہ اس میں وسعت باقی رہ جاتی ہے، نہ قوت تمیز۔

اس کے برعکس دوسرا اختلاف، وہ اختلاف جو تعصب، جانب داری اور تنگ نظری پر مبنی نہ ہو، وہ نظر میں وسعت پیدا کرتا ہے، افق فکر میں کشادگی اور پہنائی پیدا کرتا ہے، نظر کے میدان کی توسیع کرتا ہے۔ اس سے ایسے مسائل نمودار ہوتے ہیں جو اس سے قبل کسی کے حاشیہ خیال میں نہیں آتے تھے۔

پس سمجھ لینا چاہیے، وہ اختلاف جو اخلاص پر مبنی ہو، وہ علم کے نشو و نما اور فروغ و عروج میں مدد دیتا ہے، حالانکہ خصومت سے صرف ایک ہی چیز پیدا ہوتی ہے، وہ ہے ضیق اور تنگی، لہٰذا ان ہر دو اختلافات کے مابین جو فرق ہے وہ معمولی نہیں بے حد عظیم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام جعفر صادق اپنے عہد کے فقہا کے اختلافات کی معرفت پر حریص تھے، جیسا کہ ان سے امام ابوحنیفہ نے روایت کیا ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ بھی اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"بہت بڑا عالم وہ ہے جو لوگوں کے اختلاف فکر و نظر سے آگاہی رکھتا ہو۔"

٭ ٭ ٭

قبل اس کے کہ ہم خصومت اور اختلاف و خصومت کے مابین فرق کی بحث ختم کریں، ضروری ہے کہ پہلے ہم دو حقیقتوں کو تسلیم کرلیں۔

خصومت کو موروثی نہیں رہنا چاہیئے

ایک یہ کہ خصومت فی الدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ عصر متخاصمین کے ساتھ ختم ہوجائے اگر دین واحد ہے، عقیدہ واحد ہے اور ملیت واحد ہے یہ قطعاً درست اور بجا نہیں ہے کہ آگے والی نسلوں تک منتقل ہوتی رہے۔ نہ یہ مناسب ہے کہ اسے موروثی بنا لیا جائے۔ جو لوگ حق کی خاطر مخاصمت میں مبتلا ہوئے۔ ان کے لیے یہ کافی ہے کہ انھیں ابتلاءِ خصومت سے دوچار ہونا پڑا۔ اسے اخلاف کی طرف منتقل کرنا شیوۂ دانش نہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب عصبیت نسب سے منع فرمایا ہے تو عصبیت دینی کی گنجائش اسلام میں کہاں سے نکل سکتی ہے؟ آپؐ کا ارشاد ہے؟

"جو عصبیت کی طرف بلاتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

اس ارشاد نبوی کی روشنی میں واجب ہے کہ عصبیت دینی کو ورثہ بنایا جائے بلکہ عصبیت نسب کے مقابلہ میں عصبیت دینی تو اور زیادہ ممنوع اور غیر پسندیدہ ہونی چاہیئے، کیوں کہ جو لوگ عصبیت نسب کے قائل ہیں وہ تو ایک دلیل بھی دیتے ہیں کہ اس سے قرابت نسب اور خون کو تقویت ملتی ہے لیکن دینی عصبیت کے لئے تو اس طرح کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے، یہ تو صرف افتراق ہے جس سے نہ صرف دین کو کسی طرح کا فائدہ پہنچتا بلکہ گزند پہنچتا ہے۔ اسے تو کسی درجہ میں مستحسن اور روا نہیں قرار دیا جا سکتا

لیکن ہم دکھ اور تکلیف کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ جو خصومت دینی اخلاف تک منتقل ہوتی ہے وہ دین میں افتراق کا سبب بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمان گروہوں اور طائفوں میں بٹ گئے، ہر گروہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہے کچھ لوگ ہیں جو ڈھکی چھپی باتیں کرتے ہیں کچھ بانگ دہل لیکن خصومت موروثہ کو ختم کرنے کی سبیل صرف یہ ہے کہ ہم اسے صرف اسلاف تک محدود کردیں اور صرف وہی باتیں لیں جو اخلاف کے لیے مفید اور سود مند ہوں اور بے جھجک صاف اور واشگاف الفاظ میں کہہ دیں۔

خصومت دینی کا ایک روشن پہلو

ہم دیکھتے ہیں کہ جس خصومت نے اپنے زمانے میں شورش اور فتنے پیدا کیے تھے جب وہ ختم ہو گئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے رات کی تاریکی دور ہو گئی۔ اور روز روشن نمودار ہو گیا جو فرقے ان خصومات کے حامل تھے ان کے پاس اگر افتراق کے بیکاں تھے تو علم نافع بھی تھا، وہ علم جو افکار مختلف اور آراء رنگا رنگ کا مجموعہ تھا۔ کیوں کہ ہر فرقہ کے پاس ایسی علمی میراث موجود ہے جو علم حقیقی کی حامل ہے اور واجب ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس کی خوشہ چینی کی جائے، اسی طرح اس سے ایسے حقائق برآمد کیے جا سکتے ہیں، جو اسلام کے لیے مفید ہیں اور دفاع اسلام کے لیے جن سے خاطر خواہ کام اسی طرح لیا جا سکتا ہے جیسے معتزلہ کا چھوڑا ہوا فلسفہ تنزیہ باری تعالیٰ کے بارے میں!

مذہب امامیہ کے فقہی افکار گراں بہا سرمایہ کے حامل ہیں

بعض اسلامی فرقوں مثلاً زیدیہ اور امامیہ کے فقہی افکار و آراء میں ایسا سرمایہ بھی ہے جس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور بلاشبہ وہ ہمارے بعض اجتماعی امراض کا شافی علاج بھی ثابت ہو سکتا ہے اور وہ بذاتہٖ نہ مخالف کتاب اللہ ہے نہ مخالف سنت رسول اللہ بلکہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں اسے حسن استنباط کا فکر انگیز موقف قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مصر کی حکومت نے فرقۂ امامیہ کے بعض فقہی مسائل کو اپنا لیا ہے۔ مثلاً فرقہ امامیہ کا مفتی بہٖ مسئلہ یہ ہے کہ اگر تین طلاقیں ایک مرتبہ دے دی جائیں تو صرف ایک طلاق واقع ہو گی۔ طلاق مغلظہ واقع نہیں ہو گی۔ کتاب و سنت کی روشنی میں یہ بہترین استنباط ہے، اس لیے مصر کی حکومت نے شیعہ نہ ہونے پر شیعوں کے اس مسلک کو اختیار کر لیا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے بھی شیعوں کے اس مسلک کو صحیح اور درست تسلیم کیا تھا، اور اس پر وہ فتویٰ دیتے تھے، امام ابن تیمیہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ انھوں نے یہ مسلک آئمہ آل بیت کے اقوال سے کیا ہے۔

اسی طرح شیعوں کا قانون وصیت ہے، جو بیوہ کے وارث کے لیے بھی۔ اگر ضرورت اور مصلحت داعی ہوتی۔ وصیت کی جا سکتی ہے اگرچہ امام جعفر صادق سے اس کے خلاف قول منقول ہے لیکن امامیہ مذہب کا فتویٰ اجازت وصیت پر ہے اس مسلک کو بھی مصر کی حکومت نے اپنا لیا ہے۔

اسی طرح اور بھی کئی مسائل ہیں جو شیعوں سے اور دوسرے فرقوں سے ہم لے سکتے ہیں۔ ہم پر واجب ہے کہ خصومت کا وہ ترکہ جو ہمارے لیے مفید ہے ـــــ افتراق باہمی سے دامن بچاتے

"تلك امة قد خلت لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت۔

(یعنی ،ان لوگوں کی ایک جاعت تھی جو گذر گئی اور جو کچھ انھوں نے کیا اس کا بُرا بھلا بھی سمیٹیں گے)

اور پھر طول افتراق کے بعد آپس میں مل بیٹھیں۔

ہر شر میں خیر کا پہلو بھی موجود ہوتا ہے

(۲) کوئی شر بھی ایسا نہیں جس میں خیر کا پہلو موجود نہ ہو۔ چنانچہ خصومت دینی نے گو موروثی تلخ کامی اور بدمزگی کے اثرات پیدا کیے لیکن اپنے ساتھ خیر بھی زیادہ نہیں تو قلیل سہی، لیکن لائی، کیونکہ اللہ تبارک تعالٰے کے پیدا کیے ہوئے موجودات میں نہ یہ ہے کہ خیر ہی خیر ہو، نہ یہ ہے کہ شر ہی شر ہو، کوئی وجود نہ شر محض ہے نہ خیر محض۔

متخاصمین کا عہد گزر جانے کے بعد اس خصومت نے ایسے افکار و آرا چھوڑے جنھیں بعد میں آنے والی نسلوں نے جانا، پرکھا اور جانچا اور خالص علمی انداز میں ان کی تنقیح کی، انھوں نے متخاصمین کے اقوال کا امعان نظر سے مطالعہ کیا اور پھر تاریخ نے اس حصہ کو زندہ رکھا، جو زندہ رہنے کا مستحق تھا اور زمانہ کی تیز رو اس خس و خاشاک کو اپنے ساتھ بہا لے گئی، جو زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتا تھا اگرچہ علم سینہ کے طور پر کسی نہ کسی حد تک کہیں نہ کہیں موجود رہا ہو۔

اس طرح آثار خصومت کا وہ حصہ باقی رہ گیا جو درس و نظر فحص و تحقیق کے لائق تھا، اور جس سے استفادہ اور استفاضہ ممکن تھا۔

یہ بات ان افکار و آرا پر بھی صادق آتی ہے جن کی نسبت شیعوں نے امام جعفر صادق کی طرف کر رکھی ہے۔ اللہ کا فضل شامل حال ہے تو ہم تحقیق و تدقیق کے ساتھ اس پہلو پر نظر ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ نسبت کس اعتبار سے اور کہاں تک اور کس کس پہلو سے صحیح ہے۔ ہماری گفتگو تحقیق و تمحیص علمی کے اسلوب پر ہوگی، نہ کہ جدل و مناظرے کے طور پر۔

شیعوں کے پاس جو سرمایہ ہے عام اس سے کہ اس کے کچھ حصہ کی نسبت امام جعفر صادق کی طرف از روئے تحقیق صحیح ہو یا نہ ہو، کوئی شبہ نہیں وہ ایک بہت بڑا علمی سرمایہ ہے، جس سے اخلاف کو پورا پورا فائدہ، خصومت فی الدین کے شر سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اٹھانا چاہیئے۔ یہ تاریخ ایسی رواں دواں دریا ہے جو تیزی کے ساتھ جاری ہے جس کی موجیں متلاطم ہیں اور پھر یہ متلاطم موجیں، اور آب رواں ان نہروں میں منتقل ہو جاتا ہے جن کا آب شیریں کام و دہن کو لذت اندوز کرتا ہے۔ کھیتیاں لہلہاتی ہیں اور نباتات میں روئیدگی پیدا ہوتی ہے۔

ہوئے اسے لے لیں، قبول کرلیں؛ اس کا مطالعہ کریں۔ دوسرے مسائل سے اس کا موازنہ کریں اور اس گلشن زرخیز سے پورے طور پر متمتع ہوں جس کے شگوفے اور اثمار ہمارے نفوس وعقول کے لیے صالح ترین غذا کی حیثیت رکھتے ہیں اور جس کی بنیاد پر ہماری سوسائٹی کی ایک ایسی محکم اور مستحکم تعمیر قائم ہوتی ہے جو ماضی کے پردے سے نکلی ہے اور حال کے لیے سازگار ہے۔ اور جس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ہمارے مصالح عمومی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔

وہ نفسیاتی امور جو مانع اور سدّراہ ہیں

لیکن ان فقہی افکار وآراء کے مطالعہ کے مابین بعض نفسیاتی امور مانع اور سدراہ ہیں۔ یہ کہ ان فقہی آرا کے حامل وہ فرقے ہیں جو ماضی میں ایک دوسرے سے دست وگریباں رہ چکے ہیں اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے بھی عائد کر چکے ہیں۔ ان فرقوں میں بعض وہ بھی ہیں جو شیخین یعنی حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان ذی النورین پر سب وشتم کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ چیز اور زیادہ دوری کا سبب بن جاتی ہے۔ اور ایک مخلص محقق اور متلاشی حق کے لیے جوان وزرائے نبیؐ کے مقام کو پہچانتا ہے اور اسلام میں ان کے رتبۂ عالی سے واقف ہے، اپنے اندر ایک طرح کی جھجک اور کوفت محسوس کرتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ امر اس کا متقاضی ہے کہ جو علماء ان فرقوں کے علم کے حامل ہیں اور جو ان کے علمبردار ہیں وہ آگے بڑھیں، سامنے آئیں اور دوسرے گروہ کے علماء کو بتائیں کہ ان کا مذہب بھی دوسرے اسلامی مذاہب کے مانند ہے اور ان اسلامی مذاہب میں کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہے جو تمام تر مقدس آرا کا حامل ہو۔ ان میں ایسے آرا بھی ہیں جو کتاب اور سنت نبویہ شریفہ کے ہم آہنگ نہیں ہیں ان کے مسائل صحیح بھی ہوسکتے ہیں اور غلط بھی، کیوں کہ ان مسائل کو مستنبط کرنے اور ان کی تخریج کرنے والے بہرحال معصوم نہیں تھے۔ اور یہ کہ ہر مجتہد سے غلطی بھی ہوسکتی ہے اور صواب کا صدور بھی ہوسکتا ہے اگر ان لغزشوں اور خطاؤں سے کوئی ذات مستثنیٰ ہے تو بس وہ صاحب روضہ شریفہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

اور اخلاص کا تقاضا یہ بھی ہے کہ یہ علماء بلند مرتبت اس بات کا اعلان کریں کہ آراء شاذہ مثلاً ابوبکر وعمر پر سب وشتم ان کے علمی سرمایہ کا کوئی اہم اور قابل مطالعہ حصہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف بعض متحرفین کے آرا ہیں جو اپنی اس غلط روی کا خمیازہ خود بھگت لیں گے اور اس طرح ان کے متبعین بھی۔

تلخیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے

ان افاضل علماء پر یہ فرض جلیل بھی عائد ہوتا ہے کہ شروع سے اب تک ان کے دلوں

میں جو غلط فہمیاں یا تلخیاں ان کے بعض افکار و آراء سے متعلق پیدا ہو چکی ہیں ان کو پہلی فرصت میں زائل کرنے کی کوششیں کریں۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ میرے علم میں ایسے علماء اجل ہیں جنھوں نے مجاہدانہ جوش اور سرگرمی کے ساتھ پیدا شدہ تلخیوں، بدپرہیزیوں اور غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں جو صحیح ترین اور بہترین طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اعلان کر دیں کہ وہ ان آراء میں سب و شتم کے قائل نہیں ہیں جنھوں نے ہر گوشۂ ارض کے مسلمانوں کو متوحش اور بیزار کر رکھا ہے۔ ایسا کون صادق الایمان مسلمان ہے جو یہ جانتے ہوئے کہ فرق اسلامیہ میں سے ایک فرقہ امیر المومنین عمر بن الخطاب پر لعنت بھیجنا داخل دین سمجھتا ہے اور پھر بھی اس کے مذہب کے اصول اور تعلیمات کے مطالعہ میں وقت صرف کرنا گوارا کرے گا؟ بجز ایسے شخص کے جسے قدرت کی طرف سے غیر معمولی دل و دماغ عطا ہوا ہو۔ اسی طرح ہر مسلمان کے لیے یہ باور کرنا بھی مشکل ہے کہ یہ جاننے کے باوجود کہ لعن و سب و شتم کسی فرقہ کا دینی اصول ہے۔ اس کے اقوال و آراء کو قبول کرلے گا۔

ان تلخیوں اور بدمزگیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ ایک بہت بڑا علمی اور دینی فریضہ ان فرقوں کے ان علماء مخلصین پر ہے، ضروری ہے کہ وہ اس ناگوار صورت حال کو ختم کرنے کی طرف متوجہ ہوں، اور اس تلخی کا ازالہ کرنے کی سعی فرمائیں جو مدت مدید سے پیدا ہو چکی ہے۔

ہمیں یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے وہ بھائی جو مذہب امامیہ رکھتے ہیں اس حقیقت کو سمجھ رہے ہیں اور الحمد للہ کہ ان کی بہت سی کتابوں میں اب ہمیں اس طرح کا مواد ملتا ہے جو خوشگوار دوستانہ برادرانہ فضا پیدا کرنے میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔

شیعہ سنی اختلاف، حنفی شافعی اختلاف کی طرح ہے

ان مذہبی فرقوں میں متوارث طور پر جو خفقر چلی آرہی ہے

اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ کتنے گراں قدر اور گراں بہا سرمایہ کی حامل ہے اور توحید ملت اسلامیہ میں کتنی معین اور مددگار ثابت ہو سکتی ہے اور ان رکاوٹوں کا مکمل طور پر سدباب ہو سکتا ہے جو ہمارے اور ان کے مابین دشمنوں نے پیدا کر دی ہیں ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ نفسانیت میں اضافہ ہو اور شوکت اسلام کو ضعیف کیا جائے اور مسلمانوں کو پراگندہ کر کے کمزور کر دیا جائے اور انھیں ایک دوسرے سے دست و گریبان کر دیا جائے۔

اگر ہم یہ جان لیں اور محسوس کر لیں کہ ہمارا اور فرق اسلامیہ کا اختلاف صرف مسلک کا اختلاف ہے وہ افتراق باہمی کا سبب نہ ہے نہ ہو سکتا ہے نہ ہونا چاہیے تو شیعوں اور دوسرے مسلمان فرقوں کے

درمیان اختلاف کی وہی صورت رہ جائے گی، جو حنفیوں اور شافعیوں کے اختلاف کی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک یہ باور کرنے لگے گا کہ گو اس کے نزدیک اُن کا مذہب درست اور صحیح ہے لیکن اس کا احتمال ہے کہ اس کی بعض باتیں درست نہ ہوں اور دوسرے فرقہ کا مذہب گو غلطی کا احتمال رکھتا ہو لیکن صواب کا احتمال بھی رکھتا ہے اس طرح قلوب میں اتنی وسعت اور گنجائش پیدا ہو جائے گی کہ وہ آراءِ مخالفہ کو قبول کر سکیں۔ اور افق فکر حتمی میں بھی وسعت پیدا ہو جائے گی۔ لوگ آپس میں گھل مل جائیں گے۔ اور باہمی نفرت اور بیزاری کا جو جذبہ پیدا ہو گیا ہے وہ آسانی سے دور ہو جائے گا اور اسکے بجائے باہمی انس پیدا ہو جائیگا اور وحدت جامعہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں رہے گا اور اللہ تبارک تعالے کا یہ ارشاد محقق ہو جائے گا۔ وان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ

ہر فقہ کا مسئلہ اگر صحیح ہو تو قبول کیا جا سکتا ہے

اگر یہ مذہبیت، طائفیت کی جگہ حاصل کرے تو ہر انسان کے لیے یہ آسان ہو جائے گا کہ بے جھجک اپنی رائے ظاہر کرے اور دوسروں کے لیے آسان ہو جائے گا کہ اس پر غور کریں اور کھرا پائیں تو قبول کر لیں مثلاً ایک شیعہ کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ کسی مسئلہ میں حنفی فقہ کی کوئی رائے قبول کرے اور ایک شافعی کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ فقہ شیعہ کا کوئی مسئلہ اختیار کرے۔ کیونکہ مذہبیت میں "منتقل فکری" کوئی عیب کی بات نہیں ہے لیکن طائفیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں خون کی طرح توارث کا سلسلہ چلتا ہے چنانچہ ایک شیعہ کا بیٹا شیعہ اور ایک سنی کا بیٹا سنی ہی ہو گا۔ اسی طرح دوسروں کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

شیعہ علماء کی رواداری

اور یہ بالکل حق ہے اگر ہم کہیں کہ مذہب جعفری کے متبعین نے اس سلسلہ میں پیشقدمی کی اور وہ بہت دور تک بڑھتے چلے گئے انھوں نے دوسرے مذاہب اسلامیہ سے پورا استفادہ کیا اور جن چیزوں کو بجا اور درست پایا انھیں اختیار بھی کر لیا۔ انھوں نے سنیوں کے فقہی مذاہب اربعہ کو معتبر قرار دیا۔ اسی طرح جمہور مسلمین کے نزدیک جو صحاح ستہ معتبر ہیں انھیں بھی پائے اعتبار پر بحال رکھا۔ انھوں نے اس مائدہ کریم سے ریزہ چینی کی جسے ہم سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے ہیں اور اسوۂ سلف آل بیت قرار دیتے ہیں۔

فقہ امامیہ کا مطالعہ خالی الذہن ہو کر کرنا چاہیئے

بہر حال اگر ہم ایسی روح مذہبی کے ساتھ جو طائفیت اور تحزب سے خالی ہو۔ امام جعفر صادق عنہ اور ان کے آباء کرام کا مطالعہ کریں تو بلا ریب شک ہم اپنے تئیں مجبور پائیں گے کہ اس مذہب کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں جو ان کے اسم گرامی سے منسوب ہے۔

و لیکن یہ ضرور ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس پر آمادہ نہیں کر سکتے کہ امام جعفر صادق کی طرف جو کچھ منسوب ہے

کا [illegible] لفظاً بلفظ اور حرف بہ حرف صحیح ہے۔

کلینی نے ان کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ قرآن میں نقص داخل ہوگیا ہے لیکن امام جعفر صادق کی طرف اس قول کی نسبت کسی طرح بھی صحیح تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ خود ثقاہت مذہب امامیہ نے اس قول کو رد کیا ہے اور اس کی صحت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے تسلیم کی ہے اور یہ ثقاہت وہ ہیں جو مذہب امامیہ کے چوٹی کے لوگوں میں ہیں اور جن کا شمار کبیر علماء مذہب امامیہ میں ہوتا ہے مثلاً شریف مرتضیٰ اور ان کے شاگرد رشید طوسی۔

وارث کے لیے وصیت کے جواز و عدم جواز کا قول

مذہب امامیہ میں حضرت امام جعفر صادق کی طرف یہ قول بھی منسوب ہے کہ انھوں نے وارث کے لیے وصیت جائز رکھی ہے۔

ایک قول وارث کے لیے منع وصیت کا بھی آپ سے منقول ہے کیوں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو فرائض مقرر کیے ہیں ان میں تغییر لازم آتی ہے کیوں کہ قرآن کریم سے منصوص یہ ہے کہ بنت منفردہ کی میراث نصف ہے اور اگر وصیت کی اجازت دے دی جائے تو اسے ثلث اور نصف ملے گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو آدھا حصہ رکھا ہے اس میں تغیر واقع ہو جائے گا۔

متعہ کے بارے میں اقوال امام جعفر صادق

مذہب امامی میں مروی ہے کہ امام جعفر صادق نے متعہ کی اجازت دی ہے

متعہ نام ہے مہر کے ساتھ زن معلومہ سے کم و بیش تین مہینے کے لیے عقد کا۔ لیکن زیدیہ نے اپنی کتابوں میں حضرت امام جعفر صادق کا جو قول نقل کیا ہے وہ اس کے خلاف ہے، اس کی رو سے آپ نے اس طرح کے تعلق کو زنا قرار دیا ہے۔

اور امر واقعہ بھی یہ ہے کہ متعہ متعدد آیات قرآنی کے خلاف پڑتا ہے۔ مثلاً

محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان

یعنی: اس طرح سے کہ تم بیوی بناؤ صرف مستی ہی نکالنا نہ ہو، نہ خفیہ آشنائی کرنا۔ یا یہ ارشاد

محصنات غیر مسافحات ولا متخذات اخدان

یعنی: اس طور پر کہ وہ منکوحہ بنائی جائیں نہ علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں نہ خفیہ آشنائی کرنے والی۔

کتب مذہب امامیہ کی چار قسمیں

اس طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے جو اقوال منقول اور مروی ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو ایک دوسرے سے متخالف ہیں ان میں سے صحیح ترین قول کو تلاش کر لینا جہد کبیر کا محتاج ہے اور سعی بلیغ و جہد کثیر

کے بعد بھی اس حقیقت تک پہنچنا بہت مشکل ہے کہ قطعی قول کونسا ہے، ہم صرف ظن غالب ہی کی بنا پر صحت و عدم صحت کا فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ یقینی اور قطعی قول تک رسائی سعی و کوشش کے بعد بھی آسان نہیں ہے۔

ظن راجح اور ظن غالب کی تحقیق کے سلسلہ میں ان کتب امامیہ کو جو امام جعفر صادق کی طرف منسوب ہیں، چار قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) امام جعفر صادق سے وہ مرویات جو معروف جمہور امت کتب سنت سے متفق ہیں۔

ایسی پہلی قسم کی بغیر کسی معاوضہ کے امام جعفر صادق کی طرف نسبت صحیح اور درست ہے کیونکہ اس پر علماء کا ہر دور میں اتفاق چلا آیا ہے لہٰذا اس میں ظن و ریب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(۲) وہ مرویات جو کتاب اللہ تعالیٰ اور تواتر کے بالکل خلاف جاتے ہیں اور جن کے قبول کر لینے سے دین میں طعن لازم آتا ہے

ایسے مرویات بلا شبہ ناقابل تسلیم ہیں۔ مثلاً نقص قرآن سے متعلق روایات جو کلینی نے درج کئے ہیں اور ہم بغیر کسی تامل اور تذبذب کے کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فقیہہ جلیل اور عترت طاہرہ بنی پر تہمت ہے۔

(۳) وہ روایات جو کتب شیعہ میں ہیں اور باہم متخالف ہیں ان میں سے بعض روایات صحیحہ کے ساتھ متفق ہیں اور بعض جمہور سے مختلف ہیں۔

اس صورت میں ہم ان روایات کو قبول کر لیں گے جو جمہور سے ہم آہنگ ہو اور مخالف روایات کو ترک کر دیں گے۔ مثلاً وارث کے لیے وصیت کی اجازت والی روایت اور اس روایت کی مخالف روایت، کیونکہ ان دونوں میں سے ایک وہ ہے جو جمہور کے ساتھ متفق نہیں ہے اور دوسری منع وصیت والی وہ ہے جو جمہور کے ساتھ متفق ہے۔

بس اس صورت میں ہم وہ روایت اختیار کریں گے جو جمہور سے مطابقت رکھتی ہے اور وہی حضرت امام جعفر صادق سے ہم آہنگ بھی ہو سکتی ہے کیوں کہ وہ اپنے عصر سے بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے ہم عصر فقہا سے ان کا ربط و تعلق ثابت ہے۔ چنانچہ وہ امام محمد سے ربط رکھتے تھے۔ اور امام مالک نے ان سے کسب علم بھی کیا ہے وہ امام ابو حنیفہ سے بھی ربط رکھتے تھے اور امام ابو حنیفہ نے بھی ان سے کسب فیض کیا ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسف کی کتاب الآثار اور امام محمد کی کتاب الآثار (یہ دونوں کتابیں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے مسند ہیں اور ان دونوں میں بکثرت روایات امام جعفر صادق سے مروی ہیں لہٰذا منطق اور عقول کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ان روایتوں کو قبول کریں جو جمہور سے موافقت رکھتی ہیں اور ان کے

مخالف نہیں ہیں۔

اسی طرح متعہ کا مسئلہ ہے، امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ انھوں نے اسے مباح قرار دیا ہے لیکن کتب شیعہ میں ائمہ آل بیت سے اور خود امام جعفر صادق سے مروی پاتے ہیں کہ انھوں نے اسے زنا قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ہم سطور ما سبق میں بتا چکے ہیں۔

(۴) روایت محض شک کی بنا پر رد نہیں کی جا سکتی

امام جعفر صادق سے مروی وہ روایتیں جو کتب امامیہ میں موجود ہیں لیکن وہ کتاب و سنت کے مخالف نہیں ہیں، انھیں ہم بے تامل اور بے چون و چرا قبول کریں گے اکسی طرح بھی انھیں رد نہیں کر سکتے اسی طرح وہ روایات مختلفہ جو کسی مسئلہ سے متعلق ہوں لیکن ان مختلف روایتوں میں کوئی روایت ایسی نہ ہو جو جمہور سے معارض ہو، اسے بھی ہم رد نہیں کریں گے قبول کریں گے کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسی حجت، دلیل یا روایت نہیں ہے جو دوسری روایت کے صدق کی نقیض ہو۔

اور ایسا اس لیے ہے کہ ہم محض شک کی بنا پر کسی روایت کو رد نہیں کر سکتے جب تک یقین یا ظن غالب نہ ہو، ہم کسی روایت کو رد کر ہی نہیں سکیں گے، اور موجودہ صورت مسئلہ میں نہ ہمارے پاس یقین ہے نہ ظن غالب، لہٰذا ہم قبول کرنے پر مجبور ہیں۔

امام جعفر صادق سے منسوب روایات کی تحقیق

اور ہمارا یہ اسلوب فکر و مطالعہ ہمیں ان سے دور نہیں کرتا۔ کچھ اور زیادہ قریب کر دیتا ہے۔ ہم یہ کوشش نہیں کرتے کہ جس ذکر کو امام جعفر صادق سے منسوب کیا گیا ہے۔ اسے ہم اسی جگہ پر بجا اور درست تسلیم کریں۔ ان سے منسوب اقوال و روایات کا جو ذخیرہ ہے ہم اسے دیکھتے ہیں پرکھتے ہیں اور پھر خدائے تعالٰے کے فضل و کرم سے ہمارے سامنے امام صاحب کی رائے اس طرح روشن اور نمایاں ہو جاتی ہے جیسے نجم ثاقب۔ ہمارے پرکھنے اور جانچنے کا اصول یہ ہے کہ ہم امام صاحب سے منسوب اقوال و افکار کو ان کی حیات گراں سے ربط دینے کی کوشش کرتے ہیں جو انھوں نے مدینہ منورہ میں گزاری اور بقاع اسلامیہ کے معمار تک جس کی روشنی پہنچی اور ان علما نے ان سے کسب علم و فیض بھی کیا۔ اور انھوں نے بھی ان علما سے مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھا۔

مذہب امامی اثنا عشری اور اقوال مختلفہ

مذہب امامی اثنا عشری جو حامل علم امام جعفر صادق ہے وہ قول واحد پر مبنی نہیں ہے۔ اگر وہ قول واحد پر مبنی ہوتا تو امام صاحب پر قلم اٹھانے والا سخت ضیق میں مبتلا ہو جاتا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مذہب امامی اثنا عشری اقوال مختلفہ پر مبنی ہے اور یہ اقوال مبنی ہیں امام ابو عبداللہ الصادق

سے منسوب روایات پر۔

چنانچہ ایک تحقیق کرنے والا بہ آسانی ان روایات میں تمیز کرسکتا ہے کہ کونسی روایت اس امام جلیل کے اصول و اسلوب سے میل کھاتی ہے اور کونسی نہیں کھاتی۔ چنانچہ جہاں ہمیں یہ روایت ملتی ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ موجودہ قرآن جو ہمارے ہاتھ میں ہے ناقص ہے وہاں ایک دوسری روایت بھی ملتی ہے جو یہ ہے کہ آپ نے اس شخص کو کافر قرار دیا جو نقص قرآن کا قائل ہو۔

ان دونوں روایات میں آخری روایت ایسی ہے جس میں صاف اور واشگاف طور پر حق جھلک رہا ہے اور پہلی روایت قطعاً بجا اور درست تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

فقہ امامیہ کے مسائل اور رائے جمہور

فقہ امامیہ میں جو مسائل ہیں وہ رائے جمہور سے موافق بھی ہیں اور مخالف بھی۔ جو مخالف ہیں اور ان میں کوئی ایسی بات نہیں جو کتاب و سنت کے خلاف ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک محقق انھیں قبول کرنے میں تامل کرے۔ مثلاً انہار و وقف اور اس کی تعتیم کے بارے میں فقہ امامی کا مسلک ہر اعتبار سے بجا اور درست ہے۔

فقہ امامیہ میں جو مسائل ہیں ان میں سے وہ مسائل جو اجماع جماہیر مسلمین کے خلاف ہیں، کچھ ایسے زیادہ نہیں ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فقہ اثنا عشری اور دوسرے فقہی مذاہب میں بہت زیادہ بعد نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں مسلک فقہ امامیہ بجائے خود ایک مذہب ہے وہ کسی ضعیف فرقہ کا طریقہ نہیں ہے۔ اس جگہ اتنا اجمال کافی ہے۔ آگے چل کر اس بحث پر ہم زیادہ تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

امور تنقیح طلب

ہم ابو عبداللہ امام جعفر الصادق کے بارے میں زیادہ صحت اور تکمیل کے ساتھ اس وقت تک گفتگو نہیں کرسکتے جب تک دو امور کو بخوبی منقح نہ کرلیں۔

پہلا امر ہے عقائد میں ان کے افکار و اقوال۔

عقائد میں بحث و گفتگو نے زیادہ زور عصر اموی اور صدر عصر عباسی میں باندھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غیلان دمشقی مسئلہ قدر اور حریت ارادۂ انسان پر گفتگو اور بحث کرتا ہے۔

اس طرح جہم بن صفوان جبر اور ذات الٰہی سے نفی صفات کے مسئلہ پر بحث و گفتگو کرتا اور بحث و نطق کا آغاز کرتا ہے۔

اور قرآن میں اللہ تعالیٰ کے جو اوصاف، قدرت، ارادہ، علم اور حیات سے متعلق وارد ہوئے ہیں ان پر بحث و گفتگو ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے اسماء یعنی اسماء حسنیٰ، وغیرہ کو ذات سے منفک صفات تاہم جہم تسلیم نہیں کرتا۔

اس سلسلہ بحث میں لوگوں کے اندر اس بحث نے بھی زور پکڑا کہ کیا قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اس بارے میں غور و خوض کرنے سے لوگوں کو منع کیا گیا لیکن جعد بن درہم اور جہم بن صفوان نے اس مسئلہ پر بھی نطق و کلام کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ذہنی سرگشتگی کا دور اضطراب انگیز

یہ تمام باتیں عصر اموی اور عصر امام جعفر صادق میں رونما ہوئیں یہ ایسے مباحث و مسائل تھے، جنھوں نے عقل میں سرگشتگی پیدا کر دی اور لوگ گمراہ ہو گئے، جو ایمان قوی سے محروم تھے۔

لیکن جو مومن صادق تھے وہ بادِ صرصر کے ان زبردست جھگڑوں میں بھی ثابت قدم رہے، البتہ جو کمزور اور ضعیف تھے ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور ان کا یقین شک سے بدل گیا۔

خانوادۂ بنو مروان کے کارکن یوحنا دمشقی کی فساد انگیزیاں

یہ ان لوگوں کی فتنہ انگیزی تھی جو مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے، جن کی تمنا تھی کہ مسلمان اختلاف باہمی اور اختلاف فکر و نظر کا شکار ہو جائیں ان میں بہت سے گروہ، فرقے اور طبقے پیدا ہو جائیں اور ہر فرقہ اور گروہ اپنے مزعومات میں مگن رہے۔

اس طرح ان لوگوں نے اختلاف و شقاق کی تخم ریزی کی اور تدبیرات خفیہ سے کام لے کر ان میں اضطراب خیال اور انتشار فکر کا مرض پیدا کیا۔

شک، بے یقینی اور ضعف ایمان پیدا کرنے والی اس خفیہ تحریک کا سالار کارواں یوحنا دمشقی تھا جو خانوادۂ بنو مروان کا ایک کارکن تھا اور جس کا باپ معاویہ بن ابی سفیان کا کاتب تھا۔

عہد امام کے دو گروہ علماء

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے عہد میں علماء دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ وہ تھا جو ان فکری تصورات سے واقف تھا لیکن ان میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا۔ نہ کسی طرح کی رائے ظاہر کرتا تھا۔ مثلاً امام مالک رضی اللہ عنہ امام لیث، سفیان ثوری سفیان بن عیینہ وغیرہ ائمہ فقہ و حدیث۔

ان ائمہ کرام کے سکوت کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے یہ ایسا امر ہے جس میں سلف صالح نے فکر و خوض سے کام نہیں لیا لہٰذا اس پر بحث و گفتگو اور غور و خوض غیر ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس سے ضعیف الایمان لوگوں کے دلوں میں شک اور ریب کی تخم ریزی ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کس گروہ میں شامل تھے؟

دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو ان کلامی مسائل پر غور و خوض اور بحث و گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ

کانام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی اقامت عراق میں تھی۔ وہ بصرہ بھی تشریف لایا کرتے تھے اور بصرہ مختلف فکری گروہوں اور فرقوں اور جماعتوں کا مرکز تھا۔ یہاں رہنے اور آنے جانے والا شخص ان کلامی مباحث سے دیے بہرہ ہو سکتا تھا نہ بے تعلق رہ سکتا تھا۔

لیکن امام ابوحنیفہ کی رائے اس باب میں وہی تھی، جو سلف صالح کی تھی۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ امام ابوحنیفہ کی رائے عبارت تھی سلف صالح کے اقوال و رجحان سے۔

سلف صالح نے اگرچہ کلامی مباحث میں حصہ نہیں لیا اور اس امر میں غور و خوض نہیں کیا، لیکن کسی بحث میں الجھے بغیر اور جدل و مناظرہ میں حصہ لیے بغیر تنزیہ الٰہی سے متعلق انھوں نے اپنے افکار و خیالات کا برملا اظہار کیا۔

امام جعفر صادق کا تعلق کس گروہ سے تھا؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ علماء کے ان دونوں فریقوں میں سے امام ابوعبداللہ الصادق کس گروہ علماء میں شریک تھے؟ آیا ان کا منہاج وہی تھا جو ان کے تلامیذ مثلاً امام ابوحنیفہ کا تھا جو ان کے شاگرد بھی تھے، ہم عصر بھی اور جنھوں نے ان سے مذاکرہ بھی کیا تھا؟

معتزلہ کا ایک تحقیق طلب دعویٰ

امامیہ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ اس باب میں ان کی جو رائے تھی وہ بڑی حد تک معتزلہ سے ملتی جلتی تھی، ان کا دعویٰ ہے کہ عترت نبویہ کی رائے ان کی رائے سے موافق اور ہم آہنگ تھی۔

اور کوئی شبہ نہیں یہ دعویٰ تحقیق و دراست کا طالب ہے۔

ہم اس جانب مائل ہیں کہ امام جلیل جعفر الصادق ان مسائل سے متعلق اپنے مخصوص افکار و آرا رکھتے تھے۔ اس لیے کہ عراق اور فارس کے عقیدت مندان سے ان مسائل کے بارے میں وقتاً فوقتاً سوال و استفسار کیا کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ ان پر غور و خوض کے عادی تھے۔ بس ضروری تھا کہ عقیدت مندوں کے سوالات اور استفسارات کا جواب ہادی مرشد کی طرف سے دیا جائے۔ اور یہ جواب طریق امثل اور سبیل رقوم کا حامل ہو۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہم امام صاحب کے افکار و آرا کا مطالعہ کریں جو کچھ ان سے اثنا عشریہ نے روایت کیا ہے۔

اس باب میں بھی ہمارا مسلک فقہ کی طرح ہوگا اور امام صاحب سے منسوب جو خیالات و اقوال کتاب و سنت صحیحہ سے متفق نہیں ہوں گے انھیں قبول نہیں کریں گے اور امام صاحب کی ذات گرامی

کی طرف ان کی نسبت تسلیم نہیں کریں گے۔ کیونکہ ان کے اور مصادر شریعت کے مابین توفیق ممکن نہیں قبول نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری جازم اور محکم رائے یہ ہے کہ ان اقوال وخیالات کی نسبت جو کتاب وسنت سے معارض ہوں۔ امام صاحب کی طرف کسی طرح صحیح ہو ہی نہیں سکتی۔ اور جو اقوال وخیالات کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہوں گے انھیں ضرور تسلیم کریں گے۔

دوسرا اہم ترین مسئلہ ہے سیاست کا۔

سیاسیات عصر اور عترت نبوی ﷺ آل بیت کے متعلق مشہور ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد ان حضرات نے سیاسیات سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

چنانچہ امام زین العابدین جو خانوادۂ حسین کے سربراہ اعلیٰ تھے، اپنے والد شہید کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے اور انھوں نے سیاست میں سلبی یا ایجابی کسی طرح بھی کوئی حصہ نہیں لیا اور اپنی ساری ذہنی و دماغی صلاحیت علم کی نشر و اشاعت پر مبذول کر دی۔ ان کا سارا وقت خدمت خلق اور امور خیر میں صرف ہوتا، وہ فقیروں اور بے نواؤں کے کام آتے، ضعیفوں اور دردمندوں کی چارہ جوئی فرماتے ان کی مالی حالت جہاں تک اجازت دیتی وہ ہر حاجت مند کی ضرورت پوری کرتے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کا اجلال واکرام اور زیادہ بڑھ گیا وہ ان کی نظروں میں اور زیادہ محبوب بن گئے۔

عوام کے قلوب ان کی عقیدت کا مرکز تھے اور اس بات سے خلفائے وقت کے بیٹے، اور حاشیہ نشین جلتے اور چڑتے تھے۔ حتیٰ کہ ہشام بن عبدالملک تک آپ کی عظمت اور محبوبیت عام دیکھ کر اس وقت جل اٹھا تھا جب آپ طواف کے لیے تشریف لائے اور لوگوں کا جمگھٹ آپ کو دیکھ کر راستہ دینے کے لیے کائی کی طرح پھٹ گیا۔ اس موقع پر خلیفۂ وقت کا بھائی ہشام بھی موجود تھا لیکن اس کی طرف کسی نے نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا اور یہ ہشام صرف خلیفۂ وقت کا بھائی ہی نہیں ولی عہد مملکت بھی تھا۔

اس موقع پر مشہور شاعر فرزدق بے ساختہ کہہ اٹھا

هذا الذی تعرف البطحاء وطاته!
والبیت یعرفه والحل والحرم
هذا ابن خیر عباد الله کلهم
هذا التقی النقی الطاهر العلم

ﷺ

امام زید کی شہادت اور اس کے اثرات

سیاست نے امام زید کو شہادت گاہ میں پہنچا دیا۔ انھوں نے خروج کیا اور مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان کا قتل بھی اتنا ہی بے دردانہ اور سفاکانہ تھا، جتنا ان کے دادا حسینؑ کا۔

لیکن کیا سیاست امام محمد باقر اور ان کے فرزند دلبند امام جعفر صادق کو بھی رزمگاہ میں لا سکی؟

کوئی شبہ نہیں ان دونوں اماموں کی بڑی کڑی آزمائش خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے ہوئی۔ ان دونوں کا زمانہ، فرقہ آرائیوں اور گروہ بندیوں کا زمانہ تھا۔ یہ فرقے اور گروہ دین صحیح سے انحراف و بُعد رکھتے تھے۔ بایں ہمہ ان جلیل القدر اماموں سے دعوائے نسبت بھی رکھتے تھے۔ ان کا یہ انتساب پہلے امام باقر سے رہا۔ پھر امام جعفر صادق سے، انھوں نے ان دونوں کی طرف ایسے اقوال منسوب کیے جن سے انھوں نے اپنا دامن اس طرح صاف کیا جیسے پاک صاف کپڑے سے گرد و غبار چھانٹ دیا جاتا ہے۔

ان دونوں نے سیاسی امور و مسائل پر بھی گفتگو کی ان کی طرف سب ابوبکر و عمر کا انتساب کیا گیا لیکن انھوں نے آل بیت سے اس طرح ان باتوں کی نفی کردی جیسے امام علی زین العابدین نے آل بیت سے ایسے امور کی نفی کردی تھی۔

امام جعفر صادق کے افکار سیاسی

امام جعفر صادق نے بھی سیاسی امور پر گفتگو کی، اگرچہ وہ اپنے گوشۂ عزلت سے باہر نہیں نکلے۔ اور یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ ان جیسا مفکر اعظم اپنے ارد گرد حوادث کو ابھرتے اور نمود پاتے دیکھتا رہتا اور اپنی رائے کا سلباً یا ایجاباً اظہار نہ کرتا۔ خصوصاً جب کہ یہ حوادث آل بیت سے گہرا ربط و تعلق رکھتے تھے۔

امام جعفر صادق نے بچشم خود ملاحظہ فرمایا تھا کہ ان کے عم محترم امام زید نے خروج کیا۔ اور شہید ہوئے ان کے ابن عم محمد نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم نے خروج کیا۔ اور جام شہادت نوش کیا۔ پس یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ ان امور سے متعلق ان کی کوئی سلبی یا ایجابی رائے نہ ہوتی۔

اور اگر انھوں نے فاش و برملا اظہار رائے نہیں کیا تو یہ اس امر کی مستلزم نہیں ہے کہ وہ ان امور سے متعلق کوئی رائے ہی نہیں رکھتے تھے۔ وہ رائے رکھتے تھے اور جانتے تھے۔ محسوس کرتے تھے کہ یہ فتنے جو ابھر رہے ہیں ان کی طرف دعوت دینا یا ان میں کود پڑنا تقاضائے دانش و مصلحت نہیں ہے وہ یہ بھی دیکھتے اور محسوس کرتے تھے کہ اس خروج کے بعد ظلم اور زیادہ شدید اور غلیظ ہو گیا پہلے سے کہیں زیادہ۔

اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ

اس وقت دو بڑے فرقے۔ اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ تھے جو اپنے آپ کو امام جعفر صادق کی طرف منسوب کرتے تھے اور

خلافت کو ان کی اولاد اعجاد میں دائر و سائر مانتے تھے ۔

ان دونوں فرقوں نے امام صاحب کی طرف سیاسی افکار وآرا منسوب کیے ہیں۔ واجب ہے کہ ان افکار وآراء کا ہم جائزہ لیں اور انھیں پرکھیں ۔

اس دراست میں بھی ہمارا اصول اور منہاج وہی ہوگا جو فقہ میں تھا، یہ ضرور ہے کہ اگر فقہ میں ہم تفصیل تک جانا پسند کرتے ہیں، تو اس میں اجمال کو کافی سمجھتے ہیں، کیونکہ مقصود اصلی ہے، اور دوسری چیزیں، ثانوی مرتبہ رکھتی ہیں لہٰذا ان کی دراست تبعی ہے اور فقہ کی اصلی۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس تصفیہ میں حق تک پہنچنا ایک کارا ہم اور مرحلہ صعب ہے جس میں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا احتمال ہے اور ایک محقق جن نتائج تک پہنچے گا وہ تمام لوگوں کے لیے نہ قابل قبول ہو سکتے ہیں نہ محمود اور مرغوب ۔

اگر ہم آراء امام جعفر صادق کا وہی پہلو لیں جو ان کا نام لینے والے اختیار کرتے ہیں تو وہ زیادہ برہم نہیں ہوں گے، لیکن اگر دوسرا پہلو اختیار کریں تو ان کی برہمی بڑھ جائے گی، لیکن اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہیں، ہم وہی کہیں گے جو ہماری تحقیق کا نتیجہ ہے اور جو ہمارے نزدیک حق ہے۔ لومۃ لائم کی ہم ذرا بھی پروا نہیں کریں گے، ہم حق کا ساتھ دیں گے اگرچہ ساری دنیا ہم سے خفا ہو جائے ۔

الامام جعفر الصادق

از ۸۰ھ تا ۱۴۸ھ

بیت علوی نور و عرفان کا مرکز پہلی صدی ہجری کے نصف آخر اور دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں بیت علوی مدینہ منورہ میں، نور و عرفان کا سب سے بڑا مرکز اور مصدر تھا، کیونکہ نکہت اسلام، یعنی شہید ابن شہید وابوالشہداء حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے قتل کے وقت سے، آل بیت نے علم نبوی کی تعلیم و تلقین اور تدریس و تبلیغ کو اپنا وظیفۂ حیات بنا لیا تھا، ان میں اپنے آباد کی ذکاوت تھی۔ اپنے جد (م) کی ہدایت تھی۔ ہاشمیت کا شرف تھا، جس نے انھیں پست اور رکیک باتوں سے دور کر دیا تھا۔ اور معالی امور کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔

انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اس لیے کہ اس کی تلخی وہ چکھ چکے تھے اور اس کی حلاوت سے آشنا نہیں ہوئے تھے، یہ علمی مرتبہ انھیں وراثت میں ملا تھا۔ امامت بھی ان کی موروثی چیز تھی۔ اگرچہ وہ دنیا کے جاہ و حشم سے دور ہی رہتے تھے۔ گو انھوں نے اہل دنیا کی سلطانی اور سرداری اپنے ہاتھ میں نہیں لی۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے اہل آخرت کی سلطانی اور سرداری انھیں عطا فرما دی تھی۔

آستانہ امام زین العابدین و امام باقر امام علی زین العابدین، امام مدینہ اور فاضل اجل اور عالم بے بدل تھے۔ ان کے صاحبزادے محمد الباقر نے والد بزرگوار سے امامت علم و ہدایت وراثت میں پائی تھی، لہٰذا جملہ بلاد اسلامیہ کے علماء اور فضلا اس آستانہ پر کسب علم و فیض کے لیے سر جھکا کر حاضر ہوتے اور رشاد کام ہو کر واپس جاتے تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جو مدینہ آئے اور بیت باقر کی زیارت سے مشرف ہوئے بغیر واپس چلا جائے۔

یہ لوگ! ـــــ یہ لوگ جو آستانۂ باقر پر حاضر ہوتے تھے، ان میں شیعیان آل بیت بھی تھے اور اصحاب اہل سنت بھی۔

ان لوگوں میں وہ غلو پسند لوگ بھی تھے جو شیعیت میں حد سے آگے بڑھ گئے تھے۔ امام باقر ان کے سامنے حق پیش کرتے اور اس کی وضاحت کرتے تھے۔ اگر وہ ہدایت قبول کر لیتے، تو وہ حق کامل کے لیے ان کی

بیعت قبول کرلیتے۔ اور اگر وہ اپنے غلو اور تشدد پر قائم رہتے تو انھیں اپنی مجلس سے باہر نکال دیتے۔

امام باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہونے والے اصحاب زیادہ تر ائمہ فقہ و حدیث ہوتے۔ مثلاً سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ محدث مکہ۔ ابوحنیفہ فقیہہ عراق

جو بھی اس آستانہ پر حاضر ہوتا، ہدایت پاتا۔ آپ اس کے سامنے حق کو اس طرح پیش فرماتے کہ اس میں کسی طرح کی کمی نہ رہتی۔

ایک علمی مناقشہ کا مرقع ذیل میں ہم ایک علمی مناقشہ کا مرقع پیش کرتے ہیں جو ان کے اور فقیہہ عراق ابوحنیفہ کے مابین ہوا تھا۔

امام ابوحنیفہ کثرت قیاس کے سلسلہ میں غیر معمولی شہرت پا چکے تھے، یعنی فقہی مسائل میں وہ کتاب و سنت کا اتنا خیال نہیں کرتے جتنا قیاس سے کام لیتے ہیں۔ اس چیز پر بعض لوگ انھیں ملامت بھی کرتے تھے۔ بہر حال اس مناقشہ کی کیفیت یہ ہے۔

امام محمد باقرؑ۔ کیا تم ہی وہ شخص ہو جس نے میرے جد(ص) کے دین کو اور اس کی احادیث کو قیاس سے بدل دیا ہے؟

امام ابوحنیفہ۔: آپ اپنی جگہ تشریف رکھیے، کیونکہ میرے نزدیک آپ کی وہی حرمت ہے جو آپ کے جد(ص) کی اپنے اصحاب کے نزدیک تھی۔

امام باقرؑ بیٹھ گئے، پھر ابوحنیفہ ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے اور گویا ہوئے۔

"میں آپ سے تین سوالات کرتا ہوں۔ ان کا جواب مرحمت فرمائیے۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ مرد زیادہ ضعیف ہے یا عورت؟

امام باقرؑ۔ مرد کے مقابلہ میں عورت زیادہ ضعیف ہے۔

امام ابوحنیفہ:۔ میراث میں عورت کا حصہ کتنا ہے؟

امام باقرؑ:۔ مرد کو دو حصّے اور عورت کو ایک حصّہ ملتا ہے۔

امام ابوحنیفہ:۔ یہ آپ کے جد(ص) کا علم ہے اور اگر میں نے آپ کے جد(ص) کے دین کو بدل دیا ہوتا پھر قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ مرد کو ایک حصّہ دیا جاتا اور عورت کو دو حصّے دیئے جاتے، اس لئے کہ عورت مرد سے زیادہ ضعیف اور ناچار ہے — اب میرے دوسرے سوال کا جواب دیجئے۔ ارشاد ہو، نماز افضل ہے یا روزہ؟

امام باقرؑ:۔ نماز افضل ہے۔

امام ابوحنیفہؒ:- یہ آپ کے جد (رح) کا ارشاد ہے، اگر میں نے آپ کے جد (رح) کا قول بدل دیا ہوتا تو عورت جب حیض سے ظاہر ہو جاتی، تو میں اسے حکم دیتا کہ نماز کی قضا ادا کرے، اور روزے کی قضا نہ ادا کرے، ــــ اب میرے تیسرے سوال کا جواب مرحمت ہو، وہ یہ ہے کہ پیشاب زیادہ نجس ہے یا نطفہ؟

امام باقرؒ:- پیشاب زیادہ نجس ہے۔

امام ابوحنیفہؒ:- اگر میں نے آپ کے جد (رح) کا دین قیاس سے بدل دیا ہوتا تو میں حکم دیتا کہ پیشاب کے بعد غسل کیا جائے۔ اور نطفہ کے لیے وضو کو کافی سمجھا جائے، لیکن خدا کی پناہ میں آپ کے بعد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے دین کو قیاس سے بدل دوں۔

یہ سنکر امام باقر اُٹھے۔ انھوں نے امام ابوحنیفہ سے معانقہ کیا اور ان کے چہرے کو بوسہ دیا۔

* * *

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام باقر علماء کے گروہ میں امام کی حیثیت رکھتے تھے، وہ انھیں اپنے حضور میں طلب کرتے تھے۔ ان کا محاسبہ کرتے تھے۔ اس بارے میں جو باتیں ان کے سمع مبارک تک پہنچتی تھیں ان کی جانچ پڑتال کرتے تھے۔ ان کی حیثیت ایک رئیس کی تھی جو اپنے زیر دستوں اور ماتحتوں پر حکم چلاتا تھا اور وہ بہ جان و دل ان کی تعمیل کرتے تھے۔ اور اس کی ریاست کے سامنے سر جھکاتے تھے۔

امام باقر اور صحابۂ کرام | امام باقر رضی اللہ عنہ، صحابہ کرام کا قرار واقعی اجلال واحترام ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ خاص طور پر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا اللہ تعالیٰ ان کے علم سے مسلمانوں کو نفع دے۔ اس باب میں فرمایا کرتے تھے۔

"جو ابوبکرؓ و عمرؓ کے فضل کا شناسا نہیں ہے وہ سنت سے ناواقف ہے!"

ایک مرتبہ انھوں نے جابر جعفی سے، جو ان کے اصحاب میں سے تھے فرمایا:

"اے جابر مجھے معلوم ہوا ہے کہ عراق کی ایک جماعت اس خیال میں ہے کہ وہ ہمیں محبوب رکھتی ہے، اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں برے خیالات رکھتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں نے اسے اس بات کا حکم دیا ہے، ان لوگوں کو بتادو کہ میں خدا کے سامنے ان کے اس فعل سے بری ہوں۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ مجھے شفاعت محمدؐ نصیب نہ ہو اگر میں ان دونوں کے لیے دعائے استغفار نہ کرتا ہوں، وہ لوگ خدا کے دشمن ہیں جو ان سے غافل ہیں۔

امام باقر قرآن کے بہت بڑے مفسر تھے

امام باقر قرآن کے بہت بڑے مفسر تھے اور فقہ اسلامی کے بہت بڑے رمز شناس تھے اور اوامر و نواہی دونوں ہی کی حکمت سے واقف تھے۔ اور ان کے مرامی و مقاصد کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔

وہ راویٔ حدیث بھی تھے، احادیث آل بیت کی روایت فرمایا کرتے تھے. علاوہ ازیں بغیر کسی تفریق کے صحابہ سے حدیثیں روایت فرمایا کرتے تھے۔

کبر و غرور کس دل میں بسیرا لیتا ہے

ان کے کمال نفس، نور قلب اور قوت مدارت کے باعث اللہ تعالےٰ نے انھیں دانش و بینش کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا۔ اخلاق شخصی ایقاعی سے متعلق ان سے ایسے اقوال و عبارات مروی ہیں کہ اگر انھیں ترتیب و تہذیب کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا جائے تو وہ اخلاقیات کا ایک بہترین آئین بن جائے۔ اور انسانیت مرتبۂ ارفع و اعلیٰ پر فائز ہو جائے۔ چنانچہ ان کا قول ہے:

"کسی شخص کے قلب میں کبر و غرور اسی وقت گھر بناتا ہے جب عقل وہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اپنے صاحبزادے ابو عبداللہ جعفر کو انھوں نے وصیّت فرمائی تھی۔

"اے بیٹے!"

کسل اور ضجر سے بچنا، کیونکہ یہ دونوں چیزیں شر کی کنجیاں ہیں۔

"اگر تم نے کسل سے کام لیا تو حق تک نہیں پہنچ سکوگے۔ اگر تم نے ضجر سے کام لیا تو حق پر قائم نہ رہ سکوگے۔"

اسی طرح ان کا ارشاد ہے:

"اگر تم کسی قاری (عالم) کو دیکھو کہ وہ دولت مندوں کو محبوب رکھتا ہے تو سمجھ لو وہ صاحبِ دنیا ہے اور جب تم دیکھو کہ وہ حاکم وقت کے دامن سے وابستہ ہے تو سمجھ لو وہ چور ہے!"

اپنی قوت تدین اور ادراک معانی اسلام کی بنا پر ان کی رائے تھی کہ فرائض کی ادائی کے ساتھ ساتھ طلب علم زہد سے بہتر ہے، چنانچہ ان کا ارشاد ہے:

"خدا کی قسم ایک عالم کی موت ستر عابدوں کی موت سے زیادہ ابلیس کے لیے مسرت بخش ہے"۔

الولد سرٌ لابیہ

امام باقر کے علم و حکمت سے ان کے فرزند ارجمند امام جعفر صادق نے پورے طور پر استفاع کیا وہ فرمایا کرتے تھے:۔

"میرے والد ماجد نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا، پانچ آدمیوں کی صحبت نہ اختیار کرنا۔ نہ ان سے بات چیت کرنا۔ نہ میل جول رکھنا۔ نہ راستے میں ان کے ساتھ چلنا پھرنا۔

(۱) فاسق کی صحبت نہ اختیار کرنا۔

(۲) بخیل سے بچنا۔

(۳) جھوٹے سے میل ملت نہ رکھنا، وہ اس سراب کی طرح ہے جو تم سے قریب کو دور اور دور کو قریب کر دے گا۔

(۴) احمق سے پہلو بچانا، وہ تمہیں نفع پہنچانے کا ارادہ کرے گا، لیکن ضرر پہنچا کر رہے گا۔

(۵) قاطع رحم سے کنارہ کشی اختیار کرنا کیونکہ میں نے کتاب اللہ میں اسے ملعون پایا ہے۔"

امام باقر کی وفات | ابوالفدا نے ان کا سال وفات ۱۱۵ھ لکھا ہے: یہ تھے ابو جعفر محمد الباقر: امام باقر ۱۱۴ھ میں فوت ہوئے۔ ان کے احوال و کوائف سے خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ کس خاک سے امام جعفر نے نمو حاصل کیا صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ علم نبوی کے سایہ میں انھوں نے نشوونما حاصل کی۔

امام جعفر صادق کی والدہ | امام جعفر صادق کی والدہ ماجدہ بھی ایک بہت بڑے خانوادۂ علم سے تعلق رکھتی تھیں۔ امام باقر کی رفیقۂ حیات ایک جلیل القدر تابعی کی صاحبزادی اور حضرت ابوبکر صدیق کی پوتی تھیں۔ چنانچہ امام جعفر کی ذات گرامی میں، شجاعت علیؓ اور فدویت صدیق جمع ہو گئی تھیں ان کے خون میں جہاں عبقری دوراں علیؓ کا علم گردش کر رہا تھا وہاں صبر اور وقار صدیق کی کارفرمائی بھی جاری تھی۔ چنانچہ شہرستانی کا قول ہے

"امام جعفر صادق باپ کی طرف سے شجرۂ نبوت کی شاخ ہیں اور ماں کی طرف سے ابوبکر صدیق سے انتساب رکھتے ہیں۔"

امام جعفر صادق کا خاندان | امام صاحب کی والدہ کا نام ام فروہ تھا۔ یہ قاسم بن محمد کی صاحبزادی تھیں اور یہ قاسم وہ تھے جنھوں نے حضرت عائشہ کے دامن تربیت سے فیض حاصل کیا تھا۔ انھوں نے حضرت عائشہ رضہ سے حدیث روایت کی ہے۔ ان کا شمار مدینہ کے مشہور آفاق فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مدینہ کے علم کو اخلاف تک پہنچایا ان کے آستانے سے بہت سے لوگوں نے فیض حاصل کیا جن میں امام مالکؒ بھی شامل ہیں امام موطا کا بڑا حصہ انھوں نے انہی کے مرویات کی بنیاد پر مدون کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ مدینہ کا علم امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے گھر کا تحفہ تھا۔

اور یہ ام فروہ بیٹی تھیں حضرت اسماء بنت عبدالرحمٰن بن ابی بکر الصدیق کی۔ اس طرح گویا امام جعفر صادق کو حضرت ابوبکر سے دوگونہ تعلق از طرف مادر حاصل ہے۔

قاسم بن ابی بکر آپ کے نانا تھے

امام جعفر صادق نے اپنے نانا کو دیکھا تھا، اور ضروری تھا کہ ان سے علم بھی حاصل کیا ہو۔ ان کا جب انتقال ہوا تو امام جعفر صادق کا عہد شباب شروع ہو چکا تھا۔ انھیں علم سے ربط و تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ علم حاصل کرنے کے بعد اسے وہ دوسروں تک پہنچانے بھی لگے تھے۔

قاسم رضی اللہ عنہ یعنی امام جعفر صادق کے نانا کی وفات ۱۰۸ھ میں ہوئی۔ اس وقت حضرت امام جعفر صادق کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔

اور یہ قاسم رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ صدیقہ کے علم کے حامل تھے۔ انھوں نے ابن عباس سے بھی علم حاصل کیا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کے والد محمد بن ابی بکر صدیق کو اپنے بیٹے کی طرح پالا پوسا تھا کیوں کہ حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد ان کی بیوی اور محمد کی ماں ہو ملہ سے حضرت علی نے شادی کر لی تھی۔

اور قاسم نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہ سے روایت کی اور حضرات حسنین علیہما السلام کے بعد بنو ہاشم کے سب سے بڑے اہل علم بزرگ عبداللہ بن عباس کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور ویسے بجائے خود بھی بہت بڑے فقیہہ اور ناقد روایت و حدیث تھے۔ وہ فقہ و حدیث کے جامع تھے، ان کے بارے میں ان کے شاگرد باتمیز ابوالزناد اور عبداللہ بن ذکوان کا قول ہے:

"میں نے قاسم سے بڑا کوئی فقیہہ نہیں دیکھا۔ نہ ان سے بڑا کوئی سنت کا عالم میری نظر سے گزرا۔"

مرکز فیض و ہدایت سرچشمۂ علم و فضل

یہ تھے امام جعفر صادق کے وہ جد محترم، جن کی زندگی میں امام صاحب سن رشد کو پہنچے۔ علم حاصل کیا، اور مرتبہ عالی پر فائز ہوئے یہاں تک کہ انھوں نے وہ رتبہ حاصل کر لیا کہ بلاد اسلامیہ کے مشرق اور مغرب سے علماء کبار ان کی بارگاہ میں طلب علم کے لیے حاضر ہوتے تھے اور وہ علم جو انھوں نے اپنے والد بزرگ اور اپنے نانا سے حاصل کیا تھا۔ اپنے دامن میں بھر کر لے جاتے تھے۔

مولد اور نشوونما

امام جعفر صادق کی تعلیم و تربیت اور تحصیل علم کی داستان

آل محمدؐ کا چشمۂ صافی

امام جعفر صادق نے اپنے اکابر کی گود میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے دامن تربیت سے فیض یاب ہوئے۔ آل محمدؐ کے چشمۂ صافی سے سیراب ہوئے۔ تابعین کے ذخیرۂ علم کو حاصل کیا اور اس مقدس فضا میں نشوونما کے مراحل طے کیے۔ اور اس بیت کریم میں بلوغ و شعور سے بہرہ ور ہوئے۔ وہ بچپن ہی سے علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جیسا کہ اس زمانہ میں اہل بیت کا معمول تھا۔ انھوں نے علی بن زین العابدین کا دیدار بھی کیا تھا، جن کے زہد و تقدس اور علم و فضل سے حجاز کے در و بام آشنا تھے۔ آنکھیں ان کے دیدار سے بصیرت کی تمنا اور قلوب ان کی محبت و عقیدت سے سعادت کا تحفہ حاصل کر رہے تھے۔ ان کے سامنے کسی کی مجال دم زدن نہ تھی۔ ان کے شرف و فضیلت کے سامنے سب کے سر جھک ہی جاتے تھے۔

سال ولادت، ایک مختلف فیہ مسئلہ

امام جعفر صادق کے سال ولادت میں اختلاف ہے بعض کا قول ہے کہ وہ سنہ ۸۰ھ میں تولد ہوئے، بعض سنہ ۸۳ھ بتاتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۸۰ھ سے پہلے ہوئی تھی، لیکن زیادہ مرجح روایت یہ ہے کہ ان کا سال ولادت سنہ ۸۰ھ ہی ہے۔ اس سال ان کے چچا امام زید کی بھی ولادت ہوئی اور اسی سال دنیائے فقہ کے فقیہ اعظم امام ابو حنیفہ بھی کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔

امام صاحب کی عمر جب چودہ سال کی ہوئی تو ان کے جد محترم امام زین العابدین نے اس دنیا سے کنارہ فرمایا۔ یہ وہ عمر تھی کہ ان کی فکر پیدا ہو چکی تھی۔ اور وہ شعور و بلوغ کی منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ اپنی نشاۃ اولیٰ میں تین چشموں سے وہ سیراب ہوئے۔

امام زین العابدین
امام محمد باقر
قاسم رضی اللہ عنہ

اور یہ تینوں اصحاب، ارباب فضل عظیم تھے۔

امام جعفر صادق کی مرکزی شخصیت

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں علم مدنی اور آثار صحابہ کے لیے مرکزی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اکابر تابعین روایت حدیث کیا کرتے تھے اور اس امام متقی پر یہ بات گراں نہیں تھی۔ کہ ان سے اپنے جد (۳) کا علم حاصل کریں کیوں کہ نبی علیہ السلام کا علم تمام صحابہ میں شایع تھا۔ اسی طرح آپؐ کی احادیث کا حال تھا یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی حدیث کسی صحابی کے علم میں نہ آسکی ہو۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ کوئی حدیث تمام صحابہ کے علم میں نہ آسکی ہو۔ کیونکہ اگر کوئی کسی حدیث سے ناواقف تھا، تو دوسرا اس سے واقف تھا۔ لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی حدیث جملہ صحابہ سے مخفی رہ گئی ہو۔

اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کی جستجو تھی۔ اس نے ہر دروازے پر قید مقام سے بے نیاز ہو کر دستک دی اور ان طالبان علم رسولؐ میں اخلاف علی رضی اللہ عنہ وکرم اللہ وجہٗ پیش پیش تھے انھوں نے پورے طور پر اس علم کے حصول کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا چونکہ علم صاحب علم میں خاکساری اور تواضع پیدا کر دیتا ہے۔ علم اگر کسی آدمی کی صورت اختیار کرے تو یقیناً وہ مرد متواضع کی صورت اختیار کرے گا۔ اور یہ بات تھی بھی مستحیل اور ناممکن کہ باب مدینۃ العلم علی کے ابناء و اخلاف اس طرف متوجہ نہ ہوتے۔ اس کے مصادر کا سراغ نہ لگاتے اور اکابر تابعین سے اسے حاصل نہ کرتے۔

کسب علم کے دوران میں امام جعفر صادق کے ایک معاصر زہری تھے۔ اسی طرح دوسرے فقہاء مدینہ بھی تھے جنھوں نے عمر اور ان کے صحابی تلامذہ سے کسب علم کیا تھا۔

ان تابعین میں ایسے حضرات بھی تھے جنھیں بعض اہل بیت کرام سے خصوصی ربط و تعلق تھا۔ چنانچہ ابن شہاب زہری کو امام زین العابدین اور امام زید سے بڑا گہرا لگاؤ اور ربط تھا جو امام جعفر صادق کے برابر تھے۔

چنانچہ آل بیت کا علم تابعین کے علم سے منقطع نہیں تھا بلکہ متصل تھا۔ آل بیت تابعین سے علم نبوی حاصل کرتے تھے اور تابعین آل بیت سے کسب علم رسول علیہ السلام کرتے تھے۔ یہ سب کے سب جس علم کے جویا تھے، وہ اللہ تعالےٰ کے رسول مقبول کا علم تھا۔

امام جعفر صادق خلیفہ منصورؔ اور امام ابو حنیفہ

امام جعفر صادق کے طلب واکتساب علم کا سلسلہ جاری تھا کہ ان کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔

والد کے انتقال کے وقت امام جعفرؓ کی عمر ۳۴ سال کی اور ایک روایت کے مطابق ۳۵ سال کی تھی؛

"ہمارا مسلک یہ ہے:
کبھی ہم ان کی متابعت کرتے ہیں، کبھی وہ ہماری متابعت کرتے ہیں اور کبھی ہم سب سے جدا مسلک اختیار کرتے ہیں"
اسی طرح میرے مرتب کردہ چالیس سوالات پورے ہو گئے۔

٭ ٭ ٭

پھر امام ابوحنیفہ نے اس کے بعد فرمایا:
"لوگوں میں سب سے بڑا عالم وہ ہے جو لوگوں کے اختلاف افکار و اقوال سے پورے طور پر واقف ہو"

امور سہ گانہ امام ابوحنیفہ کے اس ارشاد سے تین امور پر روشنی پڑتی ہے۔ جنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

امام صادق علم میں غیر متعصب تھے (۱) امام صادق رضی اللہ عنہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ طلب علم میں وہ کسی طرح کا تعصب روا نہیں رکھتے تھے۔ وہ اہل مدینہ اور اہل عراق دونوں سے کسب علم کرتے تھے۔ ایک کے لیے دوسرے کو ترک نہیں کرتے تھے، اور اس طلب علم میں اپنے عصر سے وہ پورے طور پر موثق تھے۔ ان کا علم صرف آل بیت تک محدود و مقصود نہ تھا بلکہ ہم بلا اندیشہ تردید کہنے کا یہ حق رکھتے ہیں کہ
"جملہ ائمہ آل بیت اپنے عہد اور عصر سے پورے طور پر ہم آہنگ تھے۔ وہ اسے دیتے بھی تھے اور اس سے لیتے بھی تھے"

(۲) امام جعفر صادق مجتہد و مستقل تھے امام جعفر صادق مجتہد مستقل تھے۔ وہ اپنا ایک مخصوص منہاج رکھتے تھے۔ اور اس پر ان افکار و آرا کو پرکھتے تھے اور جانچتے اور قیاس کرتے تھے جو ان کے علم اور مطالعہ میں آتے رہتے تھے۔
اس علم اور مطالعہ کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حجاز والوں سے بھی اتفاق کرتے تھے اور اہل عراق کی بھی تائید کرتے تھے۔

(۳) امام جعفر صادق اختلاف فقہا کے عارف تھے اختلاف فقہا کی معرفت نے امام جعفر صادق کو سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز کر دیا تھا۔ اس سے ان کے سامنے فقہ کے نئے نئے گوشے آ گئے تھے۔

امام صاحب فقہاءِ مصر کے آرا سے پورے طور پر واقف تھے۔ وہ اپنی دراسات میں پوری توجہ کے ساتھ فقہاء کے مناہج مختلفہ گوش نظر رکھتے تھے، تاکہ ان میں منہاج قدیم اختیار کریں۔

* * *

امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"ایک مرتبہ مجھ سے ابوجعفر منصور[1] نے کہا۔

"اے ابوحنیفہ لوگ (امام) جعفر کے فتنہ میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ذرا تم ان کے لیے کچھ بڑے بڑے، اور سخت قسم کے سوالات تیار کرو جن کا جواب دینا انھیں مشکل ہو جائے"۔

چنانچہ امام ابوحنیفہ نے چالیس سوالات مرتب کیے، یہ دونوں ائمہ فقہ حیرہ میں خلیفہ ابوجعفر منصور کے سامنے پیش ہوئے۔ امام ابوحنیفہ اس ملاقات کی روداد یوں بیان کرتے ہیں:

"میں آیا، اور خلیفہ ابوجعفر منصور کے حضور میں پیش کیا گیا (امام) جعفر خلیفہ کے داہنی طرف تشریف فرما تھے۔ جب میری نظر (امام جعفر پر گئی) تو میں نے ایک طرح کی دہشت سی اپنے اندر محسوس کی، ایسی دہشت میں نے خلیفہ منصور کی کبھی نہیں محسوس کی۔ میں نے منصور کو سلام کیا اس نے اشارہ کیا میں بیٹھ گیا۔ پھر خلیفہ امام جعفر کی طرف متوجہ ہوا۔

اس نے کہا:

"یہ ابوحنیفہ ہیں"۔

"آپ نے فرمایا

"ہاں —"

پھر خلیفہ میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے کہا:

"ابوحنیفہ تم اپنے سوالات ابوعبداللہ (امام جعفر صادق) کے سامنے پیش کر دو"

میں نے یہ سوالات ان کے سامنے پیش کرنا شروع کیے اور وہ جواب دیتے گئے۔ وہ فرماتے:

"تم لوگ یہ کہتے ہو"۔

"اہل مدینہ کا یہ قول ہے"۔

---

[1] عباسی خاندان کا پہلا خلیفہ، جس نے علویوں کو مرکز ہدف ستم بنایا۔

اور امام کے لیے یہ کوئی نقص کی بات نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے افکار و آراء سے واقف ہو، بلکہ نقص تو یہ ہے کہ اس کا علم صرف اپنے ہی تک محدود و مقصور رہو۔ چنانچہ امام صاحب کے بارے میں امام ابو حنیفہ کا جو قول ہم اوپر نقل کر چکے ہیں وہ ہر اعتبار سے ان پر صادق آتا ہے اس لیے کہ اختلاف فقہا کا علم، ان کے آراء و افکار جن ادلہ پر مبنی ہوں ان کا علم اور ان کے مناہج استنباط اسے محکم ترین افکار و آراء کا حامل بنا دیتے ہیں[1]۔"

---

[1] اصلی بات یہ ہے کہ گو علم فقہ ایک مستقل بالذات علم ہے، لیکن مناہج اختلاف کا علم بجائے خود ایک مستقل علم ہے۔ اور جب تک ائمہ فقہ کے مناہج اختلاف کا علم نہ ہو۔ اس وقت تک فقہ کا علم بھی پورے طور پر گرفت میں نہیں آسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ گو حضرت امام اپنی ذات کے اعتبار سے یگانہ اور منفرد خصوصیات کے حامل تھے۔ اور گو فقہ میں آپ کی حیثیت مجتہد مستقل اور امام یکتا کی تھی۔ آپ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ایک مستقل قدر و قیمت رکھتا تھا۔ آپ کے ارشادات احکام و مسائل میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ علم آل بیت تو گویا آپ کے گھر کی میراث تھا۔ بایں ہمہ علم اختلاف فقہا پر آپ کی نظر حد درجہ وسیع تھی۔ اور اس کا باعث یہ تھا کہ آپ علم کے ہر گوشہ پر نظر رکھتے تھے اور حد درجہ وسعت نظر کے ساتھ علوم متعلقہ کے تمام گوشوں کو اپنی گرفت میں رکھتے تھے اور سچ پوچھیے تو علم کی یہی شان اور عالم کا یہی مقام ہے۔

(رئیس احمد جعفری)

امام جعفر صادق اور علم کونیات

امام ہمام کی تحصیل وکسب علم اور سعی وجہد کا بیان

ذوق وشوق

امام جعفر صادق ہمہ تن حصول علم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ ہر در پر دستک وہی تھی، اور ہر گوشے تک پہنچے تھے۔ یہ ذوق وشوق علم انھیں اپنے والد ماجد اور اپنے دادا امام زین العابدین اور نانا قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق سے گویا ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ انھوں نے پورے طور پر علم قرآن حاصل کیا۔ ناسخ اور منسوخ کی معرفت حاصل کی۔ حدیث کا فن پورے طور پر حاصل کیا اور جہاں جہاں سے یہ علم مل سکتا تھا، وہاں سے انھوں نے اخذ وکسب علم کیا۔ فقہ پر پوری توجہ مبذول فرمائی۔ اور ہمہ ابواب فقہ پر مکمل مہارت اور دسترس حاصل کر لی۔ رائے اور استنباط کو بھی اچھی طرح سمجھا اور جانا۔ یہی سب چیزیں تھیں جنھوں نے انھیں اپنے وقت کا امام جلیل بنا دیا تھا اور اس ذخیرہ علم کے ساتھ ساتھ اور قواعد فقہ پر کامل عبور کے ہمرکاب، جو چیز انھیں اور زیادہ سب سے ممتاز کرتی تھی وہ تھا شرف نسب محمدی اور شرف علم جدی اور سچ پوچھیے تو اس شرف سے بڑا کوئی شرف نہیں ہے اور اگر کوئی اس سے بڑے شرف کا مدعی ہے تو وہ اس قابل ہے کہ بے تامل اسے رد کر دیا جائے۔

لیکن امام جعفر صادق کے قوائے ذہنی ودماغی صرف ان علوم پر قناعت نہیں کر سکتے تھے۔ جو انھوں نے حاصل کر لیے تھے، بے شک انھوں نے قرآن بھی پڑھا۔ حدیث بھی سیکھی۔ فقہ کی معرفت بھی حاصل کی۔ زہد وعبادت کو بھی اپنا شعار بنایا۔ علم اور عبادت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ علم کونیات کی طرف بھی توجہ مبذول فرمائی اور اس کے مشمولہ اور متعلقہ علوم بھی سیکھے۔ اور ان کا یہ قدم اللہ تعالے کے اس فرمان کی تعمیل پر مبنی تھا کہ جو کچھ زمین وآسمان میں ہے اسے دیکھو، اور جیسا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قل انظروا ماذا فی السماوات والارض

اس ارشاد الٰہی کی تعمیل تھی کہ امام صاحب نے کونیات اور اس کے مشمولہ ومتعلقہ علوم بھی پورے شغف اور انہماک کے ساتھ حاصل کیے۔ چنانچہ ابن خلکان نے امام صاحب کے حالات وسوانح پر بحث وگفتگو

کرتے ہوئے لکھا ہے

"امام جعفر صادق مذہب امامیہ کے بارہ اماموں میں سے ایک ہیں۔ یہ سادات اہل بیت میں سے تھے، اپنے صدق مقال کے باعث "صادق" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ان کا فضل وکمال محتاج بیان وتشریح نہیں، ان کے ایک شاگرد جابر بن حیان الصوفی الطرطوسی تھے۔ انھوں نے ایک کتاب مرتب کی جو ایک ہزار اوراق پر مشتمل تھی۔ اور تمامتر رسائل جعفر صادق کو متضمن تھی۔ اور یہ پانچ سو رسالے تھے

—— امام جعفر صادق بقیع کی اس قبر میں دفن ہوئے جس میں ان کے والد ماجد امام باقرؒ مدفون ہوئے تھے۔ نیز ان کے جد امام زین العابدینؒ کی بھی یہیں تدفین ہوئی تھی اور ان کے جد کے چچا امام حسن علیہ السلام بھی یہیں دفن ہوئے تھے۔ پس اس قبر کی رفعت مرتبت کا کیا کہنا جسے یہ شرف واعزاز حاصل ہوا ہو"[1]

———— ٭ ————

ابن خلکان کی اس تحریر سے دو امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) امام جعفر صادق کو علم کونیات سے شغف تھا۔ جابر بن حیان ان کے شاگرد تھے، جو صاحب علوم کیمیا تھے۔ جنھوں نے متعدد رسائل فن کونیات عقائد اور کیمیا پر لکھے تھے۔

(۲) یہ کہ جابر نے امام جعفر صادق کے پانچسو رسائل مرتب اور مدون کیے تھے۔ لیکن اگر اس تعداد کے رسالے تمام کے تمام امام صاحب کی ذات گرامی سے منسوب کیے جائیں تو یہ دعویٰ محل نظر ہے۔

آگے چل کر ہم جابر بن حیان کے بارے میں ذرا بسط وتفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔ اور اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

امام صادق علم کونیات کے ماہر تھے

بہرحال امام جعفر صادق نے اس مسئلہ پر کتنے ہی رسالے لکھے ہوں۔ ان کی تعداد کتنی ہی ہو۔ ایک بات ایسی ہے جس پر ہم اپنے طور پر بالکل مطمئن ہیں، وہ یہ کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ علم کونیات کے ماہر تھے۔ انھوں نے پورے شغف اور انہماک کے ساتھ اس علم کا مطالعہ کیا تھا۔ قدرت کی طرف

---

[1] وفیات الاعیان ج ا ص۱۰۵

سے انھیں ذہنی و دماغی کمالات فراوانی سے عطا ہوئے تھے۔ انھوں نے علوم وفنون کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور ہر علم وفن کی معرفت حاصل کی۔ ہمارے پاس بکثرت دلیلیں اس امر کی موجود ہیں کہ وہ علم کونیات سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور اس سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔

اس علم کی تکمیل وتحصیل انھوں نے اس لیے کی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت کا یہ بہت اچھا اور جاذبِ فکر بیان تھا۔

امام صادق کی ایک جامع ومانع اور فصیح وبلیغ تحریر

امام جعفر صادق نے اپنے رسالہ "التوحید" میں شب و روز ظلمت و نور اور سورج کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے پڑھیے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ علم کون کے کتنے بڑے ماہر تھے۔

اس سلسلہ میں ہم ان کی ایک عبارت کے کچھ حصص طوالت کے باوجود درج کرتے ہیں:

"آفتاب کے طلوع وغروب کی حکمت پر غور کرو، جس سے شب و روز کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔

اگر سورج طلوع نہ ہو تو یہ سارا عالم ویرانہ بن کر رہ جائے، پھر لوگ اپنے وسائل معاش کی تگ و دو کے لیے مصروفِ عمل نہ ہو سکیں۔ نہ اپنے معاملات پر کسی طرح کا تصرف رکھ سکیں۔ یہ دنیا یکسر ان کے لیے خانۂ تاریک بن جائے۔ لذت نور سے گم ہو جانے کے بعد ان کی زندگی وبالِ جان بن جائے۔

اور ذرا غروبِ آفتاب کی منفعت پر غور کرو۔

اگر آفتاب غروب نہ ہو تو لوگ سکھ کی نیند کس طرح سوئیں؟ انھیں سکون و اطمینان کی نعمت کیونکر حاصل ہو؟ حالانکہ سکون و اطمینان کے وہ بہت زیادہ حاجت مند ہیں وہ رات ہی ہے جس سے ان کا بدن سکون حاصل کرتا اور ان کے تمام حواس آرام پاتے ہیں ہضم طعام کے لیے، قوت ہاضمہ کا انبعاث اسی وقت ہوتا ہے اور غذا اعضا تک اسی وقت پہنچتی ہے۔

اور جب وہ غروبِ آفتاب کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر اپنے بدن کو سکون اور وجود کو آرام پہنچا لیتے ہیں تو تازہ دم ہو جاتے ہیں اور مداومتِ عمل کے لیے تیار ہو جاتے ہیں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ اگر رات کی تاریکی انھیں سکون و قرار سے بہرہ ور نہ کرتے

تو بس وہ کسب و جمع اور ذخیرہ اندوزی ہی میں لگے رہیں۔

اور اگر سورج غروب نہ ہو ہمیشہ جگمگاتا ہی رہے تو یہ زمین حرارت آفتاب کے تسلسل اور دوام کے باعث کرۂ نار بن جائے۔ پس اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی حکمت و تدبیر سے طلوع و غروب کے اوقات مقرر کر دیئے۔ وقت مقررہ پر وہ طلوع ہوتا ہے اور وقت مقررہ پر غروب ہو جاتا ہے، جیسے تم دیکھتے ہو کہ چراغ کی جب ضرورت گھر والے محسوس کرتے ہیں جلا لیتے ہیں اور جب ضرورت نہیں دیکھتے بجھا دیتے ہیں۔ پس نور و ظلمت اپنے ظاہری تضاد کے باوجود دنیا کی صلاح و فلاح اور استحکام نظام کا سب سے بڑا واضح مظہر ہیں۔

اور پھر ذرا سورج کے ارتفاع و انحطاط پر غور کرو۔ اسی ارتفاع و انحطاط پر سال کے چاروں موسم بنتے ہیں، یہ ارتفاع و انحطاط اپنے اندر تدبیر و مصلحت کی ایک دنیا پوشیدہ رکھتے ہیں۔

موسم سرما میں شجر اور نباتات میں حرارت پیدا ہوتی ہے، جس سے ان میں مواد ثمار پیدا ہوتا ہے، ہوا کثیف ہو جاتی ہے۔ اس سے بادل اٹھتے ہیں اور بارش ہوتی ہے جانداروں کے بدن میں قوت آتی ہے اور ان میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔

موسم ربیع میں تحریک ہوتی ہے اور موسم سرما میں جو مواد پیدا ہوا تھا۔ وہ اب نمایاں ہوتا ہے نباتات سر اٹھاتی ہے، درختوں پر رونق آ جاتی ہے۔ جان داروں میں ہیجان جذبات پیدا ہوتا ہے۔

گرمی کے موسم میں پھل پک جاتے ہیں، بدن کا فضلہ تحلیل ہو جاتا ہے۔ زمین خشک ہو جاتی ہے اور اس میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اعمال اور تعمیر کو قبول کر سکے۔

خریف کے موسم میں ہوا صاف ہو جاتی ہے۔ امراض دور ہو جاتے ہیں، بدن حسین ہو جاتا ہے ہوا خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مصالح ہیں جن سے دنیا بہرہ ور ہوتی ہے۔

اسی طرح ذرا اس پر بھی غور کرو کہ سورج بارہ برجوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے، تاکہ سال کا دورہ پورا ہو جائے۔ اس دورے سے زمانہ کا اندازہ لگایا جاتا ہے[1]۔

---

[1] رسالہ التوحید جسے امام صاحب نے مفضل بن عمر کو املا کرایا تھا ص ۴۸، ۴۹۔

فن نجوم اور فن بروج سے واقفیت تامہ اس کلام کی نسبت اگر امام جعفر صادق کی طرف صحیح ہے کہ یہ بحث بڑی دلیل ہے اس امر کی کہ وہ علم کونیات پر گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ نیز فن نجوم اور فن بروج سے بھی پورے طور پر واقف تھے۔

ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے ہم امام صاحب کی جانب اس نسبت کو رد کر سکیں جہاں تک امامیہ کا تعلق ہے وہ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں اور ہم تمہید میں بیان کر چکے ہیں کہ امامیہ جس بات کو مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں۔ اسے ہم محض شبہ کی بنا پر رد نہیں کر سکتے۔ صرف اس وقت رد کر سکتے ہیں جب کتاب یا سنت مشہورہ یا سنت متواترہ کی کوئی قطعی دلیل ہمارے پاس ہو۔ لہٰذا جس بات کو علماء کا ایک بڑا گروہ مانتا اور تسلیم کرتا ہو۔ اس کا رد صرف دلیل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ بغیر دلیل کے رد نہیں کیا جا سکتا۔

مورخین کے بکثرت اقوال اس امر پر دال ہیں کہ جابر بن حیان کا امام صادق سے بڑا گہرا ربط موجود تھا۔ اصول ایمان اور اقتصادیات کی تعلیم انھوں نے امام صادق ہی سے حاصل کی تھی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہو گا کہ جابر نے حضرت امام سے بہت زیادہ علمی فیوض و برکات حاصل کیے تھے۔

مورخین کے اقوال کثرت کے ساتھ اس بات کی بھی تائید کرتے ہیں کہ اشیاء کے طبائع اور خواص کے بارے میں بھی انھوں نے امام صاحب سے بہت کچھ سیکھا تھا۔

یہ تمام باتیں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جس رسالہ کا کچھ حصہ اوپر کی سطروں میں ہم نقل کر چکے ہیں، اس کی تائید میں شواہد موجود ہیں اور وہ جن معلومات پر مشتمل ہے ان کا صدق ظاہر ہو رہا ہے۔

علوم فلسفیہ سے دلچسپی امام صادق نے جو زمانہ پایا وہ علوم فلسفیہ کے آغاز و ابتدا کا دور تھا۔ یہ علوم فلسفیہ سریانی، فارسی اور یونانی زبان سے ترجمہ ہو کر عربی میں منتقل ہوئے تھے۔ اور امویوں کے آخری اور عباسیوں کے ابتدائی عہد حکومت میں ان کے لیے جداگانہ مدرسے قائم ہو چکے تھے اور ان کے مطالعہ اور تدریس کا منظم اور مرتب طور پر بندوبست ہو چکا تھا اور عربی اسلامی عقلیت پر، ہندی، فارسی اور یونانی عقلیت کے ثمرات نمایاں ہو رہے تھے۔

پس جب کہ صورت احوال یہ تھی تو عصر امام صادق کے خصوصیات سے ممکن نہ تھا کہ ان پر اثر انداز

علم جفر اور امام صادق

کیا امام صاحب کی طرف یہ نسبت صحیح ہے؟

حصول علم کی سعی وکوشش امام جعفر صادق نے علم کے مختلف اور متفرق دروازوں پر دستک دی، انھوں نے اپنے آپ کو علم کے لیے وقف کر دیا اور حصول علم کے سلسلہ میں سعی وکوشش کا کوئی دقیقہ فردگذاشت نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی کوشش اور اجتہاد سے ایسا مقام بلند حاصل کر لیا، جس کی سب شہادت دیتے ہیں اور کوئی نہیں جو اس حقیقت کے اعتراف میں انکار یا تامل وتذبذب کرتا نظر آتا ہو۔ انکار کی جرأت اگر کوئی کر سکتا ہے تو صرف جو حقائق سے روگردانی کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ ایسے حقائق ثابتہ جن سے مجال انکار نہیں اور یہ علم اثر کے مقام رفیع اور فضل عظیم کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

لیکن وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ امام صاحب کو اس مرتبہ انسانی سے بھی اونچا کر دیں، جو انسان اپنی سعی وکوشش طلب واجتہاد، تحقیق وبحث سے حاصل کرتا، اور مسلمہ مقدمات علمیہ سے پیوستہ رہتا ہے ظاہر ہے وہ اس مرتبہ پر اکتفا نہیں کر سکتے چنانچہ وہ امام صاحب کے علوم کثیرہ میں ایک نئے علم کا اضافہ کرتے ہیں، یہ وہ علم ہے جو کسب و دراست سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ یہ وہ علم ہے جو وصیت اور ودیعت سے حاصل ہوتا ہے۔

اس علم کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو عطا فرمایا اور حضرت علیؓ نے اپنے بعد کے بارہ اماموں کو باری باری سے بذریعہ وصیت اور ودیعت عطا فرمایا۔ ان بارہ اماموں میں امام صادق چھٹے امام ہیں ان سے پہلے کے پانچ امام حضرت علی، حسن، حسین، زین العابدین اور باقر علیہم السلام ہیں۔

اس نئے علم کا نام ان لوگوں نے علم جفر رکھا ہے۔

علم جفر کی تعریف جفر دراصل بکری کے بچہ کو کہتے ہیں جب وہ بڑا ہو جائے پھر اسے بکری کی کھال کے لیے بولنے لگے۔ اس کے بعد یہ لفظ اس نوع علم کے لیے استعمال ہونے لگا جو دراست اور تلقی سے حاصل نہ ہوتا ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کے ذریعہ بہ صورت وصیت معلوم ہو

نہ ہوتے اور امام صاحب علم کونیات اور فلسفۂ وجود سے بے بہرہ رہتے۔ ضروری تھا کہ دیگر علوم فنون کی طرح ان علوم کا بھی وہ گہرا مطالعہ کرتے اور پوری دستگاہ حاصل کر لیتے۔ ؎

؎ حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق کا عہد ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز تھا۔
اور عہد نو کا یہ آغاز اپنے اندر بہت سے فتنے پوشیدہ رکھتا تھا۔
یہ فتنے عقلی، ذہنی اور فکری تھے۔
ان فتنوں کا استیصال بزور شمشیر ممکن نہ تھا۔ نہ فوج و سپاہ کی مدد سے انھیں دبایا اور کچلا جاسکتا تھا، آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر یہ فتنے پروان چڑھ رہے تھے، قوت حاصل کر رہے تھے اور مسلمانوں کی متاع دین و دانش کو لوٹ رہے تھے۔ ان کا استیصال صرف کسی ایسی شخصیت ہی سے ممکن تھا جو عظمت کی حامل ہو جس کا علم و کمال اور فضل و ہنر، وسعت نظر اور عمق فکر ہر چیز شک و شبہ سے بالا ہو، جو روحانیت کے مرتبہ بلند پر فائز ہو اور جس کے ارشادات قلب مومن ہی میں نہیں ہر سننے والے کے دل میں گداز اور رقت کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اور بلاشبہ وہ شخصیت امام ہمام کی تھی۔
حضرت امام کے احوال و سوانح پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ انھوں نے نہ صرف فکری اور ذہنی فتنوں کے سیل رواں کا راستہ روکا بلکہ انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا ورنہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ علم جدید (فلسفہ) ایسے حربوں اور اسلحہ سے آراستہ ہو کر میدان میں اترا تھا کہ اس سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار تھا لیکن وہ حضرت امام ہمام ہی کی ذات گرامی تھی جس نے بگڑے ہوئے حالات کو سنوار دیا۔
(رئیس احمد جعفری)

چنانچہ بعض نئے امامیہ اہل قلم کا اس سلسلہ میں قول ہے:

"علم جفر وہ علم حروف ہے جس سے انقراض عالم تک کے حوادث کا علم ہو جاتا ہے۔ امام جعفر صادق کے بارے میں وارد ہے کہ وہ علم جفر کے حامل تھے۔ انھوں نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ یہ علم گویا ایک چرمی پیالہ ہے جس میں انبیاء اور علمائے بنی اسرائیل کا علم موجود ہے جفر کے بارے میں ان سے علم کثیر مروی ہے۔ ہم اس علم کی معرفت نہیں رکھتے نہ اس میں کسی طرح کا تصرف ہمیں حاصل ہے، لیکن ان احادیث سے جو علم جفر کے بارے میں مروی ہیں یہ معرفت بہرحال حاصل ہو جاتی ہے کہ یہ علم شریف اللہ تعالیٰ کا براہ راست عطا کردہ ہے۔[1]"

علم جفر کی قدامت

کلینی کی "الکافی" میں جو اثنا عشریہ کے چار اہم ترین اور نادر میں سے ایک ہے، مرقوم ہے:

"علم جفر وہ ہے جس کو تورات موسیٰ، انجیل عیسیٰ، علوم انبیاء و اوصیاء و علمائے بنی اسرائیل نیز علم حلال و حرام اور جو کچھ ہے اس کا علم اور جو کچھ ہوگا اس کا علم ———— یہ ہے علم جفر"

پھر آگے چل کر علم جفر کی کلینی نے دو قسمیں بتائی ہیں!

ایک قسم وہ ہے جو بکری کی کھال پر مرقوم ہے۔

اور دوسری قسم وہ ہے جو مینڈھے کی کھال پر مرقوم ہے۔

آگے چل کر کلینی نے لکھا ہے۔

"امام جعفر صادق نے ایک مرتبہ فرمایا، آج صبح صبح میں نے کتاب جفر کا مطالعہ کیا، جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلعم اور ان کے بعد آنے والے ائمہ کے لیے خاص کی ہے۔ اس میں، میں نے اپنے، آپ کی ولادت اور اس کی غیبت (یعنی بارھویں امام جو سرمن رائے میں غائب ہوئے)۔ ان کی طول عمر کا مشاہدہ کیا، اس زمانے میں مسلمانوں کا ابتلاء دیکھا۔ ان کے قلوب میں شکوک کا پیدا ہونا دیکھا۔ ان میں سے اکثر کو دین سے مرتد ہوتے ہوئے دیکھا، دین اسلام کا قلاوہ گردن سے اتارتے ہوئے دیکھا۔

ہم نے عرض کیا:

---

[1] الصادق ج ۱: ص ۱۰۹، تالیف للسید حسین المظفری۔

اے ابن رسول اللہ اس علم سے معرفت کا کچھ حصہ ہمیں بتائیے۔

امام صادق نے فرمایا۔

"اللہ نے امام قائم میں اپنے انبیاء کی کئی سنتیں رکھی ہیں۔ وہ نوح کی سنت، یعنی طول عمر، ابراہیم کی سنت یعنی خفاء اولاد، اور گوشہ نشینی، موسیٰ کی سنت، یعنی خوف اور غیبوبت، عیسیٰ کی سنت، یعنی ان کے بارے میں لوگوں کا اختلاف۔ ایوب کی سنت، یعنی مصیبت کے بعد امان اور محمدؐ، خروج بالسیف ۔ یہ ساری سنتیں اللہ نے امام قائم میں رکھ دی ہیں"۔

جفر علم غیب پر مشتمل ایک کتاب تھی

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ "جفر" ایک کتاب تھی، جو امام جعفر صادق کے پاس موجود تھی، جس سے انھیں غیب کا علم ہو جاتا تھا۔ خواہ بہ صورت حروف۔ خواہ بہ صورت اخبار

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو ائمہ میں سے ہر امام کو عطا کی گئی۔ ہر امام نے اپنے بعد آنے والے امام یعنی اپنے وصی کو دی۔ امام حسن سے یہ کتاب امام حسین کو ملی۔ اس طرح امام جعفر صادق تک پہنچی۔ ان کے بعد دوسرے ائمہ کو ملتی گئی۔

—— ٭ ——

کلینی کی "کافی" میں مرقوم ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر کتاب اتاری۔

جبریل نے کہا

اے محمد یہ تمہاری وصیت ہے نجبا کی طرف۔

آپؐ نے پوچھا۔

اے جبریل نجبا کون؟

جبریل نے جواب دیا:

"علی اور ان کی اولاد، اللہ نے اپنے رسولؐ پر جو کتاب نازل کی تھی۔ اس پر سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ کتاب علیؓ کو دے دی۔ اور انھیں حکم دیا کہ اس میں سے ایک مہر توڑ دیں اور جو ہدایت پائیں اس پر عمل کریں علیؓ نے اسے حسن کو دے دیا۔ انھوں نے مہر توڑ دی اور جو کچھ ان کے لیے مرقوم تھا اس پر عمل کیا۔ پھر انھوں نے وہ حسین کو عطا کر دی۔ انھوں نے بھی مہر توڑی اور اس میں یہ ہدایت درج پائی کہ اپنے لوگوں

کے ساتھ شہادت گاہ کی طرف جا، وہ صرف تیری معیت ہی میں مرتبہ شہادت پا سکتے ہیں۔ اور اپنے نفس کو اللہ کے لیے خرید لے۔

حسین نے یہ کتاب علی بن حسین (امام زین العابدین) کو دے دی، انھوں نے اپنے لیے اس میں یہ ہدایت درج پائی۔

"خاموش رہ، گھر سے باہر نہ نکل، اور جب تک موت نہ آ جائے عبادت کرتا رہ!"

انھوں نے ایسا ہی کیا پھر وہ کتاب، اپنے بیٹے محمد بن علی کو دے دی، انھوں نے مہر توڑی تو یہ ہدایت ملی۔

"لوگوں سے تخاطب کر فتوے دے، اپنے اہل بیت کے علوم پھیلا، خدا کے سوا کسی سے نہ ڈر۔ تجھ پر کوئی غلبہ نہ پا سکے گا!"

انھوں نے یہ کتاب جعفر صادق کو دی، انھوں نے اس میں یہ لکھا پایا:

"لوگوں سے بات چیت کر، فتوے دے۔ اپنے اہل بیت اور آباء صالحین کے علوم نشر کر، تو ہر طرح سے حفاظت (الٰہی) اور امان میں ہے"[1]

ملاحظات سہ گانہ بہرحال یہ ہیں وہ اقوال جو جعفر سے متعلق امام جعفر صادق کے بارے میں بیان کیے جاتے ہیں، لیکن اس موقع پر ملاحظات سہ گانہ ہم ضرور زیر بحث لا نا چاہتے ہیں:

(۱) نسبت کیوں صحیح نہیں ہو سکتی امام صادق کی طرف جفر کی نسبت ہم تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ یہ علم، علم غیب سے متعلق ہے اور جہاں تک علم غیب کا تعلق ہے صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی اس باب میں منفرد ہے۔ اس نے یہ علم کسی کو نہیں دیا، سوا بعض انبیاء کے تاکہ وہ اپنی رسالت کا اثبات کر سکیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ (علم غیب کی نفی کرتے ہوئے) اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے فرماتا ہے:

ولو كنت اعلم الغيب لاستكثرت من الخير وما مسني السوء

یعنی: اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت بھی مجھ پر واقع نہ ہوتی۔ اور اللہ تعالیٰ نے بعض غیبی معلومات جو کسی کو عطا کیے، تو وہ بطور معجزہ کے، جس سے

---

[1] الوشيعة فی عقائد الشیعہ، طوسی جاب اللہ، طبعۃ الخنجی۔

انھوں نے کفار کو چیلنج کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

الم غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون
فی بضع سنین للہ الامر من قبل و من بعد و یومئذ یفرح المومنون
بنصر اللہ ینصر من یشاء و ھو العزیز الرحیم

یعنی: اہل روم ایک قریب کے موقع میں مغلوب ہو گئے، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند ہی سال کے اندر غالب آ جائیں گے۔ پہلے بھی اختیار اللہ ہی کو تھا اور پیچھے بھی! اور اس دن اللہ کی اس مدد پر مسلمان خوش ہوں گے وہ جسے چاہے غالب کر دیتا ہے اور وہ غالب ہے۔ رحیم ہے۔

اور امام جعفر صادق سے علم جفر کی نفی ان کی جلالت شان اور مرتبۂ علمی پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہو سکتی، نہ ان کے شرف نسب پر اس سے کچھ اثر پڑ سکتا ہے علم دین میں ان کی حیثیت امام حجت کی ہے، جن سے کبار فقہا مثلاً ابو حنیفہ اور مالک، نیز کبار محدثین جیسے سفیان ثوری اور دوسرے ائمہ حدیث نے تحصیل علم کی اور کسب فیض کیا۔

(۲) یہ روایات کیوں ناقابل قبول ہیں

دوسرے یہ کہ اس طرح کی روایات خاص طور پر علم جفر کے بارے میں جو روایات ہیں وہ زیادہ تر کلینی کی روایت کردہ ہیں، اور آگے چل کر ہم زیادہ تفصیل سے بتائیں گے کہ ہم روایات کلینی قبول نہیں کر سکتے، کیوں کہ کلینی ہی کا یہ ادعا ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ قرآن مجید میں نقص اور زیادتی ہے اور اس ادعا کی تردید کبار علمائے اثناء عشریہ مثلاً مرتضیٰ اور طوسی وغیرہما کر چکے ہیں۔ اور ان کبار علمائے اثناعشریہ نے، ابو عبداللہ الصادق سے جو کچھ روایت کیا ہے، وہ کلینی کے ادعا کا یکسر نقیض ہے۔

(۳) کبار علمائے شیعہ کا بیان

جن کبار علمائے شیعہ نے حضرت امام صادق پر جو تازہ تحریری مواد مرتب کیا ہے اس میں انھوں نے جفر کا ذکر تو کیا ہے، لیکن اس کی تائید نہیں کی ہے۔

بلکہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے متضاد ہوتا ہے کہ وہ انکار کی طرف مائل ہیں۔ چنانچہ کتاب "جعفر الصادق مصنفہ الاستاذ احمد مغنیہ" (ص ۲۰۸) میں یہ عبارت ہماری نظر سے گزرتی ہے۔

"باقی رہا علم جفر اور اس کی حقیقت تو گو اس بارے میں بکثرت مرویات ہیں: اور احادیث بھی بیان کی جاتی ہیں۔ پھر بھی یہ ایک امر غامض ہے اور علمائے اقدمین بھی اس کی کیفیت و حقیقت کے بارہ میں مطمئن نہیں نظر آتے۔"

اور کوئی شبہ نہیں یہ بالکل سچی بات ہے، کیوں کہ اس علم کے بارے میں کوئی ایسا کافی اور شافی بیان

امام جعفر صادق کا دائرۂ علم و فضل

اس چشمۂ صافی سے سیراب ہونے کے لیے تشنگانِ علوم کا ہجوم

امام صاحب کا نورِ حکمت امام جعفر صادق کی نشوونما گہوارۂ علم اور معدنِ حکمت میں ہوئی انھوں نے بیتِ نبوت میں آنکھیں کھولیں، جہاں متوارث طور پر علم ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتا چلا آرہا تھا۔ انھوں نے مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں زندگی بسر کی۔ انھوں نے اس غرس طاہر سے تغذیہ حاصل کیا۔ ان کے قلب میں تحصیل علم و حکمت، تحقیق و نکتہ سنجی، ژرف نگاہی اور وسعت فکر و نظر کے باعث نورِ حکمت جگمگانے لگا۔ ہم ان لوگوں کے اقوال کو نظر انداز کردیں جو انھیں ایسے صفات سے متصف کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک ناقابل قبول ہیں۔ تو بھی اس نفی سے ان کی جلالت قدر اور رفعت شان میں کوئی فرق نہیں آتا وہ اس رتبۂ بلند اور مقام علم پر فائز ہیں کہ اس کے بعد کوئی ایسا مقام نہیں جس پر دوسرے لوگ فائز ہوسکیں۔

امام صادق نے اپنے آباء کرام سے علم حاصل کیا۔ اپنے عہد کے شیوخ علم و فضل کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ جو کچھ ان کے پاس تھا اسے دیکھا پرکھا، جو قابل قبول تھا اسے لے لیا، جو قابل رد تھا اسے رد کردیا۔

انھوں نے اپنے بزرگوار کی نصیحت اور ہدایت پر پورا پورا عمل کیا جو یہ تھی کہ صحبت صرف اخیار و ابرار کی اختیار کی جائے۔ اہل نفاق سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مجلس میں ان لوگوں کو کبھی بار پانے کا موقع نہیں دیا جو مکارم اخلاق کے صفات سے متصف نہیں تھے۔ انھوں نے ابرار اطہار کو اپنے سے قریب رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مجلس مدینہ میں اہل علم، طالبان حدیث اور طلاب فقہ کا مرکز وحید تھی۔ یہ لوگ تشنہ کام آتے تھے اور ان کے در سے سیراب ہو کر واپس جاتے تھے۔ جس شخص کو ایک مرتبہ بھی ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ ان کے علم اور ان کی شخصیت کا کلمہ پڑھنے لگا۔ ان کے حلق و حکمت اور علم و فضل کی خوشہ چینی پر مجبور ہوگیا۔

سفیان ثوری بارگاہ امام میں روایت ہے کہ عراق کے محدث جلیل اور کوفہ کے واعظ شیریں گفتار

اب تک پیش نہیں کیا گیا، جو اس کی حقیقت وکیفیت کو تکمیل معنیٰ کے ساتھ بیان کر سکے — اور یہ ایک مزید سبب اس کے انکار کا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ علام الغیوب صرف اللہ سبحانہٗ وتعالےٰ ہی ہے۔

کیا یہ فرقۂ خطابیہ کی جدّت ہے؟

میری تحقیق اس بارے میں یہ ہے کہ مذہب اثنا عشری میں جفر کا خیال جس گروہ نے داخل کیا ہے، وہ خطابیہ ہے یعنی ابوالخطاب کا اتباع۔ چنانچہ مقریزی کی خطط میں درج ہے۔

"جماعت خطابیہ کا خیال ہے کہ امام جعفر بن محمد الصادق نے انھیں ایک چرم عطا فرمایا جسے جفر کہتے تھے۔ اس میں علم غیب کے نوشتے اور تفسیر قرآن کا بیان موجود تھا[1]

—— ❁ ——

اور یہ ابوالخطاب وہ شخص تھا جس نے حضرت امام صادق کے بارے میں غلط بیانی سے خوب خوب کام لیا اور اس کی ان غلط بیانیوں کی حقیقت حضرت امام کی حیات گرامی ہی میں آشکارا ہو گئی چنانچہ آپ نے ان غلط بیانیوں کی تردید فرمائی اور ابوالخطاب کو کاذب قرار دیا، جس کا کچھ ذکر انشاء اللہ آگے چل کر آئے گا

---

[1] الخطط العزیزیہ ج ۲ ص ۳۵۳۔

حضرات امامیہ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ حضرت امام صادق کی خدمت میں دو سال تک حاضر رہے مشہور ہے کہ ان دو سالوں کے بارے میں امام ابوحنیفہ فرمایا کرتے تھے۔

لولا السنتان لهلك النعمان

یعنی اگر یہ دو سال خوبی قسمت سے نہ حاصل ہو گئے ہوتے تو نعمان (ابوحنیفہ) ہلاک ہو گیا ہوتا؛ اور شاید یہ دو سال وہی ہیں جب ابوحنیفہ ابن ہبیرہ کے خوف تعزیر سے روبہ فرار ہو کر وارد حجاز ہوئے تھے۔ اور یہ ساری مدت انھوں نے امام جعفر صادق کے دبستان علم میں صرف کر دی تھی۔

حلیۃ الاولیاء کی ایک روایت حلیۃ الاولیاء سے بھی ان روایات کی توثیق و تصدیق ہوتی ہے۔

"امام جعفر صادق سے متعدد تابعین نے روایت کی ہے۔ ان میں یحییٰ بن سعید الانصاری ایوب سختیانی ابان بن تغلب۔ ابوعمرو بن العلاء یزید ابن عبداللہ الہادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں ان سے کئی ائمہ اعلام نے روایت حدیث کی ہے، مثلاً مالک بن انس شعبہ بن القاسم۔ سفیان بن عیینہ وسلمان بن بلال اور اسماعیل بن جعفر وغیرہ۔[1]"

ہم دیکھتے ہیں جہاں امام جعفر صادق کے مذہب سے نسبت رکھنے والوں کے غلو کا یہ عالم ہے کہ وہ ان کے علم کو ماورائے بشریت ایک چیز گردانتے ہیں۔ ساتھ ساتھ حیرت اور افسوس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کے بعض محدثین ایسے بھی ہیں جو اولاد نبی اور عترت رسول امام جعفر صادق کی روایت کو مشکوک قرار دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی تعصب انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔

لیکن خواہ وہ غلو پسندوں کا قول ہو، یا متشککین کا۔ ان میں سے کوئی بھی امام صادق کے رتبۂ جلیل میں کسی طرح کی کمی نہیں کر سکتا جیسے ان کے جد علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہ کے مرتبہ اور مقام کو دروغ گو لوگوں کی یاوہ گوئی کم نہ کر سکی۔ بالکل اسی طرح جیسے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو۔ افترا پردازیاں کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں، جن میں سے ایک گروہ ان کی رسالت

---

[1] حلیۃ الاولیاء ج ۳، ص ۱۹۹۔

سفیان ثوری ایک مرتبہ ان کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ امام صادق خاموش بیٹھے رہے، کوئی گفتگو نہیں کی۔ ثوری نے کہا۔

میں اس ورسے اس وقت تک نہیں ہٹوں گا جب تک آپ مجھ سے کلام نہ فرمائیں۔

یہ سنکر امام جعفر صادق نے فرمایا:

"اے سفیان کثرت قیل وقال اچھی بات نہیں ہے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ اگر تمہیں کوئی نعمت دیں تو اس کے دوام و بقا کو محبوب رکھو۔ اس پر اللہ تبارک و تعالےٰ کا زیادہ سے زیادہ شکر و سپاس بجا لاؤ۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے۔

لئن شکرتم لازیدنکم

یعنی "اگر تم شکر گزار رہو گے تو میں تم پر انعامات زیادہ کروں گا۔"

اگر تم سے کوئی لغزش ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ استغفار کرو، کیوں کہ اللہ تعالےٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

واستغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا ویمددکم باموال وبنین و یجعل لکم جنات، ویجعل لکم انھارا۔

یعنی "تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال و اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لیے باغ لگائے گا اور نہریں لگائے گا۔

اے سفیان اگر تمہارا سلطان یا حاکم وقت سے پالا پڑ جائے تو "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" بکثرت پڑھا کرو کہ کشادگی کی کنجی اور جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے"!

سفیان نے دل میں نقش ہو جانے والے یہ الفاظ سنے۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔

امام صادق سے امام مالک کا استفادہ

امام مالک رضی اللہ عنہ نے بھی امام جعفر صادق سے علم حاصل کیا۔ ان کی مجلس میں حاضری دی اور ان کی فقہ و روایت سے انتفاع کیا۔

امام ابوحنیفہ امام جعفر صادق سے بکثرت روایت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام ابو یوسف کی کتاب الآثار اور امام محمد بن حسن شیبانی کی "الآثار" کا مطالعہ کیجئے۔ تو ان دونوں کتابوں میں امام ابوحنیفہ کی جو روایتیں آپ کو، امام جعفر صادق سے ملیں گی وہ تعداد کے اعتبار سے کسی طرح کم نہیں ہوں گی۔

کا منکر تھا۔ اور دوسرا ان کی الوہیت کا قائل تھا[1]

---

[1] وہ لوگ جو دنیا میں رہتے ہیں لیکن دنیاداروں کے طور طریق نہیں اختیار کرتے، انھیں اہلِ دنیا معاف نہیں کرتے۔ ان کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ انھیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ ان کی دعوت اور پیام کے نشر و اشاعت میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتے ہیں اور جب ان باتوں سے بھی ان کا جی سیر نہیں ہوتا تو افترا پردازیوں، تہمت تراشیوں اور دروغ بیانیوں پر اتر آتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے حسنات و برکات کے سرچشموں کی روانی روک دی۔

لیکن کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟

ایسا کبھی نہیں ہوا، اس لیے کہ حق بہر حال باطل پر غالب آکر رہتا ہے۔ حقیقت کا چہرہ روشن بہر حال نمایاں ہو کر رہتا ہے، خواہ گرد و غبار کی کتنی ہی تہیں اس پر کیوں نہ بیٹھ جائیں۔

ازل سے یوں ہی ہوتا آیا ہے اور ابد تک یوں ہی ہوتا رہے گا۔

(رئیس احمد جعفری)

امام جعفر صادق اور سیاست

امام زید اور نفس ذکیہ کے خروج سے عدم موافقت

شہرستانی کا بیان

شہرستانی نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں کہا ہے:
"علم دین میں وہ مرتبۂ عالی پر فائز تھے۔ ادب میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا، حکمت میں یکتا تھے۔ دنیا سے نفور، جب دنیا اور شہوات سے بے تعلق تھے۔ زہد اور ورع ان کی خصوصیت تھی۔ ایک عرصۂ دراز تک مدینہ میں انھوں نے بود و باش رکھی، یہاں طالبان علم کشاں کشاں آتے تھے اور فیض یاب ہو کر واپس جاتے تھے، وابستگان دامن پر اسرار علوم منکشف کرتے تھے۔

پھر وہ عراق تشریف لے گئے، اور ایک عرصے تک وہاں مقیم رہے، نہ وہ امامت کے لیے کسی سے برسرِ پیکار تھے، نہ خلافت کی خاطر کسی سے جنگ و جدل پر آمادہ تھے اور سچ تو یہ ہے کہ جو بحرِ معرفت میں غرق ہو چکا ہو، پھر اسے کسی چیز کی طمع نہیں ہو سکتی اور جو حقیقت کے بامِ بلند تک پہنچ چکا ہو، وہ اس منزل سے نیچے نہیں اتر سکتا۔ مشہور ہے کہ جسے خدا سے انس ہو جاتا ہے وہ لوگوں سے وحشت کرنے لگتا ہے۔ اور جو اللہ کے سوا دوسروں سے مانوس ہو جاتا ہے اس پر وسواس کا قبضہ اور تسلط ہو جاتا ہے۔"

امام صادق نے خلافت کے لئے منازعت نہیں کی

شہرستانی کی اس عبارت سے کیا واضح ہوتا ہے؟

کیا یہ نہیں واضح ہوتا کہ انھوں نے علانیہ یا خفیہ کوئی جد و جہد تخت خلافت حاصل کرنے کی نہیں کی، نہ اس باب میں کسی سے کوئی جھگڑا کیا اور یہ بیان متفق علیہ ہے۔ امامیہ اور دوسرے فرقوں کے لوگ سب اسے صحیح اور درست تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ امامیہ کا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ وہ امام زمانہ تھے اگرچہ تقیہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنی دعوت کبھی نہیں دی، چنانچہ ان سے امامیہ حکایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا۔

"تقیہ میرا، اور میرے آبا کا مذہب رہا ہے۔"

تقیہ کی تعریف یہ ہے کہ مومن اپنے اعتقاد کا علانیہ اظہار نہ کر سکے، بلکہ اسے مخفی رکھے، اس اندیشہ سے کہ اگر مخفی نہیں رکھتا تو وہ ہدف ستم بنالیا جائے گا۔

اور تقیہ کی بنیاد اللہ تعالےٰ کے اس قول پر بتائی جاتی ہے:

لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین، ومن یفعل ذٰلک فلیس من اللہ فی شیٔ الا ان تتقوا منھم تقاۃ، ویحذرکم اللہ نفسہ

یعنی، مسلمانوں کو چاہیئے کہ کفار کو (ظاہراً یا باطناً) دوست نہ بنائیں، مسلمانوں کی دوستی سے تجاوز کر کے اور جو شخص ایسا کام کرے گا سو وہ شخص اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں، مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کسی قسم کا اندیشہ رکھتے ہو۔ اور اللہ تعالےٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

یہ بات کہ امام جعفر صادق نے خلافت کے لیے کسی سے منازعت نہیں کی، بقول امامیہ ایسی آیت پر مبنی ہے، ورنہ وہ ان کی امامت کے قائل ہیں۔ اور انھیں ان کے والد ماجد کا خلیفہ تسلیم کرتے ہیں البتہ عدم اعلان و مطالبہ خلافت کی تعلیل اس آیت کی روشنی میں کرتے ہیں۔

لیکن غیر امامیہ یعنی جمہور اہل سنت کا دعوےٰ یہ ہے کہ امام جعفر صادق نہ خلیفہ تھے، نہ انھوں نے خلافت کا مطالبہ کیا، نہ اس باب میں کسی سے منازعت کی۔

امامیہ اور اہل بیت کی اساس اختلاف

فریقین — امامیہ اور اہل بیت کے مابین اختلاف کی اساس دو چیزوں پر ہے:

(۱) امامیہ کے نزدیک امام کو خلافت وراثت یا وصایت، نبوت سے ملتی ہے۔

لیکن غیر امامیہ (اہل سنت) کے نزدیک امامت کا انعقاد بیعت سے ہوتا ہے۔

جمہور مسلمین ملوک کی حاکمیت نہیں تسلیم کرتے، مثلاً عبدالملک اور اس کی اولاد، سفاح اور منصور اور اس کی اولاد، حاکمیت تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں (امویوں اور عباسیوں) کی حکومت کو خلافت نبویہ تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اسے بادشاہی خلافت قرار دیتے ہیں اور خلافت نبویہ صرف چار خلفائے راشدین تک محدود ہے (اللہ تعالےٰ ان سے راضی ہو) اور دلیل میں یہ قول نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لاتے ہیں۔

"الخلافۃ بعدی ثلثون ثم تعید ملکاً عضوضاً۔

یعنی میرے بعد تیس سال تک خلافت رہے گی، پھر ملوک عضوض کا دور دورہ ہو جائے گا۔"

(۲) امامیہ کا اعتقاد ہے کہ امام بہر حال امام ہے، اگرچہ وہ اپنی دعوت دیتا ہوا خروج نہ کرے اس کا

حکم سب پر بالا ہے۔ وہ شرح شریف کو نافذ کرے گا۔

لیکن جمہور اور زیدیہ امامیہ کے اس مسلک سے اختلاف رکھتے ہیں۔

امام صاحب نے اپنی دعوت نہیں دی

باایں ہمہ کہ امام جعفر صادق نے اپنی دعوت نہیں دی لیکن عراق کے شیعوں نے اپنی خفیہ جماعتوں میں ان کی امامت کا پرچم بلند رکھا۔ اور اپنے آپ کو ان کی امامت کا متبع اور پیرو رکھتے رہے، بلکہ بہت سے ایسے افکار بھی انھوں نے پھیلائے جن سے امام صادق نے برئیت کا اظہار کیا۔

حکام وقت آپ سے بدگمان رہتے تھے

اپنی اس اعتزال اور گوشہ نشینی کی پالیسی کے باوجود امام صادق حکام وقت کی بدگمانی، اور شکوک و شبہات کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے، اور آل بیت کو جن مصائب کا ہدف بنایا گیا۔ اس کا اثر ان کی ذات گرامی پر بھی پڑا۔

امام صادق کے عم محترم امام زید نے ہشام بن عبدالملک کے عہد میں آل علی رضی اللہ عنہم اجمعین کے تجربہ کار اور باخبر لوگوں کے مشورے اور صلاح کے برخلاف خلافت کا دعویٰ کرتے ہوئے خروج کیا۔ لوگوں نے انھیں یاد دلایا کہ یہ اہل عراق وہ لوگ ہیں جنھوں نے امام حسین کا ساتھ بھی نازک وقت پر نہیں دیا تھا۔ اور انھیں یکہ و تنہا ابن زیاد کی ستم رانیوں اور سفاکیوں کا ہدف بننے کے لیے چھوڑ دیا تھا، اور اس نے امام زید اور ان کے اظہار و اہرار اہل پر ظلم و جور کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ اور بالآخر امام زید کے خروج کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان درندہ صفت قاتلوں نے نہ صرف انھیں شہید کیا بلکہ ان کی قبر تک کھود ڈالی، ان کے پاک جسم کو نکالا اور سولی پر چڑھایا اور اس کے بعد ان کی ذریت کرام پر جتنے بھی لرزہ خیز مظالم ڈھائے جاسکتے تھے۔

✿

یہ حادثۂ فاجعہ گزر گیا۔

لیکن امام جعفر صادق کے دل اندوہ گیں پر ایک نہ مٹنے والا اثر چھوڑ گیا۔

اس ہولناک اور رُوح فرسا حادثہ نے امام صادق کے دل پر یہ نقش قائم کر دیا کہ یہ لوگ جان کا دم بھرتے ہیں کیسے ہیں؟ — یہ وہ لوگ ہیں جو آگے بڑھاتے ہیں لیکن ساتھ نہیں دیتے، باتیں خوب کرتے ہیں مگر کام کرکے نہیں دکھاتے۔ اکساتے ہیں، لیکن جب کٹھن گھڑی آتی ہے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ تھے جن کے بارے میں امام ہدیٰ علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے دور میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

عباسی حکومت کا رویّہ

پھر جب عباسی حکومت قائم ہوئی تو اس سے خیر کی امید بہت سے لوگوں نے قائم کرلی۔ کیونکہ فرمان روایان بنو عباس آل علی کے ابن عم تھے اور اہل بیت علی کے ساتھ ان کا برتاؤ، عطف ورفق کا شروع میں رہتا چلا آیا تھا۔ سفاح کے عہد میں اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن جب خلیفہ منصور عباسی سریر آرائے خلافت ہوا، اور اس کے خلاف محمد بن عبداللہ بن حسن نے مدینہ میں اور ان کے بھائی ابراہیم نے عراق میں خروج کیا تو علویوں کے خلاف، سختی تشدد اور ظلم وجور کا دور شروع ہو گیا اور ان کے بارے میں شکوک وشبہات بڑھنے لگے۔

ان دونوں پاک نہاد اور پاک سرشت بھائیوں کے خروج کا انجام یہ ہوا کہ انھیں بھی ویسی ہی ہولناک مصیبتوں، تباہیوں اور قتل و دہشت سے دوچار ہونا پڑا، جن سے امام زید کو سابقہ پڑا تھا بلکہ اس واقعہ کے بعد تو بیت علوی کو آماجگاہ ظلم وستم بنا لیا گیا۔ ذرا سی بدگمانی اور معمولی شبہے پر علویوں کی جان ومال پر ڈاکہ پڑنے لگا۔

اہل بیت میں سب سے زیادہ سن رسیدہ اور معمر شخص عبداللہ بن حسن تھے یہ بھی نہ بچ سکے' ۱۴۵ھ میں بہ عہد ابوجعفر منصور انھیں قید خانہ میں موت سے دوچار ہونا پڑا۔

سیاست سے کیوں علیحدگی اختیار کی؟

امام جعفر صادق نے یہ سارے مناظر بچشم خود ملاحظہ کیے ان مناظر نے ان کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے قریب ترین عزیزوں کے قتل اور ہلاکت نے ان کے قلب غمگیں کو مجروح کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیاست سے بیزار اور دل برداشتہ ہو گئے۔ اور اپنی ساری توجہ علم پر مبذول فرما دی کہ اس میں نور تھا، عزت تھی، وقار تھا اور دنیا کے جھگڑوں اور دنیاوی تمناؤں سے کنارہ کشی تھی،" اور جو معرفت کی منزل بلند تک پہنچ گیا۔ پھر وہ معمولی معمولی اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور آرزوؤں کا پابند نہیں رہتا کیونکہ ان مطامع میں مکارہ اور مہالک کے سوا اور ہے کیا؟ لہٰذا انھوں نے مطامع دنیا سے نظر پھیر لی، اور ایسے کام کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور حکمت و معرفت کی دنیا کو اپنا لیا۔ یہ حکیمانہ ارشاد بھی انہی کا ہے۔

"جس نے ریاست طلب کی وہ ہلاک ہوا۔"

امام صاحب کے سیاسی افکار و آرا

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ کوئی سیاسی رائے ہی نہیں رکھتے تھے؟ اگرچہ وہ سیاست سے کنارہ کش تھے اور اس میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے پھر بھی کیا وجہ ہے کہ وہ سیاسی افکار نہیں رکھتے تھے؟

یہ درست ہے کہ انھوں نے حکمرانی کے معاملہ میں کسی سے اشتراک نہیں کیا۔ نہ اس بارے میں کسی سے کوئی منازعت کی، نہ کسی طریق سے حصولِ اقتدار و اختیار کی سعی و کوشش کی، مگر اس کے باوجود کیا یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی سیاسی رائے نہیں رکھتے تھے؟

ہمارے سامنے جو معلومات کا ذخیرہ ہے، جو واقعات ہیں، ان کا اگر احاطہ اور استفسار کیا جائے تو بے شک اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ امام صادق نے:

- درپردہ یا علانیہ طلبِ اقتدار و اختیار دنیاوی کی کوئی کوشش نہیں کی۔
- سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔
- ریاست و حکومت کے حصول سے کوئی سروکار نہیں رکھا،

لیکن ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی کیا اس سے یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ وہ ان معاملاتُ مسائل پر غور بھی نہیں کرتے تھے؟ سوچتے بھی نہیں تھے؟ کوئی رائے بھی نہیں رکھتے تھے؟

سیاسی افکار و آرا کی نفی نہیں ہو سکتی

امامیہ اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جبکہ وہ امام برحق تھے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ریاست و سیاست کے معاملات پر وہ غور نہ کرتے؟ اور کوئی رائے نہ قائم کرتے؟۔ انھوں نے ایسا کیا یہ دوسری بات ہے کہ اپنے افکار و آرا، کا اعلان و اظہار نہیں کیا۔

غیر امامیہ بھی امام صادق کی ذات سے سیاسی افکار و آراء کی نفی نہیں کرتے۔

واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب کے سیاسی افکار و آراء کی نشر و اشاعت ان کے تلامذہ اور مخلصین کے ذریعہ ہوئی جو ان کی مجلس علم و معرفت میں ہمہ وقت حاضر باش رہتے تھے۔ یہ وہ قواعد فکریہ تھے، جو ہر پابندی سے آزاد تھے، ان کے لیے رعایت اور نشر و بیان اور لوگوں کو منظم طور پر اس طرف متوجہ کرنے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔

کیا امام صاحب کی سیاسی رائے معروف تھی؟

اب سوال یہ ہے کہ اگر امام جعفر صادق سیاسی معاملات و مسائل پر کوئی رائے رکھتے تھے تو کیا وہ معروف بھی تھی؟

امامیہ کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ان کے افکار سیاسی کی معرفت رکھتے ہیں۔ جمہور کا قول ہے کہ انھوں نے اپنے سیاسی افکار کا کبھی اعلان و اظہار نہیں کیا۔

لیکن ایک بات بہر حال معروف و معلوم ہے۔

وہ یہ کہ امام جعفر صادق کے بارے میں یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ امویوں کے بارے میں، جنھوں نے ان کے جد امام حسین اور چچا زیدؒ اور ان کی اولاد کو قتل کیا تھا، ایسی رائے رکھتے تھے جسے کسی درجہ میں بھی موافقت

کا درجہ دیا جا سکے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ ابوجعفر منصور عباسی کی حکومت سے خوش ہوں، جس نے ان کے عزیز قریب نفس ذکیہ اور ان کے بھائی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے[1] اور صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خانوادۂ علی کے سب سے زیادہ معمر اور سن رسیدہ بزرگ عبداللہ بن حسن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔

خلیفۂ منصور کے اندیشہ ہائے دور و دراز

ابوجعفر منصور کا گمان یہ تھا کہ امام صادق عباسیوں کی حکومت سے خوش نہیں ہیں لہٰذا ان کے بارے میں وہ ہمیشہ بدگمانی اور شکوک و شبہات میں مبتلا رہتا تھا۔ جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں تو اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اور جب وہ یہ دیکھتا کہ مختلف دیار و امصار اور اقالیم کے شہروں سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں تو اور زیادہ بھڑکتا تھا، اور اس کے شکوک و شبہات کو اور زیادہ تقویت ملتی تھی، اور وہ اپنے وساوس کو مبنی بر ایقان و حقیقت سمجھنے لگتا تھا۔

منصور صرف ان ہی باتوں پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ اس نے جاسوسوں کا پہرہ بھی ان پر بٹھا رکھا تھا جو ایک ایک پل کی جھوٹی سچی خبریں اسے پہنچایا کرتے تھے۔ خاص طور پر اس کی اس پالیسی میں اس وقت اور زیادہ تشدد پیدا ہو گیا جب اس خاندان کے بعض لوگوں نے اس کے خلاف خروج کیا۔

یہ تمام واقعات و حوادث ایسے تھے جنھوں نے اس کے شک میں اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ اور ظلم و جور کے بل پر حکومت قائم کرنے اور فرماں روائی کرنے والوں کی یہ کچھ فطرت سی بن جاتی ہے کہ جس طرح اور جس طور سے بھی ہو سکے وہ اپنے اقتدار و اختیار کی حفاظت کریں۔ اور اس پر کسی طرف سے زد نہ پڑنے دیں یہی وجہ ہے کہ ابوجعفر منصور نے جاسوسوں کا ایک جال پھیلا رکھا تھا، اور یہ جاسوس امام صاحب کے بارے میں اسے طرح طرح کی خبریں پہنچایا کرتے تھے جیسی کچھ بھی خبریں اس سلسلے میں اس تک پہنچیں انھیں سننے کے لیے وہ ہمیشہ اپنے تئیں آمادہ اور تیار رکھتا تھا۔

خلیفۂ منصور کی وضع احتیاط

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اس کا ساعی بھی رہتا تھا کہ امام صادق کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچے۔ نگرانی کڑی سے کڑی رکھے، لیکن جلد بازی یا حرص حکومت سے متاثر ہو کر وہ غلطی نہ کر بیٹھے جو ہشام بن عبدالملک سے سرزد ہوئی تھی جب اس نے امام زید بن علی کو آماجگاہ ستم بنایا تھا، اور جس سے مجبور ہو کر وہ خروج پر آمادہ ہو گئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امویوں کے خلاف عوام میں عام بیزاری پیدا ہو گئی اور ان کے بارے میں لوگوں کے خیالات

---

[1] یہ نفس رضیہ کے نام سے مشہور تھے۔ (رئیس احمد جعفری)

حد سے زیادہ خراب ہو گئے ۔

اور اس عام بیزاری کا جو امویوں کے خلاف پیدا ہو گئی تھی بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ دولت بنو مروان کی بنیادیں ہل گئیں، بلکہ یہ حکومت ہی ختم ہو گئی، جس طرح قتل حسین نے دولت سفیانیہ کا خاتمہ کر دیا تھا۔

خلیفہ منصور اور امام جعفر صادق

ابو جعفر منصور گو امام صادق کی نگرانی کرتا رہتا تھا اور ان کی نقل و حرکت سے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ باخبر رہتا تھا لیکن یہ کوشش بھی کرتا تھا کہ اسے ان کی ذات سے جو خوف اور دہشت ہے اس سے وہ باخبر نہ ہونے پائیں، جب بھی وہ حج کے لیے جاتا تھا انھیں ملاقات کے لیے بلاتا تھا تاکہ ان کے چند پند گوش نصیحت نیوش کو پورے جلال و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے سنے۔

لیکن جب اس کا وسواس شک بدگمانی کے درجہ غالب پر پہنچ گیا تو اس نے انھیں بغداد طلب کیا تاکہ اپنے شکوک رفع کر سکے۔ جب بھی اس کے دل میں شکوک و شبہات کا طوفان سر اٹھاتا، وہ انھیں بغداد بلاتا، اس طرح کی بعض دعوتوں کا ذکر ہم کریں گے۔ اور اس سلسلہ میں جو مناقشات برپا ہوئے انھیں بھی زیر بحث لائیں گے۔ ان دعوتوں نے اس زمانہ میں زیادہ سرگرم صورت اختیار کر لی جب منصور اور نفس ذکیہ کے مابین معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہوا، اگرچہ بعد میں بھی یہ جاری رہیں۔

کوفہ میں امام صاحب کی طلبی

منصور نے امام جعفر صادق کو اس وقت کوفہ میں طلب کیا، جب نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کی دعوت زور شور سے جاری تھی اور منافقوں نے منصور کو یہ باور کرا دیا تھا کہ نفس ذکیہ کے خروج کے پس پشت امام جعفر صادق کی تائید و حمایت کارفرما ہے۔ یہ بات منصور کے دل میں بیٹھ گئی۔ وہ اندیشہ محسوس کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے امام صاحب کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ ان کی کوئی خاص تعظیم و تکریم نہیں کی۔ جب آپ تشریف لائے تو آپ کے اور منصور کے مابین مناقشہ بصورت ذیل رونما ہوا۔

منصور:۔ اے جعفر تمہارے حسد، بغاوت، سرکشی اور فساد اہل بیت بنی عباس کو بھی نہیں چھوڑا اللہ تمہارے اس حسد میں اور زیادہ شدت پیدا کرے لیکن تم ان باتوں اور حرکتوں سے اپنا مقصد نہیں حاصل کر سکتے۔

امام صادق:۔ خدا جانتا ہے تمہارے الزامات میں سے کوئی بھی میرے اوپر صادق نہیں آتا۔ میں نے بنو امیہ کا دور بھی دیکھا ہے۔ تم جانتے ہو وہ ہمارے اور تمہارے بھی سب سے بڑے دشمن تھے۔ انھیں امر خلافت کا کوئی حق نہیں حاصل تھا، لیکن خدا کی قسم میں نے ان کے خلاف بھی بغاوت نہیں کی۔ انھوں نے گو مجھے ہدف ستم و جور بنا رکھا تھا، لیکن میرے بارے میں ان تک کوئی ایسی بات نہیں پہنچی۔ پھر جب میں نے ان کے

ساتھ یہ نہیں کیا تو اب کیسے کر سکتا ہوں؟ کیا تم میرے ابن عم نہیں ہو اور حسن سلوک کا مظاہرہ نہیں کرتے رہے؟ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ مجھ سے ایسی حرکتیں سرزد ہوں[1]۔

اس طرح کی بحث و گفتگو کے بعد جو ان دونوں میں کچھ دیر تک جاری رہی، منصور نے کہا:

"میں آپ کو سچا باور کرتا ہوں!"

پھر اس نے تعظیم و تکریم کے ساتھ آپ کو مدینہ روانہ کر دیا۔

"یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہو سکتا" خلیفہ منصور، اور امام جعفر صادق کے مذکورۂ بالا قصّہ سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

ایک تو یہ کہ شک و شبہ نے ابو جعفر منصور کو چراغ پا کر رکھا تھا، چنانچہ اس نے گفتگو میں حد درجہ درشتی اور تلخی اور ناروا الفاظ کا استعمال روا رکھا، لیکن آپ کی باتیں سن کر اس کا شک دور ہو گیا۔ کیوں کہ آپ کی شخصیت صادقہ نے اس کے دل میں سکون اور اطمینان کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس وقت امام صادق کی عمر تقریباً ساٹھ سال کی تھی، گویا آپ کی ذات میں نور ہدایت اور وقار پیری کا اجتماع تھا۔ سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے، صدق آپ کے چہرے سے ہویدا تھا، اس کے لیے کسی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں تھی، اور سچوں کا چہرہ ہمیشہ خود ہی صدق اور سچائی کا آئینہ دار ہوتا ہے، جیسا کہ مروی ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے جیسے ہی آپؐ کا دیدار کیا پوچھا،

"کیا آپ ہی وہ شخص ہیں جسے قریش دروغ گو اور کذاب کہتے ہیں؟

رسول صادقؐ نے جواب دیا،

"ہاں ــ"

یہ سنتے ہی وہ اعرابی بول پڑا،

"لیکن یہ چہرہ، جھوٹے کا چہرہ تو نہیں ہو سکتا!"

اس کے بعد وہ اللہ اور رسولؐ پر ایمان لے آیا!

دوسری بات جو اس قصّہ سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ امام صادق نے نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کی تحریک میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔

خلیفہ منصور اور امام صادق کی گفتگو اب ہم امام صادق اور منصور کی ایک دوسری ملاقات کا ذکر کرتے ہیں

---

[1] یہ پورا قصہ السید محمد حسین المظفری کی کتاب "الصادق" میں مرقوم ہے۔

یہ ملاقات، نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کی شہادت کے بعد ہوئی تھی، اور ابوجعفر منصور ابھی کوفہ ہی میں مقیم تھا، اس مرتبہ اس نے امام صاحب پر یہ تہمت لگائی کہ وہ اپنے شیعوں سے میل جول رکھتے ہیں، ان کے لیے زکوٰۃ کی رقم جمع کی جاتی ہے اور وہ اسے استعمال میں لاتے ہیں۔

اس گفتگو میں جو ماجرا گزرا اس کی تفصیل یہ ہے:

خلیفہ منصور:۔ اے جعفر یہ کیسا مال ہے جو معلی بن خنیس[1] تمہارے لیے وصول کرتا اور جمع کرتا رہتا ہے؟

امام صادق:۔ معاذ اللہ، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے:

خلیفہ منصور:۔ کیا تم اپنی برأت میں طلاق اور عتاق کی قسم[2] کھا سکتے ہو؟

امام صادق:۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ ساری باتیں غلط ہیں۔

خلیفہ منصور:۔ لیکن تم طلاق اور عتاق کی قسم کھانے پر تیار نہیں ہو؟

امام صادق:۔ کیا تم میری اس قسم کا اعتبار نہیں کرتے جو میں نے خدا کا نام لیکر کھائی جس کے سوا کوئی معبود نہیں؟

خلیفہ منصور:۔ میرے اوپر اپنی فقہ دانی کا رعب ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔

امام صادق:۔ لیکن فقہ میرا دامن چھوڑتی کب ہے؟

خلیفہ منصور:۔ یہ باتیں چھوڑو، میں اسی وقت تمہارے سامنے اس آدمی کو پیش کرتا ہوں جس نے تم پر یہ الزام لگایا ہے اور اب پھر وہ تمہارے معاجہ میں یہ بات کہے گا۔

تہمت لگانے والے کا حشر

اس گفتگو کے بعد، وہ شخص حاضر کیا گیا، جب اس سے سوال کیا گیا تو اس نے اپنے الزامات دہراتے ہوئے کہا:

"ہاں یہ سب صحیح ہے! — اور جعفر (امام صادق) وہی ہیں جن کے بارے میں آپ، (خلیفہ منصور) سے میں نے گفتگو کی تھی۔"

امام جعفر صادق:۔ اے شخص قسم کھا کہ تو نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے وہ صحیح ہے۔

یہ سنکر اس شخص نے کہا:

"ہاں میں قسم کھانے کو تیار ہوں!"

پھر اس نے قسم کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔

---

[1] یہ امام جعفر صادق کا آزاد کردہ غلام تھا اسے داؤد بن علی نے جب وہ مدینہ کا والی تھا، قتل کر دیا تھا اور امام صاحب کو بھی طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی تھیں۔

[2] یعنی قسم اگر جھوٹی ہو تو تمام غلام آزاد اور تمام بیویوں کو طلاق۔ (رئیس احمد جعفری)

اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو غالب، حیّ اور قیوم ہے"!
وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ امام صادق نے فرمایا:
"اے شخص اپنی قسم میں جلدی نہ کر جس طرح میں بتاؤں اس طرح قسم کھا!"
خلیفہ منصور نے سوال کیا۔
"اس قسم کو آپ کیوں کافی نہیں سمجھتے؟
امام صادق نے جواب میں فرمایا:
اللہ تعالےٰ حیّ اور کریم ہے۔ اگر بندہ اس کی ثنا میں رطب اللسان ہو۔ تو وہ عقوبت میں جلدی نہیں کرتا!"
پھر آپ اس تہمت لگانے والے شخص سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:
اے شخص کہہ "برأت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی قوت و طاقت سے اور بھروسا کرتا ہوں میں اپنی قوت اور طاقت پر بے شک میں سچا ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں صادق ہوں۔
منصور نے اس شخص سے کہا۔
"جس طرح ابو عبداللہ (امام جعفر صادق) کہتے ہیں اس طرح قسم کھالے۔
راوی کا بیان ہے کہ اس شخص نے امام صادق کے بتائے ہوئے الفاظ پر قسم کھانا شروع کی اور ابھی قسم تمام نہیں ہوئی تھی کہ "دفعتہً" وہ مر کر گر پڑا۔
یہ بات دیکھ کر منصور گھبرا گیا، خوف اور دہشت کے باعث اس کے بازو پھڑکنے لگے، اس نے امام صادق سے کہا:
"اے ابو عبداللہ! آپ میرے پاس سے اپنے جد کے حرم میں تشریف لے جائیے۔ اگر آپ پسند کریں، اور اگر ہمارے پاس رہنا چاہیں تو ہم آپ کے اعزاز و اکرام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ خدا کی قسم آج کے بعد سے (آپ کے خلاف) میں کسی کی بات پر کان نہیں دھروں گا نہ اس کا قول قبول کروں گا۔

امام صاحب کے اعتزال اور گوشہ نشینی کے اسباب

ان اخبار اور واقعات سے اور اس طرح کے دوسرے مشابہ اور مماثل اخبار اور واقعات سے بھی، اس حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ امام جعفر صادق، حکام وقت سے الجھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ حکومت کے خلاف جو سرگرمیاں شروع کی جائیں، اور جو تحریکیں چلائی جائیں وہ اقامت حق اور ابطال باطل کے لیے مفید و معین نہیں ہو سکتیں اس لیے کہ حکومت اور اقتدار و اختیار کی حرص و طمع میں انسان خواہشات نفسانی کا شکار بن جاتا ہے۔ وہ ہوا و ہوس کا متبع ہوتا ہے۔

قرآن اور احکام قرآن کا نہیں۔ پھر وہ حق اور برہان کے سامنے نہیں جھکتا۔ سچائی باطل کے ساتھ مخلط ہو جاتی ہے۔ افہام میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ اور حق باطل کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اوہام چھا جاتے ہیں اور حقیقت چھپ جاتی ہے۔

پھر ان سب باتوں سے ماورا، امام صادق اس حقیقت سے بھی شناسا تھے کہ خروج اور بغاوت کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ فتنے بڑھ جاتے ہیں اور ان فتنوں سے معاملات اور زیادہ بگڑ جاتے ہیں اور ایک طرح کی انارکی پھیل جاتی ہے اور جب انارکی پھیل جائے تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی ایک ساعت میں جتنے مظالم برپا ہو جاتے ہیں، استبداد کے عہد حکومت کے سالوں میں بھی نہیں ہوتے۔

علاوہ ازیں امام صادق نے اپنے عہد کے برپا شدہ حوادث کا بچشم خود ملاحظہ بھی کیا تھا۔

انھوں نے امام زید کا خروج دیکھا اور اس خروج کے جو نتائج رونما ہوئے ان کا مشاہدہ بھی کیا۔

انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ بڑھ بڑھ کر تائید و حمایت کا اعلان کر رہے تھے، وقت آنے پر وہی کھسک گئے، بھیڑ چھٹ گئی تا اعلان رفاقت کرنے والوں کا انبوہ دغا دے گیا اور جان دینے والے اکیلے رہ گئے — یکہ و تنہا!

انھوں نے اپنی آنکھوں سے خوارج کا فتنہ بھی ملاحظہ فرمایا۔

اور اس فتنہ خوارج نے اہل مدینہ کو جس کرب و ابتلا، شدت و مصیبت اور آفت و صعوبت سے دوچار کیا، اسے بھی دیکھا اور اچھی طرح دیکھا۔

حق سربلند نہ ہو سکا۔

باطل سرنگوں نہ کیا جا سکا۔

آخر میں انھوں نے وہ بغاوت بھی دیکھی جو ان کے برادران عم زادنے حالات سے بے بس ہو کر کی تھی۔ یعنی محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم (نفس رضیہ) کا خروج۔

انھوں نے یحییٰ بن زید کا قتل بھی دیکھا۔

اور اس قتل کے بعد کشت و خون کے جو واقعات و حوادث برپا ہوئے انھیں بھی دیکھا۔

انھوں نے یہ سب کچھ دیکھا۔

اور یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد، ہمہ تن علم کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں دانش کدے میں انھیں سکون کی نعمت ملی۔ اس میں انھوں نے اس عمل کا نظارہ کیا جس کے ثمر بخش نتائج ایک حقیقت ثابتہ کی طرح ظاہر اور عیاں تھے — اور بلاشبہ علم کا نتیجہ ثمر خیر کے سوا کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا۔ اور اس سے قطع نظر کرنے کے بعد جو کچھ

رہ جاتا ہے، اس میں حق کے ساتھ باطل بھی آجاتا ہے اور اکثر حالات میں اس صورت میں نتائج صرف یہی ہوتے ہیں کہ ظلم اور زیادہ مستقل ہوجاتا ہے۔ باطل اور زیادہ مستحکم ہوجاتا ہے۔

مسئلہ خروج اور امام صادق

بہرحال حاکمان وقت کے خلاف خروج کے سلسلہ میں یہ تھی۔ امام صادق کی عام رائے جو مبنی تھی تجربے اور مشاہدے پر۔

لیکن ضروری ہے کہ ہم یہ بھی دیکھیں کہ وہ ایک عالی مرتبہ عالم تھے۔ انھوں نے اگر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی لیکن سیاست نے تو ان کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ علم فقہ میں وہ مسلمانوں کے ائمہ میں سے تھے۔ اور اگرچہ امامیہ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ سیاست سے دست کش ہونے کے باوجود وہ سیاسی امور میں بھی امام حقیقی کا درجہ رکھتے تھے اور اگر مطالبۂ خلافت کے بارے میں انھوں نے سکوت اختیار کیا۔ تو یہ سکوتِ تقیہ تھا۔ نہ کہ سکوت خضوع مطلق۔ اسے رضا کارانہ طاعت بھی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ نہ اسے سیاست سے نفرت پر مبنی قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے سکوت اس لیے اختیار کیا کہ اپنے تئیں اور عامہ مسلمین کو اذیتوں سے محفوظ رکھ سکیں اور مصالح اسلامیہ عامہ کی حفاظت کرسکیں۔

ان کے زمانے میں علویوں نے خروج کیا۔ ان کے چچا امام زید نے خروج کیا۔ ان کی اولاد نے خروج کیا ان کے برادران عم زاد محمد (نفس زکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم (نفس رضیہ) نے خروج کیا۔ ان دونوں کی حمایت اور پشت پناہی ان کے والد نے بھی کی۔

سوال یہ ہے کہ آیا امام صادق اس خروج کے حامی تھے؟

امامیہ کہتے ہیں امام صادق اس خروج کے حامی نہیں تھے، کیوں کہ ان خروج کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کی امامت توارث سے ثابت ہو۔ یا اس فیضان روحانی سے بہرہ ور ہو۔ جو امام اپنے بعد آنے والے کو عطا کرتا ہے، یہ حق ان کے والد (امام باقر) کو اپنے والد (امام زین العابدین) کے بعد حاصل ہوا اور والد کے بعد خود انھیں۔

ہم اس قول کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ہمارا خیال ہے کہ امام صادق نے خروج کی تائید و حمایت جو نہیں کی اس کے اسباب وہی ہیں جن پر ہم گزشتہ صفحات میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

اب ہم چند شواہد ایسے پیش کرنا چاہتے ہیں جو خروج کی عدم موافقت پر دال ہیں۔

امام زید کے واقعہ سے استشہاد

امام زید نے جب خروج کیا تو ان کے بھتیجے امام جعفر صادق بلوغ و شعور اور علم و فضل کی منزل تک پہنچ چکے تھے، یہ دونوں تقریباً ہم سن تھے۔ بایں ہمہ امام صادق نے امام زید کے ساتھ خروج نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر اہل بیت کی طرح

وہ اس حقیقت کے شناسا تھے کہ اہلِ عراق بہت جلد انھیں دغا دیں گے، چنانچہ بہت سے افراد اہلِ بیت نے انھیں خروج سے روکا، لیکن ہشام بن عبدالملک کی شعلہ سامانیوں اور اشتعال انگیزیوں نے انھیں میدان میں آنے پر مجبور کردیا تھا۔ کیونکہ وہ انھیں ستاتا اور ان کی توہین کرتا رہتا تھا۔ تنگ آکر انھوں نے خروج کا فیصلہ کرلیا۔ بعض اہلِ بیت نے ان کا ساتھ بھی دیا لیکن امام جعفر صادق اس خروج میں ان کے شریک نہ بن سکے کیوں کہ اس اقدام کے وہ حامی اور مؤید نہیں تھے لیکن بااِیں ہمہ وہ اپنے عم محترم کے موقف کو سمجھتے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ اس حادثۂ الیمہ پر انھوں نے آنسو بھی بہائے اور مقتولین کے پسماندگان کی کھلے دل سے مالی مدد بھی کی۔ اور ان لوگوں کو سخت ملامت کی، جنھوں نے خروج کی دعوت دی اور خود کنارے ہٹ گئے، جنھوں نے نصرت کا وعدہ کیا پھر ساتھ چھوڑ دیا اس واقعہ پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے انھوں نے امام زید کے لیے فرمایا:

> اللہ تعالٰی ان پر رحم فرمائے، وہ مومن تھے عارف تھے، عالم تھے، صادق تھے اگر وہ کامیاب ہوجاتے تو وفائے عہد کرتے، اگر حکومت ان کے ہاتھ میں آجاتی تو اس ذمہ داری کو خیر وخوبی کے ساتھ وہ انجام دے کر دکھا دیتے[1]

امام صادق کے اس ارشاد سے کیا یہ نہیں ثابت ہوتا کہ اگرچہ (بعض وجوہ سے) وہ ان سے ہم آہنگ نہیں تھے لیکن ان کی کامیابی کے دل سے آرزومند تھے اور جب انھیں شکست ہوئی تو ان کا دل کڑھا، اور جو لوگ حقیقتاً اس ناکامی کے ذمہ دار تھے انھیں ملامت کرنے میں انھوں نے ذرا بھی تامل نہیں کیا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ امام زید کے ساتھ خروج میں امام جعفر صادق کی عدم شرکت صرف عدم موافقت کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے تئیں علم ودرس کے لیے وقف کردیا تھا البتہ مالی امداد اس طرح کرتے رہے، جیسے امام ابوحنیفہ نے درہم ودینار کی تھیلیاں امام زید کی اعانت کے لیے کھول دی تھیں کہ وہ حرب وقتال کی تیاریاں کریں۔

امام زید کے قتل کے نتائج امام زید کا قتل خانوادۂ علوی کے لیے مزید مصائب اور آلام کا سبب بن گیا۔ ان کی اولاد میں سے بعض لوگوں نے خروج کیا اور جان دی۔ مدینہ کے آلِ بیت نے ولید بن یزید بن عبدالملک کے قتل کے بعد ۱۲۵ھ میں ایک اجتماع کے موقع پر محمد بن عبداللہ نفس ذکیہ کے لیے بیعت کی لیکن اس اجتماع میں امام جعفر صادق نے شرکت نہیں کی۔

---

[1] رجال کشی ص ۱۸۴

ابو جعفر منصور اس مجلس میں موجود ہے وہ تیزی سے لپکتا ہے اور محمد نفس ذکیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیعت کر لیتا ہے اور کہتا ہے :-

" وہ کون چیز ہے جس سے تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو؟ خدا کی قسم تم اچھی طرح جانتے ہو، اس نوجوان یعنی محمد بن عبداللہ (نفس ذکیہ) سے زیادہ کوئی شخص بھی اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کے سامنے گردنیں جھکیں اور اس کی دعوت قبول کی جائے !"

لوگوں نے یہ سن کر کہا :

"تم سچ کہتے ہو، بے شک یہ وہ شخص ہے جسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں ۔

پھر سب نے محمد نفس ذکیہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ۔ سوا جعفر بن محمد کے ۔

روایت ہے کہ امام صادق کے امتناع بیعت سے عبداللہ بن حسن بھڑک اٹھے، جس پر امام صادق نے ان سے کہا :

" خدا کی قسم یہ امر بیعت نہ آپ کے لیے ہے نہ آپ کے دونوں بیٹوں کے لیے ہے، بلکہ دراصل یہ اس (سفاح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) شخص کے لیے ہے پھر اس (منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) شخص کے لیے ۔ پھر اس کے بعد اس کے بیٹے کے لیے، اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا یہاں تک کہ لڑکے حکومت کرنے لگیں اور عورتیں مشورہ دینے لگیں ۔

امام صادق کے یہ الفاظ سن کر عبداللہ بن حسن نے کہا ۔

" خدا کی قسم اے جعفر خدا نے تمہیں غیب کا علم نہیں دیا ہے ۔ اور یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو صرف میرے بیٹوں سے حسد کا نتیجہ ہے !

امام صادق نے جواب دیتے ہوئے کہا :

" خدا کی قسم مجھے آپ کے صاحبزادے سے ذرا بھی حسد نہیں ہے ۔ اور سن رکھیے کہ یہ ابو جعفر منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) شخص پہلے نفس ذکیہ کو پھر ان کے بھائی کو قتل کر کے رہے گا

منصور امام صاحب کو صادق کیوں کہتا تھا؟

پھر سفاح کے بعد جب ابو جعفر منصور سریر آرائے خلافت ہوا تو اس نے اس واقعہ (قتل نفس ذکیہ)

لہ یہ واقعہ روایات متعددہ کی صورت مقاتل الطالبین کے صفحات ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۳۸، ۲۴۸، ۲۵۶ پر مرقوم ہے ۔

البتہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس اجتماع کے بیعت کرنے کے لیے ابوجعفر منصور (جو بعد میں خلیفہ بنا) موجود تھا۔ اس کے علاوہ بنو عباس کے اور بھی متعدد نفوس اس موقع پر موجود تھے۔ یہ اجتماع صرف علویین ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ جملہ ہاشمیوں کا جامع تھا۔ اس اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ امویوں کی بیعت اطاعت توڑنے کی دعوت دی جائے جیسا کہ مقاتل الطالبین میں وارد ہے:

"بنو ہاشم جمع ہوئے۔ اس موقع پر عبداللہ بن حسن نے ان کے سامنے ایک خطبہ دیا۔ انھوں نے حمد و ثنا کے بعد کہا:

تم اہل بیت ہو، اللہ تعالےٰ نے تمہیں رسالت کی فضیلت سے نوازا ہے۔ لوگوں میں تم سب سے زیادہ بابرکت ہو تم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذریت ہو۔ ان کے چچا کی اولاد ہو۔ ان کے ہم خاندان ہو۔ اللہ کے معاملات میں (اگر رو براہ نہ ہو رہے ہوں تو) ان پر سب سے زیادہ تشویش و اضطراب کا حق تمہیں کو ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ کتاب اللہ معطل کی جا چکی ہے سنت رسولؐ کو ترک کیا جا چکا ہے، باطل زندہ اور سربلند ہے، حق مردہ اور سرنگوں ہے۔ میدان مقابلہ میں اترو، تاکہ خدا کی خوشنودی حاصل کر سکو۔ قبل اس کے کہ تمہارا نام و نشان مٹ جائے اس طرح جٹ جاؤ جس طرح بنو اسرائیل نے کیا تھا۔ جو اس وقت خلق میں سب سے زیادہ خدا کے محبوب تھے تم جانتے ہو ہم ایک مدت سے یہ سنتے آئے ہیں کہ ان لوگوں نے جب ایک دوسرے کو قتل کیا۔ تو معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے سردار ولید بن یزید کو قتل کر دیا۔

پس آؤ، ہم محمد نفس ذکیہ کی بیعت کریں تم جانتے ہو۔ وہ مہدی ہیں۔"

امام صادق اجتماع ہاشمین میں

ان الفاظ کے ساتھ عبداللہ بن حسن نے اپنے بیٹے (نفس ذکیہ) کے لیے دعوت دی۔

لیکن لوگوں نے کہا:

ہمارے سب لوگ یہاں مجتمع نہیں ہیں جب وہ جمع ہوں گے تو ہم بیعت کریں گے اور ہم یہاں ابو عبداللہ جعفر بن محمد (امام صادق) کو بھی نہیں دیکھتے۔

چنانچہ امام جعفر صادق کو بلایا گیا۔ انھوں نے جواب میں کہلایا:

"آپ بزرگ ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی بیعت پر تیار ہوں، لیکن جہاں تک آپ کے صاحبزادے کا تعلق ہے میں ان کی بیعت نہیں کروں گا۔"

ابوجعفر منصور کی بیعت نفس ذکیہ میں سبقت

اس موقع پر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ

ابراہیم) کو امام صادق کی پیش گوئی کے مطابق پایا اور انھیں "الصادق" کے نام سے یاد کرنے لگا۔ وہ جب بھی ذکر کرتا تو اس نام سے انھیں یاد کرتا۔

روایات مختلفہ کا جائزہ اجمالی

نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر اس واقعہ سے متعلق روایات مختلفہ کا مختصر سا جائزہ لے لیں۔

اس کا اہم ترین پہلو وہ ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ابوجعفر منصور نے محمد نفس ذکیہ کی بیعت میں ہوشیاری سے کام لے کر مسارعت کی۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس کے اس اقدام کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ امر خلافت کو اہل بیت سے بنو عباس کی طرف منتقل کر دے، کیونکہ اب راہ صاف ہوتی نظر آرہی تھی۔ امر خلافت کا فیصلہ اب اہل بیت نہیں، ہاشمین کر رہے تھے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ امام جعفر صادق نے عبداللہ بن الحسن کی اولاد کی بیعت سے انکار کر دیا تھا لیکن خود عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار تھے اس لیے کہ وہ بنو ہاشم میں سب سے زیادہ بزرگ تھے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کیا امام جعفر صادق نے اس بات کا ادراک کر لیا تھا کہ چونکہ نفس ذکیہ قوم کی حیثیت نہیں رکھتے اس لیے اس بیعت کا بالآخر انجام کیا ہوگا؟

نیز امام جعفر صادق کی پیش گوئی جو انھوں نے نفس ذکیہ کی بیعت تمام ہونے کے بعد کی اس پیش گوئی کو روایات متعددہ کی صورت میں اصفہانی نے ذکر کیا ہے۔ اور ہم بھی گزشتہ صفحات میں اسے بیان کر چکے ہیں۔ یہ روایت — پیش گوئی والی — اگر صحیح ہے تو ہمارے خیال میں اس کا شمار انواع حدس و تخمین میں کرنا چاہیئے۔ بعض نفوس قدسیہ ایسے ہوتے ہیں جن کی زبان پر اللہ تعالےٰ ایسی باتیں جاری کر دیتا ہے جو بعد میں پیش آکر رہتی ہیں۔ امام جعفر صادق نے اپنی روشن ضمیری سے جو بات پیش گوئی طرح بیان فرمائی، وہ اسی قبیل سے تھی۔

اس جگہ ہم ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ اس سلسلہ میں جو روایات وارد ہیں وہ اس پیش گوئی کے بارے میں متفقہ نہیں ہیں۔ چنانچہ بعض روایات میں مکان اور اشخاص کی تفصیل نہیں ہے صرف اتنا ہی ہے کہ خلافت عبداللہ کے دونوں بیٹوں میں سے کسی کو نہیں ملے گی۔ قتل کا ذکر نہیں ہے۔ نہ خلافت عباسیہ کی ترتیب کا ذکر ہے ہم اس طرف مائل ہیں اور کوئی شبہ نہیں یہ بات از قبیل کرامت صادقہ ہے۔

ہماری اس ترمیم کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہم اصل الہام کے قائل نہیں ہیں ہم قطعاً اس کی نفی نہیں کرتے کر بھی کیسے سکتے ہیں جب کہ رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے:

لوکان فی هذہ الامۃ محدثون لکان عمر:- یعنی اس امت میں اگر محدثین (صاحب الہام و گوں) کی گنجائش ہوتی تو وہ عمرؓ ہوتے۔

لیکن ملہم یا محدث، اپنی بات کبھی بھی تحدّی کے ساتھ جزم اور قطعیت کا پہلو لیے ہوئے نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی زبان پر بے ساختہ کچھ باتیں جاری ہو جاتی ہیں۔ بلکہ بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ ان باتوں کو منہ سے نکالتے وقت وہ ان کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔ بلکہ غیر ارادی طور سے زبان پر جاری ہو جاتی ہیں۔

کیا امام جعفر صادق کی زبان پر یہ الفاظ اسی طرح آئے تھے؟ —— ہمارا خیال یہی ہے کیونکہ غیب کا علم صرف خدا ہی کو ہے۔ اس صورت میں ان کا یہ قول ادعائے علم کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ القا اور الہام کے طور پر تھا۔ علماء نے کرامت اور معجزہ میں جو فرق کیا ہے وہ یہ ہے کہ معجزہ، جزم، تعین قطعیت اور تحدّی کے ساتھ رونما ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ علم ہوتا ہے جو اثبات۔ رسالت کے لیے اللہ تعالےٰ اپنے نبی مرسل کو عطا کرتا ہے۔ اور کرامت ایسے شخص سے سرزد ہوتی ہے تو اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں مکرم ہوتا ہے۔ اور صاحب کرامت کی زبان پر جو الفاظ جاری ہوتے ہیں، وہ ادعائے علم غیب اور تحدّی کے بغیر جاری ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ مبنی بر علم نہیں ہوتے۔

کرامت ایسی چیز ہے جس پر ایمان لانا واجب نہیں ہے۔ جو شخص کسی میں کرامت کی جلوہ گری دیکھ لیتا ہے اسے مان لیتا ہے۔ جو نہیں دیکھتا وہ تصدیق پر مجبور نہیں۔

امام مالک کا فتویٰ نفس ذکیہ کی تائید میں

اوپر کے صفحات میں ہاشمیوں کے کل اجتماع کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہ واقعات اگر صحیح ہیں تو ماننا پڑیگا۔ محمد نفس ذکیہ کے خروج کے کچھ منطقی اسباب بھی تھے، جنھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ابوجعفر منصور نفس ذکیہ کی بیعت کر رہا تھا، بلکہ وہ پہلا شخص تھا جس نے ہاشمیوں کے اس اجتماع میں سب سے پہلے لپک کر بیعت کی تھی، لہٰذا نفس ذکیہ کا خروج یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ اس بیعت کا جو منصور ان کے ہاتھ پر کر چکا تھا نفاذ چاہتے تھے۔

ایک بات اور بھی ہے۔

ابوجعفر منصور نے نفس ذکیہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی لیکن ان کے لیے بیعت عامہ کی تکمیل نہیں ہوئی تھی، اور بیعت اسلامیہ جس سے خلافت کا انعقاد ہوتا ہو جمہور کی نظر میں چند افراد امت کے اجتماعِ و اتفاق سے نہیں مکمل ہو سکتی۔ خواہ ان چند افراد کا حسب نسب کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو۔ اور خواہ اسلام میں ان کا مرتبہ کتنا ہی عالی کیوں نہ ہو۔ اور ابوجعفر منصور نے بیعت عامہ سے تمسک کیا۔

امام نفس ذکیہ نے ابوجعفر منصور پر یہ الزام لگایا کہ یہ بیعت عامہ جو لی گئی ہے جبراً لی گئی ہے ۔ اور مجبور شخص کی یمین و قسم کا کوئی اعتبار شرعاً نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس فتویٰ کا اعلان کیا گیا اور مدینہ میں اس کی منادی کرائی گئی۔ امام مالک نے اس مفہوم کی حدیث بھی روایت کرنا شروع کی "لیس لمنکرہ یمین" اور اس پر فتویٰ دینا شروع کر دیا۔ نفس ذکیہ کے انصار نے اس فتویٰ کو حجت اور دلیل بنا لیا۔ چنانچہ والی مدینہ نے ۔ جو دولت عباسیہ کا ماتحت تھا ۔ امام مالک کو مجبور کیا کہ ایسا فتویٰ نہ دیں۔ لیکن انھوں نے اس کی بات نہیں مانی کیونکہ ان کے نزدیک یہ بات قطعاً نادرست اور نا زیبا تھی کہ کسی سبب سے احادیث رسولؐ کا اخفا کیا جائے۔ خواہ وہ سبب کتنا ہی بڑا اور کیسا ہی اہم کیوں نہ ہو، امام مالکؒ کے اس انکار پر والی مدینہ نے ان پر بہت زیادہ سختیاں کیں، جن کی تفصیل کتب تاریخ اور حالات و سوانح امام مالکؒ میں موجود ہے۔

امام جعفر صادق کا موقف کیا تھا؟

اس جگہ ہمیں فریقین کے تنازعہ اور دلیل و حجت سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اس جگہ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں، کہ نفس ذکیہ کے خروج کے سلسلہ میں امام جعفر صادق کا موقف کیا تھا؟

آیا وہ اس خروج اور بغاوت کے حامی تھے یا حامی نہیں تھے؟

بلاشبہ منطق حوادث کا اشارہ ایک ہی جواب کی طرف ہے۔ اور وہ نفی میں ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک فتنہ تھا اور امام صادق فتنہ کی تائید و حمایت پر اپنے تئیں آمادہ نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے خود اس کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"یہ ایک فتنہ تھا جس میں محمد (نفس ذکیہ) بیت اول کے نزدیک قتل کیے گئے۔ اور ان کے برادر حقیقی بھی عراق میں قتل کئے گئے۔ جب کہ ان کے سم اسپ پانی میں تھے۔"[1]

انصار نفس ذکیہ اور امام صادق

تو بات یہ تھی کہ امام صادق نے فتنہ دیکھا اور اس سے دامن سمیٹ لیا۔ نفس ذکیہ کے بعض انصار ان کے پاس پہنچے انھوں نے انھیں بیعت کرنے کی دعوت دی اور اس سلسلہ میں کافی تند و تیز گفتگو ہوئی۔ اس مناقشہ کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں کیونکہ زیر بحث مسئلہ سے متعلق کئی اہم گوشوں پر اس سے روشنی پڑتی ہے

انصار نفس ذکیہ سے امام صادق کی گفتگو

"معتزلہ وغیرہ کی ایک جماعت امام صادق کے

---

[1] مقاتل الطالبین ص ۲۱۸۔ نیز ملاحظہ ہو الطبری ج ۹ ص ۲۳۰۔

پاس پہنچی، ان لوگوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ نفس ذکیہ کی بیعت کریں، بحث وگفتگو نے جب طول کھینچا تو امام صادق نے کہا۔

"تم اپنا ایک ترجمان مقرر کر لو جو گفتگو کرے!

ان لوگوں نے عمرو بن عبید کو اپنا ترجمان نامزد کیا۔ پھر عمرو بن عبید اور امام صادق میں یوں گفتگو شروع ہوئی

عمرو بن عبید:۔ اہل شام نے اپنے خلیفہ کو قتل کر دیا ہے، ان میں پراگندگی پیدا ہوگئی ہے۔ ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک شخص نظر آگیا جس کی ذات دین، عقل اور مروت کی جامع ہے۔ اور وہ بجا طور پر معدن خلافت ہے۔ وہ ہے محمد بن عبداللہ بن الحسن (نفس ذکیہ) ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس کے دامن سے وابستہ ہو جائیں اس کی بیعت کریں، اپنا معاملہ اسے سونپ دیں اور اس کی دعوت کا فریضہ اپنے ذمے لیں پس جو شخص نفس ذکیہ کی بیعت کرے گا ہم اس کے ساتھ ہیں وہ ہمارا ساتھی ہے۔ اور جو ہم سے الگ رہا، ہم اس سے پرے رہیں گے اور جو ہمارے آڑے آیا اس سے ہم جہاد کریں گے اور اسے پنپنے نہیں دیں گے۔ ہماری آرزو ہے کہ ہم آپ سے التجا کریں کہ آپ بھی بیعت کرلیں۔ کیونکہ ہم آپ جیسی صاحب فضل وعلم شخصیت سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

امام صادق:۔ کیا تم سب کی رائے بھی وہی ہے جو عمرو بن عبید نے ابھی ظاہر کی ہے؟

سب نے اثبات میں جواب دیا، اور کہا "جی ہاں، ہم سب کی یہی رائے ہے۔

امام صادق:۔ اگر خدا کی نافرمانی ہوتی ہو تو ہم اس پر برہم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اگر انسان کی طاعت ہو رہی ہو تو ہم رضامند اور خورسند ہیں، اے عمرو مجھے بتاؤ۔ اگر امت نے اس امر خلافت کو تمہیں سونپ دیا ہوتا اور تم بغیر قتال و مونت کے اسکے مالک بن گئے ہوتے پھر تم سے کہا جائے کہ تم جسے چاہو ولایت امر سونپ دو۔ تو تم کسے یہ بار گراں سونپتے؟

عمرو بن عبید:۔ میں مسلمانوں کی مجلس مشورت کے سپرد یہ کام کر دیتا۔

امام صادق:۔ تمام مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھ دیتے؟

عمرو بن عبید:۔ جی ہاں۔ ایسا ہی کرتا۔

امام صادق:۔ قریش اور غیر قریش سب کے سامنے؟

عمرو بن عبید:۔ جی ہاں، عرب وعجم سب کے سامنے۔

امام صادق:۔ اے عمرو۔ تم ابوبکر وعمر کا طریقہ پسند کرتے ہو۔ یا ان کے طریقے سے اظہار برأت کرتے ہو؟

عمرو بن عبید:۔ میں ان دونوں بزرگوں کا طریقہ پسند کرتا ہوں۔

امام صادق :۔ اے عمرو، اگر تم ان دونوں سے اظہار برأت کرتے، تو ضروری تھا کہ ان کے طرز عمل کے خلاف جاتے اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو پھر ان کے خلاف جا رہے ہو۔ عمرؓ نے ابوبکرؓ کو نامزد کیا اور بیعت کرلی۔ اور کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ پھر ابوبکر نے یہ منصب انھیں سونپ دیا اور کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ پھر عمر نے چھ آدمیوں کی ایک مجلس انتخاب خلیفہ کے لیے نامزد کردی اور اس میں انصار کو شامل نہیں کیا۔ پھر لوگوں کو ایک خاص بات کی وصیّت کی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ نہ تم، نہ تمہارے اصحاب اس راستے پر چل رہے ہیں جو ابوبکر و عمر کا تھا۔

عمرو بن عبید : وہ کیا تھا؟

امام صادق :۔ عمرؓ نے صہیب کو حکم دیا کہ تین روز تک وہ لوگوں کی امامت کریں، اور یہ چھ آدمی اس عرصہ میں مشورہ کریں کہ اور اس مجلس میں اب عمر کے سوا، جو مشورہ دینے پر مامور تھے کوئی اور نہ شریک ہونے پائے، اور ان مہاجرین و انصار کو جو حاضر تھے وصیت کی کہ اگر تین دن گزر جائیں اور ارکان مجلس کسی شخص کو منتخب نہ کرسکیں، اور کسی کی بیعت نہ کریں تو ان سب کی گردن اڑا دو۔ اور اگر تین دن گزرنے سے پہلے چار آدمی کسی رائے پر متفق ہوجائیں اور دو مخالفت پر اڑے رہیں تو ان دونوں کی گردن اڑا دو۔ کیا تم اپنی مجلس شورائے مسلمین میں یہ طریقہ اختیار کرنے پر تیار ہو؟

سب لوگوں نے جواب دیا،

"نہیں۔ ہم اس پر تیار نہیں ہیں"۔

امام صادق :۔ اچھا فرض کرو۔ میں اس شخص کی بیعت کرلوں جس کی طرف تم دعوت دے رہے ہو۔ اور امت کا اس پر اتفاق بھی ہو جائے۔ پھر تم مشرکین کی طرف بھی متوجہ ہوگے؟

عمرو بن عبید :۔ جی ہاں۔ کیوں نہیں!

امام صادق :۔ کیا کروگے؟

عمرو بن عبید :۔ ہم انھیں اسلام کی دعوت دیں گے۔ اگر انھوں نے اسلام قبول نہ کیا تو جزیہ طلب کریں گے۔

امام صادق : لیکن اگر وہ اہل کتاب نہ ہوں، مجوس اور آتش پرست وغیرہ ہوں تب؟

عمرو بن عبید :۔ سب برابر ہیں۔

امام صادق :۔ اپنے قول کی دلیل قرآن سے لاؤ۔ کیا تم قرآن کی تلاوت کرتے ہو؟

عمرو بن عبید : جی ہاں، کیوں نہیں۔

امام صادق :۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھو۔

"قاتلوا الذین لایؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر، ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولایدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب، حتی یعطوا

"یعنی، اہل کتاب جو نہ خدا پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں، نہ قیامت کے دن پر، اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے، نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کرلیں"۔

عمرو بن عبید: ان میں سے اہل کتاب مستثنیٰ ہیں، اور جو لوگ ایمان نہ لائیں برابر ہیں۔

امام صادق:۔ یہ بات تم نے کہاں سے پیدا کی؟

عمرو بن عبید:۔ میں نے سنا ہے لوگ اس طرح کہتے ہیں۔

جزیہ اور صدقات کے مسئلہ پر بحث کرنے کے بعد امام جعفر صادق، عمرو بن عبید اور حاضرین کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔

اے عمرو، اور اے حاضرین خدا سے ڈرو۔ میرے والد نے جو اس زمین پر رہنے والوں میں بہترین شخص اور کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے سب سے بڑے عالم تھے مجھ سے حدیث بیان فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

من ضرب الناس بسیفہ ودعاھم الی نفسہ، وفی المسلمین من ھو اعلم منہ فھو ضال متکلف۔[1]

"یعنی، جو لوگوں کو بزور شمشیر اپنی طرف دعوت دیتا ہو، حالانکہ مسلمانوں میں اس سے زیادہ عالم موجود ہوں، تو وہ شخص گمراہ ہے۔"

امام صادق نے نفس ذکیہ کی بیعت کیوں نہیں کی؟

ان ارشادات امام صادق سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف انتزاع فتنہ کے باعث نفس ذکیہ کی تائید و حمایت سے گریز نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ انھیں غیر اہل سمجھتے تھے، یا کم از کم ان سے زیادہ اہل اشخاص ان کی نظر میں تھے جیسا کہ انھوں نے عبداللہ بن الحسن سے جب وہ اپنے صاحبزادہ کی بیعت کی دعوت دے رہے تھے تو انھوں نے بیٹے کے بجائے باپ کے ہاتھ پر بیعت

---

[1] "الصادق" للسید محمد حسین المظفری، نقلاً عن احتجاج الطبرسی ج ۱ ص ۳۷۲

یعنی رجل (آدمی۔ امام) ہی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جس نے اس رجل (امام) کو جان لیا اور اس کی معرفت حاصل کرلی تو عمل کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ جان لینا کافی ہے، گویا اس نے نماز بھی پڑھ لی، زکوٰۃ بھی ادا کردی۔ رمضان کے روزے بھی رکھ لیے۔ حج اور عمرہ بھی کرلیا۔ نیز غسل جنابت بھی کرلیا اور پاک بھی ہوگیا۔ اور حرمات اللہ شہر حرام اور مسجد حرام کی توقیر کرلی۔ ان لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ جس نے اس رجل (آدمی) کا عرفان حاصل کرلیا اور اپنے دل پر اسے نقش کرلیا تو اس کے لیے علی طور پر تہاون اور عدم تعمیل فرائض جائز ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے، جس نے اس رجل کو جان لیا تو یہ سارے فرائض اور واجبات (خود بخود) اپنے اپنے وقت پر اس کی طرف سے انجام پا جائیں گے۔ اگرچہ اسے اس کا علم نہ ہونے پائے۔ ان لوگوں کے بارے میں تمہیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ باور کرتے ہیں کہ فواحش جن کی اللہ تعالٰے کی طرف سے نہی وارد ہوئی ہے۔ نیز شراب، جوا، زنا، سود، مردار، سور کا گوشت یہ سب اشخاص ہیں۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، بھتیجیوں اور خالاؤں سے شادی حرام نہیں کی ہے۔ نہ مومنین پر نساء نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حرام کیا ہے۔ نیز یہ کہ وہ ظاہر اور باطن معنی کو خوب سمجھتے ہیں، جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے، وہ میرے نزدیک مشرک ہے، شرک جلی کا ارتکاب کرتا ہے اور کسی کے لیے بھی روا نہیں ہے کہ اس باب میں شک وشبہ سے کام لے[1]

ایک ناقابل فہم جسارت

امام جعفر صادق کا یہ ارشاد سراسر حق ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے اس افترا سے کام لیا وہ اس کے مستحق تھے۔ امام صاحب نے انھیں مشرک قرار دیا ہے اور بلاشبہ یہ مشرک تھے۔ ان سے تو عہد جاہلیت کے مشرک بھی اچھے تھے، یا کم از کم ان میں شر کا پہلو ان سے بہت کم تھا۔ انھوں نے کبھی یہ جرأت نہیں کی کہ ماؤں، بیٹیوں، بہنوں اور بھتیجیوں کو حلال کرلیا۔ نہ اپنی نفک میں وہ اتنے پست درجہ تک اترے۔ اصل بات یہ ہے کہ گمراہی اور زندقہ نے ان کے قلوب پر تسلط حاصل کرلیا تھا۔ انھوں نے جماعت اسلامیہ کی وحدت میں رخنہ ڈالنے کی افسوسناک کوشش کی تھی - امام صادق جیسے پاک سرشت، پاک باز اور سراپا عظمت وتقدس شخصیت کی آڑ لے کر اپنے شر و فساد کی نشر و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن آل بیت پر یہ محض ایک تہمت تھی، جس سے وہ قیامت تک بری ہیں۔

---

[1] کتاب "دعائم الاسلام" از قاضی ابوحنیفہ النعمان۔ التیمی المتوفی ۳۶۳ھ - جو دولت فاطمیہ کے قاضی تھے۔

امام جعفر صادق فقیہہ مجتہد تھے

یہ ساری تفصیل ہم نے اس لیے پیش کی ہے کہ اندازہ ہو سکے امام جعفر صادق کن ذہنی پریشانیوں اور صدمات و الم میں مبتلا تھے۔ لوگوں نے انھیں گوشۂ علم میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ نہ انھیں محراب مسجد میں عافیت کی زندگی بسر کرنے دی۔ یہ پریشانی تو تھی حکام وقت کی طرف سے لیکن جو لوگ ان کی ذات گراں سے عقیدت کا دم بھرتے تھے۔ ان کے نام کا غلغلہ بلند کرتے تھے۔ اپنے آپ کو ان کا جان نثار اور فدوی قرار دیتے تھے۔ ان کی بھی حقیقت یہ تھی کہ وہ شیطان کے وفادار تھے، نہ کہ اس امام جلیل کے، جو لوگ اللہ تعالےٰ کے وفادار ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے!

الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون، الذین اٰمنوا وکانوا یتقون لھم البشریٰ فی الحیاۃ الدنیا وفی الاخرۃ۔

یعنی، یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے، نہ وہ مغموم ہوتے ہیں، وہ ایمان لاتے اور معاصی سے پرہیز رکھتے ہیں۔ ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (خوف وحزن سے) بچنے کی خوش خبری ہے۔"

—— جو لوگ اس معیار پر پورے اتریں بلا شبہ وہی اولیاء اللہ کہے جا سکتے ہیں۔

امام جعفر صادق فقیہہ مجتہد تھے، ان سے امام مالکؒ نے روایت کی، امام ابوحنیفہؒ نے ان سے روایت کی، اور ان سب باتوں سے بالا تاریکی اور ظلمت میں وہ نور مبین کی حیثیت رکھتے تھے، وہ سراپا علم وبرکت تھے۔ جو لوگ نام نہاد طور پر صرف ظاہر میں اپنے آپ کو ان کا شیعہ اور عقیدت مند ظاہر کرتے تھے وہ اس نور مبین کی ضیا پاشیوں سے مستفید نہ ہو سکے بلکہ انھوں نے ضلالت اور گمراہی کے راستے پر قدم زنی جاری رکھی۔

اس امام جلیل کے ارشادات و اقوال تاریکی کو نور سے بدلنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن جو لوگ گمراہ تھے۔ اور گمراہ رہنا چاہتے تھے انھوں نے اتحاد اسلام ہی کو شعار بنا رکھا تھا وہ ہدایت کے نہ طالب تھے، نہ ہدایت حاصل کر سکے۔ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے اور نور کی طرف سے انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ ان کو پہچانتے نہ ہوں، خوب پہچانتے تھے، لیکن عمداً اور ارادۃً ان کے راستے پر چلنے سے کتراتے تھے۔ اس لیے کہ اگر وہ امام صادق کے صحیح معنی میں پیرو ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اس درجہ غلو پسند ہوتے کہ راہ امام سے منحرف ہو جاتے اور

اقوال امام کی پروا نہ کرتے اور اپنا سارا وقت گمراہیوں اور فارسائیوں میں صرف کر دیتے۔

مدینۃ الرسول میں امام صادق کی اقامت

امام جعفر صادق مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اقامت گزیں تھے، وہاں سے باہر قدم نکالنے کا انھیں کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ اس معاملہ میں بھی وہ اپنے والد اور جد کے نقش قدم پر چلتے رہے جنھوں نے جوار رسول کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا، وہیں معتکف ہو کر وہ بیٹھ رہے تھے۔ وہ ان لوگوں کے لیے محراب علم بن گئے تھے جو کسب فیض اور حصول علم کے لیے ان کے آستانے پر حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اس منہاج کو صرف ان کے عم محترم امام زید رضی اللہ عنہ نے ترک کیا اور وہ بھی خوشی سے نہیں حالات سے مجبور ہو کر انھیں اس طرح ستایا۔ اور پریشان کیا گیا کہ خروج کے سوا ان کے لیے کوئی اور چارۂ کار ہی نہیں رہ گیا تھا لیکن اہل عراق جنھوں نے بڑے شد و مد سے انھیں بلایا تھا، رسم وفا نہ نباہ سکے۔ انھوں نے بڑے کٹھن وقت پر ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور نصرت و اعانت سے گریز کیا۔ اور شاید یہی وہ تجربہ اور مشاہدہ تھا جس نے امام جعفر صادق کو مدینہ سے باہر نہ نکلنے دیا اور وہ مدینہ علم و نور و ہدایت میں اقامت گزیں رہے۔ اور سیاست کے اس بحر متلاطم و شورانگیز سے دور رہے جس کا عراق میں کوئی ساحل نہیں تھا۔

لیکن اس کے باوجود عراق وہ کئی مرتبہ تشریف لے گئے، اور یہ تشریف لے جانا عباسیوں کے طلب و اصرار پر مبنی تھا۔ امام صادق کا عراق جانا، کبھی تکریم و تقریب کے لیے ہوتا تھا، کبھی تظنن اور اہتمام کے سلسلہ میں۔

تربت علی کی امام صادق نے نشان دہی کی

سب سے پہلے امام صادق عہد سفاح میں عراق تشریف لے گئے۔ جب کہ امویوں کا دور حکومت ختم ہو چکا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عراق میں تشریف آوری کے موقع پر انھوں نے امام علی کرم اللہ وجہ کی تربت نجف میں پہچانی، ورنہ بنو امیہ نے اسے بے نشان کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا تھا۔ بنو امیہ نے اپنے دور حکومت میں بڑی شدت سے اس بات کا اہتمام ملحوظ رکھا کہ ان تمام نشانات کو مٹا دیں جو امام علی کرم اللہ وجہٗ کی تربت پر دلالت کرتے ہوں۔ بنو امیہ کے حکام و عمال اور انصار و اشیاع کی سرگرم سعی و کوشش یہ تھی کہ تربت علی ہمیشہ چشم مردم سے نہاں رہے، حتیٰ کہ ان فساق بنو امیہ نے ان کے جسم طاہر تک کو قبر میں چین سے نہیں رہنے دیا۔ جس طرح منابر پر انھوں نے ان کے خلاف سب و ستم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے ان کی کنیت "ابو تراب" تک کا مذاق اڑایا،

حالانکہ یہ تسمیہ کنیت کی صورت میں حضرت علیؓ کو سب سے زیادہ پسند تھا، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں یہ کنیت عطا فرمائی تھی۔ حجاج بن یوسف ثقفی اور اس کے امثال نے اس کنیت کو ہدف بنا لیا تھا۔ اپنی مجالس خاصہ وعامہ میں وہ اس طرح کی باتیں کرتا رہتا تھا، بلکہ اپنے فسق قول کی تائید علماء سے بھی کرانا چاہتا تھا۔ اس کی دیدہ دلیری اور شوخ چشمی اور گستاخی کی یہ انتہا تھی کہ اس کے فسق قول کی زد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب ترین صحابی کو بھی امن نہ ملا۔

روایت ہے کہ امام جعفر صادق نے جب اپنے اتباع کو مرقد علیؓ کی خبر دی، تو بعض لوگوں نے ان سے سوال کیا:

"ابرار اہل بیت کو کس چیز نے روکا تھا کہ وہ مشہد علی کی نشاندہی نہ کریں؟"

امام صادق نے جواب دیا۔

"بنو مروان اور خوارج کے اندیشہ سے کہ وہ بے حرمتی کرتے۔"[1]

طوسی نے امام علی علیہ السلام کی قبر کی زیارت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

"امام جعفر صادق نے امام علی علیہ السلام کی تربت کی متعدد مرتبہ زیارت کی۔"

عبداللہ بن طلحۃ الہندی[2] کا بیان ہے۔

"میں ابو عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم ان کے ساتھ چلے یہاں تک کہ ایک جگہ پہنچے، وہاں انھوں نے نماز پڑھی، وہیں ان پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ علی کرم اللہ وجہہ کی تربت مبارک ہے۔"

شجر نبوت کا ثمر شیریں

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صادق نے عراق سے پہلے ہی سفر کے موقع پر امیر المومنین علی علیہ السلام کی قبر کی جگہ معلوم کر لی تھی۔ اخبار وارده سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آل بیت کو حضرت علیؓ کی قبر کا نشان، اور مقام معلوم تھا۔ اور امام جعفر صادق تک یہ نشان قران کے آبائے کرام سے بطور توارث پہنچا تھا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس خطۂ ارض پر وہ علویوں سے ملے۔ اس سرزمین پر ائمہ ثلاثہ کا شہر

---

[1] "الصادق" للسید محمد حسین المظفر، ج ۱، ص ۱۳۷۔

[2] امام جعفر صادق کے شاگرد، یہ کوفہ کے رہنے والے عرب تھے۔ ان سے علمائے شیعہ نے امام صادق کے اخبار واحادیث روایت کیے ہیں۔

تھا، جو غدر و خیانت اور ساتھیوں کی بے وفائی سے یہاں شہید ہوئے تھے یعنی امام علی ان کے طاہر و مطہر فرزند حسین اور پوتے زید۔

اور آپ کی علویوں سے ملاقات فائدہ جلیلہ پر منتج ہوئی یعنی غلو پسندوں کی اصلاح اور صحیح اصول پر آل بیت کی محبت خالصہ، جو ہر طرح کے غلو اور انحراف سے پاک ہو، کا نشوونما۔

اور ان سب باتوں پر بالا یمان ان لوگوں کو ایک ہستی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا جس کا وہ اجلال و احترام کرتے تھے، عظمت کرتے تھے، جس سے عقیدت رکھتے تھے۔ اور جس کی تلقین کو گوش ہوش سے سننے پر مجبور تھے۔ بعض تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملاقات کے سلسلہ میں ان لوگوں کی مقدار تاثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض اشخاص کی زبان پر تو یہ منفرد حکم جاری ہو لیا

"جب ہم امام صادق کی طرف دیکھتے تھے، تو معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ شجر نبوت کا ثمر شیریں ہیں۔"

ایک اور قول ہے:

"امام کا دیدار، خدا کو یاد دلا دیتا ہے، ان کی باتیں سن کر دنیا سے نفرت ہو جاتی ہے۔ ان کے نشان قدم کی پیروی بلاشبہ جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔"

عراق میں آپ کے زمانہ قیام میں متعدد مجالس مناظرہ منعقد ہوئیں جن میں فرق مختلفہ کے لوگ حصہ لیا کرتے تھے۔ آپ بھی ان میں تشریف لے گئے۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد ان میں صرف اس لیے شریک ہوئی کہ قلوب آپ کی طرف متوجہ تھے، اور مسلمانوں کے دل آپ کی طرف مائل تھے۔

امام صادق کا بابرکت سفر عراق

امام جعفر صادق کا یہ سفر عراق بہت زیادہ متبرک ثابت ہوا، کیوں کہ یہاں لوگوں کو آپ کا شرف دیدار اور شرف لقا حاصل ہوا، لوگ آپ پر دیوانہ وار ٹوٹ رہے تھے۔ اور ذوق و شوق سے آپ کا کلام سن رہے تھے۔ بیت حسینی کی سرداری خود بخود آپ کے دامن سے وابستہ ہو گئی۔ علم علوی کے طالبوں نے کشاں کشاں آپ تک پہنچنا شروع کر دیا۔

لیکن بعد میں آپ کی عراق میں تشریف آوری جب کہ ابو جعفر منصور تخت خلافت پر متمکن تھا، سرکاری بدگمانی کے ہجوم میں ہوئی۔ تب آپ پر طرح طرح کے اتہامات اور الزامات لگائے گئے، اور لوگوں کو آپ سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ ابو جعفر منصور ڈرتا تھا کہ آپ کی مرجعیت کہیں اس کے زوال اقتدار کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ آپ کی حلاوت حدیث، قوت مہابت، یہ ایسی چیزیں تھیں جو آپ کی شان و تجمل کے عناصر میں شامل تھیں۔ اور اسی باعث منصور نہیں چاہتا تھا کہ لوگ آپ سے

میل جلیں اور امام صادق اپنی اس کی پوری کوشش فرماتے تھے کہ منصور کے اضطراب و دہشت میں اپنی طرف سے اضافہ نہ ہونے دیں۔ چنانچہ آپ نے مدینہ میں محراب علم کا رخ کیا۔ اور عراق کی مدت اقامت کو زیادہ طول نہیں دیا۔

امام جعفر اور تنقیہ عقائد مسلمین

عراق میں امام صادق کی کئی مرتبہ کی تشریف آوری نے عراق کے بارے میں جچی تلی رائے قائم کرنے میں آپ کو بہت مدد دی اور تنقیہ عقائد مسلمین میں آپ کو بہت سہولت ہوئی، جب کہ وہاں طرح طرح کے افکار وخیالات عقائد ائمہ میں خلل انداز ہو رہے تھے۔ مثلاً اقوال جہمیہ جو اختیار انسانی کی نفی کرتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ آپ اس زیغ اور کجی فکر کو دور کریں جو آل بیت کے معاملہ میں نظر آ رہی تھی اور ان کی اصلاح کریں۔ جنھوں نے محبت آل بیت کو گمراہی کا وسیلہ بنا لیا تھا۔ یہ بھی لابدی تھا کہ اسلام کی روح تسامح اور رواداری کی آپ نشر و اشاعت کریں۔ اپنوں میں بھی اور دوسروں میں بھی۔ آپ کا ایک کام یہ بھی تھا کہ طائفیت اور گروہ بندی کو روکیں اور خصومت فی الدین کا راستہ بند کردیں تاکہ مسلمان امت واحدہ بن جائیں۔ فکر و رائے میں بے شک باہم اختلاف کریں لیکن فرقہ اور گروہ کی حیثیت سے پراگندگی اور انتشار ملت کا سبب نہ بنیں۔

معتزلہ سے امام ہمام کے مناظرات

عراق میں آپ اصحاب مذاہب عقیلہ مثلاً معتزلہ سے بھی ملے، اس سلسلہ میں بعض مناظرات بھی ہوئے جن میں آپ نے حصہ لیا۔

اس موضوع پر ہم اس وقت گفتگو کریں گے جب عقیدۂ اسلامیہ کے سلسلہ میں آپ کے افکار و آراء پر بحث کریں گے۔

کیونکہ مروی ہے منصور کو جب امام جعفر صادق کی خبر وفات ملی، تو وہ اپنے آنسو ضبط کر سکا، رونے لگا، روتے روتے اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ چنانچہ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔

"اسماعیل بن علی کا بیان ہے کہ میں ابوجعفر منصور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا،

"کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ تمہارے اہل پر کیا گزر گئی؟

میں نے عرض کیا۔

یا امیرالمومنین وہ کیا بات ہے؟

ابوجعفر منصور نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا۔

"ان کا سردار سب سے بڑا عالم اور فقیہہ اخبار اس دنیا سے گزر گیا۔

میں نے دریافت کیا۔

"کون اے امیرالمومنین؟"

ابوجعفر منصور نے کہا:

"جعفر بن محمد اے جعفر (صادق) ان لوگوں میں تھا جن کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔

(پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں میں پہنچائی جنھیں تمام دنیا کے بندوں میں برگزیدہ کیا)

بلاشبہ وہ ان لوگوں میں تھے جنھیں خدا نے برگزیدہ کیا تھا اور وہ نیکی میں سبقت کرنے والے لوگوں میں سے تھے[1]

منصور امام صادق سے مرعوب و متاثر تھا

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نفی سم کی شہادت تاریخ سے ملتی ہے لیکن زہر خوانی کی کوئی تائید کتب تاریخ سے نہیں ہوتی، اور جو بات ثابت ہو، اسے بہر حال اس بات پر ترجیح ہے جو ثابت نہ ہو۔

بلاشبہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ منصور اس بات کا حریص تھا کہ ہر قیمت پر اپنی حکومت وسطوت قائم رکھے اور جو اس کے آڑے آئے اسے ہر قیمت پر تہس نہس کر کے رکھ دے لیکن امام جعفر صادق تو اس کے راستے

---

[1] تاریخ ابن واضح ج ۳، ص ۱۱۰ طبع نجف۔

وفات

کیا امام ہمام کی وفات زہر خورانی سے ہوئی؟

اسلام کا مجاہد اعظم

امام جعفر صادق زندگی بھر، زندگی کی آخری سانس تک راہ اسلام میں جہاد کرتے رہے، لیکن انھوں نے تلوار میان سے باہر نہیں نکالی۔ سچ پوچھئے تو ان کا یہ جہاد جہاد اکبر تھا۔ خواہش اقتدار و اختیار سے ضبط نفس، ارشاد و تعلیم میں شب و روز انہماک، دوستوں اور مخالفوں کی طرف سے پہنچائی ہوئی اذیتوں، تکلیفوں اور صدموں پر صبر کامل، ان لوگوں کے افعال پر تحمل، جنھوں نے انحراف اور تبدیل حقائق اسلامیہ کا راستہ اختیار کرلیا تھا۔ گمراہی اور ضلالت کے بھنور سے لوگوں کو نکالنے کی استقلال اور عزیمت کے ساتھ سعی و کوشش کیا یہ سب چیزیں جہاد اکبر کے ذیل میں نہیں آتیں؟

دس امام جلیل کا میدان جہاد اکبر کیا تھا؟

صبر آزما جہاد مستقل

وہ جہاد جو حد درجہ صبر آزما تھا اور جس میں زندگی بھر یہ امام جلیل و صادق معروف و منہمک رہا تھا۔ وہ تھا تصحیح عقائد، بیان شرع اور بیان حقائق امور کا جہاد، وہ جہاد تھا، بدگمانیوں، تلخیوں اور شکوک و شبہات کے ہجوم میں، صبر و ضبط کا جہاد —

اور اس جہاد میں اس امام جلیل کا حامی و ناصر کون تھا؟

کوئی نہیں —— بجز خدائے بزرگ و برتر کے۔

اور زندگی کے شب و روز اس جہاد میں بسر کرنے والا، بدگمانیوں کے وار، اور شکوک و شبہات کے تیر سینے پر لینے والا، یہ امام جلیل۔ یہ مرد مجاہد، بالآخر شوال ۱۴۸ھ میں شاداں و خنداں، صابر و شاکر اپنے رب سے جا ملا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابو جعفر منصور نے اپنے بعض حاشیہ نشینوں اور اعوان کی مدد سے انھیں کھانے میں زہر دلوادیا لیکن اس قول کی تائید میں کوئی ثبوت اور دلیل ہمارے سامنے نہیں ہے بلکہ مورخین کا جو بیان ہمارے سامنے ہے اس سے تو کسی طرح بھی اس کی تائید و توثیق نہیں ہوتی۔

میں کبھی بھی سنگ گراں بن کر حائل نہیں ہوئے۔ وہ تو صرف اپنے گوشۂ علم میں بیٹھے، نشر و تبلیغ علم میں مصروف رہے۔ اور جب منصورؔ کے دل میں ان کے خلاف بدگمانیاں پیدا کی گئیں اور وہ دارالخلافہ طلب کیے گئے اور وہاں ان کے اور خلیفہ کے مابین مجلس گفت و شنید برپا ہوگئی تو اس کا اختتام اعتماد اور اطمینان پر ہوا۔ یعنی منصور کی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں رفع ہوگئیں۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ امام جعفر صادق کی وفات اس وقت ہوئی جب منصور کی حکومت پورے طور پر مستحکم ہو چکی تھی۔ اور وہ بے غل و غش داد فرماں روائی دے رہا تھا، اور علویوں کے خروج و بغاوت کی طرف سے پورے طور پر مطمئن ہو چکا تھا اور جب کہ صورت حال یہ تھی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ حسد اور کینہ سے بے بس ہو کر خواہ مخواہ اس طرح کی حرکت کر گزرتا، جو اس کی طرف بعض لوگوں نے منسوب کی ہے۔

منصور بڑا معاملہ فہم اور دوراندیش آدمی تھا۔ وہ چشم بیدار کا حامل تھا، اور اس حقیقت کا اچھی طرح شناسا تھا کہ امام صادق اس کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل نہیں ہیں۔ انھیں سیاست سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ خاموشی اور سکون کے ساتھ، عملی سیاست سے دور رہ کر تمام تر علم کی طرف متوجہ ہوں، اور ان کے چشمۂ فیض سے تشنگان علم دور دور سے آکر شاد کام اور سیراب ہوتے ہیں۔

ان واقعات و حقائق کی روشنی میں ہماری یہ پختہ رائے ہے کہ ان کی وفات زہر سے نہیں ہوئی بلکہ طبعی طور پر ہوئی۔

دوست اور دشمن سب "الصادقؒ" کہتے تھے

امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام صادق بڑھاپے کے عیب اور بدحواسی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے۔ ان کی بیدار مغزی نے عالم نزع تک ان کا ساتھ دیا اور اس شخص سے بڑھ کر صادق کون ہو سکتا ہے، جسے دوست اور دشمن، حامی اور مخالف "الصادقؒ" کے مکرم و محترم نام سے یاد کرتے ہوں۔ اور بلاشبہ وہ ذات گرامی امام صادق ابو عبداللہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی تھی۔

چنانچہ ہمارا عقیدہ ہے کہ امام صادق کے آخر وقت تک ہوش و حواس بجا رہے۔ زندگی کی آخری سانس تک ان کا علم حاضر رہا۔ اپنے پورے زمانہ حیات میں وہ ہادی، مرشد اور داعی الی الحق رہے یہاں تک کہ اپنے رب سے جا ملے۔

روایت ہے کہ امام صادق نے جو وصیت فرمائی۔ وہ تھی نماز اور اس پر مداومت و استقامت کی اور وصیت میں اس بات پر زور دینے کی وجہ یہ تھی کہ نماز درحقیقت عماد دین ہے۔ یہ ایسی تسبیح و تقدیس ہے جس کی مداومت کا اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو فحشاء اور منکر

سے روکتی ہے۔ یہ خدائے بزرگ و برتر کا ذکر ہے، جیسا کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے :-

ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر۔

یعنی بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے امام صادق ؑ نے اپنے اقربا کو وصایائے دینیہ سے بھی سرفراز فرمایا، تاکہ ان معاملات میں یہ لوگ غلطی نہ کر سکیں اور دین اسلام کے پاسبان و نگہبان بن جائیں جس طرح وہ خود اور ان کے آبائے کرام اس فریضہ کو انجام دیتے رہے تھے، دینی امور کے سرانجام دینے اور فرائض کے ادا کرنے میں وہ عام لوگوں کے ساتھ مشترک ہیں ان چیزوں سے کوئی بھی مستثنٰی نہیں ہے۔ لیکن ان اقربا پر یہ ذمہ داری اور زیادہ شدید ہے، کیوں کہ نبی اکرم کی عترت اور اولاد میں سے ہیں اور یہ صلۂ مبارکہ ان پر ایسے واجبات عائد کرتا ہے جو عام لوگوں سے زیادہ ہیں اور ان سے معمولی سی تقصیر بھی زیادہ شدید مواخذہ کا سبب بن سکتی ہے۔

امام صاحب کا شمار صدیقین و ابرار میں تھا

غرض امام صادق کی ساری زندگی، طلب حق اور تبلیغ و نشر حق میں گزری، ان کے قلب مبارک پر کبھی ریب و شک کا اثر نہیں ہوا۔ انکے فعل و عمل میں سیاست کبھی دخیل نہ ہو سکی۔ نہ اس کی فتنہ سامانیاں اثر انداز ہو سکیں۔ لہٰذا جب انھوں نے اس دنیا سے کنارہ کیا تو سارا عالم اسلام تڑپ اُٹھا۔ کوئی ایسا نہ تھا جس نے اس نقصان عظیم کو محسوس نہ کیا۔ ان کا ذکر گرامی ہر زبان پر تھا۔ ائمہ کے بارے میں لوگوں کے ہمیشہ دو گروہ رہے ہیں۔ ایک عقیدت مندوں کا غالی گروہ، دوسری مخالفوں کی غالی جماعت، لیکن امام صادق کی ذات وہ تھی کہ ہر حلقۂ فکر کے علماء اس غم میں سوگوار تھے اور امت کا کثیر حصہ ان کی عقیدت میں سرشار تھا، اور ان کی محبت کا دم بھر رہا تھا لیکن اس کے برعکس صورت نہیں تھی یعنی کوئی ایسا نہ تھا جو اس حادثۂ المیہ پر خوش ہوا ہو۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے ان کی عداوت میں غلو کیا ہو۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں ان کا کوئی دشمن تھا ہی نہیں اس لیے کہ وہ نور ساطع تھے۔ لوگ ان کے نور سے مستنیر ہوتے تھے۔ بلاشبہ ان کا شمار صدیقین و ابرار میں تھا۔

علم وفضل

امام جعفر صادق کے پایۂ علم وعرفان پر ایک نظر

علمائے اسلام کی متفقہ تائید اختلاف فکر ونظر اور اختلاف حزب وطائفہ کے باوجود علمائے اسلام کسی امر پر اس درجہ متحد ومتفق نہیں ہوئے جتنے امام صادق کے علم وفضل پر۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں ان کے ہم عصر ائمہ سنت نے ان سے کسب علم اور کسب فیض کیا۔ ان سے روایت کی۔ امام مالک نے ان سے روایت کی طبقۂ مالک نے ان سے روایت کی، جیسے سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری وغیرہ دوسرے کثیر ائمہ سنت۔

امام ابوحنیفہ قریب قریب امام جعفر صادق کے ہم عمر تھے۔ لیکن یہ چیز بھی ان کو بارگاہ امام میں ایک طالب حق کی حیثیت سے حاضر ہونے میں مانع نہ ہو سکی۔ امام ابوحنیفہ انھیں سب سے بڑا عالم مانتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اختلاف ناس کے سب سے بڑے عالم تھے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں طبقۂ تابعین کا ایک بڑا گروہ در امام پر اخذ علم کی نیت سے حاضر ہوتا ہے۔ ان سے حدیث حاصل کرتا ہے۔ اس گروہ تابعین میں یحییٰ بن سعید الانصاری، ایوب سختیانی، ابان بن تغلب، اور ابوعمرو بن العلاء جیسے اہل حضرات نظر آتے ہیں۔

علاوہ ازیں، فقہ وحدیث کے ائمۂ تابعین ان سے یکساں طور پر حصول علم وکسب فیض کرتے نظر آتے ہیں۔

تابعین کے علاوہ تبع تابعین کے گروہ پر جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ان کی اور زیادہ کثیر تعداد اس آستانۂ عالیہ پر کسب علم وفیض کرتی نظر آتی ہے۔

تابعین اور تبع تابعین کے علاوہ اور کل ائمہ مجتہدین اس بارگاہ میں پہنچے اور اپنا دامن علم وفضل کے جواہر سے بھر کر واپس گئے[1]

---

[1] حلیۃ الاولیاء۔ ج ۳ ص ۱۸۹۔ ۱۹۹

امام جعفر صادق اور علم کلام

امام جعفر صادق کا علم فراواں صرف حدیث و فقہ تک محدود نہ تھا علم کلام میں بھی انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ معتزلہ انھیں اپنا امام تسلیم کرتے تھے۔ بہت سے تھے جنھوں نے فہم عقائد میں صرف عقل کو کافی سمجھا ایسے لوگوں سے امام صادق کے متعدد مناظرات ہوئے جو گراں بہا فوائد کے حامل تھے۔ ان میں سے بعض کا ہلم علم کلام اور امام صادق کے سلسلہ میں آگے چل کر ذکر کریں گے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ امام ہمام رضی اللہ عنہ اس فن میں کیسی یگانہ دستگاہ رکھتے تھے۔

گزشتہ صفحات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ امام صاحب کو علم کونیات سے بھی غیر معمولی شغف تھا۔ چنانچہ ان کے ایک شاگرد جابر بن حیان نے اس سلسلہ میں ان کے بعض رسائل میں نقل کیے ہیں جن کا ابن خلکان نے اپنی وفیات الاعیان میں ذکر کیا ہے۔

غرض اگر تفحص اور تحقیق سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امام صادقؒ کسی ایک علم تک محدود نہیں تھے۔ بلکہ وہ ان جملہ علوم و فنون پر ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے جو ان کے عہد میں شائع و ذائع تھے۔

امام صادق اور اخلاقیات

ان تمام علوم سے بالا اور ماورا امام صادق نے علم اخلاق کو خاص طور پر اپنا لیا تھا۔ انھیں یہ علم اشراف روح، کثرت تجارب التزام جادہ حق کا نتیجہ تھا۔ وہ اخلاق کی اصلاح و فساد کی روح پر نظر رکھتے تھے۔ دراسات اسلامیہ وجدان دینی۔ تقویٰ اور پارسائی۔ رذائل سے اجتناب۔ فضائل سے استمساک۔ یہ تھے وہ عناصر اس نفس شریف و مومن کے جنھوں نے دنیا پر رذائل کا دروازہ بند کر دیا اور استمساک بالحق کی راہ کھول دی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا نطق گرامی حق کا آئینہ دار ہوا کرتا تھا۔

امام صادق کی وصیت اپنے فرزند کو

ذیل میں ہم وہ وصیت درج کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے صاحبزادے موسیٰ کو کی تھی اور جو خلاصہ ہے تجارب نفس مومنہ تقیہ کا۔ حلیۃ الاولیاء میں اس نصیحت کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:۔

"جعفر بن محمد صادق کے اصحاب میں سے ایک کا بیان ہے کہ میں امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے صاحبزادے موسیٰ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور امام ہمام انھیں وصیت فرما رہے تھے اس وصیت میں سے مجھے جو کچھ یاد رہ گیا وہ یہ ہے:۔

آپ نے فرمایا:

"اے بیٹے میری وصیت گرہ میں باندھ لے، میری بات یاد رکھ اگر تو نے پند پیرانہ یاد رکھا تو

تیری زندگی عافیت اور اطمینان سے گزرے گی۔ جب موت آئے گی تو وقار اور سکینت کے ساتھ۔
اے میرے بیٹے
جس نے اس پر قناعت کی جو خدا نے اسے دے رکھا ہے۔ اس سے بڑھ کر تونگر کوئی نہیں اور جس نے دوسرے کی چیز پر للچائی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ فقیر مرے گا، جو اس پر قانع نہیں ہے جو خدا نے اسے دے رکھا ہے تو گویا وہ قضائے الٰہی پر الزام لگاتا ہے۔ جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو کم سمجھتا ہے، اسے دوسروں کی غلطیاں اور لغزشیں بڑی نظر آتی ہیں۔
اے میرے بیٹے
جو دوسروں کی پردہ دری کرتا ہے اس کے اسرار اندرون خانہ بھی آشکار ہو کر رہتے ہیں۔ جو دوسروں پر تلوار اٹھاتا ہے خود اسی سے قتل کیا جاتا ہے۔ جو دوسرے کے لیے گڑھا کھودتا ہے، خود اس میں گرتا ہے۔ جو احمقوں کی صحبت اختیار کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے جو علماء سے میل جول رکھتا ہے وہ اعزاز و اکرام حاصل کرتا ہے جو بری جگہوں پر جاتا ہے متہم ہوتا ہے۔
اے میرے بیٹے!
سچ بول، خواہ تیرے موافق پڑے یا مخالف، خواہ تجھے اس سے نفع پہنچے یا ضرر،
اے میرے بیٹے!
کتاب اللہ کا ہو رہ، اس کا بن جا، نیکی کا حکم دے۔ برائی سے روک، جو تجھ سے روٹھے تو منالے، جو تجھ سے بات چیت بند کر دے تو اس سے بول چال جاری رکھ، جو تجھ سے سوال کرے تو اسے دے۔
خبردار،
چغل خوری اور لگائی بجھائی سے بچنا کہ اس سے قلوب رجال میں کھوٹ پیدا ہوتی ہے۔
خبردار،
لوگوں کے عیوب سے تعرض مت کر، جو لوگوں کے عیوب سے تعرض کرتا ہے، وہ خود ان کا ہدف بن جاتا ہے۔
اے میرے بیٹے!
اگر تو طالب جود ہے، تو یاد رکھ جود کے معادن ہوتے ہیں اور معادن کے اصول، اور اصول کے فروع۔ اور فروع کے ثمر اور ثمر اچھا نہیں ہو سکتا جب تک جڑ اچھی نہ ہو اور جڑ ثابت نہیں رہ سکتی

جب تک معاون طبیب نہ ہوں۔

اے بیٹے۔

اگر لوگوں سے ملنے جلنے کا شوق ہے تو اخیار سے مل اور فجار سے کنارہ کش رہ، کیونکہ وہ چٹان ہیں۔ اور چٹان سے پانی کا چشمہ نہیں پھوٹتا، نہ درخت اُگتا ہے، نہ پتیاں سبز ہوتی ہیں۔ وہ ایسی زمین ہے جس پر روئیدگی کا نام و نشان ہی نظر نہیں آتا۔

یہ حکیمانہ ارشادات، درحقیقت دراساتِ عمیقہ کا ثمر نورس ہیں اور کوئی شبہ نہیں ان ارشادات کو جوامع کلم کے ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

بارگاہ امام ہمام کے حاضر باش

امام جعفر صادق کی خدمت میں علماء کے گروہ حاضر ہوا کرتے تھے کہ آپ کے حکمت آمیز ارشادات سنیں۔ اور یہ حکمت کی باتیں ان سے حاصل کر لیں۔

وہ لوگ جو بارگاہ امام میں آپ کے مواعظ و ارشادات سننے کے لیے مسلسل حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان میں کوفہ کے محدث جلیل اور فقیہہ اعظم سفیان ثوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"میں صادق بن صادق جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے عرض کیا،

اے ابن رسول اللہ مجھے کچھ وصیت کیجئے۔

آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اے سفیان جھوٹے کو مروت نہیں ملتی، ملول کو بھائی نہیں ملتا، حاسد کو راحت نہیں ملتی، بدخلق کو سرداری نہیں ملتی۔

میں نے عرض کیا:

اے ابن رسول اللہ کچھ اور ۔۔!

آپ نے ارشاد فرمایا۔

"اے سفیان، خدا پر بھروسا رکھ، مومن بن جائے گا۔ اللہ جو کچھ دے اس پر راضی رہ غنی بن جائے گا، جو تیرا پڑوسی ہو اس سے حسن سلوک کر مسلمان بن جائے گا۔ فاجر کی صحبت کبھی اختیار نہ کر وہ اپنا فجور تجھ تک منتقل کر دے گا، اپنے معاملات میں ان لوگوں سے مشورہ کر جو خدائے عزوجل سے ڈرتے ہوں!"

میں نے عرض کیا:

اے ابن رسول اللہ کچھ اور ارشاد فرمائیے:

آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اے سفیان، جو یہ چاہتا ہے کہ عزت حاصل کرے، خواہ پشت پناہ نہ ہوں، غنی بن جائے خواہ مال و دولت نہ ہو، تو اسے چاہیئے کہ معصیت الٰہی کی پستی سے، طاعت الٰہی کی بلندی تک پہنچنے کی سعی و کوشش کرے[1]

امام صادق کے جوامع الکلم سے خوشہ چینی

یہ ہیں حضرت امام جعفر صادق کے جوامع الکلم کے چند نمونے جو اس امام جلیل کے نطق گوہر بار کا شاہکار ہیں۔ طالبان فضیلت نے ان ارشادات کو شمع ہدایت سمجھا، اور ان کی روشنی میں راہ ہدایت پر گامزن ہوئے، جب کہ امور ان کے اوپر ملتبس ہو گئے تھے۔ اور تاریکی نے ان پر تسلط کر لیا تھا، یہی وہ چیزیں ہیں جنھیں صوفیوں نے اپنا منہاج بنایا ہے اور اس منہاج پر چل کر طلب حقیقت میں مصروف و منہمک ہو گئے۔ اور وہ لوگ جو اسلام کا راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے انھوں نے اپنے ایمان میں اضافہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ بالاتفاق تمام علماء امام صادق کے فضل و علم اور کمال کی ثنا و صنعت میں رطب اللسان رہے، اور یہی چیز تھی جس نے اپنے عہد میں انھیں امام دوراں بنا دیا تھا، بالکل اسی طرح جیسے ان کے پدر بزرگوار نے یہ منصب بلند حاصل کیا تھا۔ اور ان کے جد عالی تبار اس منزل تک پہنچے تھے اور ان کے عم محترم امام زید رضی اللہ عنہ نے یہ مرتبہ حاصل کیا تھا۔

یہ سب ائمہ ہدیٰ تھے، جن کی لوگ اقتدا کرتے تھے۔ جن کے اقوال کی رہنمائی میں راہ حیات کی گام فرسائی کرتے تھے۔ اور ان سے علم الاسلام اسی طرح حاصل کرتے تھے جس طرح ایک عابد عبادت کے جذبہ سے سرشار ہوتا ہے۔ ان ائمہ ہدیٰ نے اپنے پیچھے علم بھی چھوڑا اور رجال بلند مرتبت بھی۔ ان کا علم لوگوں تک منتقل ہوتا رہا۔ لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ انہی سے فقہا نے جانا کہ کس طرح اپنے علم کو محکم کریں، امام ہمام رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

"فقہا رسول ؐ کے امین ہیں، جب تم فقہا کو دیکھو کہ وہ سلاطین کی بارگاہ کا طواف کرنے لگے ہیں تو انھیں متہم سمجھ لو!"

الہام و کسب، علم امام صادق میں

نفس انسانی کا مطالعہ کرنے والا اور اخیار علماء پر نظر رکھنے والا، ایسے نظر رکھنے والا، جنھوں نے علوم و فنون کے گراں بہا

---

[1] "الصادق" ج ٢،

خدمات انجام دیئے ہیں اور جنھیں قدرت کی طرف سے اس باب خاص میں بہرۂ وافر ملا ہے، وہ اس حقیقت کا شناسا ہے کہ الہام اور صفاالنفس سے وہ لوگ ضرور بہرہ ور ہوتے ہیں جو علم کی تگ و دو میں رہتے ہیں، حتیٰ کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عالم پوری سعی و کوشش، غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کے باوجود، ایک ایسے نتیجۂ صادقہ پر نہیں پہنچتا جس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اور جہاں تک وہ پہنچنا چاہتا ہے یہاں تک کہ وہ مایوس اور دل گرفتہ ہو جاتا ہے اور پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ یہ عالم محقق محسوس کرتا ہے کہ اس کی سعی و کوشش سے ماورا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے الہام ہوتا ہے اور یہ الہام اسے صحیح رائے اور نتیجہ پر پہنچا دیتا ہے کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، کوئی عالم بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے نتائج کاوش کو صرف اپنی سعی و کوشش کا نتیجہ قرار دے سکے جس میں خدائی کارفرمائی کا دخل نہ ہو۔ بجز اس صورت کہ اللہ تعالےٰ نے اس کی عقل سلب کرلی ہو۔

چنانچہ فقیہہ عمیق النظر عبداللہ بن مسعود اپنے ان آراء کے بارے میں جن کی بنا پر وہ فتویٰ اور اجتہاد سے کام لیتے تھے، فرماتے ہیں۔

"اگر میں نتیجۂ صواب پہ پہنچتا ہوں، تو یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور اگر غلط نتیجہ پر پہنچتا ہوں تو یہ غلطی میری اور شیطان کی طرف سے ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اشراق نفس سبیل حکمت اور طریق معرفت صادقہ ہے لیکن اس کے لیے ریاضت روحی ضروری ہے، دراسات عمیقہ ناگزیر ہیں، ان دراسات کے بعد ہی کشف عقلی ممکن ہوتا ہے، اور نتائج موفقہ حاصل ہوتے ہیں، اور الہام صادق ہوتا ہے — !

لیکن الہام مجرد جو عدم مطالعہ، عدم دراست، عدم علم اور عدم تعمق اور فحص و بحث کا نتیجہ ہو، وہ از قبیل خوارق ہے، ان امور میں نہیں شمار ہو سکتا جو مختص ہیں، فحص و بحث اور دراست و تعمق سے۔

بلاشبہ ہماری نظر سے ایسی باتیں گزرتی ہیں جو خوارق کے ذیل میں آتی ہیں اور یہ سب خدائے بزرگ و برتر اور کارساز کی کارفرمائیاں ہیں، کیوں کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وھو فعال لما یرید۔

اور یہ خوارق جس طرح کونیات میں جاری ہوتے ہیں اسی طرح اشخاص میں بھی ان کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور یہ دونوں صورتیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہیں جو عالم الغیب والشہادۃ ہے۔

امام جعفر صادق کا علم الہامی تھا یا کسبی؟

یہ باتیں بطور مقدمہ کے ہم نے بیان کی ہیں اور علم امام صادق کی معرفت کے لیے یہ بہت ضروری ہیں۔

سوال یہ ہے کہ امام صادق کا علم آیا کسبی تھا جو ان کے آبائے کرام کی دراست کا نتیجہ تھا، اور جو علماء

تابعین مدینۂ منورہ میں مقیم تھے ان سے حاصل ہوا تھا اور اس کے بعد، امام ہمام کے صفاءِ نفس اور اشراقِ روح کے باعث اور کلی طور پر انصرافِ علم کے سبب اللہ تعالےٰ نے ان پر ابوابِ معرفت وا کر دیا، جیسے کہ دوسرے نفوسِ اصفیاء پر ابوابِ معرفت وا ہوتا رہا تھا، جنھوں نے طلبِ حقیقت میں خلوص کے ساتھ سعی و کوشش کی؟ یا امام صادق کا علم تمام تر اللہ تعالےٰ کی طرف سے الہام تھا، جو وحی کے مشابہ یا اس کے قریب قریب تھا، اور نتیجہ تھا وصیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جس میں دراست اور تحصیل کا کوئی دخل نہیں تھا اور اسی طرح ائمہ آل بیت سے سلف سے خلف تک اس سے بہرہ ور ہوتے رہے تھے؟

امامیہ یہی کہتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ علم امام جعفر صادق تمام تر الہامی تھا، کسی درجہ میں بھی کسبی نہیں تھا، وہ خالص اشراقی تھا، ہرگز کسبی نہیں تھا، اپنے اس قول کو وہ دو مقدمات پر مبنی قرار دیتے ہیں۔

ایک معصوم مفسرِ شریعت کی ضرورت

(۱) اللہ تعالےٰ نے شریعت، ایسی شریعت اتاری جو ہر زبان و مکان کے لیے یکساں طور پر مفید اور نافع ہے۔ مسائل و حوادث سے متعلق لوگوں کے لیے اس میں ہر طرح کے اقضیہ اور فتادیٰ موجود ہیں۔

لیکن یہ مسائل و حوادث لا متناہی ہیں، لہٰذا ضروری اور لابدی ہے کہ ہر دور اور عصر میں ایک ایسا شخص موجود ہو جو شرع شریف کی ترجمانی کر سکے۔ اور اس کی ترجمانی ہر اعتبار سے کافی اور شافی ہو۔ اس میں غلطی اور خطاء و تورع کا ذرا بھی احتمال نہ ہو۔ اور اللہ سبحانہٗ و تعالےٰ اپنے بندوں پر حد سے زیادہ رحیم ہے، لہٰذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ انھیں یوں ہی چھوڑ دیتا اور ان کے لیے ایسے ہادی کا انتظام نہ کرتا جو انھیں راہِ راست دکھاتا رہتا؟ کوئی ایسا مرشد ان کے لیے نہ پیدا کرتا جو زندگی کے ہر مرحلہ پر ان کی رہنمائی کرتا رہتا؟ اور ظاہر ہے یہ ہادی اور مرشد امام ہی ہو سکتا ہے، جسے اللہ تعالےٰ ہر دور اور عصر میں نصب کرتا ہے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ماثور ہے کہ آپ نے فرمایا:

"کوئی دور ایسا نہیں گزرتا کہ صفحۂ ارض پر اللہ تعالےٰ کی طرف ایک قائم بہ حجت موجود نہ ہو، خواہ پوشیدہ اور مستور خواہ ظاہر اور مشہور۔"

امام کا خطا اور غلطی سے معصوم ہونا ضروری ہے

(۲) ضروری ہے کہ شرع شریف کی یہ ترجمانی کرنے والا خطا اور معصیت سے معصوم ہو۔ کیوں کہ اگر اس میں خطا اور لغزش کا احتمال ہوا تو اس کی ہدایت مستقیم نہیں ہو سکتی۔ نہ اس کی حجت واضح ہو سکتی ہے کیوں کہ اگر اس میں یہ خامی ہوتی تو ضروری ہے کہ اس کا نظیر، بلکہ اس سے بھی کوئی بڑا اور بہتر و برتر شخص موجود ہو، جو زیادہ مبنی بر صواب طریقہ سے شرع شریف کی ترجمانی کر سکے۔ اور جو حق ہو اسے واضح کر سکے، کیونکہ اگر

اس سے خطا بھی سرزد ہو اور صواب بھی، جیسا کہ دوسرے علماء سے ہوتا ہے، اور وہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم بر حجت نہ ہو تو وہ ایسا منارۂ نور نہیں بن سکتا، جس کی روشنی سے لوگ راہ یاب ہوں۔

مذکورہ مقدمات کے نتائج

ان دونوں مقدمات سے۔ اگر انھیں صحیح اور درست تسلیم کر لیا جائے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امام کا معصوم عن الخطا ہونا لا فانی اور لابدی ہے۔ اس کی ہر بات صواب ہے۔ اس میں ریب و شک کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ اس کا کلام الہامی ہو، اور وصیت سلف پر مبنی ہو۔

اور امام جعفر صادقؒ اپنے عہد کے امام جلیل تھے۔ وہ آل علی رضی اللہ عنہ کے چھٹے امام تھے۔ انھیں بیان بالا کے مطابق الہامی علم عطا کیا گیا تھا، دوسرے لوگوں کی طرح ان کے پاس جو کچھ علم تھا وہ کسبی نہیں تھا، جیسا کہ ابو حنیفہ، مالک، اوزاعی، ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ اور بتی وغیرہم جیسے فقہا قضاۃ اور مفتیوں کا تھا، جو امام ہمام کے ہم عصر تھے۔

امام صادق کا اشراق روحی

یہ حضرات امامیہ کا قول ہے، اور ہم اس کے اس لیے قائل ہیں کہ امام جعفر صادق، اشراق روحی سے مالا مال تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں جو توفیق عطا ہوتی تھی، وہ ان کے قول و عمل سے نمایاں تھی، لیکن ہمارا یہ خیال ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا علم کسبی تھا اور اس میں اشراق کارفرما تھا، جیسا کہ ان تمام علماء اصفیا و اتقیا میں دیکھا جا سکتا ہے جنھوں نے ریاضت روحیہ عالیہ کے لیے اپنے تئیں وقف کر دیا تھا اور اس ریاضت سے بڑھ کر اعظم و اکرم اور اجل کون ریاضت ہو سکتی ہے جس کا نمونہ امام جعفر صادق نے اپنی حیات گرامی میں برت کر اچھی طرح سے دکھا دیا۔

ہم اپنی تفتیش سے جس نتیجہ پر پہنچے ہیں یہ ہے کہ امام جعفر صادق کے احوال و سوانح کا اگر نظر غائر سے مطالعہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ وہ امام مجتہد تھے، جنھوں نے اپنے پیشروؤں سے اور بعد کے لوگوں نے ان سے حاصل کیا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ان کا علم خالص الہامی تھا اس میں سعی و اجتہاد کو ذرا بھی دخل نہ تھا، اور وہ اس طرح القاء کا نتیجہ تھا جس طرح وحی القاء کا نتیجہ ہوتی ہے، تو ہم امام جعفر صادق کی تاریخ حیات میں چند باتیں خاص طور پر محسوس کرتے ہیں۔

(۱) نصوص سے استنباط احکام

مذکورہ دونوں مقدمات جن پر قضیۂ الہام مبنی ہے۔ ہم ان سے وہ نتیجہ نہیں نکالتے جو نکالا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ مقدمات جس چیز پر دال ہیں وہ یہ ہے کہ لوگ ایک مفسر شریعت کے محتاج ہیں، جو احکام شریعت کو مستنبط کرے، اس لیے کہ نصوص لا متناہی

ہیں اور حوادث محدود اور محدود، پس عالم کے لیے ضروری ہے کہ وہ نصوص سے استنباط احکام کرے جن سے پیش آمدہ حالات و حوادث کا حل نکل سکے، لیکن یہ بات اس کی مقتضی نہیں ہے کہ مفسر شریعت ملہم بالغیب ہو، بلکہ اس کی مقتضی ہے کہ مفسر شریعت کتاب و سنت کا رمز آشنا ہو۔ اگرچہ فروعات میں فقہاء باہم مختلف الرائے ہو سکتے ہیں، لیکن اگر یہ صرف فروعات تک محدود ہے تو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا کیوں کہ ہر رائے اصولی طور پر بہر حال کتاب و سنت ہی سے قوت حاصل کرتی ہے اور اختلاف احکام وقائع اور علاج مشاکل ایک ایسا امر ہے جو امراض اجتماعیہ کے علاج میں ضروری ہے۔ پس مسائل میں حلول فقیہہ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے دوا، جو آفات و امراض اجتماعی کے دور کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے اور اصل عام بہر حال ثابت ہے۔ اور وہ اختلاف فروعات اور اختلاف اجزا و عناصر کے باوجود، مصدر و منبع ہے دوا، اور علاج کا اور یہ مصدر ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی دونوں چیزوں میں حجۃ قائمہ ثابت موجود ہے۔ یہی دونوں چیزیں جملہ امراض اجتماعی کے لیے شافی اور کافی دوا کا حکم رکھتی ہیں لہٰذا، گو حلول جزئیہ اپنے ظواہر میں متغیر اور مختلف ہوں، لیکن بہر حال ان کا مصدر و منبع واحد ہے۔

اس تصریح کی روشنی میں یہ مناسب نہیں کہ ہم کسی معصوم کی ضرورت، صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔ اس لیے کہ امراض واسقام اُمت کی دوا اگر واحد ہے تو پھر اس کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، کیوں کہ جو دوا بھی تجویز کی جائے گی، اور جو علاج بھی تجویز ہو گا ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم یا سنت نبی کریم کی نص سے ثابت ہو۔ یا اس پر اجماع امت ہو چکا ہو اور یہ اجماع بھی کتاب و سنت پر مبنی ہو۔

(۲) فروعات میں اختلاف پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہمارے برادران امامیہ گو معصوم مفسر شریعت کے قائل ہیں لیکن فروعات میں ان کے ہاں بھی اختلافات موجود ہیں۔ ایک ہی مسئلہ میں بہت سی رائیں ہمیں نظر آتی ہیں، لہٰذا عصمت امام بھی کسی فرقہ یا گروہ کو اختلاف سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ عصمت امام

(۳) امام محکوم کا اجتہاد ضروری ہے یا نہیں؟ کا مطلب یہ ہے کہ امام اجتہاد سے کام نہ لے کیوں کہ جب اسے علم الٰہی حاصل ہے تو اسے اجتہاد فقہی کی ضرورت کیوں لاحق ہو گی؟ کیوں کہ ہر الہام ایک ایسا علم ہے جو سعی و کوشش اور طلب و جستجو کے بغیر حاصل ہوتا ہے، اور یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت شدہ حدیث کے خلاف ہے۔ کیوں کہ آپؐ نے ان لوگوں کو جو آپؐ سے دور ہوں۔ اور وقت کے وقت ہدایت نہ حاصل کر سکتے ہوں اجتہاد کی اجازت مرحمت فرمائی تھی، اور امر واقعہ یہ ہے کہ

خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اجتہاد فرماتے تھے، اور آپؐ کا وہ اجتہاد بھی معرض خطا میں آ سکتا تھا۔ چنانچہ اسیران جنگ کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے آپؐ کی ایک طرح کی لغزش کے بارے میں فرمایا ہے۔

ما کان للنبی ان یکون لہٗ اسریٰ حتی یثخن فی الارض، تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ واللہ عزیز حکیم۔ لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم فکلوا مما غنمتم حلالا طیبا واتقوا اللہ۔ ان اللہ غفور الرحیم۔

یعنی، نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیئے جائیں) جب تک زمین میں اچھی طرح کفار کی خونریزی نہ کر لیں تم تو دنیا کا مال اسباب چاہتے ہو۔ اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے، اگر خدا کا نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی سو جو کچھ تم نے لیا ہے اسے حلال پاک سمجھ کر کھاؤ اور اللہ تعالےٰ سے ڈرتے رہو، بیشک وہ بڑا بخشنے والا، رحمت والا ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ آپؐ اجتہاد کرتے اور اس میں خطا کرتے، آپؐ کا یہ اقدام صرف اس لیے تھا کہ باب اجتہاد کھول دیں اور بتادیں کہ مجتہد سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ اور صواب بھی سرزد ہو سکتا ہے اور مجتہد کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ وہ اپنے بارے میں یہ باور کرے کہ اگر اس نے اجتہاد کیا تو اس سے غلطی کا صدور ہو ہی نہیں سکتا۔

(۴) آں حضرتؐ کا اجتہاد یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطا سرزد ہوئی۔ اور خدائے بزرگ و برتر نے صواب کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ لہٰذا یہ بات کسی کے لیے بھی روا نہیں ہے کہ اسے معصوم عن الخطا قرار دیا جائے۔ کیونکہ کوئی بھی اس مرتبۂ عالی تک نہیں پہنچ سکتا جس پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فائز تھے اور تمام لوگ علم جس چیز سے حاصل کرتے ہیں وہ ہے کتاب اللہ۔ جو بذریعہ وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اور سنت شریفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

(۵) صحابہ کرام کا اختلاف فقہی صحابہ کرام اپنے آرا سے اجتہاد کرتے تھے اور اس اجتہاد میں وہ باہم اختلاف بھی کرتے تھے جیسے بعض مسائل میراث و فرائض میں نظر آتا ہے، یا جس طرح جس باندی کے بطن سے اولاد پیدا ہو اس کی فروخت کے بارے میں اختلاف ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام ہدیٰ علی رضی اللہ عنہ نے ام ولد جس باندی کے بطن سے آقا کی اولاد

پیدا ہوئی ہو) کے بارے میں فرمایا:

"میری اور عمر کی رائے یہ تھی کہ ام ولد فروخت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ اسے فروخت کیا جا سکتا ہے۔"

پس اگر علی بن ابی طالب آل بیت کے امام ائمہ اور حبد کریم معصوم مطلق ہوتے تو نہ ان کی رائے میں تغیر ہوتا، نہ ان کی فکر میں اختلاف۔

(۶) اختلاف فقہا پر جناب امام کی نظر

امام صادق رضی اللہ عنہ اختلاف فقہا کے سب سے بڑے عالم تھے اور اگر ان کا علم الہامی ہوتا تو انھیں فقہا مختلفین کے آراء سے واقفیت پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ وہ اپنے آراء و فقہیہ میں ایک فریق کی تائید کرتے ہیں تو دوسرے کی مخالفت، ایسا بھی ہوتا ہے وہ اپنی منفرد رائے رکھتے ہیں، اور جملہ فرق سے اختلاف رکھتے ہیں، جیسا کہ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے چالیس مسئلے ان سے پوچھے اور ہر مسئلہ کے جواب میں وہ فرماتے جاتے تھے۔

"اس مسئلہ میں تم لوگ یہ رائے رکھتے ہو، اہل حجاز کی یہ رائے ہے اور ہماری رائے یہ ہے۔"

اگر ان کی یہ رائے ہوتی کہ علم جا حد ہے اور وہ مبنی بر الہام ہے تو وہ دوسرے فقہا کے افکار و آراء کی طرف ذرا بھی التفات نہ فرماتے، چنانچہ ایک مرتبہ ان سے ان کے علم کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ارشاد فرمایا:

"میں نے اپنے ابا سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے علم حاصل کیا۔"

آخر میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ ہم اپنے برادران امامیہ سے مسئلہ معصومیت میں اختلاف رکھتے ہیں لیکن جہاں تک امام صادق کی عظمت، بزرگی اور اجلال و اکرام کا تعلق ہے ہم ان سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ مجتہد تھے۔ اور ایک مجتہد کی حیثیت سے ان سے خطا و صواب کا صدور ممکن تھا۔ اور وہ مرتبۂ امامت پر اس وقت فائز ہوئے تھے جب انھوں نے علم، مطالعہ اور تحقیق، تدقیق کے مرحلے طے کر لیے تھے تو اس سے ہمارا یہ مطلب اور مدعا نہیں ہوتا کہ ہم انھیں اس مرتبہ سے جس پر برادران امامیہ انھیں فائز سمجھتے ہیں کم تصور کرتے ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک اجتہاد بھی الہام سے کم نہیں ہے اس لیے جو شخص اجتہاد کرتا ہے اسے ثواب ملتا ہے، اور الہام عطیۂ الٰہی ہے، جس میں ثواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ بارگاہ احدیت سے اس عطیہ پر شکر و سپاس واجب ہے۔

سلسلۂ بحث سے متعلق دو اہم امور

قبل اس کے کہ ہم یہ بحث ختم کریں ہم دو امور پر گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں :۔

(۱) جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ نفوس ذکیہ اور اصحاب اخلاص کے اشتراک روحی کی ہم نفی نہیں کرتے ہیں۔ اور ائمہ اصحاب مذاہب اس اشتراک روحی سے خالی نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ ریاضت راجیہ انھیں اسی طرح ملی ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ ان میں باہم تفاوت مراتب موجود ہے اور ہم امام صادق کو اس باب میں سب پر بالا اور فائق تصوّر کرتے ہیں۔

(۲) اس رائے کے اظہار سے ہمارا مقصد معاندت فکری یا مخالفت برائے مخالفت کا اظہار نہیں ہے، بلکہ ہم بتا چکے ہیں کہ ہم امام صادق کی شخصیت اور علم و کمال کا مطالعہ اپنی تفکیر و نظر سے کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم صرف ان حضرات کی ترجمانی نہیں کر سکتے، جو مذہب جعفری کے حامل ہیں بلکہ ہمیں اپنی ترجمانی بھی کرنی ہے، اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ امام صادق کے بارے میں ہمارا اور دوسرے اصحاب مذاہب کا فکری اختلاف قائم رہے، لیکن ایک بات بہر حال مسلم ہے وہ یہ کہ خواہ ہم ہوں یا وہ، دونوں کا مقصد شان امام کا بیان ہے۔ ان کی علو قدر و منزلت کا اعتراف ہے، وہ ان کی نظر میں بھی مرتبۂ عالی پر فائز ہیں اور ہماری نگاہ میں بھی ان کا مرتبہ سب سے اونچا ہے، پس غایت واحد ہے۔ اور یہ کافی ہے کہ جس طرح وہ ان کی نظر میں مراتب عالیہ پر فائز ہیں، اسی طرح ہماری نگاہ بھی انھیں سب سے بالا مرتبے پر فائز دیکھتی ہے۔

دراست و مطالعہ ائمہ مذاہب

اور یہ رائے جس پر ہم پہنچے ہیں، اس منہاج کا نتیجہ ہے جس پر ہم رہبری کر رہے ہیں اور یہ وہی منہاج ہے جس پر ہم دراست و مطالعہ ائمہ اصحاب مذاہب کے سلسلے میں گام فرسا رہے ہیں اور فقہاء اعصار کے سلسلے میں جو ہمارا شعار رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ شخصیت کے صفات میں سب سے پہلے اس کے مصادر علم کا بیان ضروری سمجھتے ہیں. پھر اس عہد کا جس میں وہ پیدا ہوا، اور زندگی گزری، بعد ازاں ان شیوخ اور اساتذہ کا جن سے اس نے علم حاصل کیا۔ اور ان دراسات کا جن کی اس نے دراست کی، اور اگر ہم صرف الہام مجرد کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کریں، تو صرف الہام کا اثبات کر کے ہمیں سکوت اختیار کر لینا چاہیئے کیوں کہ پھر اس کے بعد کیا چیز رہ جائے گی جس پر بحث و گفتگو کی جائے؟

صفاتِ عالیہ

شخصیت ——— سیرت ——— کردار

صفات اور علمی شخصیت

تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ امام جعفر صادق کی شخصیت کس درجہ پرشکوہ تھی۔ ان کا نسب، اسلام کی دو انتہائی جلیل القدر اور برگزیدہ ہستیوں سے تعلق رکھتا ہے، ان کا نسب والد کی طرف سے اللہ کی شمشیر خارا شگاف اور اسلام کے شجاع ترین بزرگ، علی بن ابی طالب تک پہنچتا ہے اور ماں کی طرف سے ان کا نسب صدیق امت اور وزیر نبیؐ ابوبکرؓ تک اور کوئی شبہ نہیں عمل صالح کے بعد سب سے بڑا شرف خانوادۂ نبوت سے انتساب ہے۔

ضروری ہے کہ اب ہم امام صادق کے صفات اور علمی شخصیت پر ایک نظر ڈال لیں کہ دوسرے امور کے علاوہ فقہ اسلامی پر آپ کی شخصیت کا اثر بہت گہرا پڑا ہے اور اس سے آپ کے صفات عالیہ پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے۔

امام ہمام کی شکل و شمائل

سب سے پہلے اس سلسلہ میں ہم آپ کا حلیہ اور شکل و شمائل پیش کریں گے جس سے آپ کا ایک مرقع نظر کے سامنے آ جائے گا۔

"کتب مناقب میں وارد ہوا ہے:

"آپ میانہ قد تھے، نہ طویل القامت، نہ پستہ قد، چہرہ گورا، اور روشن، جو اس طرح دمکتا تھا جیسے اندھیری رات میں شمع کا نور، بال سیاہ، ستواں ناک، بال لٹک کر پیشانی تک آ جاتے تھے، جس سے رعنائی کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ رخسار مبارک پر ایک خال سیاہ بھی موجود تھا!"

یہ کیفیت تو تھی عالم شباب کی، جب کہ ابھی آپ نے پیری کی منزل میں قدم نہیں رکھا تھا اور اس کے بعد تو آپ کے وقار و جلال اور سطوت و ہیبت میں اور زیادہ اضافہ ہوا ہوگا۔

یہ تھا آپ کا وصف جسمی، لیکن آپ کا وصف نفسی و عقلی؟ وہ تو بلندی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا جس تک نظر کا جانا اور دیکھنا تک محال تھا۔ اور آپ کے صفات عالیہ کا کچھ حصہ آپ کے اقران و معاصر تک پہنچا تھا، جس نے انھیں بھی بالا اور برتر بنا دیا تھا یہی وہ مرتبہ بلند تھا جس سے حکام اور اصحاب اقتدار و اختیار زیر نگیں

کرتے تھے۔ لیکن یہ رتبہ بلند آسمانی اور الٰہی عطیہ تھا۔ اور اہل زمین میں یہ سکت کب ہے، کہ وہ اہل آسمان سے ٹکر لے سکیں، یا ان کی برابری کر سکیں۔

حقائق ومعارف کی طلب وجستجو

امام صادق کی سب سے بڑی صفت اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ حصول مقصد وغایت کے لیے ہمہ تن متوجہ تھے۔ طلب حقیقت کے جوش میں انھوں نے ہر چیز پس پشت ڈال دی تھی، دنیا سے اور دنیا کی باتوں سے انھوں نے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی دنیاوی امر کی طلب وجستجو کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ نہ انھوں نے کوئی ایسی بات چاہی جو دنیاوی خواہشات کی آئینہ دار ہو۔ ان کا دامن ہر طرح سے پاک وصاف تھا، اس پر شبہ کی گرد وغبار کا نام ونشان تک نہ تھا وہ صرف حقائق کی جستجو میں مصروف ومنہمک رہے۔ انھوں نے حق کی طلب ذات حق کے لیے کی۔ اس کے علاوہ نہ ان کی کوئی تمنا تھی نہ آرزو، ان پر امور کبھی ملتبس نہیں ہوئے۔ اگر کوئی مشتبہ بات سامنے آئی بھی، تو ان کے اخلاص بے ریا نے اس کی حقیقت جان لی۔ اور ان کی بصیرت نے حق کا جلوہ دیکھ لیا اور شبہات کے بادل چھٹ گئے۔ اور اگر کبھی ان کے سامنے کوئی ایسا امر آیا، جو خواہشات وطمع دنیاوی سے تعلق رکھتا ہو تو یہ تاریکی انکی عقل کے سامنے ایک لمحہ بھی نہ ٹھہر سکی۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث مرسل کے مصداق تھے۔

"ورود شبہات کے موقع پر اللہ تعالےٰ اس شخص کو پسند فرماتا ہے جو صاحب نظر ہو اور عقل کامل کے حامل کو وہ پسند کرتا ہے جب خواہشات کا ہجوم ہو"

اور امام صادق کے سوا وہ کون ہے جس کی عقل روشن نے شبہات کے بادل کافور کر دیئے ہوں، اور جس کی بصیرت ہادیہ مرشدہ نے تاریکی کو نور سے بدل دیا ہو؟

اور وہ اخلاص جو امام صادق میں پایا جاتا تھا ایک معدن تھا۔ اس لیے کہ وہ شجر نبوت کا ثمر شیریں تھے اور اس بیت طاہر کا اخلاص ہر طرح کے شک وشبہ سے بالا ہے اور اگر عترت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اخفاد امام ہادی علی پر اخلاص کامل اور اخلاص بے ریا غالب نہ ہوگا تو پھر اس صفحۂ گیتی پر کون ہے جو اخلاص کامل کا دعویٰ کر سکے؟ اخلاص کی یہ نعمت اس خانوادے کو متوارث طور پر سلف سے خلف کو پہنچی تھی۔ جڑ سے شاخ تک آئی تھی، یہ اہل بیت نبوی کسی چیز سے بھی چاہت نہیں رکھتے تھے۔ سوا خدائے بزرگ وبرتر کے۔ اس کو وہ اصل ایمان سمجھتے تھے، اسی کو وہ ظواہر ویقین میں شمار کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

"تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس چیز کو مرغوب ومحبوب نہ رکھے جسے اللہ تعالےٰ پسند فرماتا ہے"۔

"کھاؤ، پیو، پہنو، لیکن فضول خرچی اور تکبر سے بچو۔"

لیکن جذبہ طلب حلال کے باوجود، ان کی خوش ذوقی اپنی جگہ قائم تھی۔ وہ اچھے اور ستھرے کپڑے پہنتے تھے، وہ اسے پسند فرماتے تھے کہ لوگوں کے سامنے اچھے اور ستھرے لباس میں نمودار ہوں۔

وہ اپنے تقشف اور زہد و عبادت کو پوشیدہ رکھتے تھے تاکہ نفس میں کسی طرح کا جذبہ ریا نہ پیدا ہوسکے۔

وہ ان متقشفین میں نہیں تھے جو لوگوں کے سامنے اس طرح نمودار ہوتے ہیں کہ لباس دریں دربراور امیرانہ طمطراق کے ساتھ اپنے زہد و تقشف کو ریاکاری کا زینہ بنا لیتے ہیں، اور لوگوں کو مبتلائے فریب کرتے ہیں اور کوئی شبہ نہیں ان سے ان باتوں کا بہت سخت محاسبہ ہوگا۔

ایک مرتبہ سفیان ثوری حضرت امام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے آپ کے جسم اطہر پر اچھا سا لباس دیکھا، جو بہت دلکش اور دربا نظر آرہا تھا۔ سفیان ثوری کہتے ہیں۔

"میں حیرت اور تعجب سے آپ کی طرف دیکھنے لگا!

حضرت امام نے مجھے اس طرح دیکھتے دیکھ کر فرمایا!

کیا بات ہے کیوں میری طرف اس طرح تکے جا رہے ہو؟ شاید تمہیں میرے اس لباس پر تعجب ہے"؟

میں نے اس ارشاد کے جواب میں عرض کیا۔

اے ابن رسول اللہ یہ لباس نہ آپ کا ہے۔ نہ آپ کے آبائے کرام کا تھا۔

یہ سنکر حضرت امام نے اپنے نطق گوہر بار کو جنبش دی اور فرمایا:۔

وہ زمانہ اور تھا، یہ اور ہے، وہ زمانہ تھا غربت اور افلاس کا، وہ اپنی غربت اور تنگی کے مطابق بسر کرتے تھے۔ اور اس زمانے میں کون سی چیز ہے جو میسّر نہ ہو۔

پھر آپ نے جبہ کا دامن کھولا، تو میں دیکھتا کیا ہوں اس کے نیچے سفید اون کا کھردرا جبہ زیب جسم تھا، جس کے دامن اور آستین بالکل بالائی جبہ سے ملی ہوئی تھی۔ یہ دکھا کر آپ نے فرمایا:

"یہ (اونی جبہ) ہم نے خدا کے لیے پہنا ہے اور یہ (اچھا) تمہارے لیے، نہ تم پر ہم اسے ظاہر کر سکتے ہیں، نہ خدا سے اسے چھپا سکتے ہیں۔[1]"

(۳) امام ہمام کی سب سے بڑی خصوصیّت امام ہمام کی ایک اور صفت اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ خدا کے سوا نہ کسی سے خائف تھے، نہ ترساں

---

[1] حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۱۹۳

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قلب امام صادق میں، اخلاص کی جو نعمت ودیعت فرمائی تھی۔ وہ متعدد عناصر پر مشتمل تھی، جو یہ تھے۔

(۱) امام مالک کا بیان حضرت امام صادق کے بارے میں

علم کی لگن، اور ریاضت نفس کی طرف انہماک، عبادت سے لگاؤ اور مآرب دنیا سے پورا پورا اعراض،

امام مالک، امام صادق کے صفات عالیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"میں جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ہمیشہ متبسم نظر آتے تھے۔ لیکن جب ان کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہوتا، تو وفور تاثر سے ان کا چہرہ زرد پڑ جاتا تھا۔ میں ایک عرصۂ دراز تک ان کی خدمت گرامی میں حاضر ہوتا رہا۔ میں نے ہمیشہ انھیں حالتوں میں سے ایک حالت میں پایا، یا تو وہ نماز میں مصروف نظر آتے تھے۔ یا روزے کی حالت میں ہوتے تھے یا قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہوتے تھے۔

میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی کوئی حدیث بیان کی ہو اور با وضو نہ ہوں۔

"ان کے منہ سے وہی بات نکلتی تھی، جو ان کی مراد ہوتی تھی۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عابد اور زاہد تھے، جو صرف خدا سے ڈرتے ہیں۔

میں جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو جس گدیلے پر تشریف فرما ہوتے تھے اسے اٹھا کر میرے لیے بچھا دیتے تھے!"

امام مالک ہمیشہ بڑے ذوق وشوق سے امام صادق کے فضائل وملکات بیان کیا کرتے تھے۔ اپنے مشائخ اور اساتذہ میں سے کسی کی بھی اتنی مسلسل، تعریف اور فضائل کا ذکر وہ کبھی نہیں کرتے تھے۔[۱]

(۲) زہد و ورع اور تقدس

امام جعفر صادق کی دوسری نمایاں صفت اور خصوصیت ان کا ورع تھا۔ لیکن یہ ورع ایسا نہیں تھا کہ وہ اس چیز کو حرام کر لیتے ہوں جسے خدا نے حلال کر دیا ہے۔ انھوں نے حلال چیز کبھی ترک نہیں کی۔ وہ طلب حلال میں بشرطیکہ وہ اسراف وتکبر کے ذیل میں نہ آتا ہو کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ صحیح معنیٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد پر عامل تھے۔

---

[۱] المدارک، (قلمی نسخہ دار الکتب المصریہ) ورق - ۲۱ -

اللہ کے راستے میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ نہ لومۃ لائم کی اس باب میں کوئی پروا کرتے تھے۔ امیر سے اس کی امارت کے باعث خائف نہیں تھے۔ عوام سے انکی کثرت کی بنا پر ترساں نہیں تھے، تعریف سے وہ فخر و غرور میں مبتلا نہیں ہوتے تھے۔ اور ہجو سے ان کے عزم ثبات پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا جو اسلام میں تعریف کے کوشاں تھے۔ ان سے برأت کے اظہار میں وہ ایک تامل نہیں فرماتے تھے۔ جو تعلیمات اسلامی میں رد و بدل کرنا چاہتے تھے۔ ان سے وہ کسی قسم کا رابطہ و تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ خلیفہ منصور تک کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اور ان کا یہی اخلاص اور یہی تقویٰ تھا جس نے برحق طور پر اور سچے طور پر انھیں سید اور سردار بنا دیا تھا۔

نفاذ بصیرت اور قوت ادراک

جب اخلاص کسی نفس میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اسے نور حکمت سے منور کر دیتا ہے۔ اس کی فکر، قول اور عمل میں استقامت پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ اخلاص سے بصیرت جلا پاتی ہے۔ اور بغیر کسی رکاوٹ کے ادراک حق حاصل ہو جاتا ہے، چنانچہ امام ہمام میں بھی یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ذکاوت اور ذہانت سے بھی آپ کو بہرۂ وافر ملا تھا، وہ حد درجہ وسیع النظر تھے۔ ان کا علم بے پایاں تھا، اہل بیت اطہار کی ذکاوت انھیں وراثت میں ملی تھی، جس طرح ان کی فہم و دانش کو انھوں نے ورثہ میں پایا تھا۔ تجربہ نے ان کے نفس پر صیقل کر دی تھی۔ ان کی معرفت کو نکھار دیا تھا۔ وہ حقیقت کی جستجو ہر مصدر اور منبع سے کرتے تھے۔ ان کے قلب منور نے ان میں ایسی بصیرت پیدا کر دی تھی کہ وہ شریعت کے معانی، مفہوم اور غایات پر پورا پورا احاطہ رکھتے تھے ان کی عقل متفکر نے سارے موانع ان کے راستے سے دور کر دیئے تھے۔ ان کے مطالعہ اور دراست واسعہ نے انھیں اس بات کا رمز آشنا بنا دیا تھا۔

ایک مرتبہ آپ سے سوال کیا گیا۔

"اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام کیوں کر دیا ہے؟"

آپ نے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"تاکہ لوگ تمانع میں آسودہ نہ ہو جائیں۔"

اور بلاشبہ یہ ارشاد سراسر حق ہے۔

کیونکہ لوگ اگر سود پر قرض لینے لگیں اور دینے لگیں، تو تعاون باہمی کی روح مفقود ہو جائے گی، اور اگر تعاون کی روح مفقود ہو گئی تو لازمی طور پر تمانع پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر تمانع پیدا ہو گیا تو یہ نتیجہ ہو گا، سود کا، خواہ قرض استہلاک کے لیے ہو یا استغلال کے لیے، کیوں کہ سود لینے والا، نقصان اور خسارہ میں شریک نہیں

ہوتا. اسے تو اپنی دی ہوئی رقم پر زیادہ رقم چاہیے خواہ قرض لینے والے کو فائدہ ہوا ہو یا نقصان، لیکن اگر قرض دینے والا نقصان اور خسارہ میں بھی شریک ہو، پھر اگر (نفع کی صورت میں) وہ اپنی دی ہوئی رقم سے زیادہ لیتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیوں کہ اب تمانع نہیں رہا تھا، تعاون کی صورت پیدا ہوگئی پس تعاون اور تعامل بالربا دو ایسے نقیض ہیں، جو کبھی مجتمع نہیں ہو سکتے. اسی طرح ربا اور تمانع دو ایسے امر لازم ہیں جو ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے.

برجستگی اور بدیہہ گوئی

حضرت امام حد درجہ برجستہ گو بھی تھے. کوئی معنوی دشواری کبھی آپڑتی تو فی البدیہہ آپ کافی و شافی جواب مرحمت فرماتے نہ بحر فکر میں غوطہ لگانے کی ضرورت ہوتی، نہ زبان میں لکنت پیدا ہوتی۔ انھوں نے بہت سے فقہی مناظروں میں حصہ لیا، جس سے ان کی حاضر جوابی اور برجستہ گوئی پر روشنی پڑتی ہے۔ یاد کیجئے، جب امام ابوحنیفہ نے ان سے چالیس پیچیدہ فقہی سوال کیے تو وہ تابڑ توڑ جواب دیتے چلے گئے۔ نہ کسی طرح کا تردد، نہ تذبذب ساتھ ہی ساتھ فقہا کے اختلافات فکر و نظر پر بھی روشنی ڈالتے گئے۔ یہ بھی بتاتے جاتے تھے کہ کس مسئلہ میں وہ فقہا سے ہم آہنگ ہیں اور کسی مسئلہ میں وہ تمام فقہا سے اختلاف رکھتے ہیں۔

حضرت امام کو زنادقہ سے بھی مناظرے پیش آئے۔ ایسے مواقع پر بھی ان کی حاضر جوابی اور برجستہ گوئی نے حریف کو ساکت و صامت کر دیا۔ اس جگہ ہم ایک مناظرہ کی کیفیت درج کرتے ہیں جو عدل بین الازواج سے متعلق ایک زندیق سے ہوا تھا جن کی اس زمانے میں کافی تعداد موجود تھی ۔ !

ایک زندیق نے حضرت امام سے عرض کیا:

" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنیٰ وثلٰث وربٰع فان خفتم الا تعدلو فوا حدۃ ۔

یعنی " نکاح کرلو ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، دو دو اور تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر بس کرو"

اور آخری صورت میں اللہ تعالےٰ کہتا ہے:

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النسآء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل

یعنی، اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیویوں میں برابری رکھو، گو تمہارا کتنا ہی جی چاہے لیکن تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ۔

یہ کیا بات ہے؟

امام صادق نے زندیق کے اس سوال کے جواب میں فرمایا:۔

اللہ تعالےٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی پر قناعت کرو، تو یہاں عدل سے مراد نفقہ کا عدل ہے، اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم بیویوں کے ما بین عدل نہیں کر سکتے، خواہ کتنی ہی کوشش کرو، یہاں عدل سے مراد محبت کا عدل ہے اور یہ کسی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ سب بیویوں کو یکساں طور پر چاہ سکے۔"

واقعہ یہ ہے کہ حاضر جوابی ایک مفکر بلند مرتبت اور ائمہ متبعین کے لیے سب سے پہلی اور لازم چیز ہے۔ جو شخص چبا چبا کر بولتا ہو وہ قیادت فکری کا اہل نہیں، ایسے شخص میں قیادت فکری کا جوہر پایا ہی نہیں جا سکتا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی بھی حاضر جواب اور برجستہ گو تھے سوال کا جواب فوراً دیتے تھے۔ امام مالک کی بھی یہی کیفیت تھی۔ امام مالک کے بارے میں امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں۔

"میں نے مالک سے زیادہ تیزی سے جواب دینے والا کوئی اور نہیں دیکھا۔"

صبر و تحمل اور ضبط نفس

امام ہمام میں یہ صفات بھی بدرجۂ وافر پائے جاتے تھے، وہ صاحب صبر و تحمل تھے، ان کی قوت نفس بہت عالی اور محکم تھی، ضبط کے خوگر تھے۔ اضطراب امور سے وہ پریشان نہیں ہوتے تھے۔ اذیت رسانیوں سے وہ دل برداشتہ نہیں ہوتے تھے، وہ صبور و شکور تھے، عمل مستمر پر قادر تھے، جس میں کبھی انقطاع نہیں ہوتا تھا، ان کے مطالعہ اور دراست کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔

اور کمال کی بات یہ ہے کہ اس صبر و ضبط کے باوجود وہ اللہ تعالےٰ کے شاکر بندے تھے، ہم دیکھتے ہیں کہ صبر و شکر قوی الایمان مومن کے نفس میں ہمیشہ جاگزیں رہتے ہیں، جس نے شکر نعمت کیا وہ کٹھن گھڑی کے وقت ضرور صابر ثابت ہوگا، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شکر نعمت اور صبر لازم و ملزوم ہیں کیونکہ ابتلا کے وقت صبر کا مظاہرہ وہی کر سکتا ہے، جو قلب شاکر کا مالک ہو، اور مصیبت کے وقت نعمت کو یاد رکھے، دقیق معنی کے لحاظ سے صبر اس کے سوا کچھ نہیں ہے کیونکہ صبر حقیقی مقتضائے رضا ہے۔ اور یہی صبر جمیل ہے۔

حضرت امام جعفر صادق صابر تھے، شاکر تھے، مومن قانت تھے، خدا سے ڈرتے تھے، عابد شب زندہ دار تھے۔ شدائد اور مصائب کے وقت صبر کے خوگر تھے۔ فراق اقربا کے وقت بھی صبر کرتے تھے، بیٹے کا

انتقال ہوا تو وہ صبر کے پیکر نظر آرہے تھے ان کے سامنے ان کے چھوٹے بچے کا انتقال ہوا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اور اس موقع پر شکر نعمت کرتے ہوئے وہ فرمارہے تھے:

"اگر مجھے ابتلا میں ڈالا گیا، تو یہ عافیت ہے، جو مجھے ملی۔"

پھر وہ لاش لے کر گھر کے اندر گئے، عورتیں آہ و بکا کرنے لگیں، لاش کو دیکھ کر آپ نے انھیں قسم دیتے ہوئے تاکید کی کہ آہ و بکا بند کردیں پھر وہ دفن کرنے لے گئے، اور فرمایا:

"خدا کتنی تعریف کا سزاوار ہے کہ وہ ہماری اولاد کو اٹھا لیتا ہے، تب بھی ہمارا دل اس کی محبت کا گنجینہ بنا رہتا ہے۔"

پھر جب آپ مٹی دے چکے، تو فرمایا۔

"ہم وہ لوگ ہیں جو اللہ سے سوال کرتے ہیں اور پاتے ہیں، اور اگر ہم پر کوئی غم اور صدمہ نازل ہوتا ہے تب بھی اس کے شکر گزار رہتے ہیں [1]"

آپ نے دیکھا کہ حضرت اس وقت شکر نعمت کرتے ہیں، جب نعمت عطا ہوتی ہے، اور جب کوئی صدمہ یا غم نازل ہوتا ہے۔ تو بھی ان کی زبان شکوہ سنج نہیں ہوتی۔ شکر و سپاس الٰہی میں وہ رطب اللسان رہتے ہیں، شکر اس وقت کامل ہوتا ہے جب صبر بھی کامل ہو۔

لیکن فریاد و فغاں کے ساتھ جو صبر ہو، صبر نہیں، وہ ضجر (بیقراری) ہے، اور ضجر و صبر دو متضاد چیزیں ہیں، اور ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بلند تر ہستی جس میں صبر و شکر کے ہر دو صفات پوری اکملیت کے ساتھ جمع تھے، وہ امام صادق رضی اللہ عنہ کی شخصیت تھی۔

بذل و عطا، جود و سخا

بہت سے مفسرین اس آیہ کریمہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکینا ویتیما و اسیرا۔

اور وہ لوگ محض خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اگرچہ اپنے عموم کے لحاظ سے یہ تمام مومنین صادق الایمان پر صادق آتی ہے، کیونکہ اعتبار عموم لفظ کا کیا جاتا ہے نہ کہ سبب مخصوص کا، لیکن یہ بات بھی ثابت ہے کہ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ سخی تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ سارے عرب میں ان سے زیادہ سخی کوئی نہیں تھا تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔

---

[1] کتاب "الصادق" ج ۱۔ ص ۲۶۹۔

اور بالکل یہی بات ان کے بعد ان کے اخلاف و احفاد پر صادق آتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام علی زین العابدین رات کی تاریکی میں بدست خود کھانا لے کر جاتے تھے اور ضرورت مند گھروں میں تقسیم کرآتے تھے۔

امام صاحب حد درجہ سخی اور جواد تھے؛ جو بھی حاجت مند اور مستحق نظر آتا، بے تامل اس کی امداد فرماتے اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی؛ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جس دامن میں پرورش پائی تھی اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ انھوں نے اپنے بعض اتباع کو حکم دیا تھا کہ لوگوں سے جھگڑا نہ کریں، تحمل کا ثبوت دیں، خواہ اس میں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے، حضرت امام رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

"اتمام معروف کے لیے تین چیزیں شرط ہیں۔ تعجیل، تصغیر اور ستر!"

چنانچہ ان کے جود و بخشش اور بذل و عطا کا حال یہ تھا کہ انتہائی خفیہ طور پر وہ داد و دہش کیا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ بالکل اپنے جد عالی تبار امام زین العابدین کے نقش پر چلتے تھے۔ جب شام کا اندھیرا ہو جاتا، تو وہ ایک ٹوکری لیتے جس میں روٹی۔ گوشت۔ اور دراہم رکھتے۔ یہ ٹوکری کاندھے پر رکھ لیتے پھر مدینہ کے اہل حاجت کے ہاں تشریف لے جاتے اور ان میں تقسیم کر دیتے جب تک آپ کی وفات نہ ہو گئی؛ لوگوں کو پتا بھی نہ چلا یہ کون سخی داتا تھا؟ البتہ وفات کے بعد یہ راز آشکارا ہوا۔ حلیۃ الاولیا میں مرقوم ہے:۔

"امام جعفر صادق لوگوں کو اتنا کچھ دے ڈالتے تھے کہ خود ان کے عیال کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا تھا۔

حضرت امام کی یہ مالی سخاوت اس بات کی دلیل ہے کہ اجتماعی فلاح و صلاح کے سلسلہ میں وہ کتنے حاس تھے اور سخاوت و جود کو چھپانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی قوت وجدان دینی کتنی زیادہ تھی۔

امام ہمام کا حلم اور سماحت امام ہمام حد سے زیادہ متحمل، بردبار اور مرنجاں مرنج تھے انھوں نے کبھی برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیا، بلکہ حسن عمل سے جواب دینے کی کوشش کی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم ہ

یعنی "آپ نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجیے۔ پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے!"

آپ کا برتاؤ، تمام خادموں کے ساتھ حد درجہ نرم تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں روایت ہے:۔

حضرت امام نے اپنے ایک غلام کو کسی کام سے بھیجا، اس نے کام میں دیر کر دی، آپ اس کی تلاش میں نکلے تو دیکھتے کیا ہیں وہ تو سو رہا ہے۔ آپ اس کے سرہانے بیٹھ گئے اور اسے پنکھا جھلنے لگے۔

آپ کے تسامح اور رفق کا یہ عالم تھا کہ جو آپ کے ساتھ بدی سے پیش آتا تھا آپ اس کے لیے بھی دعائے مغفرت کرتے تھے، روایت ہے کہ جب کسی کے بارے میں اطلاع ملتی کہ وہ آپ پر سب و شتم کر رہا تھا تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور بڑی دیر تک مصروف رہتے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے کہ اس شخص سے کوئی مواخذہ نہ کرے، کیونکہ وہ اپنے حق انتقام سے دستبردار ہوتے ہیں، اور اسے معاف کیے دیتے ہیں۔ آپ کا خیال تھا کہ عفو میں   نہیں اور انتقام میں عظمت نہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا، معاف کر دینے سے عزت بڑھتی ہے جو اللہ کے لیے نگوں سار ہوتا ہے اللہ اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حلم اور تسامح قائدین فکر اور داعیان حق کا جوہر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن،

یعنی "اپنے رب کے راستہ کی دعوت، حکمت اور مواعظ حسنہ سے دو، ان سے اگر جھگڑو تو احسن طریقہ پر۔" اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور ہادی کو بلکہ ہر مسلمان کو حکم دیا ہے۔

خذ العفو وأمر بالمعروف واعرض عن الجاهلین۔

یعنی معاف کر دو، نیکی کی تاکید کرو، جھگڑالو، لوگوں سے اعراض کرو!

کیونکہ سخت کلامی اور درشت گوئی سے بدمزگی اور تلخی پیدا ہوتی ہے۔ انتقام سے اشتعال اور حسد پیدا ہوتا ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں جو اللہ اپنے داعی میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے۔

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولك فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم فی الامر، فاذا عزمت فتوکل علی الله ان الله یحب المتوکلین

یعنی "بعد اس کے خدا کی رحمت ہی کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو اور سخت مزاج ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے سو آپ ان کو معاف کر دیں اور ان کے لیے استغفار کیجیے۔ اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے، پھر جب آپ رائے پختہ کریں تو خدا پر اعتماد کیجیے۔ بے شک اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے۔"

امام صادق کی شجاعت وبسالت | ذریت علی کو شدائد و مصائب نے صیقل کر دیا تھا، محن اور الم

نے ان کے عزائم میں ذرا بھی کمزوری نہیں پیدا ہونے دی تھی، شجاعت ان کی میراث تھی۔ موت سے ڈرنا انھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ خصوصیت پورے آب و رنگ کے ساتھ امام جعفر صادق کی ذات گرامی میں بھی موجود تھی، جن کا قلب ایمان و اخلاص کا نشیمن تھا۔ وہ اہوا اور شہوات سے کوسوں دور تھے۔ ان کے دل و دماغ پر صرف اور صرف خدا کا خوف مستولی تھا۔ اور جس کے دل میں ایمان نے بسیرا لیا ہو۔ وہ خدا کے سوا کسی بندے سے خائف نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ بندہ کتنا ہی صاحب جاہ و حشم اور قوت و شوکت اور سطوت و ہیبت ہو، حضرت امام رضی اللہ عنہ، بعض ایسے لوگوں کے مقابلہ اور مواجہ میں بھی جری تھے، جو اپنے تئیں ان کا پیرو کہتے تھے، لیکن اس ادعائے پیروی کے باوجود، تحریف و تلبیس سے باز نہیں آتے تھے۔ وہ انھیں حق کا راستہ دکھاتے تھے، ان کی غلط کاریوں کی تصحیح کرتے تھے۔ توجیہہ سے کام لیتے تھے، اور جب کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا تھا تو انھیں ملامت کرنے اور ان سے اعلان برأت کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اور اپنے عقیدت کیشوں اور نیاز کاروں کو مطلع کر دیتے تھے کہ وہ اس برأت کا اعلان کر دیں۔

جو لوگ قوی اور طاقت ور تھے، صاحب سلطان و جبروت تھے، جن کے دبدبہ اور طنطنہ سے لوگ دہلتے رہتے تھے۔ ان کے سامنے حضرت امام کی شجاعت اپنی مثال آپ تھی۔ مقتضائے احوال کے مطابق دعوت حق دینے، خدا سے ڈرانے، تذکیر و موعظت سے کام لینے اور طغیان و سرکشی کے خلاف اظہار خیال کرنے سے انھیں کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ منصور نے ان سے پوچھا:

"اللہ تعالیٰ نے مکھی کیوں پیدا کی ہے؟"

امام صادق نے اہل جبروت و طغیان پر تعریض کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تاکہ اس طرح جابرہ (سرکش اور ظالم و جابر لوگ) ذلیل ہوں۔"

آپ نے یہ بات منصور کے رو در رو کہی، حالانکہ لگائی بجھائی کرنے والے برابر لگائی بجھائی کیا کرتے اور آپ کے خلاف منصور کے کان بھرا کرتے تھے لیکن یہ آپ کی شجاعت اور ہمت تھی کہ آپ نے ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر صاف اور حق بات، وقت کے سب سے بڑے حاکم مطلق کے سامنے کہہ دی۔

اس ملاقات میں آپ نے صرف اسی ایک کلمۂ حق پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ خلیفہ منصور کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"تجھے چاہیے کہ حلم کو اپنا شعار بنالے کہ یہ علم کا رکن رکین ہے، اور گو تجھے قوت و قدرت حاصل

ہو مگر اپنے آپ کو قابو میں رکھ کیوں کہ اگر تونے کسی پر اپنی قوت و شوکت کا سکّہ جما یا تو تیری مثال اس شخص کی طرح ہو گی جو اپنی صولت کی دھاک بٹھانا چاہتا ہے، اور یاد رکھ اگر تو نے کسی مستحق کو سزا دی، تو وہ عدل سے متجاوز نہ ہونی چاہیئے۔ اور ایسا حال جب شکر واجب ہو، ایسے حال سے افضل ہے جب صبر واجب ہو۔"

ذریت علی کا وصف امتیازی شجاعت تھا، اور زمانہ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ یہ شجاعت ظاہر ہو اور جس دعوت حق کو امام صادق نے اپنایا تھا وہ تو بغیر شجاعانہ جذبہ کے آگے بڑھ سکتی ہی نہیں تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ افکار فاسدہ پھیل رہے تھے، اور پروان چڑھ رہے تھے پس قائم بہ حجت اللہ کے لیے لازمی اور لابدی تھا کہ وہ ڈٹ کر میدان میں کھڑا ہو جاتا اور لومۃ لائم کی ذرا بھی پروا نہ کرتا۔

اور کوئی شبہ نہیں اس معیار پر حضرت امام جعفر صادق مکمل طور پر پورے اترتے ہیں۔ اس امام شجاع اور امام جلیل نے ان تہمتوں کا پردہ چاک کر دیا جو افاضل قوم پر وارد کی جا رہی تھیں۔

ہم تو ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق کا اپنے لیے دعوت نہ دینا۔ یہ اقدام بجائے خود بہت بڑا شجاعانہ اور دلیرانہ اقدام تھا، کیونکہ شجاع وہ نہیں ہے، جو عواقب اور نتائج اعمال کی پرکھ نہ رکھتا ہو، بلکہ صحیح معنوں میں شجاع وہ ہے جو امور پر قدرت رکھتا ہو، اور نتائج و غایات کی اچھی طرح پرکھ رکھتا ہو۔

فراست اور فہم و دانش

امام صادق کو خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ سے فراست قویہ کی نعمت بھی عطا ہوئی تھی، اور یہ فراست ہی تھی، جس نے انھیں سیاست کے خارزار میں قدم رکھنے سے روکا تھا۔ انھوں نے حالات کا جائزہ لیا اور حقیقت احوال معلوم کر لی، عراق کے مدعیان عقیدت کا حال یہ تھا کہ باتیں بہت کرتے تھے اور عمل کا کیسہ یکسر خالی تھا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان لوگوں نے جو وطیرہ اختیار کیا تھا وہ بھی آپ کی نظر میں تھا۔ پھر امام زید کے ساتھ ان لوگوں نے جو کچھ کیا اس سے بھی آپ اچھی طرح واقف تھے۔ پھر عبداللہ بن الحسن کی اولاد کے ساتھ عراق کا جو رویہ رہا، وہ بھی آپ کی نظر میں تھا، یہی وجہ تھی کہ گو ان کی طرف سے بار بار ادعائے عقیدت کیا گیا۔ گو انھوں نے بار بار خروج کی دعوت دی، مگر آپ نے التفات نہیں فرمایا، بلکہ آپ کے زمانے میں جس نے بھی حکومت کے خلاف خروج کا ارادہ کیا انھی مذکورہ

بالاحقائق کی روشنی میں آپ نے انھیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی، چنانچہ اپنے عم محترم امام زید کے فیصلہ خروج سے آپ نے اتفاق نہیں کیا۔ اسی طرح نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم (نفس رضیہ) کو بھی آپ نے خروج سے باز رکھنے کی سعی فرمائی۔

غرض آپ کے عہد میں جو واقعات و حوادث پیش آئے ان پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر موقعہ پر آپ کی فراست بڑے کار آئی۔ آپ کی فراست کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ امویوں کے خلاف تحریک چلانے کی؛ جب وہ روبہ زوال ہوچکی تھی آپ کو دعوت دی گئی، بلکہ اس تحریک کی سیادت و قیادت پیش کی گئی۔ مگر آپ نے انکار کردیا، جس کے باعث عباسیوں کو آگے بڑھنے اور خلافت پر قابض ہونے کا موقعہ مل گیا۔ حضرت امام رضی اللہ عنہ نے مختصر لیکن جامع انداز میں کتنی حکیمانہ بات ارشاد فرمائی:-

"یہ حکومت ہمارے لیے نہیں تھی!"

جو حوادث آپ کے خاندان پر نازل ہوئے۔ آپ کے گرد و پیش رونما ہوئے، جنھوں نے آپ کے چپ و راست ڈیرہ جالیا، ان سب مواقع پر وہ آپ کی فراست تاباں کی نورافشانی ہی تھی جس نے تاریکی کا خاتمہ کردیا، اور حالات کا رخ بدل دیا۔

حضرت امام فراست کو مومنین کے اخلاق کا ایک ضروری اور اہم حصہ خیال کرتے تھے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اتقوا فراسۃ المومن (یعنی مومن کی فراست سے ڈرو)

یا جیسے خدائے بزرگ و برتر نے ارشاد فرمایا ہے:

ان فی ذالک لآیات للمتوسمین۔!"

(اس واقعہ میں کئی نشانیاں ہیں اہل بصیرت کے لیے۔)

یعنی مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی فہم و دانش، اور عقل و فراست سے امور کا اور ان کے پس منظر کا ادراک کرلیتے ہیں۔

حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ تاثیر کے اعتبار سے فراست کا شمار بجا طور پر قوی ترین صفات میں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ مخصوص ترین صفت ہے جس سے جمہور کی رہنمائی خواہ انکار میں خواہ مذاہب

خواہ رائے میں کی جاتی ہے، وہ فراست ہی ہے جس کی مدد سے مخاطب کی کمزوری اور عیوب و نقائص کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کونسی دوا، اس کے ذہنی امراض کے لیے کارگر ہوسکتی ہے؟ وہ فراست ہی ہے جس سے لوگوں کے رجحان ومیلان اور غایات ومقاصد کی معرفت ممکن ہوتی ہے۔ اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں بغیر کسی جبر واکراہ کے راہ استقامت پر کس طرح گامزن کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے۔

"قلوب کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں جن کی طرف وہ مائل، یا جن سے وہ بیزار ہوتے ہیں، پس انھیں اس طرح قابو میں لانے کی کوشش کرو، جو ان کے میلان اور مزاج کے مطابق ہو، کیونکہ اگر جبر کیا جائے تو دل اندھا ہوجاتا ہے۔"

وقار وہیبت اور دبدبہ وصولت اللہ تعالیٰ نے امام جعفر صادق کو جو نعمتیں اپنی بارگاہ سے عطا فرمائی تھیں ان میں ہیبت وجلال اور نور الٰہی کی جلوہ گری بھی شامل تھی۔ اور یہ بات کثرت عبادت کے باعث حاصل ہوئی تھی۔ آپ ہمیشہ لغو گوئی سے احتراز کرتے تھے، حوادث پر صبر کرتے اور لوگوں کی ژاژخائیوں سے بے تعلق رہتے، ان تمام چیزوں نے مل کر قلوب میں آپ کی ہیبت پیدا کردی تھی، یہ صفت ان صفات کے علاوہ تھی جو مشتمل تھیں اس پاک خون پر جو آپ کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ اللہ تبارک وتعالے نے آپ کو بہت سی نعمتوں سے مالا مال کیا تھا۔ آپ صغائر (پست باتوں سے) بہت بلند تھے۔ آپ مرتبۂ رفیع پر فائز تھے۔

اس سلسلہ میں اس روایت کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ نے جب آپ کو حیرہ میں دیکھا، تو آپ خلیفہ منصور جیسے شخص کے پاس تشریف فرما تھے، جس کی حکومت میں سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ امام ابوحنیفہ نے آپ کو دیکھا، خلیفہ منصور سے تو کچھ زیادہ متاثر نہ ہوئے مگر آپ کو دیکھ کر وفور رعب سے لرزنے لگے، منصور صاحب جاہ وحشم تھا، صاحب مال وزر تھا، صاحب فوج وسپاہ تھا لیکن اسے دیکھ کر اتنی مرعوبیت کبھی طاری نہیں ہوئی تھی، جتنی امام صادق کو دیکھ کر ہوئی۔ لیکن یہ وہ ہیبت تھی جس سے گمراہ راہ یاب ہوتے تھے۔ سرگشتگان راہ منزل مقصود تک پہنچ جاتے تھے، کج رو استقامت سے بہرہ ور ہونے لگتے تھے۔ امام صادق کی مہابت وجلال کا یہ منظر دیکھ کر وہ گم صم ہو گئے۔ اور گویا ان کے غاشیہ برداروں میں شامل ہو گئے۔ وہ خود بھی قوت بیان اور زور کلام کے ماہر تھے، لیکن جب امام ہمام سے گفتگو ہوئی، تو اس مہابت وجلال کا اثر یہ تھا کہ جو

کچھ امام ہمام نے فرمایا، اس کی تردید میں کچھ نہ کہہ سکے۔

عراق کے زندیقوں کا سربراہ اور زعیم ابن العوجاء تھا ایک مرتبہ حضرت امام کی اس سے ملاقات ہوئی، اس نے جب آپ کو دیکھا تو اس پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ یکسر ششدر اور حیران نظر آنے لگا۔ آپ نے اس سے گفتگو کا آغاز کیا لیکن اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا، جس پر امام صادق اور حاضرین کو سخت حیرت ہوئی۔ آپؑ نے اس سے پوچھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟"

زندیق نے جواب میں عرض کیا:

"آپ کے جلال اور مہابت نے میری زبان پر تالا لگا دیا ہے۔ آپ کے سامنے میری زبان نہیں کھل سکتی ہیں نے بہت سے علماء کو دیکھا ہے میں نے ماہرین علم کلام سے مناظرے کیے ہیں، لیکن میں کبھی کسی سے ذرا بھی مرعوب ومتاثر اور دہشت زدہ نہیں ہوا لیکن آپ؟ آپ کی ہیبت نے میری قوت نطق وکلام چھین لی ہے!"

ایک طرف تو آپ کی ہیبت و وقار اور دبدبہ وصولت کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو آپ کے سامنے یارائے تکلم نہ تھا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے شاگردوں، عقیدت کیشوں، اور حاضر باشوں کے سامنے آپ یکسر خلق وتواضع نظر آتے تھے۔ یہاں تک ہوتا کہ جس گدّے پر آپ بیٹھے ہوتے، اسے دوسرے کے لیے بچھا دیتے، جیسا کہ امام مالک کے ساتھ اس طرح کا واقعہ گزر چکا ہے، حالانکہ امام مالک کی حیثیت آپ کے سامنے ایک شاگرد سے زیادہ نہ تھی وہ آپ کے پاس حصول اور سماع حدیث کے لیے آیا کرتے تھے۔

یہ ہوتا ہے عظماء کا حال!

ان میں قدرتی طور پر ایسی مہابت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کے سر ان کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ بایں ہمہ ضعیفوں اور کمزوروں، مجبوروں اور خستہ حالوں، کم رتبہ اور معمولی حالت والوں کے لیے وہ سراپا خلق وتواضع ہوتے ہیں۔

امام جعفر صادق کے صفات وملکات

یہ تھے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے بعض فضائل و ملکات اور صفات وخصائص ۔

ان صفات میں سے چند صفات بھی اگر لوگوں میں ہوتے ہیں تو وہ اپنے ہم عصروں سے بازی لے جاتے ہیں اور اعلیٰ مراتب فکریہ پر فائز ہوجاتے ہیں.

لیکن جس شخص میں یہ پورے صفات جلوہ گر ہوں، بلکہ ان صفات کے علاوہ دوسرے صفات کریمہ بھی موجود ہوں جو سراپا لطف دہر اور اخلاق وعطوفت ہو، زاہد و عابد ہو، شاکر و صابر ہو اس کی برتری اور اس کے مرتبہ رفیع کا کون اندازہ کر سکتا ہے ؟

اور بلاشبہ امام صادق کی تکوین امامت کے اہم ترین عناصر میں ان صفات کا شمار ہے[1]۔

---

[1] امام جعفر صادق کے خصائص اور ممیزات بے شمار ہیں، لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے امامت روحانی کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ، علم کی نشر و اشاعت میں غیر معمولی حصہ لیا۔

وہ امام زمانہ صرف روحانی اعتبار سے نہیں تھے۔ علمی اعتبار سے بھی تھے۔

انھوں نے علم آل بیت کو ایک باقاعدہ شکل دی اور دوسرے علوم وفنون پر بھی پوری پوری توجہ مبذول فرمائی۔ ان کے اس شغف اور التفات نے نہ صرف ان کی شخصیت کی تعمیر و تکوین میں حصہ لیا بلکہ ملت اسلامیہ کی صلاح و فلاح میں بھی اس نے اتنا وقیع حصہ لیا کہ ہم بے اندیشہ تردید کہہ سکتے ہیں۔ حضرت امام کی ذات عہد آفرین ثابت ہوئی، انھوں نے ایک نیا عہد اور ایک نیا دور پیدا کیا، جو تاریخ اسلام میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ ایسی خصوصیت ہے جس نے ذات امام کو مرجع خلائق بنا دیا۔ ہر مکتب فکر کے لوگ اس آستانے پر پہنچتے تھے اور کسب فیض و سعادت کر کے واپس ہوتے تھے۔

(رئیس احمد جعفری)

شیوخ واساتذہ

امام جعفر صادق نے کن کن اکابر سے تعلیم حاصل کی؟

سیرت امام ہمام کا نکھار اس موضوع پر ہمارا برادران امامیہ سے کچھ اختلاف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ امام جعفر صادق کا علم تمام تر الہامی تھا۔ اس میں کسب کو ذرا بھی دخل نہیں تھا، لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ علم نتیجہ تھا کسب کا جس میں اشراقِ اخلاص کی روح کارفرما تھی۔ نورِ حکمت اور ریاضت نفس جلوہ گر تھی، پھر تقویٰ اور فضیلت روحی مستزاد، ساتھ ہی ساتھ منائم و مشاغل دنیا سے بے تعلقی نے ان کی سیرت کو اور زیادہ نکھار دیا تھا، لہٰذا ہماری یہ پختہ رائے ہے کہ انھوں نے شیوخ و اساتذہ سے پڑھا، سیکھا اور حاصل کیا اور اس طرح علوم قرآن، حدیث اور فقہ کے جامع اور امام جلیل بن گئے۔ اور اس مجموعۂ علمیہ کے حصول میں وہ اپنے معاصرین سے پورے طور پر ان کا صلہ قائم رہا، کیوں کہ ان کا گھر بیت علم تھا، بیت حکمت تھا، بیت حدیث تھا۔

امام صادق کے تین اساتذہ ہمارے علم و ایقان کے مطابق تین اساتذہ ایسے تھے جن کے سامنے حضرت امام نے زانوئے شاگردی تہ کیا اور یہ ہر سہ حضرات منارۂ علم و فضل تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے وقت کا امام یگانہ و فرزانہ تھا۔ اور وہ تین شیوخ امام یہ ہیں۔

(۱) امام علی زین العابدین بن حسینؓ حضرت امام کے جد عالی تبار امام علی زین العابدین رضی اللہ تعالٰی عنہ، حضرت امام زین العابدین نے جب اس دنیا سے کنارہ فرمایا تو امام صادق کی عمر ۱۴ سال کی تھی، یہی عمر کسب و حصول علم کی ہوا کرتی ہے، پس لازم ہے کہ انھوں نے تحصیل علم کا آغاز اپنے جد والا تبار سے کیا ہو کیوں کہ اولاد حسین رضی اللہ عنہ کی بقیۃ السیف اولاد میں بھی ایک ہستی باقی رہ گئی تھی۔

اور یہ امام زین العابدین نہ صرف آل بیت کے علم و کمال کا گنجینہ تھے بلکہ انھوں نے اپنے ہم عہد تابعین سے بھی علم حاصل کیا تھا۔ یہ مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تشریف لے جاتے اور تابعین کرام کے حلقہ درس میں شریک ہوتے۔

چنانچہ روایت ہے کہ جب آپ مسجد نبوی میں پہنچتے تو سیدھے زید بن اسلم کے حلقۂ درس میں پہنچ جاتے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ نافع بن جبیر بن مطعم القرشی نے کفِ افسوس ملتے ہوئے آپ سے کہا:

"خدا آپ پر رحم کرے۔ آپ سید الناس ہیں، لوگوں کے سردار اور ملجا و ماوی ہیں، لیکن کتنے افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ سب کو چھوڑ کر، حتیٰ کہ قریش کے اہل علم کو نظرانداز کر کے آپ اس سیہ فام غلام کے حلقۂ درس میں تشریف لے جاتے ہیں؟

امام علی زین العابدین بن امام حسین نے جواب دیا:

"آدمی وہیں بیٹھتا ہے جہاں سے اسے فائدہ پہنچے اور علم جہاں کہیں بھی ہو اس کی جستجو کرنی چاہیے اور اسے لے لینا چاہیے۔"

روایت ہے کہ امام زین العابدین مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر کے پاس (حصول علم) کے لیے جایا کرتے تھے، جو ایک آزاد کردہ غلام تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ آپ سے عرض کیا گیا:

"یہ آپ کیا کرتے ہیں؟ کہاں آپ کہاں سعید بن جبیرؒ؟

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

"میں ان سے ایسی باتیں معلوم کرتا ہوں، جن میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے نفع رکھا ہے۔"[1]

ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ آل بیت اپنے عہد کے علماء سے ربط و ضبط قائم رکھتے تھے، ان سے حاصل بھی کرتے تھے، انھیں دیتے بھی تھے۔ علم وہ چیز نہیں ہے جو سات پردوں میں مستور رکھا جائے، وہ تو ایک نور ہے، جہاں کہیں بھی ہوگا، اس کی روشنی، اس جگہ کو جگمگا دے گی اور روشن کر دے گی۔ اور ان کے نور ساطع کا یہ حال تھا کہ اس سے ہر وہ شخص مستنیر ہو سکتا تھا جو راہِ ہدایت کا جویا ہو۔

بہر حال ہماری یہ پختہ رائے ہے کہ آل بیت کے اصحاب و افراد اپنے عہد کے علماء سے

---

[1] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۹ ص ۱۰۷، طبع السلفیہ

ربط و تعلق رکھتے تھے۔

(۲) حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ

امام صادق کے دوسرے استاذ ان کے والد ماجد حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ بھی امام زمانہ تھے۔۔ ان کے شاگردوں کی فہرست میں اگر ایک طرف امام ابو حنیفہ نظر آتے ہیں تو دوسری طرف خود ان کے بھائی امام زید نظر آتے ہیں۔ امام باقر کا گھر، ایک ایسا دانش کدہ تھا۔ جہاں اطراف و جوانب اور دیار و امصار اور مقامات بعیدہ سے لوگ جوق درجوق حصول علم کے لیے آتے تھے اور اپنا دامن علمی جواہر ریزوں سے بھر کر واپس جاتے تھے۔

یہ بات ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے سیاست میں حصہ لیا ہو، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سیاست ان کے قریب بھی نہیں پھٹکی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دورعلمی سیاست کا دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ساری توجہ درس کی طرف مبذول فرما دی، مدینہ کے تمام علماء سے آپ کا ربط وصلہ قائم تھا۔ یہ سب آپ کی خدمت عالی میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جگہ جگہ تابعین کرام کے حلقے قائم تھے۔ جہاں علم و روایت کی گرم بازاری تھی، اور یہ روایات صاحب روضۂ شریفہ سے متعلق تھے، پس ان حلقوں میں جہاں نبوت کی دل ربائی تھی، وہاں نبوت کا علم بھی تھا۔ صحت و راستی کے ساتھ آثار نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر و درس جاری رہتا تھا۔

پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم یہ باور نہ کریں کہ امام باقر بھی طلب معرفت میں حلقات و مجالس کے اندر ورود فرما نہیں ہوتے تھے، جب کہ وہ بہ چشم خود ملاحظہ فرما چکے تھے کہ ان کے والد بزرگوار زید بن اسلم کے حلقے میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور سعید بن جبیر کے حلقے میں بھی بعض لوگوں کے اعتراض کے باوجود تشریف فرما ہو جایا کرتے تھے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم کس طرح باور کرلیں کہ امام باقر نے مسجد نبویؐ کے ان حلقوں سے قطع تعلق رکھا تھا جہاں لوگ شد رحال کر کے اور سفر کی کٹھنائیاں برداشت کر کے ان کے جد والا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم حاصل کرنے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہاں ذکر و درس کا سلسلہ قائم رہتا تھا۔ لوگ اس علم کو حفظ کرتے تھے اور اسے علم دین قرار دیتے تھے، اور یقین رکھتے تھے کہ جس نے یہ علم حاصل کر لیا نجات پالی اور جس نے اسے ترک کر دیا ہلاک ہوا۔

ہندا ہم کہتے ہیں:

"امام صادق نے آل بیت کا علم اپنے والد ماجد سے حاصل کیا۔ اور کبار تابعین کا علم بھی حاصل کیا!"

(۳) قاسمؓ بن محمدؓ بن ابی بکرؓ یکے از فقہائے سبعہ

امام صادق کے تیسرے استاد قاسم بن محمد بن ابی بکر ہیں جن کا شمار مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے۔ یہ وہ تابعین ہیں جنھوں نے صحابۂ کرام کے علم اور روایات کو اپنے بعد آنے والے لوگوں کے لیے منتقل کر دیا۔

اور یہ قاسم وہ بزرگ ہیں جنھوں نے علم عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھی روایت کی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے روایات بھی حاصل کیے۔ یہ بہت بڑے مجتہد ذی رائے تھے۔ لوگوں کے شئون و احوال پر بہت گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۸ھ میں ہوا، یعنی جس وقت امام صادق کی عمر ۱۸ سال کی تھی، لہٰذا کوئی شبہ نہیں حضرت امام نے قاسمؓ سے بھی علم حاصل کیا۔

یہ بات ہم کسی طرح باور نہیں کر سکتے کہ امام صادق رضی اللہ عنہ نے اپنی ساری زندگی مدینہ منورہ میں گزاری اور پوری مدت حیات میں لوگوں سے منقطع رہے، نہ مساجد میں گئے۔ نہ مجالس علماء میں تشریف لے گئے اور اگر گئے تو ان سے کچھ لیا نہیں صرف عطا فرماتے رہے۔

اختلاف بین العلماء کا علم تام

اخبار و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف بین العلماء سے وہ پورے طور پر واقف تھے اور اس باب میں انھیں علم تام حاصل تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیوخ و اساتذہ سے بہرہ ور رہے اگرچہ نسب مناقب میں ان کی تفصیل اور تعداد شرح و بسط کے ساتھ مذکور نہیں ہے لیکن پھر بھی جو معلومات ہمارے سامنے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے تابعین سے حصول علم کیا۔ ان سے مذاکرہ کیا۔ ان سے روایت کی، جس طرح خود ان تابعین نے ان سے علم حاصل کیا اور ان سے روایت کی۔

اور یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ امام مالک رضی اللہ عنہ اکثر و بیشتر آپ کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے اور اس حاضری کا مقصد حصول علم ہوتا تھا۔ اور کھلی ہوئی بات ہے امام مالک کا سا جویائے علم اس مقصد عظیم و جلیل کو ضرور پیش نظر رکھ کر بارگاہ امام میں حاضری دیتا ہوگا، کیوں کہ وہ

اس حقیقت سے شناسا تھے کہ آپ کے پاس علم اہل مدینہ اور اخبار رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدرجہ اتم موجود ہیں، کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جو آپ کی نظر میں نہ ہو۔

علم نبوی ایک جوہر فائقہ کی طرح ہے، اور یہ بات نہ کسی طرح سمجھ میں آسکتی ہے نہ باور کی جاسکتی ہے کہ حفید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دل کے دروازے ان سرچشمہ ہائے علم کے لیے بند کر لیے ہوں، جو مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پھوٹتے تھے۔

جو ہستی کسی بزرگ اور کریم ہستی سے نسبت رکھتی ہے، واجب ہے اس بزرگ اور کریم ہستی کے اخبار و آثار کی جستجو ہر گوشہ سے کرے اور کوئی شبہ نہیں امام صادق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت عظیم رکھتے تھے۔ اور اس شرف عظیم کے باعث اور اس نسبت طاہر کے سبب ضروری تھا کہ اخبار و آثار نبوی کی تلاش و جستجو وہ نواحی میں کرتے اور کوئی گوشہ اس سلسلہ میں نہ چھوڑتے۔

آل بیت علوی مصدر علم اور منبع فیض تھا

مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ عقیدہ رکھتی ہے اور اس کی زبان پر یہ کلام جاری ہے کہ ائمہ اطہار ہی علم آل بیت علوی کا مصدر اور منبع ہیں، ہم اس بات سے انکار کی جرأت نہیں رکھتے، بلکہ کہتے ہیں کہ آل بیت کریم کے پاس علم و روایت کا ذخیرہ تھا اور یہ علم سنت سے منفصل نہیں تھا۔

بلاشبہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں اور دل سے مانتے ہیں کہ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ صحابہ میں سب سے زیادہ قضا کا علم رکھتے تھے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے جو مدینۂ علم تھے۔ حضرت علی نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایات کثیرہ روایت کی ہیں کیونکہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر باشی کا، اور آپؐ سے قرب کا زیادہ سے زیادہ بلکہ سب سے زیادہ موقعہ ملا تھا۔ انھوں نے دامن رسولؐ میں تربیت پائی تھی۔ اور وہیں سے حکمت کے موتی رولے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ حضرت فاطمہؓ کے شوہر تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی بیٹیوں میں سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھیں۔ پھر یہ خصوصیت بھی انھیں حاصل تھی کہ دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں انھیں قرب رسولؐ زیادہ حاصل رہا تھا، کیونکہ شرف صحابیت کے علاوہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم نسبی اور ان کے داماد ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں بہت زیادہ عزیز اور محبوب رکھتے تھے، جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب وہ روضہ شریف نبویہ پر حضرت علیؓ کی خبر شہادت لے کر گئی تھیں تو فرمایا تھا، بلاشبہ بغیر کسی اختلاف اور منازعت کے اسلام کے بہت بڑے ہیرو اور دلیر و شجاع شخص تھے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ بغیر کسی تامل اور تذبذب کے ہم یہ تسلیم کرلیں کہ حضرت علی کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کا بہت بڑا حصہ تھا اور اموی حکومت نے اس طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی کہ حضرت علی کے علم کو، اور ان کے احکام اور فیصلوں اور قضایا کو محفوظ کرلیتی۔ یہی سلوک اس نے احکام عمرؓ اور احکام ابوبکرؓ کے ساتھ بھی کیا۔ لہٰذا ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رواۃ سنت کی زبان پر حضرت علیؓ کا علم پورا پورا نہیں نقل ہوسکا۔ لیکن جو کچھ نقل ہوا ہے وہ اگرچہ سب کا سب نہیں ہے لیکن اتنا بھی کم نہیں ہے۔ ان کے احکام قضایا، یقیناً اور قطعاً شام کے امویوں کے لیے غیر مرغوب تھے۔

حضرت علیؓ کا علم ان کی ذریت میں بدرجۂ اتم موجود تھا

چنانچہ بجا طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا علم ان کی اولاد اور ذریت میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اور اس بیت عظیم کو یہ گراں بہا تر کہ ایک بہت بڑی نعمت کی صورت میں عطا ہوا تھا اور آل بیت کے ائمہ کرام میں ایک سے دوسرے تک یہ علم برابر منتقل ہوتا رہا لیکن اس سلسلہ میں دو امور خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

(۱) جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں یہ علم اس سنت مشہورہ سے منفصل نہیں تھا جسے جمہور مسلمین تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ اور جس کا بڑا حصہ صحاح مشہورہ میں موجود ہے۔ اس کی تائید مجموع کبیر سے بھی ہوتی ہے جو امام زید رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، جس کی روایت ان کے شاگرد ابوخالد عمرو ابن خالد الورسکی نے کی ہے۔

ہماری تحقیق کا جہاں تک تعلق ہے اس مجموعہ میں کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو جمہور علماء مسلمین سے مخالفت تامہ رکھتا ہو۔ مخالفت تامہ کی شرط ہم نے یوں لگائی کہ ایک روایت اگر ایک فریق اہل سنت کے نزدیک ناقابل قبول ہے تو دوسرے کے نزدیک قابل قبول ہے۔ لہٰذا ہم پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آل بیت کا علم جو امام ہدیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے متوارث چلا آرہا ہے، وہ جمہور مسلمین کے نزدیک علم سنت نبوی سے کسی وجہ میں بھی غیر ہم آہنگ نہیں ہے۔[1]

(۲) ائمہ آل بیت کرام نے اگرچہ علم علوی کی روایت کی لیکن انھوں نے ہرگز مدینہ کے علم، تابعین کے گروہ کثیر کے روایات سے انقطاع قائم نہیں رکھا۔ نہ صحابہ کرام کے مرویات سے بے تعلق رہے

---

[1] اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب "امام زیدؒ" میں تحقیق و تفصیل سے بحث کی ہے۔

کیوں کہ یہ جو کچھ بھی تھا، اسی نور سے مقتبس تھا جو سید المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور تھا، گزشتہ موقع پر ہم اس کی وضاحت بھی کر چکے ہیں۔

امام جعفر صادق کا علم تمام نواحی پر محیط تھا

یہی وجہ ہے کہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق کا علم محیط تھا، تمام نواحی اور گوشوں پر اسراتق اور مخالف ہر طبقہ کے علم پر ان کی نظر تھی۔ انھوں نے مختلف سرچشموں سے فائدہ اٹھایا تھا، اور یکسر خالی الذہن ہو کر انھوں نے علم آل بیت بھی حاصل کیا، علم اہل مدینہ بھی، علم اہل عراق بھی اور علم ملل متفرقہ و فرق مختلفہ بھی،

یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ وہ مدارِ اول جس سے انھوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا وہ علم بیت علوی تھا، یہی علم اصل تھا، آل بیت کے طریقہ سے ہٹ کر جو علم حاصل کیا وہ اپنے جد قاسم بن محمد بن ابی بکر کا تھا، اس کے بعد انھوں نے ہر گوشہ کو کھنگالا اور کوئی سرچشمہ ایسا نہیں تھا جسے چھوڑ دیا ہو۔

علم اور دراست کی ترتیب زمانی کچھ بھی رہی ہو، ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس امام جلیل نے حصول معرفت کے لیے کوئی دروازہ ایسا نہیں تھا جس پر دستک نہ دی ہو، کیونکہ یہی ان کی غایت تھی، اور نسبی شرف کے بعد یہی ان کا سب سے بڑا شرف تھا۔

علم اور صرف علم

امام جعفر صادق کا علم کی طرف شغف اور انہماک تام

ایک عالم کی خصوصیت

ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی علم حاصل کرتا ہے، شیوخ اور اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتا ہے، اسباب معرفت کی جستجو کرتا ہے اور انھیں حاصل کرلیتا ہے لیکن اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد اس کی زندگی کے شب و روز دوسرے مشاغل میں بسر ہوتے ہیں وہ علم سے غیر متعلق سا ہو جاتا ہے۔

رجال اسلام میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ملے گی، جنھوں نے اپنی علمی زندگی بڑے اہتمام اور جوش سے شروع کی لیکن بعد میں ایسے حالات پیش آئے کہ وہ علم سے اپنا تعلق قائم نہ رکھ سکے۔

مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز نے شیوخ تابعین کے سرچشمہ علم سے اپنی پیاس بجھائی، لیکن جب وہ مدینہ کی گورنری پر مامور ہوئے تو دبستان علم سے بے تعلق ہو گئے۔

ابو جعفر منصور نے بھی تابعین کرام سے علم حاصل کیا، لیکن سیاست کے خارزاروں میں الجھنے کے بعد یہ راستہ بھول گیا: اب اس کی توجہ حکم داری اور فرمانروائی کی طرف مبذول ہو گئی اور علم سے اس نے اپنا رشتہ قطع کر لیا، اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ امرائے اسلام میں زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی ملے گی۔

اور اگر کوئی شخص یہ کوشش کرے کہ علم اور امارت سلطنت دونوں چیزیں اپنی ذات میں جمع کرے تو وہ دونوں کو نہیں اپنا سکتا۔ جیسا مامون اور بعض امرائے اندلس کو ہم دیکھتے ہیں۔

لہٰذا جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں اور شیوخ و اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتے ہیں، ان کے تکوین علم میں، علم کی طرف انصراف اور توجہ کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے، کیونکہ علم اس دل میں نشیمن نہیں بنا سکتا جو اپنے تئیں اس کے لیے وقف نہ کر دے، جو علم کو قابو میں رکھ کر دوسرے امور میں مصروف و منہمک ہو جاتا ہے وہ غلطی کرتا ہے پھر علم اس کے قبضہ اور تصرف سے باہر نکل جاتا ہے جس طرح عابد ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف عبادت کے لیے وقف ہو جاتا ہے اسی طرح علم بھی چاہتا ہے کہ ایک عالم ماسوا سے بے نیاز

ہوکر صرف اسی کا ہو رہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ تاجر بھی تھے اور فقیہہ عراق بھی۔

لیکن اس طرح صحیح نہیں ہے جس طرح کہا جا رہا ہے۔ بے شک وہ تجارت کرتے تھے لیکن اس طرح نہیں کہ تن من دھن سے اس کام میں مستغرق ہو گئے ہوں، در حقیقت یہ کام انھوں نے اپنے گماشتوں کو سونپ رکھا تھا۔ ان کی طرف سے وہی سارا کاروبار سنبھالتے تھے اور بازار کے اتار چڑھاؤ سے باخبر رہ کر لین دین کرتے رہتے تھے، ورنہ امام صاحب کا جہاں تک تعلق تھا، وہ صرف علم ہی کے لیے وقف تھے۔

امام جعفر صادق کی سبق آموز مثال

اب امام جعفر صادق کی مثال سامنے رکھئے حضرت امام نے پورے طور پر اپنے تئیں علم کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے اسی علم کی خاطر نہ سیاست سے دلچسپی لی، نہ دعوائے خلافت کیا، نہ قیادت کا بار اٹھایا، نہ اپنے متبعین کی رہنمائی اپنے ذمہ اس طرح کی کہ امویین کے خلاف صف آرا ہو گئے ہوں یا عباسیوں کے خلاف میدان میں آ گئے ہوں۔ جیسا کہ ان کے خاندان کے دوسرے اکابر اور اصحاب نے کیا، مثلاً ان کے برادران عمزاد محمد بن عبداللہ اور ابراہیم بن عبداللہ انھوں نے علم کے سوا کسی چیز سے سروکار نہ رکھا۔ چنانچہ ان کے زمانہ میں جو حوادث اور واقعات سیاسی رونما ہوئے ان میں کہیں بھی حضرت امام کا ذکر نظر نہیں آتا، بجز اس صورت کے کہ اقربا میں سے جو ائمہ ہدیٰ ارباب حکومت کے ہاتھوں شہید ہوئے ان پر انھوں نے آنسو بہائے اور حزن والم، اور تاسف کا اظہار فرمایا۔

دعوائے خلافت سے اعراض اور علم کی طرف انصراف

بہر حال امام ہمام کا امارت و خلافت سے اعراض اور علم کی طرف انصراف کلی خواہ تقیہ کا نتیجہ ہو، جیسا کہ امامیہ کہتے ہیں یا شغف علم کا، جیسا کہ جمہور کا خیال ہے امر واقعہ یہ ہے کہ علم کے لیے اپنے آپ کو انھوں نے اس طرح وقف کر دیا تھا جس طرح ایک عابد عبادت کے لیے اپنے تئیں وقف کر دیتا ہے وہ بہت بڑے عابد بھی تھے اور بہت بڑے عالم بھی۔ ان کے نظام عمل میں جو چیزیں شامل تھیں وہ مشتمل تھیں یا مطالعہ پر یا عبادت پر، یا تلاوت قرآن پر یا روایت حدیث پر یا نطق حکمت مآب پر جس نے ان کے قلب صافی کو منور کر رکھا تھا۔ اور جس سے ان کا نفس متبسم ہوتا رہتا تھا۔

وہ طلب علم میں حد درجہ مخلص تھے اور ان کے اس اخلاص نے انھیں ہر طرح کی ہنگامہ آرائی اور جنگ و جدل اور بحث و منازعت سے دور کر دیا تھا، جو لوگ ان کی خدمت میں شاگرد کی حیثیت سے

حاضر ہوتے تھے یا ان کی مجلس میں کسبِ فیض کے لیے حاضری دیتے تھے۔ یا جو ان کے کلماتِ حکمت سننے کے لیے آیا کرتے تھے، ان سب کو اخلاص کے ساتھ طلبِ علم پر اکسایا کرتے تھے۔

وہ اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں کو کتابتِ علم پر بھی اکساتے رہتے تھے، چنانچہ وہ اپنے تلامیذ سے فرمایا کرتے تھے۔

"لکھ لو، کیونکہ جب تک لکھ نہ لو یاد نہ رکھ سکوگے۔"

حضرت امام کے عہد میں کتابتِ علم کا چرچا شروع ہو چکا تھا۔ کوئی یہ خیال نہ کرے، کہ کتابتِ علم سے مراد تالیفِ کتب اور تصنیفِ مؤلفات ہے، لیکن کتابتِ علم کا سلسلہ بہرحال چل پڑا تھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی بعض یادداشتیں لکھ لیا کرتے تھے، انھوں نے اپنی تلوار کی میان میں دیات اور کے بارے میں اپنی یادداشت قلم بند کر لی تھی۔

کتابتِ احادیث کا سلسلہ عہدِ امام جعفر رضی اللہ عنہ میں شروع ہو چکا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں امام مالک وہ تمام حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے جن کی سماعت کرتے تھے جیسا کہ ان کے روایات سے ثابت ہے۔ اس کے بعد ہی تنقیح کر کے انھوں نے اپنی کتاب مؤطا میں یہ مرویات جمع کیے۔ لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ امام صادق نے کتابتِ علم کی ترغیب لوگوں کو دی۔ اگرچہ یہ امر واقعہ ہے کہ ان کے عہد میں تدوینِ کتب کا باقاعدہ کام نہیں شروع ہوا تھا۔

حضرت امام جامع علومِ مختلفہ و متفرقہ تھے

حضرت امام نے متعدد علوم میں کمال حاصل کر لیا تھا علماءِ حدیث کے درمیان ان کی حیثیت ایک روشن ستارے کی تھی۔ آلِ بیت علوی کی احادیث کے وہ عالمِ یگانہ تھے۔ دوسری حدیثوں کا بھی انھیں پورا پورا علم تھا۔ خاص طور پر احادیثِ عائشہ اور احادیث عبداللہ بن عباس وغیرہ سے وہ پورے طور پر آشنا تھے اور اپنے اس منہاج پر وہ پوری عزیمت و استقامت کے ساتھ قائم رہے۔

اپنے عہد کے علمائے فقہ کے وہ سردار اور سرتاج تھے۔ اختلافِ فقہا سے وہ اچھی طرح واقف تھے، تخریجاتِ فقیہہ کا علم، بڑے بڑے علماءِ الٰہی سے حاصل کیا کرتے تھے۔ احکامِ فقیہہ سے متعلق آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر معلوم کرنے لوگ انہی کے پاس پہنچا کرتے تھے وہ اپنے اصحاب اور عقیدت کیشوں کو طلبِ فقہ کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ فقہ علمِ دین ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

"دین کے مسائل سمجھو، کیونکہ جو تم میں سے فقیہہ نہیں ہے وہ گنوار ہے۔"

ایک مرتبہ حضرت امام سے اس حکمت کے معنی پوچھے گئے، جو قرآن میں وارد ہے۔ یعنی
ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا (جسے حکمت دی گئی، اسے خیر کثیر دیا گیا)

حضرت امام نے اس سوال کے جواب میں فرمایا۔
"یہاں حکمت سے مراد، دین کی معرفت اور تفقہ ہے!"

جو لوگ حلال و حرام کی معرفت سے جی چراتے تھے ان کے بارے میں حضرت امام رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔
"کاش میرے پاس کوڑے ہوتے جو میں ان لوگوں کے سر پر اس وقت تک برساتا جب تک یہ دین کے مسائل نہ سمجھ لیتے۔"

قرآن اور تفسیر قرآن کا علم

دراصل علوم قرآن کی طرف بھی آپ کی بہت زیادہ توجہ تھی، تفسیر قرآن پر آپ کی بہت گہری اور وسیع نظر تھی، علم تاویل سے بھی آپ بہت اچھی طرح واقف تھے۔ ناسخ اور منسوخ کے بھی رمز آشنا تھے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ قاسم بن محمد بن ابی بکر نے ابن عباس سے روایت کی ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کریم کے علم کی طرف متوجہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ترجمان قرآن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم بالکل صحیح اور درست طور پر یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ قاسم بن محمد کا علم ان کے (خفیہ نواسے) امام صادق تک پورے طور پر منتقل ہو گیا تھا۔

فلسفہ یونان کی محشر طرازیاں

عہد امام صادق میں عقل عربی پر فلسفہ کا زنگ چڑھنا شروع ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شک و ریب اور انکار الوہیت کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ اور حقائق اسلامیہ پر حملے بھی شروع ہو چکے تھے۔ مسلمانوں میں ریب و شک کو ابھارنے کی جد و جہد بھی شروع ہو گئی تھی تاکہ مفسران میں کج فکر اور ضعف اعتقاد پیدا کر سکیں۔ علماء نے اپنا فرض محسوس کیا وہ سد راہ اسباب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ شک کی کارفرمائی ختم ہو جائے فساد انگیزیوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ اور حقائق اسلامیہ پورے آب و رنگ کے ساتھ نمایاں ہو جائیں۔

منحرف العقائد اور منکرین خدا

امام صاحب نے ایسے لوگوں کو دیکھا جو خدا کے منکر تھے۔ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جو حقائق کا انکار کرتے تھے۔ ان لوگوں کو بھی دیکھا جو خلق قرآن کا فتنہ اٹھا رہے تھے اور حریت اختیار کا انکار کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تبارک و تعالٰے

کی عدالت پر معترض ہوتے تھے۔

ایسے لوگ بھی تھے جو حریت اختیار کا اثبات کرتے تھے لیکن اس شکل میں جو ثنویت مجوس سے شابہ تھی، یہ لوگ بھی اتنے ہی گمراہ تھے جتنے پہلے لوگ۔

ممکن نہ تھا کہ اس باب میں امام صادق خاموش رہتے۔ وہ نگاہ حق آشنا کے حامل تھے۔ حق کے ہتما تھے گمراہوں کے مرشد تھے۔ ان لوگوں سے برسرپیکار رہتے تھے جو ریب و شک پیدا کرتے تھے، اور ان کا مکر و کید انہی پر لوٹا دیتے تھے اور یہ کمال امام صادق ہی میں ہو سکتا تھا جو علی بن ابی طالب کے پوتے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے تھے۔

حضرت امام تفکیر علمی کے داعی تھے حضرت امام مدینہ میں تشریف فرما تھے اور شبہات کا رد کیا کرتے تھے، اور لوگوں کے سامنے اپنے بیان بلیغ سے روشن راستہ واضح کر دیتے تھے۔ کجی فکر رفع کر دیتے تھے۔

وہ کئی مرتبہ عراق تشریف لے گئے۔

عراق میں انھوں نے کوئی سیاسی دعوت نہیں دی نہ کسی سیاسی مسئلہ پر لوگوں کو جمع کرنے کی سعی و کوشش کی، لیکن وہ تفکیر علمی کے داعی ضرور تھے یہی وجہ تھی کہ بہت سے منحرفین راہ صواب سے الجھے اور نبرد آزما ہوئے اور انھوں نے بلا شبہ انحراف کا راستہ منقطع کر دیا۔ اور بہت سے لوگوں کو جو شکوک و شبہات فکر و عقائد میں مبتلا تھے راہ راست پر گامزن کر دیا۔

مناظرات میں حضرت امام کی شرکت اس سلسلہ میں حضرت امام کو کئی مناظروں میں حصہ لینا پڑا، جن کی تفصیل کتب امامیہ میں موجود ہے۔ اور بلا شبہ یہ روایتیں قابل قبول ہیں۔ ہمیں ان کے باور کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں، ان میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو معارض کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ہو، بلکہ حضرت امام کی ان مناظرانہ بحثوں میں ہم کتاب و سنت کے احکام کی تائید پاتے ہیں، جو عقائد اسلامیہ حقہ پر مشتمل ہیں، اور دفع زیغ اور رد شبہات کے لیے امام صاحب کے بالکل شایان شان ہیں اور ان سے منحرفین کے دعوات کا راستہ منقطع ہو جاتا ہے۔

ایک بہت اہم مناظرہ ایک زندیق سے ذیل میں ہم اس مناظرے کی روداد درج کرتے ہیں جو ایک زندیق اور حضرت امام کے مابین ہوا تھا، زندیق علانیہ طور پر اپنے زندیق ہونے کا معترف تھا۔

زندیق، لوگ اللہ کی عبادت کس طرح کر سکتے ہیں جب کہ وہ اسے دیکھ نہیں پاتے؟

امام صادق :- خدا کا دیدار نورِ ایمان کی روشنی میں دل کرلیتا ہے۔ اور عقل اس کا اثبات اس طرح کرلیتی ہے جس طرح آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز کا اور ابصار سے اس کا نظارہ اس طرح ہوجاتا ہے کہ وہ حسنِ ترتیب اور احکامِ تالیف کا مشاہدہ کرتی ہے۔ گویا رسولوں میں اور آیات میں، کتب میں اور محکمات میں، اس کی عظمت کا دیکھنا، خود اسی کو دیکھ لینا ہے۔

زندیق :- کیا اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہیں ہے کہ لوگوں پر اپنے آپ کو ظاہر کردے تاکہ وہ اسے دیکھ لیں اس کا عرفان حاصل کرلیں اور اس کی عبادت یقین و اعتماد کے ساتھ کریں۔

امام صادق :- امرِ محال کا جواب طلب کرتے ہو؟ یہ امرِ محال ہے.....

زندیق :- انبیاء و رسل کا ثبوت کس طرح مل سکتا ہے؟

امام صادق :- جب یہ ثابت ہوگیا کہ ہمارا ایک خالق ہے، صانع ہے، حکیم ہے اور وہ ہم سے بہت زیادہ بلند و بالا اور برتر ہے، صرف ہم سے نہیں جمیع مخلوقات سے، پس خلق کے لیے اس صانع حکیم کو دیکھنا، چھونا، کسی طرح بھی ممکن نہیں نہ وہ ان میں گھل مل سکتا ہے نہ وہ اس میں ہیں، وہ ان کے سامنے زیرِ حجاب ہے۔ اور وہ اس کے سامنے تو ثابت ہوا خلق و عباد کے مابین اس کے سفراء آتے رہتے ہیں، جو ان کی مصالح اور منافع کی طرف رہنمائی کیا کرتے ہیں، اس سے انکی بقا ہے اور اس کے ترک کردینے میں ان کی فنا ہے، پس ثابت ہوا کہ یہ نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے مخلوقات میں اس حکیم علیم کی طرف سے آتے ہیں اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ اس کے احکام کی ترجمانی کرنے والے ہیں۔ اور یہی دنیا اور مخلوقات کے برترین لوگ ہیں، یہ ایسے حکیم ہیں جو حکمت کے ساتھ ادب سکھاتے ہیں۔ ان کا مقصد بعثت یہی ہے اور جہاں تک خلق و ترکیب کا تعلق ہے ان میں اور دوسرے عام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خدائے حکیم و علیم کی طرف سے دلائل و براہین اور شواہد کے ساتھ ان کی تائید ہوتی ہے معجزے کے طور پر اسکے حکم سے، یہ مردوں کو زندہ کرسکتے ہیں اور برص زدہ لوگوں کو چنگا کرسکتے ہیں۔

زندیق :- اللہ نے اشیاء کو کس چیز سے پیدا کیا ہے؟

امام صادق :- کسی چیز سے نہیں۔

زندیق :- لاشے سے کوئی شے کس طرح پیدا ہوسکتی ہے؟

امام صادق :- اشیاء کی خلقت کسی چیز سے ہوگی یا غیر شے ہوگی اور یہ تخلیق کسی چیز سے ہوئی ہے۔ تو وہ اس کے ساتھ پیوست ہے اور اسے قدیم مانا جائے گا۔ اور قدیم کی تعریف یہ ہے کہ وہ نہ فنا ہوتا ہے نہ تغیر پذیر اور ضروری ہے کہ یہ ایک جوہر اور ایک رنگ ہو لیکن پھر یہ الوان مختلفہ اور جواہر کثیرہ کہاں سے

آ گئے جو اس دنیا میں مختلف اقسام کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہ موت کہاں سے آ گئی جبکہ یہ جس سے یہ شے پیدا ہوتی ہے وہ زندہ ہے اور یہ زندگی کہاں سے آ گئی جبکہ جس چیز سے یہ پیدا ہو گئی ہے اس پر موت طاری ہو سکتی ہے؟ اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ زندہ جس پر موت طاری ہوتی ہو اور وہ مردہ جو زندہ رہ چکا ہو۔ اور دونوں کو قدیم، یعنی لازوال مان لیا جائے کیونکہ زندہ جب تک زندہ ہے اس پر موت وارد نہیں ہو سکتی، اسی طرح یہ بھی نہیں مانا جا سکتا کہ میت کو قدیم مان لیا جائے جب تک وہ مردہ ہے، کیونکہ میت کو نہ کسی طرح کی قدرت حاصل ہوتی ہے نہ اس میں زندگی کے عناصر ہوتے ہیں۔[1]

زندیق: اس قول کی بنیاد کیا ہے کہ اشیاء ازلی ہیں؟

امام صادق: یہ ان لوگوں کا قول ہے جو مدبر اشیاء کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ انبیاء و رسل کی اور ان کے ارشادات کی تکذیب کرتے ہیں۔ انبیاء جو خبریں دیتے ہیں ان کے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ کتب الٰہی کو داستان اور اساطیر قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے جو دین اپنے لیے بنایا ہے وہ انہی کے افکار و آراء کا نتیجہ ہے اور اشیاء کا وجود انکے فنا پذیر ہونے کا ثبوت ہے اور یہ آسمان کی گردش زمین کی حرکت، انقلاب زمانہ، اختلاف حوادث جو دنیا میں رونما ہو کر نفع و ضرر کا سبب بنتے رہتے ہیں، موت، ابتلا، مصیبت، اضطراد النفس، یہ سب چیزیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایک صانع مدبر موجود ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ مٹھاس کھٹاس بن جاتی ہے اور شیرینی تلخی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور ہر چیز تغیر اور فنا کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے؟

---

[1] اس زندیق نے وہ مسئلہ اٹھایا تھا جو فلسفۂ یونان کا پیدا کیا ہوا ہے یعنی اصل چیز مادہ ہے۔

امام صادق نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے جو چیز پیدا کی ہے وہ غیر شے سے پیدا کی ہے، اس لیے کہ ایسی شے کا وجود مستحیل ہے جس سے ہر چیز وجود میں آ سکے۔ اس لیے کہ مادہ اگر صفت واحدہ کا حامل ہے تو اس سے ایسی چیزیں کس طرح پیدا ہو سکتی ہیں جو اوصاف مختلف رکھتی ہوں۔ اور اگر جامد ہے تو اس سے زندہ چیز کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ اور اگر زندہ ہے تو اس سے جامد چیز کس طرح وجود میں آ سکتی ہے؟ اور یہ ممکن نہیں کہ بیک وقت وہ زندہ بھی ہو اور جامد بھی، کیونکہ دو متضاد اوصاف کا ایک جگہ جمع ہونا محال ہے پھر اگر یہ مادہ زندہ ہے تو اس سے میت کا تولد کس طرح ہو سکتا ہے۔ اور اگر میت ہے تو اس سے حی (زندہ) کا تولد کیونکر ممکن ہے؟ اور میت کو قدیم اور ازلی نہیں مانا جا سکتا۔ اور اگر مشاہدہ کسوٹی قرار دیا جا سکتا ہے تو حی سے حی کا تولد جبکہ وہ منبع حیات ہو، ممکن نہیں اور اگر یہ بات باطل طور پر فرض کر لی گئی ہے تو جو اس سے متناقض بات جو فرض کی گئی تھی، لامحالہ صحیح ہو گی یعنی اللہ تعالیٰ چیزوں کو غیر شے سے پیدا کرتا ہے۔

دو قابلِ غور امور

اس مناظرہ کو طبرسی نے "احتجاجات الصادق" میں نقل کیا ہے۔ اس سے دو امور پر روشنی پڑتی ہے

(۱) فلسفہ اور مناہج فلسفہ کا دقیق علم

یہ کہ امام جعفر صادق فلسفہ اور مناہج فلسفہ کا دقیق علم رکھتے تھے، اور اس فن کی خامیوں اور لغزشوں سے بھی پورے طور پر واقف تھے، رد شبہات میں اپنے عہد کے اندر وہ مرجع انام تھے۔ اور در حقیقت وہ اس کے مستحق بھی تھے، کیوں کہ انھوں نے اپنی ساری توجہ صرف علم ہی کی طرف مرکوز کر رکھی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ علوم و فنون میں اس درجہ مہارت رکھتے تھے کہ ان کے معاصر علماء میں کوئی ان سے پایہ ہمسری نہیں رکھتا تھا۔ ٹھیک ہے اس زمانے میں محدثین بھی تھے، فقہا بھی تھے، علماء کلام بھی تھے، علماء کونیات بھی تھے لیکن امام صادق یہ سب کچھ تھے۔ وہ امام حدیث بھی تھے امام فقہ تھے، ماہر کلام بھی اور ماہر کونیات بھی، — رضی اللہ عنہ۔

(۲) زنادقہ کے سوالات کی یکسانیت

دوسرے یہ کہ اس علمی و ذہنی مناقشہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زنادقہ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اور ایک ہی انداز میں کام کرتے رہے ہیں یعنی وجود ذات باری تعالٰے کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے رہے ہیں۔ اسی زمانہ کے اس زندیق کا انداز گفتگو آپ نے دیکھ لیا اور محسوس کر لیا ہوگا کہ اس زندیق نے ابو عبداللہ جعفر الصادق حفید علی و محمد سے جو سوالات کیے یہ وہ سوالات ہیں، جو وراثت میں زنادقہ کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔ ان سوالات اور اس انداز فکر سے ان کا تصور عقل اور ضعف فکر بہت اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

وحدانیت اسلام پر اعتراض

امام صادق کے ان مناظرات نے بڑی شہرت حاصل کی یہاں تک کہ وہ علماء کے مابین مصدر اور مرجع بن گئے، زنادقہ کے ٹیڑھے ٹیڑھے سوالات کا جواب یہ علماء آپ ہی سے آکر لیتے تھے، اور توجیہات کا علم حاصل کرتے تھے۔

یہ زنادقہ ہر چیز میں شک پیدا کر دیتے تھے، اور فریب کاری سے کام لے کر حقائق اسلامیہ کو گرد و غبار میں چھپا دینے کی کوشش کرتے تھے، خاص طور پر جس چیز کو یہ سب سے زیادہ ہدف اعتراض بناتے تھے وہ وحدانیت تھی، جو اسلام کی خصوصی اور امتیازی چیز ہے۔

ملحد ابو شاکر دیصانی اور امام جعفر صادق

حضرت امام جعفر صادق کے زمانے میں ایک ملحد شخص تھا جس کا نام تھا ابو شاکر دیصانی یہ ایک غیر مسلم طائفہ کا سربراہ تھا جو دیصانیہ کے نام سے معروف تھا، ایک مرتبہ اس نے کہا:

قرآن میں ایسی عبارت بھی موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ایک نہیں ہے، چنانچہ قرآن میں آیا ہے۔

وھوالذی فی السماء وفی الارض الٰہ (وہی ذات ہے جو آسمان میں بھی قابل عبادت ہے اور زمین میں بھی قابل عبادت ہے)

یہ بات امام صادق تک پہنچی، اور جس سے یہ بات ملحد کی ہوئی تھی وہ کوئی جواب نہ دے سکا تھا حضرت امام نے فرمایا:-

"یہ ایک خبیث زندیق کا کلام ہے جب تم اس زندیق کے پاس جاؤ، تو اس سے سوال کرو تو کوفہ میں کس نام سے پکارا جاتا ہے؟ وہ کہے گا اس نام سے۔ پھر اس سے دریافت کرو، تو بصرہ میں لوگ تجھے کس نام سے یاد کرتے ہیں؟ وہ جواب دے گا اس نام سے پھر اس سے کہنا اسی طرح ہمارا رب آسمان میں بھی موجود ہے اور زمین میں بھی، سمندر میں بھی۔ اور میدان وصحرا میں بھی، وہ ہر جگہ، خواہ وہ کوئی سی بھی ہو موجود ہے۔

ملحد کے اعتراض کا امام صادق کی طرف سے یہ جواب کتنا صاف اور واضح ہے۔ اور یہ زندیق جو عربی جانتا تھا یقیناً یہ بھی جانتا ہوگا کہ کلمہ "الٰہ" خبر واحد ہے اور تعدد مکان کے باعث تعدد اخبار ضروری ہے لیکن اس سے تعدد مبتدا نہیں ثابت ہوتا، جیسے کوئی کہے۔

" زید عراق میں عالم ہے، مدینہ میں عالم ہے، مکہ میں عالم ہے"

تو اصف بہر حال ایک ہی ہے، گو خبر میں تعدد ہے اور یہ خبر کا تعدد، مقامات کے تعدد کے ساتھ ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن وصف ایک ہی رہتا ہے کیونکہ حقیقت واحد ہے۔

ان مناظرات سے - اور ایسے مناظرات بہ کثرت ہیں —

علم کلام میں حضرت امام کی بصیرت

ثابت ہوتا ہے کہ حضرت امام کو علم کلام میں کس درجہ بصیرت حاصل تھی۔ اور جو لوگ عقائد صحیحہ سے انحراف کرتے تھے یا اعتقاد صحیح پر اعتراض کرتے تھے انھیں کتنا مسکت جواب آپ کی طرف سے مل جایا کرتا تھا!

امام ہمام فرقہ اور گروہ کے تصور سے ماورا تھے

جہاں تک معتزلہ کا تعلق ہے۔ ان کے افکار و آراء سے آپ پورے طور پر ہم آہنگ اور متفق نہیں تھے بلکہ حقیقت نفس الامری تو یہ ہے کہ آپ کسی فرقہ اور رجال اور طائفہ کے پابند نہیں تھے، بلکہ اس سے بھی بڑی اور واضح حقیقت یہ ہے کہ آپ فرقہ اور گروہ کے تصور سے ماورا تھے۔ آپ کلمہ حق کہنے کے خوگر تھے خواہ آپ کی رائے معتزلہ سے موافق ہو یا کسی اور سے، آپ نے جس منہاج قدیم کو اپنے لیے مختص کرلیا تھا وہ تو التزام کتاب وسنت اور ان حقائق کی تائید جو کتاب وسنت سے موثق ہوں۔ اور عقل و

مسلمین سلیم کی بارگاہ میں وہ خیال قبول ہوں۔

کونیات اوراس سے متعلقہ علم پر گہری نظر

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے علم کونیات اوراس سے متعلقہ علوم وفنون کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم جابر بن حیان کے ان رسالوں کا ذکر کر چکے ہیں، جوانھوں نے اپنے استاد حضرت امام کے ارشادات پر مشتمل نشر کئے تھے۔ ابن خلکان نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

شہرستانی کا رسالہ الدلائل والمسائل

ہمیں ایک رسالہ ملا ہے جو امامیہ کے ایک بہت بڑے عالم ہبتہ الدین الحسینی الشہرستانی کا ہے۔ اس کا نام ہے "الدلائل والمسائل"، اس میں متعدد مسائل کا ذکر ہے اور جابر بن حیان کا امام جعفر صادق سے اتصال بھی مذکور ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

جابر بن حیان کی شخصیت اور خصوصیت

اصل عبارت "الدلائل والمسائل" کی جابر بن حیان کے بارے میں:۔

"ابوموسیٰ جابر بن حیان، صرفی کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ امام جعفر صادق کے مشاہیر تلامذہ میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ ہیں۔ سنہ ۸۰ھ میں بہ مقام طوس (خراسان) پیدا ہوئے۔ علوم ریاضیہ اور نجوم میں کمال حاصل کیا۔ بہت سی کتابیں تالیف وتصنیف کیں۔ امام صادق علیہ السلام سے ان کا تلمذ ثابت ہے حضرت امام کی بارگاہ میں ان کے اختصاص اور امتیاز کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے لیے تعلیم کا وقت الگ سے مقرر تھا اور اس وقت کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک درس نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کے اگر سب نہیں تو بہت سے رسالوں کا مصدر ان کے استاذ امام جعفر کا دبستان علم ہے۔ ان کے رسائل میں نے پچاس دیکھے ہیں جو قدیم خط میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں انھوں نے لکھا ہے:۔

مجھ سے جعفر علیہ السلام نے فرمایا:۔

"مجھے جعفر نے بتایا!"

"مولائی جعفر علیہ السلام نے مجھ سے تحدیث کی!"

جابر نے ایک اور رسالہ میں جس کا نام "المنفعۃ" ہے، رقم کیا ہے!

"میں نے یہ علم جعفر محمد سید زمانہ سے حاصل کیا ہے!"

——— ❖ ———

جابر کے لکھے ہوئے رسالوں میں سے اس وقت تک کل پانچسو رسالے جرمنی میں چھپ چکے ہیں جو برلن اور پیرس کے سرکاری کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ابن خلکان نے جابر کے حالات و سوانح کے ضمن میں ان رسالوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ اسماعیل بن امام جعفر کی امامت کے معتقد تھے، چنانچہ ان کا شمار اقطاب اسماعیلیہ میں ہوتا ہے، ان کا لقب صوفی اس لیے نہیں پڑا کہ یہ صوفی تھے بلکہ اس لیے پڑا کہ حکمت و فلسفہ میں انھیں شہرت تامہ حاصل تھی۔ اور حکمت کو "سوف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ فیلسوف کہے جاتے ہیں ان سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ صوف حکمت میں کثرت استعمال کے باعث لفظ "صوفی" کا س، ص سے بدل گیا اور پھر صوفی ہر وہ شخص کہلایا جانے لگا جو اظہار زہد کے لیے اون کا لباس پہنتا ہو۔"

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جابر امام جعفر صادق سے بہت زیادہ ربط و سلسلہ رکھتے تھے انھوں نے انہی سے کسب علم کیا تھا اور استاذ کی نظر میں اتنی خصوصیت رکھتے تھے کہ دراست میں وہ منفرد رکھے گئے، کسی اور کو ان کے ساتھ شریک نہیں کیا گیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام لوگ جو کسب علم و فیض کے لیے وہاں آیا کرتے تھے حقائق کو سمجھنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، نہ ان میں اتنی عمق تفکیر تھی، جتنی وقت حقائق کے لیے ضروری تھی۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو رسائل جابر نے قلم بند کئے ہیں ان میں امام صادق فکری طور پر شریک ہیں، اگرچہ لکھا جابر نے لیکن حضرت امام اس سے مطلع تھے ان میں پچاس رسالے ایسے ہیں جو کاتب اور امام صادق کے اتصال فکری پر دلالت کرتے ہیں۔

مدار شمس و قمر و نجوم سے واقفیت تام

اس جگہ خاص طور پر جو بات ہم زیر بحث لانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ امام جعفر صادق کی قوت فکر یہ اتنی عمیق اور وسیع تھی کہ اس نے صرف دراسات اسلامیہ اور علم قرآن و سنت و عقائد ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ علم کونیات اور اس کے اسرار و رموز پر بھی پوری توجہ کی، اور ان کی فکر فلک پیمانے مدار شمس و قمر گردش افلاک مدار نجوم وغیرہ کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔

دراست نفس انسانیہ کی طرف التفات

اگرچہ امام صادق نے علم کونیات حاصل کر لیا تھا، اور وہ اصل کونیات سے واقف تھے۔ ان فلاسفہ کے افکار سے بھی واقف تھے جو لوگوں کے اعتقادات میں خلل ڈالتے اور وسوسے پیدا کرتے تھے اور جو مشرکین یونان کے پیروکار

تھے لیکن ایک اور بات یہ بھی تھی کہ ان سب علوم کے علاوہ حضرت امام نے دراست نفس انسانیہ کی طرف بھی پورا پورا التفات فرمایا تھا اور اگر تاریخ یہ کہتی ہے کہ فلسفہ آسمان سے سقراط انسان تک لایا تو تاریخ کو بھی ماننا پڑے گا کہ امام جعفر صادق نے علم ارض دسما اور علم انسان وشرائع کو اپنی فکر کا طور بنایا۔

حضرت امام نے انسان اور کونیات کی دراست کے باعث اخلاق انسانیہ کو انسان کی تقویم وتہذیب میں اس کا کتنا حصہ ہے اور دین اس پر کس طرح انداز ہوتا ہے، چنانچہ انھوں نے اسی باعث یہ ادراک بھی حاصل کیا کہ طبائع اور نفوس کی تہذیب اسی پر منحصر ہے۔

اخلاق کے بارے میں یا دوسرے الفاظ میں اخلاقیات سے متعلق امام صاحب کے ارشادات موجود ہیں، انھوں نے اخلاقیات کا درس دیا اور یہی سبب ہے کہ ان کے شاگردوں نے ان چیزوں کو مرتب اور مدون بھی کر لیا، چنانچہ ان سے منقول کئی مجموعے مسترشد میں ملتے ہیں۔

اس سلسلہ کا سوال مرشد کا جواب

اگرچہ ہم امام صاحب کے دراسات علمیہ کا باب اب ختم کر رہے ہیں لیکن اس کا اختتام ایک بہت اچھی بات پر کرنا چاہتے ہیں اور وہ زہد سے متعلق آپ کے بعض کلمات وارشادات ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم آپ کے اور ثوری کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی، اسے پیش کریں گے۔

ثوری نے ایک مرتبہ آپ کو لباس فاخرہ میں دیکھا، بات اسی موضوع پر چل پڑی، یہ مناظرہ ذیل درحقیقت مسترشد کا سوال اور مرشد کا جواب ہے۔

سفیان ثوری نے حضرت امام سے عرض کیا،

"یہ لباس فاخرہ جو آپ زیب تن کئے ہوئے ہیں آپ کا لباس تو نہیں ہے۔

جواب میں حضرت امام صادق نے فرمایا:۔

"جو کچھ میں کہتا ہوں اسے غور سے سنو۔ وہ تمہارے خیر عاجل وعاجل کا سبب ہوگا، اگر تم سنت اور حق پر مرو اور بدعت پر تمہارا خاتمہ نہ ہو تو میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک واقعہ بتاتا ہوں، وہ یہ کہ آپ کا دور تنگی اور مالی پریشانی کا دور تھا لیکن جب دنیا (اسلام کے) قدموں پر آگری تو اب اس کے مستحق ابرار ہیں نہ کہ فجار اور مومن ہیں نہ کہ منافق — ثوری تمہیں یہ بات کیوں گراں گزری، خدا کی قسم میں بے شک وہی ہوں جیسا تم میرے بدن پر لباس دیکھ رہے ہو۔ میں نے جب سے شعور وبلوغ کی منزل میں قدم رکھا ہے۔ خدا کی قسم کوئی صبح وشام ایسی نہیں گزری کہ میں نے اپنے مال میں حکم خدا کے مطابق مستحقوں کا حق نہ رکھا ہو۔"

حضرت امام کا زہد تقشف نہیں تھا

حضرت امام رضی اللہ عنہ کی زندگی یکسر زہد وورع تھی لیکن

انھوں نے تقشف کا اظہار کبھی نہیں کیا، نہ ان کا زہد کسی درجہ میں بھی تقشف کا پہلو لیے ہوئے تھا، ان کا زہد عبادت تھا، عبارت، در یاضت سے، جود و عطا اور داد و دہش سے، ان کے در سے کوئی حاجت مند مایوس نہ لوٹتا۔ ان کا زہد اس تقشف سے عبارت نہیں تھا جس کا مقصد جسم کو اذیت دینا ہوتا ہے کہ روح اسی طرح سربلندی کی منزلیں طے کرسکتی ہے۔

ایک متقشف جماعت سے سوال و جواب ایک مرتبہ حضرت امام کے پاس کچھ لوگ جو تقشف میں شدت کا مظاہرہ کررہے تھے۔ ان کے خیال میں زہد کی یہ سب سے برتر اور اعلیٰ صورت تھی، حضرت امام سے بھی وہ اس کی توقع رکھتے تھے، آپ نے ان سے اس مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہوئے ارشاد کیا،

"تمہارے ان مزعومات کی آخر دلیل کیا ہے؟"

ان لوگوں نے اس سوال کے جواب میں کہا۔

"ہماری دلیل اللہ تعالےٰ کی کتاب ہے"

یہ سنکر حضرت امام ہمام نے ارشاد فرمایا:

"تو وہ دلیل لاؤ کہ قرآن سے بڑھ کر اس کی مستحق اور کون چیز ہے کہ اس کی پیروی کی جائے اور اس پر عمل کیا جائے"

ان لوگوں نے اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا، اللہ تبارکؐ تعالیٰ اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال وصفات بیان کرتا ہوا فرماتا ہے۔

"ویوثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصہ، ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون

یعنی، یہ اپنے سے ضرورت مندوں کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ فاقہ ہی سے کیوں نہ ہوں۔ اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"

گویا اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کی مدح فرمائی پھر ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا۔

ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکینا و یتیما و اسیرا

یعنی یہ لوگ محض خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

کیا قرآن کی یہ دلیلیں ہمارے نقطہ نظر کی تائید میں نہیں ہیں؟

حاضرین میں سے ایک اور شخص نے جو اب تک خاموش بیٹھا تھا کہا:

"ہم دیکھتے ہیں آپ اچھے کھانے سے کتنی نفرت کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود لوگوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنا مال لے کر نکلیں تاکہ آپ اس سے تمتع حاصل کریں۔

اس کے جواب میں حضرت امام صادق نے فرمایا۔

وہ باتیں چھوڑو جن سے کوئی فائدہ نہیں۔ اے شخص تو بتا کیا تم قرآن کے ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کا علم رکھتے ہو، جس کے نہ جاننے سے اس امت کے بہت سے لوگ گمراہ اور ہلاک ہو گئے؟

ان لوگوں نے عرض کیا:

"ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ میں سے سب کا تو نہیں البتہ بعض کا علم ہے ہمیں"!

امام جعفر صادق نے یہ سن کر ارشاد فرمایا:

حضرت امام کی تلقین و توضیح

"پھر تمہیں یہ باتیں کرنے کا کیا حق ہے؟ یہی حال احادیث رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ہے۔

سب سے پہلے کتاب اللہ ہے قرآن نے جن لوگوں کے حسن عمل کی خبر دی ہے۔ وہ مباح اور جائز ہیں ان کی ممانعت نہیں کی گئی ہے اور ان کا ثواب اللہ عزوجل کی طرف سے ہے اور یہ کہ اللہ تعالٰی نے اس بات کا حکم دیا ہے جو عمل کے خلاف تھا، پس اس کا اور ان کے فعل کا ناسخ ہوا، اور گویا اللہ تعالٰی نے مسلمانوں پر رحم کرتے ہوئے اس سے منع کیا تاکہ اپنے آپ کو اور اپنے عیال کو ضرر نہ پہنچائیں کہ ان میں ضعیف بھی ہیں، کم عمر بھی، بچے بھی، پیر کہن سال بھی، بڑی بوڑھیاں بھی، یہ لوگ بھوک پر صبر نہیں کر سکتے، پس اگر میں اپنی یہ روٹی، اور اس روٹی کے علاوہ کوئی اور میرے پاس نہ ہو کہ صدقہ کر دوں۔ تو یہ اور خستہ ہو جائیں گے اور بھوک سے ہلاک ہو جائیں گے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے' پانچ خرمے یا پانچ دینار یا پانچ درہم اگر کسی کی ملکیت میں ہیں، اور وہ انھیں خرچ کرنا چاہتا ہے تو افضل یہ ہے کہ پہلے اپنے والدین پر خرچ کرے پھر اپنے آپ پر اور اپنے عیال پر' پھر اپنے حاجت مند قرابت داروں پر' پھر اپنے حاجت مند پڑوسیوں پر' پھر اللہ کے (عام) راستے میں،' اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک انصاری کے بارے میں فرمایا جس نے اس حالت میں اپنے مرنے کے وقت چھ غلام آزاد کر دیئے تھے، اور یہی اس کی ملکیت تھے کہ اس کے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔

"اگر یہ بات تم نے پہلے سے مجھے بتا دی ہوتی تو میں تمہیں اجازت نہ دیتا کہ اسے مسلمانوں کے ساتھ دفن کرو، اس نے اپنے بچوں کو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

میرے والد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (صدقہ کا آغاز)
اس سے کرو جس کی ذمہ داری تم پر ہو پھر اس سے قریب، پھر اس سے قریب۔
اور قرآن بھی تمہارے قول کا رد ہی کرتا ہے۔ خدائے عزیز و حکیم ارشاد فرماتا ہے:
والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما
یعنی، وہ جب خرچ کرتے ہیں نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں۔ اور ان کا خرچ اعتدال پر (مبنی) ہے۔
پس کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تبارک و تعالٰی کا ارشاد اس امر کے خلاف ہے جو تم کہہ رہے اور کر رہے ہو؟ نیز اللہ تعالٰی فرماتا ہے:
انہ لایحب المسرفین (اللہ فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتا) اس طرح اس نے اسراف سے منع فرمایا ہے، اور تقتیر (بخل) سے بھی منع فرمایا۔ انسان کو یہ زیبا نہیں ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے سب دے ڈالے اور پھر اللہ سے مانگنے بیٹھ جائے تو اس کی دعا پوری نہیں ہوگی جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"میری امت میں بعض اس قسم کے لوگ ہیں کہ ان کی دعا مستجاب نہیں ہوگی"
• وہ شخص جو اپنے والدین کو بد دعا دے۔
• وہ شخص جو اپنے قرض دار کو بد دعا دے کہ اس کا مال لے گیا۔ اور اس نے لکھت پڑھت نہ کی ہو۔
• جو شخص اپنی بیوی کو بد دعا دے، حالانکہ اللہ تعالٰی نے اس سے چھٹکارا پانے کی سبیل (طلاق) مرد ہی کے ہاتھ میں رکھی ہے۔
• وہ شخص جو گھر میں بیٹھا دعا مانگے یا اللہ مجھے رزق دے، اور طلب رزق کی سعی نہ کرے اللہ تعالٰی اس سے کہے گا "اے میرے بندے کیا میں نے تیرے لیے طلب کے دروازے (وسائل) نہیں کھول رکھے تھے۔ اور اعضاء و جوارح صحیحہ کے ساتھ زمین پر تگ و دو کرنے کی سہولتیں نہیں دی تھیں؟
• اور وہ شخص جسے اللہ تعالٰی مال کثیر عطا فرماتا ہے، اسے وہ خرچ کر ڈالتا ہے اور پھر دعا مانگنے بیٹھ جاتا ہے اے اللہ (عطا کر) اللہ تعالٰی اس سے کہتا ہے کیا میں نے تجھے رزق وسیع عطا نہیں کیا تھا، پھر کیا تو نے اپنے اعتدال و اقتصار سے کام لیا؟ اور جب کہ میں نے تجھے اسراف سے منع کیا تھا پھر تو نے یہ فضول خرچی کی؟
• اور وہ شخص جو قطع رحم کے لیے دعا کرتا ہے۔

قدر رکھتا ہے، اس سے دشمن کو دفع کیا جا سکتا ہے۔ سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ بجائے خود ایک قوت ہے، اور عبادت کو بھی معیشت مطمئنہ سے تقویت ملتی ہے۔

حدود کے اندر مال و دولت کا حصول ناجائز نہیں

پس ان ارشادات کا اقتضا یہ ہے کہ مومن کو مال حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیئے اور اس کا حق دینا چاہیئے، اس سے بھاگنا نہیں چاہیئے، کیوں کہ اس سے فرار کے معنی ہیں واجبات اور تکلیفات سے فرار کیونکہ اگر کسی کے پاس مال ہے تو وہ امور خیر میں مال خرچ کرنے پر مکلف ہے۔ یعنی اپنے اہل پر اپنے پڑوسیوں پر اور عام فقراء پر خواہ وہ کسی دین و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اور جہاد فی سبیل اللہ پر۔ پس جو مال حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا وہ ان واجبات عالیہ سے راہ فرار اختیار کرتا ہے۔

حضرت امام کے دلائل و براہین کی نوعیت

اس جگہ ہم ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔

اور وہ یہ کہ مناظرات اور مناقشات حضرت امام اور ان کے عقیدت کیشوں کے مابین رونما ہوئے یہ عقیدت کیش آپ پر اعتراض کرتے تھے اور آپ دلائل و براہین کی روشنی میں جواب دیتے تھے اور یہ دلائل و براہین مبنی ہوتے تھے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر۔

اس سے ہمارے اس قول کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت امام کا علم تمام تر وہبی نہیں تھا بلکہ اس کا بڑا حصہ کسبی تھا۔ جو آپ نے اپنے آباء کرام اور اجداد عظام سے حاصل کیا تھا۔ نیز اپنے ہم عصر عالموں اور فاضلوں سے بھی ربط و صلہ قائم رکھا تھا، انھوں نے آپ سے بہت کچھ حاصل کیا اور آپ کو بھی اگر ان کے پاس کوئی قابل اخذ چیز ملی تو لے لی اور ہمیشہ سے متبوع کی یہی شان رہی ہے۔

اوپر جو محاضرات قیمہ ہم نے ذکر کئے ہیں۔ وہ ان احادیث پر مشتمل ہیں، جنہیں امام صادق نے روایت کیا ہے مگر سند کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور اگرچہ یہ حدیثیں کتب سنت مشہورہ میں بالکل ان الفاظ و عبارات کے ساتھ نہیں ہیں لیکن مفہوم و معنی میں پورے طور پر یکسانیت رکھتی ہیں۔ یہ وہ صحابی ہیں جو متعدد احادیث میں وارد ہوئے ہیں، یہ پورے طور پر اس اخلاق اسلامیہ سے متفق ہیں جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہے۔

وہ حقیقت جو روز روشن کی طرح واضح ہے

بہر حال یہ ہیں وہ اخبار و روایات، جو تواتر اور تسلسل کے ساتھ کتب تاریخ میں مذکور اور ان مؤرخین کے قلم پر جاری ہیں جنہوں نے اس زمانے کی تاریخ پر قلم اٹھایا ہے اور ان سب سے جو حقیقت روشن اور

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا :

"پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو بتایا کہ خرچ کس طرح کرنا چاہیئے ؟ ارشاد فرمایا :

ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسورا

یعنی ، نہ اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لینا چاہیئے ، نہ بالکل کھول دینا چاہیئے ، ورنہ الزام خوردہ تہی دست ہو کر بیٹھ رہو گے !"

اسی طرح احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی کتاب اللہ کی تصدیق ہوتی ہے سلمان فارسی اور ابوذر غفاری کے فضل و زہد کا کیا کہنا ؟ لیکن سلمان کی حالت یہ تھی ، کہ انھیں ، جب (بیت المال سے) وظیفہ ملتا تھا تو سال بھر کے کھانے کا انتظام اس سے کر لیتے تھے ، یہاں تک کہ دوسرا سال آجاتا تھا ۔ ایک مرتبہ ان سے کہا گیا اے ابوعبداللہ آپ اتنے بڑے زاہد ہو کر آئندہ کا اتنا انتظام کرتے ہیں کیا آپ نہیں جانتے موت آج یا کل آجائے وہ جواب دیتے تھے ، جس طرح تمہیں میری موت کا اندیشہ ہے میرے جینے کی امید کیوں نہیں ہے ؟ اور ابوذر کے ساتھ بکری اور اونٹنیاں تھیں ۔ جب ان کے پاس کوئی مہمان آجاتا ، یا انھیں خود بھوک لگتی تو دودھ دوہ لیتے یا ذبح کر کے گوشت استعمال کرتے ۔

ان لوگوں سے بڑھ کر فضل و زہد کس میں ہوگا ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کے لیے کلمات مدح ارشاد فرمائے ہیں لیکن ان میں سے کون تھا جو ملکیت نہ رکھتا ہو ؟ جیسا کہ تم لوگوں سے چاہتے ہو ، کہ وہ سب کچھ دے ڈالیں ، اپنا اور اپنے بال بچوں کا خیال نہ کریں ۔

حضرت امام رضی اللہ عنہ کے ان ارشادات گرامی کا مطلب یہ ہے کہ امر حلال پر اکتفا کا نام زہد ہے ۔ اس سے تجرد کا نام حلال نہیں ہے ، نہ زہد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ نے جن طیبات کو حلال کر دیا ہے انھیں حرام کر لیا جائے ۔

روح کی سربلندی کے لیے تعذیب جسم ضروری نہیں

حضرت امام کے ان ارشادات قیمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں زہد کیا ہے ؟ اور اس کی حیثیت و نوعیت کیا ہے ؟

اس محاضرۃ (تقریر) رائعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روح کی سربلندی کے لیے تعذیب جسم کا نام زہد نہیں ہے ۔ اور مال و دولت سے یکسر نفور اور کنارہ کش ہو جانا دین نہیں ہے ۔ کیونکہ مال بھی ایک مستقل

واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس امام جلیل کی حیات گرامی وقف تھی۔ تمام تر علم کی نشر و تبلیغ اور کسب و تحصیل کے لیے۔

سن طفولیت ہی سے آپ نے اس طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے بزرگوں اور ہم عصر اکابر سے تحصیل علم کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے آپ کا سینہ روشن اور منور ہوگیا اور یہ نور پھیلتا چلا گیا اس سے ہر صلاحیت رکھنے والا مستفید ہوا خواہ اس نے شخصی طور پر آپ کی زیارت کی ہو یا نہ کی ہو۔

لیکن جس شخص تک بھی آپ کا علم پہنچ گیا۔ خواہ بہ طریق اتباع، خواہ بہ طریق رسائل، اس میں طیب سے خبیث کو پہچاننے کی استعداد ہوگئی۔

حضرت امام کو طلب صرف علم کی تھی امام صادق تمام تر علم کے لیے وقف تھے! آپ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے علم کے سوا کوئی چیز طلب نہیں کی۔

نہ آپ کو مال کی طلب تھی نہ زمین اور جاگیر کی، نہ تجارت اور کاروبار کی۔

اور جس ہستی کی تربیت اس انداز میں ہوئی ہو، جس کا نشو ونما اس فضا میں ہوا ہو، وہ علم اسلام کے سوا تجارت، زراعت یا صناعت کی طرف متوجہ بھی کیسے ہوسکتا تھا؟

حضرت امام کی عملی سیاست سے بے تعلقی اسی طرح آپ عملی سیاست کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوئے کیونکہ آپ کی رائے میں خروج کا نتیجہ فتنوں کی صورت میں رونما ہوتا تھا اور فتنوں کے باعث حکام وقت کی ظلم و تشدد کی پالیسی اور زیادہ سخت ہو جاتی تھی، طغیان بڑھ جاتا تھا، استبداد کا رنگ اور زیادہ چوکھا ہو جاتا تھا، منزلِ مقصود دور ہو جاتی تھی اور حالات بدتر۔

اور جو ہستی محراب علم میں معتکف ہوگئی ہو اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ وہاں سے باہر نکلتی اس لیے کہ علم میں نور ہے اور سکون ہے۔

عصرِ امام جعفر صادق

اس عہد کے

حالات، مؤثرات، کیفیات

امام جعفر صادق علیہ السلام کا عہد، اسلام کی تاریخ میں فکر آفریں دور کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

اس عہد میں علوم اسلامیہ نے ایک مرتب اور منضبط صورت اختیار کی،

اسی عہد میں علوم اسلامیہ کی تدوین ہوئی۔

یہی دور ہے جب اقوام وادیانِ غیر کے علوم وفنون پر مسلمانوں کی دسترس ہوئی اور ان کے اندر نئے نئے فکری رجحانات پیدا ہوئے۔

اسی زمانے میں مسلمانوں نے، دوسروں کا علم حاصل کیا اور اپنا علم دوسروں کی جھولی میں ڈالا۔

غرض یہ دور ہر اعتبار سے ایک ایسا دور ہے جس نے تاریخ علوم اسلامیہ کے ایک نئے باب کا افتتاح کیا!

امام جعفر صادق کا عہد

علم قرآن، علم سنت اور تخریجات فقہیہ کا عہد

مؤثرات تفکیر و تاثیر سیاسی، فکری، اجتماعی اور طبیعی سوسائٹی اور ماحول کے اثرات انسانی طور پر ذہین و فطین لوگوں اور احباب علم ونظر پر پڑا کرتے ہیں اور یہ اثرات ان کی تفکیر میں واضح اور نمایاں نظر آتے ہیں۔

اور تاثیر و تاثر کی یہ کیفیت ایجابی بھی ہوتی ہے اور سلبی بھی، یہ اشکال و انواع مختلفہ کی حامل ہوتی ہے۔

ایجابی تاثیر ایجابی تاثیر تو تاثر علمی روح ہے جو اس عہد میں عام ہوتی ہے جس میں مفکر یا امام وقت کی زندگی بسر ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا۔

"آپ کو یہ فقہی مرتبہ کس طرح حاصل ہو گیا؟"

فقیہ عراق نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"میں نے معدن علم میں زندگی کی گھڑیاں گزاری ہیں اور ایک شیخ وقت کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے!"

معدن علم سے مراد وہ ہیئت (فضا) فکریہ ہے جس نے امام ابوحنیفہ میں یہ صلاحیت اور استعداد پیدا کی۔

اس ارشاد سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہیئت کی تاثیر بڑی گہری اور مؤثر ہوتی ہے اور جو علوم اس زمانے میں تحقیق اور بحث و نظر کی کسوٹی پر کسے جاتے ہیں وہ ان تمام مفکرین پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جو اس فضا میں رہتے سہتے اور زندگی بسر کرتے ہیں جو ان کی تفکیر کو ابھارتی اور اس کے ثمرات کو نمایاں کرتی ہے۔ اسی فضا میں ان کی فکر پروان چڑھتی اور تغذیہ حاصل کرتی ہے۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نفع حاصل کرنے والی طبیعتیں اور شخصیتیں متفاوت ہوتی ہیں، لیکن جو طبیعتیں اور

شخصیتیں خصوصیات خاصہ کی حامل ہوتی ہیں وہ پورے طور پر اس سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔

امام جعفر صادق کے احوال و شئون

اب امام جعفر صادق کے احوال و شئون پر ایک نظر ڈالیے حضرت امام کے عہد میں جتنی چیزیں بھی علوم پر اثر انداز ہوئیں۔ ان سب سے انہوں نے واقفیت رکھی، اور ان کے ایجابی پہلو کو اختیار کر لیا۔

اس زمانے میں مدینہ منورہ معدن علم نبوی تھا۔

حضرت امام کا عہد علم قرآن، علم سنت اور تخریجات فقہیہ کا عہد تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ آل بیت کا علم متوارث طور پر منتقل ہوتا ہوا سلف سے خلف تک کے صدور میں محفوظ و مدون چلا آ رہا تھا، ساتھ ساتھ صحابہ کرام اور تابعین عظام کا علم بھی شائع و ذائع تھا، اور وہ بھی یہی تھا۔ پس امام ہمام کے بارے میں یہ تسلیم کرنا چاہئیے کہ ان کے پاس جو علمی ذخیرہ تھا اور ان کا ذہن و دماغ جس علم کا گنجینہ بنا ہوا تھا وہ وہی تھا جو انھوں نے اپنے آباؤ اجداد سے حاصل کیا تھا۔

مسائل اعتقادیہ

علم عقائد کے سلسلہ میں بہت سے نئے افکار ابھرے اور اشاعت پذیر ہوئے جو "علم کلام" کے نام سے موسوم ہوئے، لوگوں میں قدر اور ارادہ بشر کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ خلافت کے بارے میں بحث و گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور یہ چیز زیر بحث آنے لگی کہ خلیفہ کے اختیار کرنے کی صورت کیا ہونی چاہیئے۔

یہ افکار و خیالات پھیلنے اور منتشر ہونے لگے!

ان افکار و خیالات کی تاثیر بیک وقت ایجابی بھی تھی اور سلبی بھی، اہل اہوا و نفسانیت اپنے گمراہ کن آراء کو پھیلانے میں مصروف و منہمک تھے اور کوئی شبہ نہیں لوگوں کا ایک حلقہ تھا جو ان خیالات کو قبول بھی کر رہا تھا اور ان سے متاثر بھی ہو رہا تھا۔

ان حالات میں امام وقت نے حق کی تجلی دکھائی اور اپنی رائے سلیم کا اظہار و بیان فرمایا، نتیجہ یہ ہوا کہ جن اہوا کی تاثیر سلبی تھی ان کا نتیجہ ایجابی برآمد ہوا اور مفید علمی ثمرات ظاہر ہوئے، جنہوں نے لوگوں کو سلبی انداز تفکیر سے منحرف کر کے ایجابی طرز تفکیر پر لا ڈالا۔

علوم عقلیہ و فلسفہ اور عقل و فکر میں ٹکر

عصر امام جعفر صادق میں علوم عقلیہ و فلسفیہ اور عقل و فکر اسلامی میں ٹکر شروع ہو گئی تھی۔

مسلمانوں میں بھی ہر طرح کے لوگ پیدا ہو گئے تھے جہاں وہ تھے جو ان ثمرات عقلی کی خوشہ چینی میں مصروف بھی تھے جو خالص دراسات اسلامی میں لگے ہوئے تھے، یہ ایسا مرکز وجہ تیار ہو گیا تھا جو صالح اور غیر صالح عناصر

پر مشتمل تھا جس نے موحدوں، اسلام پسندوں اور فکری اتفاق رکھنے والوں میں ایک کشمکش پیدا کر دی تھی۔

اور یہ تاثیر سلبی بھی ہوتی ہے!

سلبی تاثیر پس جو شخص فکرِ اجتماعی یا دینی یا خلقی یا سیاسی کی طرف دعوت دیتا ہے، اس کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا اور اہم ترین فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عصر کا "تنقیہ" کرے اور جن مختلف عوامل نے افکار فاسدہ اور اوہام ردیہ پیدا کر دیے ہیں جن کا حقائق ثابتہ سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے، انہیں دور کر دے، اس فکری زہر سے بچانا اور تطہیرِ عقول کا فریضہ انجام دینا اس کا سب سے پہلا کام ہے، اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ یہ وبا پھیل نہ سکے، اس کا دائرہ وسیع نہ ہو سکے، وہ ایک مختصر اور محدود سی جگہ پر سمٹ کر رہ جائے تاکہ آسانی سے اس کا استیصال کیا جائے۔ حصولِ مرام مقصد کے لیے اسے اپنے مساعی کا دروازہ کھول دینا چاہیے، اور اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہ کرنا چاہیے۔

اور تنقیہ کرنے کے سلسلہ میں جو راستہ اسے اختیار کرنا چاہیے وہ قریب ترین راستہ ہو۔

اگر اس کے عہد میں زندقہ اور الحاد کی کارفرمائی بڑھ گئی ہو اور اس کے اسالیب میں تنوع پیدا ہو گیا ہو تو اس مصلح کو جس نے دوش پر امامت فکریہ کی گراں بار ذمہ داریاں اپنے سر لے رکھی ہیں آگے بڑھنا چاہیے۔ اور کشفِ شبہات کی مہم شروع کر دینی چاہیے۔ اور عقول پر جن اوہام نے قبضہ و تسلط قائم کر رکھا ہے ان کے ازالہ میں ہمہ تن متوجہ ہو جانا چاہیے۔

اولۂ باطلہ کا ازالہ اور ادلۂ حق کی تقویت یہ تاثیر سلبی ہے نہ کہ ایجابی کہ یہ کسی عالم محقق دوران کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ اسے دفع کرنے اور دور کرنے میں اسے غیر معمولی سعی و جہد کرنی پڑی ہے، اور اس اندیشہ سے کہ اہل ضلال عوام کو گمراہ نہ کر دیں اور ان کے افکار و آراء میں فساد نہ پیدا کر دیں۔ اسے وقفِ عمل ہو جانا پڑا ہے۔

اور کوئی شبہہ نہیں، ایک پہلو سے یہ سلبی تاثیر عمل ایجابی کا مظہر ہے۔

اور یہ عمل ایجابی کیا ہے؟

یہ ہے افکار باطلہ کی تردید، ادلۂ باطلہ کا ازالہ اور ادلۂ حق کی تقویت۔

اس تنقیہ و اصلاح کے سلسلہ میں مفکر عہد اور امام زمانہ اور عالم دوران کو دوسرے علوم و فنون کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑتا ہے جس طرح سوفسطائیوں سے جدال و مناقشہ کا نتیجہ علم منطق کی طرف التفات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا جس طرح کہ علم کلام کو منحرفین فکر و نظر سے جدال و بحث کے سلسلہ میں علم منطق، آداب بحث و مناظرہ اور اصول نطق و گفتگو کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور

حق و باطل کے درمیان مناظرات اور تصادم کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسا صالح علمی مجموعہ تیار ہو گیا جو فہم و دانش کے لیے سامانِ غذا اور استفادہ کا موجب بن گیا جو غیر ضروری اور غیر نافع چیزیں تھیں وہ خود بخود پردۂ خفا میں مستور ہو گئیں اور جن سے لوگوں کو نفع پہنچ جاتا تھا وہ باقی رہ گئیں۔

امام جعفر صادق کا تبحر علوم کون و طبائع میں

حضرت امام جعفر صادق نے علوم دینیہ میں تو تبحر اور کمال حاصل ہی کیا، ساتھ ہی ساتھ عقل عربی فلسفۂ جدیدہ کے دراسات کا اثر جو پڑنا شروع ہو گیا تھا اسے بھی نظر انداز نہیں فرمایا، چنانچہ علم کون و طبائع کا گہرا اور محققانہ مطالعہ کیا، چنانچہ علم فلکیات میں آپ کو غیر معمولی دسترس حاصل تھی، اشیاء کے طبائع اور خواص کا فن بھی آپ کو دسترس میں تھا۔

جو لوگ حضرت امام کے حلقہ میں شریک ہوتے اور آپ کی خدمت میں حاضر باش تھے ان علوم سے بھی انہوں نے شغف اور دلچسپی کا اظہار کیا اور اپنی تفکیر کا انہیں خاص موضوع بنا لیا تھا اور ان کی طرف غیر معمولی توجہ کا اظہار شروع کر دیا۔

سیاسی اور اعتقادی فرقوں کی تشکیل

اور یہ فکری حرکت یکساں طور پر تمام فکری جماعتوں اور حلقوں میں جاری و ساری تھی، کوئی طائفہ اور گروہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفکیم طرز میں تباد کہن پیدا ہو گیا اور تفکیر مختلفہ کے مظاہر نمودار ہونے لگے اور یہ بات مسئلہ زیر بحث میں بہت نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے۔

لیکن ایسے علماء بھی تھے جو اس سے متاثر نہیں ہوئے اور اپنے کام میں لگے رہے، چنانچہ جنہوں نے دراست حدیث کو اپنا مرکز بنا لیا تھا وہ صرف اسی طرف منعطف رہے، کسی دوسری جانب، انہوں نے التفات نہیں کیا، ان کا صرف یہ کام تھا کہ تخریج فقہی کرتے رہیں اور استنباط احکام و مسائل میں مشغول و منہمک رہیں، جیسے سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری وغیرہم۔ حالانکہ یہ لوگ حضرت امام کے مستفیدین میں سے تھے۔ انہی میں وہ احباب بھی تھے جنہوں نے حدیث و تخریج فقہی کو اپنا شعار بنا رکھا تھا اور استنباط و افتا کے کام میں لگے ہوئے تھے، جیسے مالک رضی اللہ عنہ اور امام ابو حنیفہ و اوزاعی وغیرہ، خلفائے احصار، ممالک اسلامیہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہر شہر اپنا ایک خاص مکتب فکر اور اجتہاد رکھتا تھا، جس کا انداز دراست اسی کے ساتھ مخصوص تھا۔

علماء کی ایک جماعت ایسی بھی تھی جس نے دراست عقیدہ اور بیان توحید کو اپنا اوڑھنا بچھونا

بنایا تھا اور اس کی شدید ضرورت بھی تھی کیونکہ توحید اور عقیدے کی بے داغ تعلیمات پر زمانہ نے شک و ذیب کا گرد و غبار برسانا شروع کر دیا تھا، یہی وجہ تھی کہ سیاسی طور پر کئی فرقے پیدا ہو گئے بالکل اسی طرح جیسے اعتقادی طور پر پیدا ہو گئے تھے۔

اور ان حالات میں امام جعفر صادق کی ایک یگانہ ہستی ایسی نظر آتی ہے، جس کی نظر ہر چیز پر ہے اس کے زمانے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے مخفی نہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہم امام جعفر صادق کے بعض اہم ترین پہلوؤں پر بھی گفتگو کریں۔

عہدِ امام جعفر صادق کی سیاست

اس دَور اور اس کے ما سبق اور ما بعد حالات کا مورخانہ تجزیہ

امام باقرؑ کے ارشادات

ابن ابی الحدید کی روایت ہے کہ امام ابو جعفر محمد الباقرؑ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

اے فلاں!

ہم نے قریش کا ظلم دیکھا، اور تم نے ان کی جو پشت پناہی کی وہ منظر دیکھا لوگوں میں ہمیں کوئی اپنا نظر نہ آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب وصال فرمایا، تو انہوں نے فرمایا تھا لوگوں میں مزیت ہمیں کو حاصل ہے، لیکن قریش نے ہم پر زیادتی کی، یہاں تک کہ امر خلافت اپنے معدن سے نکل گیا، انصار کے خلاف انہوں نے جو دلیل دی تھی وہ ہمارے حق اور ہماری محبت کا نام لے کر دی تھی۔ پھر قریش میں سے ایک کے بعد ایک اس منصب پر فائز ہوتا رہا، یہاں تک کہ ہماری بیعت توڑ دی گئی، ہمارے خلاف محاذ جنگ قائم کر دیا گیا، صاحب امر خلافت (حضرت علیؑ) کو مبتلائے خلفشار رکھا گیا۔ یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ پھر اس کے بیٹے حسنؑ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی اور ان سے عہد طاعت کیا گیا، لیکن ان سے بھی دھوکا کیا گیا، اہل عراق ٹوٹ پڑے ان کے روبرو ان کے پہلو میں خنجر کی نوک چبھو دی۔ ان کے لشکر کو منتشر کر دیا۔ پھر معاویہ نے دست صلح بڑھایا جس نے ان کا اور ان کے اہل بیت کا خون بہایا۔ پھر بیس ہزار اہل عراق نے حسینؑ کی بیعت کی، مگر دھوکا دیا اور ان کے خلاف خروج کیا، حالانکہ وہ اپنے گلوں میں بیعت حسینؑ کا قلادہ ڈالے ہوئے تھے پھر انہوں نے حسینؑ کو قتل کر دیا پھر اس کے بعد تو ہم اہل بیت ہلاک و برباد ہوتے رہے۔ ہمیں مبتلائے معیصت کیا جاتا رہا، ہمیں قتل کیا جاتا رہا۔ ہمیں دہشت زدہ اور ہراساں کیا جاتا رہا۔ ہمارا اور ہمارے دوستوں کا خون کہیں بھی مامون نہ تھا۔ اور دروغ گو اور بدسرشت لوگ اپنے جھوٹ اور بدسرشتی کے باعث اپنے ہی جیسے بدکردار اور بدترین عمال و حکام کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنے لگے۔ انہوں نے جھوٹی باتیں اڑانا

شروع کیں اور ہمارے بارے میں ایسی باتیں کہنا شروع کیں، جو کبھی ہمارے منہ سے نکلی نہ تھیں، نہ جن کا ہم سے کبھی صدور ہوا تھا تاکہ ہمیں بدنام اور رسوا کر دیں اور حسن کی موت کے بعد تو یہ باتیں معاویہ کے زمانے میں اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ بڑھ گئیں۔ ہر شہر میں ہمارے ہمدرد اور بہی خواہ قتل کیے جانے لگے، ذراسی بدگمانی پر ان کے ہاتھ پاؤں قطع کر دیے جاتے، جو ہماری محبت کا مدعی ہوتا یا ہمارے پاس آنا جاتا یا تو اسے داخل زندان کر دیا جاتا، یا اس کی دولت لوٹ لی جاتی، یا اس کا گھر ڈھا دیا جاتا اور پھر عبیداللہ بن زیاد قاتل حسین کے زمانہ میں تو یہ ابتلا اور شدائد کا زور اور زیادہ بڑھ گیا، پھر حجاج آیا اور اس نے تو ہمارے ہر حامی اور دوست کو موت کے گھاٹ اتارنے کا تہیہ کر لیا۔ ذرا سی بدگمانی پر اس کی تلوار نکل پڑتی جس پر تہمت لگائی جاتی وہ عتاب سے نہ بچ سکتا، آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حجاج کے نزدیک ایک زندیق زیادہ گوارا اور پسندیدہ تھا بہ نسبت علی کا شیعہ اور حامی ہونے کے[1]!"

امام باقر اور شیخین

اگرچہ ہم نے یہ عبارت نقل کر دی ہے لیکن امام جلیل ابوجعفر محمد الباقر کی طرف ان کا تمام کا تمام انتساب درست نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اس میں اس بات کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے حضرت علیؓ کا حق غصب کر لیا تھا لیکن اسکے درست ماننے میں ہمیں تامل یوں ہے کہ حضرت امام باقر سے بکثرت ایسے آثار ثابت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شیخین کی خلافت کو درست سمجھتے تھے بلکہ ان کی یہ رائے تھی کہ جو شخص ان دونوں سے بغض رکھتا تھا وہ سنت محمدؐ سے بغض رکھتا ہے۔

ملوک بنی امیہ کی بدعت

بہرحال مذکورہ بالا روایت کی نسبت امام باقر کی طرف جس حد تک بھی صحیح ہو اس میں شبہہ نہیں کہ اس میں آل بیت کے لیے جن مصائب کی نشاندہی کی گئی ہے تو وہ تمام تر صدق اور راستی پر مبنی ہیں، یہ ملوک بنو امیہ ہی تھے جنہوں نے امام ہدیٰ علی کرم اللہ وجہہ پر لعنت بھیجنے کی رسم جاری کی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے احکام نے آل بیت کو ستانے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہوگا؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے معاویہ کے اس عمل پر جو حد کے حدود سے بہت آگے نکل گیا تھا سخت ملامت کی، ام المومنین حضرت ام سلمہ نے معاویہ کو پیغام بھیجا اور کہلایا۔

---

[1] شرح نہج البلاغۃ لابن ابی حدید ج ۳ ص ۱۵۔

"علی بن ابی طالب اور ان سے محبت کرنے والوں پر جب تم لعنت بھیجتے ہو تو تمہاری یہ لعنت خدا اور رسولؐ کی طرف جاتی ہے۔ میں اس کی گواہی دیتی ہوں کہ اللہ اور رسولؐ کی نظر میں علی بہت زیادہ محبوب تھے!"

ابوبکرؓ اور معاویہ کے اقدام کا واضح فرق

معاویہ بن ابی سفیان نے جن حرکتوں کا ارتکاب کیا ہے وہ بہت ہیں، انہوں نے اسلام کے نظام حیات میں سے شوریٰ کو نکال دیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا اور اس طرح امر خلافت کو ایک فاسق و فاجر انسان کے سپرد کر دیا، ان کا ادعا یہ تھا کہ یزید کو ولی عہد بنا کر وہ سنت ابوبکرؓ پر عمل کر رہے ہیں کیونکہ انہوں نے بھی اپنے بعد عمرؓ الخطاب کو ولی عہد بنایا تھا۔

لیکن معاویہ اور ابوبکر کے اس اقدام میں بہت بڑا اور واضح فرق ہے۔ یہ عمرؓ جنہیں ابوبکرؓ نے ولی عہد بنایا تھا وہ تھے جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"خدا نے عمرؓ کے قلب و لسان پر حق لکھ دیا ہے!"

حالانکہ یزید وہ تھا جو محرمات کے ارتکاب سے بھی پرہیز نہیں کرتا تھا۔

ابوبکرؓ نے وزراء نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ایک کو ولی عہد بنایا تھا، جس سے ان کی کوئی ذاتی قرابت نہیں تھی اور جس کے بارے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا!

"جس راستے میں عمرؓ چلتے ہیں وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا!"

لیکن معاویہ کے ولی عہد کے بارے میں تاریخ نے جو کچھ کہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

حضرت حسن بصری کی رائے معاویہ کے بارے میں

اسی بارے میں حضرت حسن بصری نے فرمایا تھا "معاویہ میں چار خصائل ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے صرف ایک ہوتا تب بھی وہ ہلاک کرنے کے لیے کافی تھا۔

(۱) امت اسلامیہ پر خروج یہاں تک کہ حق مشورہ چھین کر اس پر مسلط ہو جانا

(۲) استخلاف یزید:- یعنی یزید جیسے شخص کو اپنا جانشین بنایا جو شرابی تھا، نشہ میں دھت رہتا تھا، ریشمی لباس پہنتا تھا، طنبورہ بجاتا تھا۔

(۳) ابوسفیان کے ناجائز بیٹے (زیاد) کو بھائی بنا لیا (سیاسی ضرورت سے) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"بیٹا (جائز) باپ کا ہے اور زانی کے لیے پتھر (سنگساری) ہے!"

(۴) حجر بن عدی کو قتل کرنا۔[ملہ]

یزید نے جنگ بدر کے اموی مقتولین کا انصار سے انتقام لے لیا

یزید مسلمانوں کا فرماں روا بن گیا۔ لیکن مسلمان اس کی حکومت برداشت نہ کرسکے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اہل مدینہ نے اس کے خلاف خروج کیا۔

یزید نے اہل مدینہ سے بڑی خوں ریز جنگ شروع کی، یہاں تک کہ اس نے انصار کی عورتوں اوران کے بچوں کو اسیر کرلیا اور اپنے اس فعل کو جنگ بدر کا انتقام قرار دیا اور اس تمنا کا اظہار کیا کہ کاش اس کے دو اموی بزرگ جو غزوہ بدر میں قتل ہوئے تھے یہ منظر دیکھ لیتے۔

اور یہ انصار وہ تھے جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:۔

"اگر لوگ ایک راستے پر چلیں اور انصار دوسرے راستے پر تو میں انصار کا راستہ اختیار کروں گا

اے اللہ انصار پر ان کے بیٹوں پر اور ان کی اولاد پر رحم فرما"۔!

جن لوگوں کے لیے رسولؐ نے رحم کی دعا فرمائی تھی۔ ان پر ابن معاویہ نے رحم نہیں کیا ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

امویوں کا ماہرِ اعمال

اور یہ یزید وہ تھا جس نے ابن بنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کیا تھا، جوان دو بھائیوں میں سے ایک تھے جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا

"یہ دونوں جوانان جنت کے سردار ہیں"!

مقتل حسین سے متعلق اب ہم ابن ابی الحدید کی عبارت درج کرتے ہیں:۔

ان امویوں نے علی سے جنگ کی، حسن کو زہر دیا، حسین کو قتل کیا، خواتین خانوادۂ نبوت کو کھلے منہ پھرایا۔ اور علی بن حسین (امام زین العابدین) تک رسائی جب مشکل نظر آئی تو ان کی بے حرمتی کی جس طرح مشرکین کے متعلقین کے ساتھ جب ان پر بزور قوت غلبہ اور تسلط حاصل کیا جائے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ عبیداللہ بن زیاد نے صلب علی علیہ السلام سے نو بھائیوں کی اور صلب عقیل بن ابی طالب میں سے سات کی جان یوم طف کے

ملہ المنیۃ والامل۔

حجر بن عدی اصحاب رسولؐ معاویہ کے مخالف تھے معاویہ نے پہلے انہیں امان عطا کی، اسکے بعد دھوکے سے انہیں قتل کردیا۔

موقع پر لی۔ اورامان دے چکنے کے باوجود فریب اور دھوکے سے مسلم بن عقیل کی گردن ماری نیز ان کے ساتھ ہانی بن عروہ کو قتل کیا، کیونکہ انہوں نے مسلم بن عقیل کو پناہ دی اور ان کی مدد کی تھی۔ اس موقع پر شاعر نے کہا تھا:

فان کنت لاتدری ما الموت فطری — الی ھانی فی السوق وابن عقیل
تری بطلاقد ھشم السیف وجھہ — وآخر یھوی من طعام قتیل[1]

خلافت اسلامیہ پر غاصبانہ تسلط کے بعد قتل حسینؑ دوسرا زخم تھا، جو مسلمانوں کے قلب پر پہنچا جو ہر مسلمان اس زخم کی ٹیس اپنے دل میں محسوس کرنے لگا جب یہ فاجرانہ حرکت ظہور پذیر ہوئی کہ ذریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح کا قیدی بنا لیا گیا جس طرح میدان جنگ میں دشمن کے آدمیوں کو بنایا جاتا ہے۔

عبید اللہ بن زیاد کے لشکر کے ہاتھوں قتل حسینؑ کی خبر جب حضرت حسن بصری کو پہنچی تو وہ رونے لگے اور فرمایا:

"واحسرتا۔

اس امت کو کیا ہوگیا ہے، اس کے نبی کا بیٹا قتل کر دیا گیا (اور یہ دیکھتی رہی)

اے اللہ ان ظالموں کا مدعی بن جا اور بہت جلد ظلم کرنے والے جان لیں گے کہ

سچ تو یہ ہے کہ قتل حسینؑ کا حادثہ فاجعہ آج بھی ہر مسلمان کے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

بیت سفیانی کے خلاف غم و غصہ

"قتل حسینؑ کے بعد بظاہر حالات پرسکون ہو گئے لیکن دلوں میں لاوا ابل رہا تھا غم والم کا طوفان گردش کر رہا تھا، بیت سفیانی کے خلاف بیزاری اور برہمی کی عام فضا طاری تھی۔

اور یزید کے بعد تو یہ طوفان واقعی بہت بڑھا حجاز میں عبد اللہ بن زبیر نے خروج کیا۔ عراق پر قبضہ کر لیا نیز خوارج نے خروج کیا۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت سفیانیہ جس نے ایک بہت بڑی معصیت۔ قتل حسین۔ کا ارتکاب کیا تھا اپنی موت مرگئی اور دولت مروانیہ ابھری۔

بہت سے معرکوں کے بعد جنہوں نے عصبیات قدیمہ کی آگ بھڑکا دی تھی بنو امیہ کی حکومت نے

---

[1] شرح نہج البلاغۃ ج ۴ ص ۲۶۸ طبع قاہرہ

استقرار و استحکام حاصل کر لیا، اس دور میں بھی حق پامال رہا اور شر پھیلتا پھولتا رہا۔ ہر شخص انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا رہا، کسی کا بھی یہ خیال نہیں تھا کہ یہ لوگ اسلام کی حکومت چلا رہے ہیں، نہ ان کے نظم مملکت میں دین کو دخل تھا، نہ فرماں رواکی ذات وصفات میں۔ گو اس زمانے میں فتوحات کا دروازہ کھل گیا دولت اسلامیہ کے رقبہ میں غیر معمولی اضافہ ہوا، لیکن لوگوں کے دل ان سے خوش نہیں تھے۔ خاص طور پر وہ لوگ جن کے دلوں میں ایمان صادق جاگزیں تھا اس غیر اسلامی حکومت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ بنو مروان کے بعض والی تک، اپنے ان فرماں رواؤں کے بارے میں مبتلائے شک و شبہ رہتے تھے اور جو لوگ اپنے دین کو سلامت رکھنا چاہتے تھے وہ خدا سے سرکشی کے معاملہ میں ان کا ساتھ بھی نہیں دیتے تھے۔

ذیل میں ہم ان کے ولاۃ میں سے ایک والی کا قصہ بیان کرتے ہیں:۔

عمر بن ہبیرہ کی داستان

یہ والی عمر بن ہبیرہ تھا!

روایت ہے کہ جب عمر بن ہبیرہ عراق کا والی بنا یا گیا تو اس نے حسن بصری اور عامر شعبی کو اپنی بارگاہ میں طلب کیا اور ان کے مابین بحث و گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ابن ہبیرہ نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

امیر المومنین یزید بن عبدالملک نے میرے پاس ایک ایسا فرمان بھیجا ہے کہ اگر اس کی تعمیل کرتا ہوں تو (دین کی) ہلاکت کا اندیشہ ہے، مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے خلیفہ کی اطاعت کی تو خدا کا غضب مجھ پر نازل ہوگا اور اگر تعمیل نہ کرتا تو پھر خلیفہ کے غیظ و غضب سے بچانے والا مجھے کوئی نہیں۔

بتائیے آپ حضرات کا ارشاد کیا ہے؟

حضرت حسن بصری نے شعبی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا!

"اے ابو عمرو امیر کے سوال کا جواب دو!"

شعبی نے جواب دیا اور بہت خوش اسلوبی سے راہِ حق پر گامزن رہنے کی تلقین کی لیکن ابن ہبیرہ کی تشفی نہیں ہوئی وہ تو حسن بصری کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے یہ سب کچھ سن کر کہا۔

اے ابو سعید آپ فرمائیے، میں آپ سے سننا چاہتا ہوں!

حضرت حسن بصری نے جواب دیا۔

کیا تم نے شعبی کی بات نہیں سنی؟

ابن ہبیرہ نے جواب میں عرض کیا۔

سن لی لیکن آپ کیا کہتے ہیں، یہ بتائیے۔

حضرت حسن بصری نے فرمایا!

"میں کہتا ہوں، خدا کی قسم وہ وقت قریب ہے جب ایک فرشتہ آسمان سے اتر کر تمہارے پاس آئے گا اور وہ ہرگز حکم خدا کی نافرمانی نہیں کرے گا وہ تمہیں قصر کی اس وسعت سے نکال کر قبر کی تنگنائے میں پہنچا دے گا۔

میری دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر تمہیں یزید سے محفوظ رکھے لیکن یزید تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا!۔

"لہٰذا اے امیر خدا سے ڈر! تو اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا، اگر تو نے یزید کی طاعت کی تو رحمت خداوندی کے دروازے تجھ پر بند ہو جائیں گے"۔

افکار و آراء پر اموی مظالم کے آثار

"اس مقام پر ہم یہ نہیں چاہتے کہ امویوں کے ان آثار کو نمایاں کریں جنہوں نے موروثی طور پر مسلمانوں کے قلوب کو ہدف آلام و جراحت بنا رکھا ہے البتہ ان آثار کا جو اثر آراء و افکار اسلامی پر ہوا اس کا ذکر ضرور کریں گے۔

امام ہدایت علی کرم اللہ وجہہ اور معاویہ بن ابی سفیان کے مابین اول الذکر کی بیعت خلافت پر اختلاف پیدا ہوا، کیوں کہ معاویہ نے علی کرم اللہ وجہہ کی بیعت نہیں کی تھی، علی کے ہاتھ پر جن لوگوں نے اوّل اوّل بیعت کی تھی وہ اہل مدینہ تھے، اختلاف اس باب میں پیدا ہوا کہ اہل مدینہ ہی وہ لوگ ہیں جو بیعت کا حق رکھتے ہیں اسلئے کہ مدینہ مرکز اسلام ہے وہاں صحابہ کرام اور تابعین کی اکثریت قیام پذیر ہے جو صحابہ مدینہ سے نکل کر دوسرے شہروں میں جا بسے ہیں ان میں اور دوسروں میں اب کوئی تمیز نہیں رہ گئی ہے، لیکن جو مدینے میں ہیں وہ اپنے تمام حقوق سے بہرہ ور ہیں اس لیے کہ انہوں نے اس دیار نبیؐ کو کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑا، علاوہ ازیں ابوبکرؓ عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی بیعت جب اہل مدینہ نے کر لی تو وہ عالم اسلام کی بیعت مان لی گئی، معاویہ نے اس بارے میں تعلیل و تاویل سے کام لیا اور اصرار کیا کہ صرف اہل مدینہ نہیں تمام مسلمانانِ امصار و دیار اس میں برابر کے شریک ہیں لیکن اس تعلیل و تاویل کے باوجود امر واقعہ یہ ہے کہ باجماع امیر معاویہ کو باغی اور بعض محتاط لوگوں کے الفاظ میں متاوّل قرار دیا گیا، اگرچہ ان کی تاویل باطل تھی امام ہدایت علی بن ابی طالب کے خلاف خروج کی تائید میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ اس خبر نے ایک لگی بندھی روایت کو ختم کر دیا، جس سے امویوں کے خلاف بیزاری پیدا ہوئی۔

علیؓ کے خلاف دشنام طرازی کا نتیجہ

ایک اور واقعہ جس نے آراء و افکار اسلامی پر گہرا اثر ڈالا، وہ امیر معاویہ کی وہ سنت تھی جس کی رو سے۔ سیف اسلام علیؓ کے خلاف دشنام طرازی اور سب وشتم کا سلسلہ جاری ہوا۔

اس حرکت نے مسلمانوں کے دلوں کو امویوں کے خلاف برہمی اور نفرت سے معمور کر دیا اس لیے کہ، مسلمان اچھی طرح جانتے تھے کہ علیؓ پر لعنت منافق ہی بھیج سکتا ہے ان کی خدمات اور کارنامے اتنے لازوال تھے جو قلب مسلم میں جاگزیں تھے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ گو حالات کے لحاظ سے زبانیں امویوں کے ساتھ تھیں لیکن دل ان سے نفرت کرتے تھے، وہ ایسے امام برحق پر لعنت کیونکر بھیج سکتے تھے، جس کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا!

لا یحبک الا مومن ولا یبغضک الا منافق۔

"اے علی! تجھ سے وہی محبت کرے گا جو مومن ہو اور وہی نفرت کرے گا جو منافق ہو"

چنانچہ ملوک بنو امیہ کے خلاف بغض اور نفرت کی فضا عام ہو گئی، چونکہ بنو امیہ کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اس لیے فتنے کے وقت مسلمان خاموش رہے اگر وہ ان کے خلاف میدان میں آتے تو مسلمان لشکر شکست کھا جاتے لیکن جب فتوحات کا سلسلہ ختم ہوا، فوراً دولت عباسیہ آل بیت کے نام پر برسر اقتدار آ گئی اور اموی ختم ہو گئے۔

قتل حسینؓ کا اثر افکار اسلامی پر

تیسرا بہت بڑا اثر افکار و آراء اسلامی پر قتل حسینؓ کا پڑا۔ یہ بہت بڑا حادثہ تھا!

مسلمان عمل سے اس حادثے کے برپا کرنے والوں کے خلاف کچھ نہ کر سکے، لیکن اندر ہی اندر آگ سلگتی رہی اور افکار کے سانچے میں تبدیلی پیدا کرتی رہی آدمی جب بے بس ہوتا ہے تو خیالات کی دنیا کا سہارا لیتا ہے اور خیالات کے اظہار کی آزادی نہ ہو۔ تو پھر ہر شخص اپنے اپنے ظن کے مطابق سوچنے لگتا ہے، یہ آراء منقح نہیں ہوتے نہ یہ افکار نقی ہوتے ہیں ہر شخص جو کچھ سوچتا ہے اس میں اس کے ساتھ دوسروں کے افکار بھی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اثر انداز ہوتے ہیں جیسے عبداللہ بن سبا کے اتباع جنہوں نے حلول کا مسئلہ پیدا کر لیا یعنی انسان کے جسم میں خدا کا حلول ظاہر ہے یہ تفکیر بعض قدیم مذاہب کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قتل علی اور قتل حسین کے بعد اس طرح کے آراء منحرفہ پیدا ہوئے ابھرے اور پھیلے۔

اثر مقتل حسینؓ

مختار ثقفی کی تحریک اور اس کے اثرات و نتائج

مسلمانوں کے قلب و دماغ پر اثر

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں قتل حسینؓ کا مسلمانوں کے قلب و دماغ پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔

مختار ثقفی کے دعوے

مختار ثقفی ایک خارجی تھا جو بعد میں اپنے آپ کو شیعہ کہنے لگا تھا، وہ مسلم بن عقیل کے ساتھ کوفہ میں قتل حسینؓ ۔ سے پہلے وارد ہوا، یہاں اسے عبیداللہ بن زیاد نے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس کے بہنوئی عبداللہ بن عمر نے سفارش کی تو چھوڑ دیا، یہ رہائی کا واقعہ قتل امام حسینؓ کے بعد کا ہے۔

جب مختار کوفے سے باہر نکلا تو اس نے کہا

"شہید مظلومؓ، سید المسلمین و ابن سید المرسلین حسین بن علی کے قتل کا بدلہ میں لے کر رہوں گا۔

یزید کی وفات کے بعد مختار عبداللہ بن زبیر کے ساتھ ہو گیا اور ان کی طرف سے وہ اہل شام سے جنگ آزما ہوا، پھر یہ کوفہ واپس آ گیا اور دعویٰ کیا کہ وہ محمد بن الحنفیہ کا نمائندہ بن کر آیا ہے یہ حسینؓ کے بھائی ہیں اور ان کے خون کے حق کا مطالبہ کرنے کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں اس نے ابن الحنفیہ کو مہدی اور وصی کہنا شروع کیا، اس نے لوگوں سے کہا۔

"مجھے مہدی وصی نے بھیجا ہے، مجھے تمہارے پاس اپنا امین اور وزیر بنا کر روانہ کیا ہے۔ مجھے حکم دیا ہے کہ ملحدوں کو قتل کر دوں اور اہل بیت کے خون کا بدلہ لوں اور محمد بن حنفیہ کے نام پر تمہیں دعوت بیعت دوں!"

محمد بن حنفیہ کی طرف سے اعلان برأت

محمد بن حنفیہ اپنی سیرت، کردار اور شخصیت کے اعتبار سے اسلامی سوسائٹی میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ لوگ ان سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتے تھے ان کا علم وسیع تھا، معرفت کی دنیا میں یکتا تھے۔ مختار ان کا نام لے لے کر جمع کرنے لگا اور اس ندا کے ساتھ ساتھ اس نے بہت سے اوہام بھی پھیلا دیے!

ان باتوں کی محمد بن حنفیہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے امت کے اعیان و اکابر کے سامنے مختار سے برأت کا اعلان کر دیا اور اس کے اوہام و اکاذیب سے بے تعلقی اور بیزاری کا اظہار کر دیا، لیکن اس برأت کے باوجود انتقام حسین کا جذبہ عوام میں اتنا شدید تھا کہ وہ مختار کی ہمنوائی کرنے لگے۔

مختار کاہنوں کی طرح مقفی مسجع باتیں کرتا تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ مستقبل کی باتیں جانتا اور بتاتا ہے

قاتلین حسین کا عبرتناک انجام

مختار نے چن چن کر قاتلین حسینؓ کو پکڑا اور قتل کیا، علویوں کے دشمنوں کے جسم و جان کا رشتہ منقطع کیا، اس نے ایک ایک آدمی اس لشکر کا جس نے کربلا میں جنگ کی تھی ڈھونڈ نکالا اور اُسے قتل کر دیا۔ اس کے اس اقدام نے اسے مسلمانوں میں محبوب بنا دیا اور وہ جوق در جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس کے ساتھ مل کر جنگ کرنے لگے پھر عبداللہ بن زبیر کے خلاف خروج کیا، یہاں تک کہ مصعب بن زبیر نے اسے قتل کر دیا۔

فرقہ کیسانیہ اور اس کے عقائد

مختار کے افکار و آراء کی بنیاد پر ایک مستقل فرقہ پیدا ہو گیا جو کیسانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بنیادی عقائد یہ ہیں:

(۱) امام ایک مقدس ہستی ہے، جس کی طاعت واجب ہے۔

(۲) امام معصوم ہوتا ہے۔ اس سے کوئی خطا سرزد نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ وہ رمز علم الٰہی ہے۔

(۳) رجعت امام کا بھی یہ فرقہ قائل تھا۔

(۴) اس کے نزدیک ترتیب ائمہ یہ تھی۔

الف:۔ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ۔

ب:۔ امام حسن علیہ السلام

ج:۔ امام حسین علیہ السلام

د:۔ محمد بن الحنفیہ

ھ:۔ محمد بن الحنفیہ کے بارے میں بعض کیسانیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کا انتقال ہو گیا، لیکن وہ واپس آئیں گے۔

و:۔ لیکن فرقہ کیسانیہ کی اکثریت یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور جبل رضوی پر موجود ہیں۔

ز:۔ کیسانیہ "بداء" کے بھی معتقد ہیں۔

بداء کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے بدل سکتا ہے، وہ جس چیز کا حکم دیتا ہے۔ اس کے خلاف بھی حکم دے سکتا ہے۔

"شہرستانی کا قول ہے :-

" مختار نے بدا کا قول ایجاد کیا اس لیے کہ وہ حالات و واقعات و امور کے جاننے کا مدعی تھا، خواہ بہ صورت وحی یا امام کی جانب سے بہ صورت پیام، وہ جب اپنے متبعین سے کسی واقع ہونے والے حادثے کا ذکر کرتا تھا تو اگر وہ واقع ہو گیا تو ٹھیک نہ واقع ہوتا تو کہہ دیتا تھا تمہارے رب نے بداء سے کام لیا ہے۔

ح :- کیسانیہ تناسخ ارواح کے بھی قائل ہیں۔

اس کا مطلب ہے ایک جسم سے روح کا نکل کر دوسرے جسم میں حلول، یہ فلسفہ ہندوؤں سے ماخوذ ہے۔

ط :- کیسانیہ کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں، ظاہر اور باطن، اسی طرح ہر شخص کے دو پہلو ہوتے ہیں، روح اور جسم، اسی طرح ہر تنزیل کے دو پہلو ہوتے ہیں لفظ و معنی، اس دنیا میں جو کچھ ہے اس کے بھی دو پہلو ہیں مجازاً در حقیقت، یہ وہ علم ہے جس کی علی علیہ السلام نے صرف اپنے صاحبزادے محمد بن حنفیہ کو تعلیم دی اور جس کی ذات میں یہ علم جمع ہو وہی امام حق اور امام صدق ہے۔

عمل صالح میں سیئات کی آمیزش

بلا شبہ یہ عقائد کج رائی پر مبنی ہیں اور انہوں نے اسلامی سوسائٹی میں فساد پیدا کیا ہم بے تامل یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قتل حسین کا انتقام لے کر اس نے مسلمانوں کے دل جیت لیے، لیکن اپنے عمل صالح میں سیئات بھی بہت سے داخل کر دیے!

آراءِ منحرفہ کا دور

پہلی صدی کے آخری اور دوسری صدی کے آغاز کے فتنے

زمین دوز تحریکیں

بات مختار کی تفکیر پر ختم نہیں ہوگئی یہ تو ایک بیج تھا جو بعد میں ثمر آور ہوا، کوفے اور عراق کی سرزمین اس کے لیے حد درجہ ساز گار ثابت ہوئی اور یہاں بہت سی زمین دوز تحریکیں عالم وجود میں آگئیں۔

یہ تحریکیں امام باقر اور امام جعفر صادق کے زمانے میں ظاہر ہوئیں، لیکن ان دونوں بزرگوں نے ان سے اپنی بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار فرمادیا۔ بلکہ شدید نفرت کا۔!

مختلف فکری مکاتب

ان کج راہیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو بڑھتا ہی چلاگیا۔

- خلق قرآن کی تحریک بھی حقیقت پر مبنی نہ تھی۔ فتنہ فساد اس کا اصل محرک تھا جس کا موجد جعد بن درہم تھا۔
- جبر مطلق کا مسلک جہم بن صفوان کی ایجاد ہے۔
- نفی قدر کا قول غیلان دمشقی کی طرف منسوب ہے۔ کہتے ہیں اس نے یہ سبق ایک یہودی بیان بن سمعان سے حاصل کیا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ایسے آراءِ منحرفہ عالم وجود میں آئے، جو کفر بلکہ شرک جلی تک پہنچا دیتے ہیں۔

بیان بن سمعان تمیمی، داعی خلق قرآن

اس سلسلے میں ہم بعض اہم شخصیتوں کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں، ان میں ایک بہت زیادہ قابل ذکر ہستی بیان بن سمعان ہے جسے خالد بن عبداللہ قسری نے قتل کر ڈالا تھا، جو عراق کا گورنر امویوں کی طرف سے مامور تھا!

اس شخص نے سب سے پہلے خلق قرآن کا پروپیگنڈا شروع کیا اور قدر کے مسائل زیر بحث لایا، اس کے بارے میں ابن قتیبہ کا قول ہے!

"یہ پہلا شخص ہے جس نے خلق قرآن کا سوال اٹھایا!"

یہ شخص یہودی الاصل تھا، بہ ظاہر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن دل میں بدستور کافر تھا، اسلام قبول کرنے کا مقصد عقیدۂ اسلام میں فساد پیدا کرنا تھا، کتاب اخبار الرجال میں ہے کہ اس کا اعتقاد تھا کہ زمین کا قدر دوسرا ہے اور آسمان کا دوسرا۔[1] اس کا یہ دعویٰ تھا کہ ابو ہاشم بن محمد بن حنفیہ کے بعد منصب امامت پر یہ فائز ہوا ہے اور اس کی امامت کے لیے نص آ چکی ہے۔[2]

لوگوں کے قلوب کو متاثر کرنے کے لیے یہ شعبدہ گری اور سحر سے بھی کام لیتا تھا، ادعاء امامت کے بعد اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا، اور خالد قسری نے اس فتنے کا سر کچل دیا۔

مغیرہ بن سعید، تجسیم الٰہی کا دعویٰ

اس شخص کا ہم عصر ایک شخص تھا، مغیرہ بن سعید، بیان بن سمعان محمد بن حنفیہ کے نام پر فتنے پھیلا رہا تھا اور یہ حضرت امام باقر کا نام استعمال کر رہا تھا، ان کا داعی بن بیٹھا تھا۔

ابن اثیر نے لکھا ہے کہ یہ خدا کی تجسیم کا قائل تھا۔

ابوبکرؓ، عمرؓ اور جملہ صحابہ کی تکفیر کیا کرتا تھا، بجز ان صحابہ کے جو حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔

یہ ایک مرتبہ امام باقر کے پاس گیا۔ اور ان سے گویا ہوا:

"اقرار کیجیے کہ آپ علم غیب جانتے ہیں!"

آپ نے اسے جھڑک دیا اور نکال دیا۔

پھر یہ امام جعفر صادق کے پاس گیا۔ وہاں بھی ایسا ہی ماجرا پیش آیا۔[3]

تین قابل غور و فکر باتیں

ان باتوں سے جو امور منقح ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں وہ ذیل کے امور سہ گانہ ہیں:۔

(۱) یہ کج فکر لوگ کس طرح آل بیت پر جھوٹ بول کر عوام کا مرجع بن جاتے تھے، یہ مشرک تھے۔ ایمان و اسلام سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا، یہ اس عقیدت و محبت سے فائدہ اٹھا کر جو عوام کے دلوں میں اہلِ بیت کی جاگزیں تھے، اپنے آراء فاسدہ کی تبلیغ و ترویج کیا کرتے تھے۔

(۲) بت پرست مذاہب کی بہت سی باتیں اور بہت سے عقائد مسلمانوں میں پھیلا یا کرتے تھے، مثلاً عقیدۂ تناسخ یا ایک امام کی روح کا دوسرے امام میں منتقل ہوتے رہنا، جیسے مصریوں کا عقیدہ تھا کہ ایک فرعون کی روح دوسرے فرعون میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔"

---

[1] اخبار الرجال الکشی ص ۱۹۶ [2] مقالات الاسلامیین ج ا ص ۵ [3] الکامل لابن اثیر ج ۵ ص ۷۶۔

(۳) جس طرح تاریکی میں جراثیم فاسدہ پرورش پاتے رہتے ہیں اسی طرح کوفہ اور عراق میں انہدام اسلام کے لیے مجوسیت، بت پرستی اور عبودیت کے جراثیم مسلمانوں میں پہنچانے کے لیے آل بیت کا نام استعمال کیا گیا لیکن انہوں نے ایسے ہر مرحلے اور موقع پر ان کوششوں کو بارآور نہیں ہونے دیا۔

اس سلسلے میں امام جعفر صادق کو زیادہ کڑیاں جھیلنا پڑیں کیوں کہ ان کا اسم گرامی بار بار اور بکثرت استعمال کیا گیا۔ انہوں نے صرف اعلان برأت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے داعی ان اکاذیب و اباطیل کی تردید کے لیے لوگوں میں بھیجے اور کوشش فرمائی کہ ان کا نام غلط استعمال نہ کیا جائے۔

ان داعیان کذب و دروغ میں ایک شخص ابوالخطاب تھا، اس کے اور اس کے فرقے کے بارے میں ہم چند کلمات عرض کرنا چاہتے ہیں۔

فرقہ خطابیہ

یہ فرقہ امام جعفر صادق کے عہد میں ظاہر ہوا۔ اس کے داعی کا نام ابوالخطاب اسدی تھا، یہ اپنے نام کے مقابلے میں کنیت سے زیادہ مشہور ہے۔ ابوحنیفہ النعمان القاضی الشیعی الفاطمی ابوالخطاب کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

ابوالخطاب عصر امام جعفر صادق کا مشہور داعی تھا، یہ بالکل مغیرہ کے نقش قدم پر چلا اس نے کفر اختیار کیا اور دعوائے نبوت سے بھی گریز نہیں کیا، اس کا خیال تھا کہ امام جعفر خدا ہیں، اس نے محارم کو حلال کر دیا تھا اور دعوت عام دے دی تھی۔

اس کے اصحاب پر جب فرض کی ادائیگی گراں گزری تو اس کے پاس آئے اور گویا ہوئے "اے ابوالخطاب ہم پر تخفیف کیجیے۔ یہ ان فرائض کو ترک کر دینے کا حکم دے دیتا یہاں تک کہ ان لوگوں نے تمام فرائض ترک کر دیے اور جملہ محارم حلال کر لیے، یہ کہا کرتا تھا جس نے امام کی معرفت حاصل کر لی اس پر تمام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں۔

یہ باتیں جب امام جعفر صادق تک پہنچیں تو انہوں نے اس پر بہت سخت لعنت بھیجی اور اس سے اپنی کامل برأت کا اظہار کیا اور اپنے اصحاب کے سامنے اس حقیقت کا اعلان فرمایا اور دیار و امصار میں اس سے برأت کے پروانے بھیجے![1]

خطابیہ پہلا فرقہ ہے جس نے علم جفر کے بارے میں کلام کیا۔

غرض اس شخص کے مہملات و مزخرفات سے امام صادق نے یکسر لاتعلقی کا اظہار کیا، اسے مورد

---

[1] دعائم الاسلام ص ۶۲، ۶۳

طعن ولعن قرار دیا۔ اس کے اباطیل کی تردید فرمائی، چنانچہ اس کے بعض پیرو اس سے الگ بھی ہو گئے مگر یہ شخص اتنا ڈھیٹ تھا کہ امام صادق کی اس صاف اور واضح برأت کے بعد بھی اپنے غلط مسلک اور پروپیگنڈہ اور دعوت پر سختی کے ساتھ قائم رہا۔

سنہ ۱۳۸ھ میں عیسیٰ بن موسیٰ نے ایک جنگ کے بعد قتل کر دیا۔

ابوالخطاب کے عقائد کا تجزیہ

ابوالخطاب کے افکار و عقائد کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس میں فرقہ کیسانیہ اور سبیئہ کے عقائد ممزوج ہیں، بہرحال امام صادق کے اعلان برأت نے اس فرقے کو رفتہ رفتہ بالکل کمزور کر دیا لیکن ختم نہیں ہوا، اس کے تھوڑے بہت پیرو باقی رہے اور اپنے مسلک کی دعوت دیتے رہے۔

امام باقر اور امام جعفر صادق کے باموقع اقدامات

امام جعفر صادق اور ان کے والد بزرگوار امام باقر ان تمام لوگوں کے خلاف ہمیشہ برسرِ پیکار رہے، جنہوں نے اسلام پر غارت گری کے منصوبے تیار کیے تھے اور مسلمانوں میں الحاد اور زندقہ پھیلانے کی سعی کی تھی۔

مسلمان ان لوگوں سے حد درجہ متنفر تھے، ان کی پیروی سے انکار کرتے تھے جن کے دل میں روگ ہو یا جو قدیم مذاہب سے وابستگی رکھتے ہوں جنہیں اسلام ڈھانے کے لیے آیا تھا اور بت پرستی اور مجوسیت وغیرہ کے ظلمت کدے سے نکال کر وحدانیت کے مرکز نور میں انہیں لا کھڑا کیا تھا۔

ان لوگوں کو جب مسلمانوں سے نفرت کے سوا کچھ نہ ملا تو یہ مختلف فرق اسلامیہ میں بٹ گئے۔ اور خلاف اسلام خیالات پھیلانے لگے جو اباحیت کے داعی تھے۔ وہ بعض مرجبہ کی طرح یہ کہنے لگے ایمان کے ساتھ معصیت کوئی ضرر نہیں پہنچاتی جس طرح کفر کے ساتھ طاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، یا یہ کہنے لگے کہ ایمان کی اجمالی معرفت کافی ہے۔

ان فرقوں میں وہ بھی تھے جو بعض اشخاص کے لیے علم غیب کے مدعی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے اصحاب جسے حرام کر دیں اسے اللہ نے بھی حرام کر دیا، جسے حلال کر دیں اسے خدا نے بھی حلال کر دیا۔

ایسے لوگ حجت ہوتے ہیں ان سے دلیل نہیں طلب کی جا سکتی انہیں قرآن کے بعض احکام منسوخ کرنے کا بھی اختیار ہوتا ہے۔

نیز یہ معصوم ہوتے ہیں نہ صرف معاصی سے بلکہ خطا اور لغزش سے بھی۔

کچھ فرقۂ اسماعیلیہ کے بارے میں

غرض اس طرح یہ نئے نئے فرقے اسلام میں ابھرے اگرچہ یہ اپنے عقائد افکار کی دعوت علی الاعلان نہیں دے سکتے تھے لیکن خفیہ خفیہ اپنے کام میں

لگے ہوئے تھے۔

انہی میں ایک فرقہ اسماعیلیہ بھی ہے جو اپنے ائمہ میں حلول خدا کا قائل ہے۔

ان فرقوں میں فرقہ حشویہ بھی ہے جو کہتا ہے اللہ ہاتھ رکھتا ہے، آنکھ رکھتا ہے، چہرہ رکھتا ہے۔ بالکل انسان کی مانند، البتہ اسے عضو تناسل اور اندام نہانی سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔

فتنہ پسندوں کی طرف ائمہ کی جانب غلط انتسابات

یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے شیعیت کا لبادہ اوڑھ کر امام جعفر صادق کے عہد میں فتنہ انگیزیاں کیں اور امام صادق نے پوری قوت سے ان کا ابطال فرمایا۔

اگر ان سارے فرقوں کے افکار و خیالات اور عقائد و توہمات ہم تھوڑے تھوڑے کر کے بھی بیان کریں تو فرق اسلامیہ پر مشتمل ایک مفصل اور ضخیم کتاب بن جائے گی اور ہم اپنے اصل موضوع — امام جعفر صادق — سے دور جا پڑیں گے، لہٰذا ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

تصریحات بالا سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ امام جعفر صادق اور ان کے والد ماجد امام باقر کی زندگی ان منحرفین اور کج فکر لوگوں نے اجیرن کر دی تھی، لوگ ان کی افترا پردازیوں اور فساد آرائیوں کی شکایت لے کر ان کے پاس آتے تھے اور یہ ذرا بھی توقف کئے بغیر ان اباطیل اور اکاذیب کی تردید اور برأت میں لگ جاتے تھے، صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے، اپنے داعیوں کو لوگوں میں پھیلا دیتے تھے کہ جائیں اور ان کے عقائد و افکار کی اصلاح کریں اور ان میں یہ فاسد عنصر داخل نہ ہونے دیں۔

ان فتنہ انگیزوں نے صرف اپنے ہفوات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بہت سی غلط سلط باتیں بھی ان ائمہ کی طرف منسوب کر دیں اور بہت سی غلط احادیث کی ان کی طرف نسبت کر دی، اور بہت سے اقوال کا انتساب ان کی طرف کر دیا اور بہت سے افکار ان سے وابستہ کر دیئے، مثلاً خطابیہ نے علم جفر کی نسبت امام صادق کی طرف کر دی، لیکن وہ اکابر ائمہ مسلمین تھے، امام مالک اور امام ابوحنیفہ ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کر چکے تھے، بھلا ایسے امام صادق کے بارے میں یہ جھوٹ کس طرح چھپ سکتا تھا؟

خوارج

اس فرقے کے عقائد اور میلانات ورجحانات

ابوحمزہ الشاری

ان گروہوں اور جماعتوں کے علاوہ جو آلِ علی کے تشیّع کی مدعی تھیں ایک جماعت خوارج کی بھی تھی، امویوں کے آخری عہد میں ان کی قوت وسطوت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، ان میں سے ایک فرد حمزہ الشاری تھا جس نے ۱۳۰ھ میں یعنی زوال دولت بنوامیہ سے کچھ ہی قبل مدینہ منورہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

عربی عصبیت میں غلو

یہ خوارج مختلف قبائل عربیہ پر مشتمل تھے، ان کی عربی عصبیت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی اکثریت قبائل ربیعہ سے تعلق رکھتی تھی، ان کی تحریک اور دعوت اگرچہ دین کے پردے میں ظہور پذیر ہوئی تھی، لیکن حقیقتاً یہ قبائل مضر کے خلاف حقد وحسد اور منافرت و تعصب پر مبنی تھی۔

شیعی اور خارجی فکر و نظر کا فرق

شیعہ حضرات وصیت یا وراثت کے ذریعے امامت کے قائل تھے جو ایک ہی خاندان، یعنی خاندان ہاشمی علوی سے تعلق رکھتی تھی، خوارج کی فکر و نظر اس کے بالکل برعکس تھی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ خلیفہ کو عام انتخاب سے منتخب ہونا چاہیے جس میں تمام مسلمانوں کو رائے دینے اور فیصلہ کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ اس باب میں موالی اور عرب کے اندر بھی کوئی فرق اور امتیاز نہیں کرنا چاہیے، حالانکہ کیفیت یہ تھی کہ خوارج موالی سے شدید نفرت کرتے تھے۔ خلیفہ کی عصمت کے قائل نہ تھے، تسلیم کرتے تھے اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور لغزش بھی۔

خوارج کے نزدیک شرط خلافت یہ تھی کہ خلیفہ عادل ہو، احکام شرع کا نفاذ کرتا ہو، کجی اور گمراہی سے دور ہو اگر راہِ حق سے تجاوز کر جائے تو اسے معزول کر دینا اور قتل کر دینا واجب ہے۔

خوارج خلافت کو عرب خاندانوں میں سے کسی خاص خاندان کے ساتھ وابستہ نہیں کرتے تھے، نہ افضلیت کی بنیاد پر، نہ عربی پر قریشی کے امتیاز کی اساس پر، نہ عجمی پر عربی کی فضیلت پر۔

خوارج کے نزدیک بہتر یہ تھا کہ خلیفہ کسی اونچے خاندان سے نہ ہو تاکہ اسے معزول کر دینا آسان ہو اسی لیے یہ افضل خیال کرتے تھے کہ کوئی قریشی خلیفہ نہ ہو۔

ضرورت خلافت کا انکار

بعض خارجی فرقے ۔ نجدات ۔ سرے سے خلافت کی ضرورت ہی کے قائل نہ تھے، ان کا خیال تھا، اگر سوسائٹی خود اتنی ترقی پذیر ہو کہ امن و انصاف کے ساتھ زندگی بسر کر سکے تو کسی امام کی حاجت ہی نہیں۔

البتہ اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر قیام امامت واجب ہے۔

غرض ان کے نزدیک قیامِ خلافت مبنی بر مصلحت ہے، نہ کہ واجب دین۔

خوارج کی طرف سے اہل ذنوب کی تکفیر

خوارج اہل ذنوب کی تکفیر کیا کرتے تھے، یہ ایک گناہ اور دوسرے گناہ کے درمیان تفریق کے قائل نہ تھے، یہ خطائی الرائے کو گناہ سے تعبیر کرتے تھے۔

اسی لئے یہ لوگ علی کرم اللہ وجہہ و رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تکفیر کے قائل تھے کیونکہ وہ تحکیم پر رضامند ہو گئے تھے حالانکہ ان کی یہ رضامندی اضطراری تھی۔

ظاہر قرآن پر عمل درآمد

اپنے استنباطات میں خوارج ظاہر قرآن کے قائل تھے، یعنی الفاظ کا جو ظاہری مفہوم ہوتا تھا اس کو لیتے تھے۔

فرقہ خوارج اور اہلِ تشیع میں فرق

مدعیان تشیع منحرفین اور کج رائے اکثر اس کے قائل تھے، جس نے امام کی اطاعت کی اس پر حرام بھی حلال ہے۔

اس کے مقابلے میں خوارج یہ کہتے تھے جس نے عثمان، علی، طلحہ، زبیر اور ظالمین بنو امیہ سے برأت اور بیزاری کا اظہار کیا وہ نیکوکاروں میں سے ہے، چنانچہ اسکے فواحش اور کبائر تک سے درگزر کر جاتے تھے۔

خوارج کی شوکت و سطوت

جب حکومت میں ضعف اور کمزوری کے آثار نظر آتے تھے خوارج میں اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے لگتے تھے۔

وسط دولت امویہ تک ان کی قوت و سطوت قائم رہی، پھر مہلب بن ابی صفرہ نے ان کا قلع قمع کر کے رکھ دیا۔

ہشام بن عبدالملک کے بعد یعنی دولت امویہ کے زوال کے وقت خوارج خاصا زور پکڑ گئے تھے۔ اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، مدینہ پر قابض ہو گئے تھے۔

ابو حمزہ خارجی کا اہلِ مدینہ سے خطاب

یہ وہ زمانہ تھا کہ امام جعفر صادق وہاں مقیم تھے اور درس و تدریس، پند و موعظت اور تعلیم و تلقین میں منہمک تھے کامل ابن اثیر میں مدینے پر خوارج کے قبضے اور استیلاء کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"۱۳۰ھ میں ابو حمزہ قائد خوارج مدینے میں ایک معرکے کے بعد فاتحانہ داخل ہوا، منبر پر چڑھا اور خطبہ دیتے ہوئے کہا:

اے اہلِ مدینہ!

کج چشم (ہشام بن عبدالملک) کا زمانہ گزر گیا۔

یاد رکھو ہم بیکار نہیں نکلے ہیں ہم مال و دولت کے جویا نہیں ہیں، نہ کسی پرانے خون کا بدلہ لینا مقصود ہے، لیکن جب ہم نے دیکھا کہ سچائی کے چراغ گل ہو رہے ہیں تو یہ زمین ہم پر تنگ ہو گئی، ہم نے ایک داعی کی ندا سنی جو رحمان کی طاعت اور حکم قرآن کی طرف بلا رہا تھا۔ ہم نے اس داعی کی صدائے حق پر لبیک کہا، ہم مختلف قبائل کے لوگ تھے، تعداد میں کم، ضعیف و بے مایہ لیکن ہم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے، پھر تمہارے آدمیوں سے مڈبھیڑ ہوئی، انھیں ہم نے طاعت رحمان اور حکم قرآن کی دعوت دی، انھوں نے طاعت شیطان اور حکم بنو مروان کی دعوت دی۔

اے اہلِ مدینہ اگر تم نے مروان یا آلِ مروان کی مدد کی تو تم پر عذاب نازل ہوگا خدا کی جانب سے یا ہمارے ہاتھوں۔

اے اہلِ مدینہ! تمہارا اوّل جز اوّل تھا اور تمہارا آخر شر آخر ہے!"

مدینے میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور امام صادق وہاں تشریف فرما تھے اور یہ مناظر دیکھ رہے تھے، وہ دیکھ رہے تھے باطل باطل سے کس طرح ٹکرا رہا ہے حق کی آواز کس طرح مدھم پڑ گئی ہے اور بنو امیہ اور ان کے ساتھیوں پر کیا کچھ گزر رہی ہے، امام صادق ملاحظہ فرما رہے تھے کس طرح اللہ تعالیٰ نے اشرار بنو امیہ پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دیا تھا جو ان کا خون بہا رہے تھے اور گویا آلِ بیت کے خون ناحق کا بدلہ ان امویوں سے لے رہے تھے۔ یہ خوارج اگرچہ حق پر نہ تھے لیکن ان کا یہ استیلا زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد ہوا تھا۔

امام صادق، نورِ مبین، ہادیٔ حق

امام جعفر صادق سیاست سے یکسر الگ اور بے تعلق تھے، وہ ہادی اور مرشد تھے، اس گوشہ گیری کے باوجود انہیں جو احترام، وقار اور عظمت حاصل تھی وہ اس سے کہیں زیادہ تھی جو دوسرے لوگوں نے تلوار اور غلبہ و قوت کے بل پر حاصل کی تھی۔ وہ لوگ بھی ختم ہو گئے ان کی شوکت و سطوت بھی ختم ہو گئی مگر پشت ہا پشت سے، صدیوں سے آپ کا ذکر عزیز مشام جان و روح بنا ہوا ہے

آپ کا کوئی دشمن نہ تھا، آپ نورِ مبین تھے۔ ہادیِ حق تھے، صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والے تھے۔

خطبہ ابوحمزہ کے نکات و اشتمالات

اب ہم امام جعفر صادق کو ان کی محرابِ علم میں معتکف چھوڑتے ہیں اور ابوحمزہ کے خطبے کی طرف پھر عود کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں بعض پہلو ایسے ہیں جن سے اس عہد کی سوسائٹی اور احوال پر روشنی پڑتی ہے۔

اس خطبے کے مزید مطالعے سے کئی اہم امور نظر کے سامنے آ جاتے ہیں۔

- اس عہد میں غنی اور فقیر دولت مند اور غریب کے مابین تفاوت بہت بڑھ چکا تھا، جس کی طرف خاص طور سے ابوحمزہ نے اپنے خطبے میں اشارہ کیا تھا۔
- امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہو گئے تھے۔
- مدینے والوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا اس نے انہیں اور زیادہ مفلوک الحال بنا دیا تھا۔
- امام زید نے دولت بنو مروان کے اس طرز کو سخت ناپسند کیا تھا اور جس خطبے میں اہل کوفہ کو امویوں کے خلاف خروج کی دعوت دی تھی فرمایا تھا کہ میں (بیت المال سے) ہر حقدار کو اس کا حق دوں گا۔
- خوارج اہل مدینہ سے عموماً اور قریشیوں سے خصوصاً ظلم بنی مروان کا اعتراف یا بدرجۂ اقل اس معاملے میں ان کا سکوت چاہتے تھے۔
- قریش کو اس خطبے میں بار بار مخاطب کیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قبائل ربیعہ کے دل میں قریش کے خلاف بغض و عداوت کے جذبات اب تک کارفرما تھے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اہل مدینہ میں ایک جماعت ایسی تھی جو بنو امیہ سے موالات اور تعلقات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی ان کے ظلم اور آلِ رسولؐ کے ساتھ ظلم و ستم کو ذرا اہمیت نہیں دیتی تھی، چنانچہ انصار کے پوتوں میں سے ایک شخص نے زید بن علی زین العابدین سے کہا۔

"میرا باپ زید کے باپ سے بہتر تھا، میری ماں زید کی ماں سے بہتر تھی۔ میں خود زید سے بہتر ہوں۔
یہ سن کر خاندان عمر الخطاب کا ایک شخص برہمی کے عالم میں چیخ اٹھا اور گویا ہوا۔ بس اس سے زیادہ ہم صبر نہیں کر سکتے"!

اس خطبے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں میں جو سکوت نظر آ رہا تھا وہ رضاکارانہ نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد نفرت اور غضب پر تھی۔

امویوں کے خلاف اہل بادیہ اہل مداین متفق تھے

اس خطبے سے ایک اور امر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

وہ یہ کہ خوارج کی تحریک اہل بادیہ کی تحریک تھی، جو امویوں کے خلاف اٹھی تھی۔ شہری تحریک عباسیوں کی تھی۔ گویا امویوں کے خلاف اہل بادیہ اور اہل مدائن دونوں متفق تھے۔

خروج خوارج سے ایک اور امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ عرب اور موالی حکومت بنوامیہ کو ختم کرنے کے لیے مستعد ہو گئے تھے، عباسیوں کی بغاوت صرف حامیوں کی بغاوت تھی، اس میں عرب شریک نہیں تھے اس بغاوت کا قائد ابومسلم خراسانی تھا اور خوارج کی باغیانہ تحریک صرف عربی عناصر پر مشتمل تھی۔

اب ہم پھر امام جعفر صادق کی طرف رجوع کرتے ہیں!

خوارج مجلس امام میں سوال یہ ہے کہ آیا انواع اتصال کی کسی نوع کے ماتحت بھی خارجی امام جعفر صادق سے کوئی رابطہ رکھتے تھے، ہمارے سامنے کوئی ایسا دستاویزی ثبوت نہیں ہے جس سے واضح ہو سکے کہ ایسا تھا لیکن ایسا نہیں تھا، اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے، قیاس اور قرائن سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خارجی بھیس بدل کر سہی لیکن امام جعفر صادق کی مجلس میں ضرور حاضر ہوا کرتے تھے۔ خوارج کی ایک بہت سی باقوت اور باشوکت شخصیت نافع بن الازرق کی تھی، یہ نافع عبداللہ بن عباس کی مجلس میں آیا کرتا تھا، لہٰذا یہ بات ہرگز بعید نہیں ہے کہ مجلس امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ میں بھی خوارج آتے ہوں۔

خلیفہ منصور عباسی اور امام جعفر صادق عہد امام جعفر صادق کے سیاسی شئون و احوال کے یہ تھے، اشارات و مختصرات!

جو لوگ حق کی طرف دعوت دیتے تھے انہیں کوئی ناصر و یاور نہیں ملتا تھا، غلبہ ہمیشہ شر ہی کا ہوتا تھا۔

امام جعفر صادق کے عم محترم زید بن علی کتاب و سنّت اور حق و صداقت کی دعوت لے کر اٹھے۔ امویوں نے اسلام کا چراغ بجھا دیا تھا، زید نے اسے پھر سے روشن کیا، عراقیوں کے بلانے پر ہشام بن عبدالملک کے دور میں وہ میدان میں اترے، لیکن عراق نے جس طرح ان کے جد محترم حسین علیہ السلام کا عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیا تھا اس طرح زید کو بھی یکہ و تنہا چھوڑ دیا اور بالآخر وہ قتل ہو گئے۔ ہر قلب مومن پر اس کا گہرا اثر تھا اور محبین آل بیت نبیؐ کے دل میں تو ناسور ہو گیا تھا۔

اس دور میں خوارج نے مدینے پر قبضہ کیا، اس سے پہلے وہ حضر موت پر قابض ہو چکے تھے اس فتنے میں اہل مدینہ کا خون پانی کی طرح بہا، اس کشمکش میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حق فتح یاب نہیں ہوا اور باطل نے شکست نہیں کھائی، اور اگر باطل کی بنیاد ڈھے بھی گئی تو دوسروں کے ہوتے پر۔

اسی عہد میں محمد نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم نے عراق میں خروج کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ منصور غالب آیا اور وہ علویوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا اور امام صادق سے تو اسے خدا واسطے کا بیر تھا وہ کہا کرتا تھا۔

"نہ اس شخص کو جلا وطن کئے بنتی ہے نہ قتل کرتے!"

منصور نے چاہا تو بہت لیکن وہ آپ پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی موقعہ نہیں پا سکا کیونکہ نہ آپ نے کسی فتنے میں حصہ لیا، نہ کوئی تحریک اٹھائی خاموشی کے ساتھ علم کی خدمت میں لگے رہے آپ کی جلالت شخصیت کا عالم یہ تھا کہ ہر شخص آپ کے سامنے جھکتا تھا، لوگوں کے دل میں جو احترام اور وقار آپ کا تھا وہ ملوک و سلاطین کا بھی نہیں تھا.

منصور اور امام صادق میں ردّ و کد

لیکن جلن اور کڑھن کے باوجود منصور عباسی آپ کے علم بے نہایت کا حد درجہ قدر دان تھا۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ اس نے آپ کی شان علم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ شخص علم کا بحر موّاج اور ناپیدا کنار ہے، اس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا!"

منصور یہ بھی چاہتا تھا کہ آپ سے ربط ضبط رکھے ایک مرتبہ اس نے آپ سے کہا!

"جس طرح دوسرے لوگ ہمارے پاس آتے ہیں آپ بھی کیوں نہیں تشریف لایا کرتے؟"

جواب میں امام صادق نے تحریر فرمایا:

ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس کے باعث تم سے خائف ہوں، نہ تمہارے پاس امر آخرت ہے کہ امید و آرزو کا توشہ لے کر حاضر ہوں، نہ تمہارے پاس کوئی نعمت ہے کہ مبارک باد دینے حاضر ہوں"!

منصور نے پھر کہا!

"نصیحت کرنے تشریف لائیے!"

امام صادق نے جواب دیا۔

"جسے دنیا مطلوب ہو وہ تمہیں نصیحت نہیں کر سکتا، جسے آخرت کی طلب ہو، وہ تمہارا ندیم نہیں بن سکتا!"

اہل سیاست سے باوقار

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آپ سیاست سے الگ رہے لیکن اہل سیاست سے عزت اور وقار میں بہت آگے رہے. اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا اس لیے کہ آپ کی زندگی یکسر صدق و صفا تھی اور اس کے سامنے دشمن بھی سر عقیدت خم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں!

فلسفہ واعتقاد کے متنوع گوشے

نئے نئے بدعتی فرقوں کی نمود اور ان کا ظہور

مرجعیت عامہ عصر امام صادق میں اعتقادی مسائل اور نئے نئے فرقے بکثرت پیدا ہوئے علوم فلسفیہ طبیعیہ نے بھی اس دور میں کافی فروغ حاصل کیا۔ امام صادق اپنے والد ماجد کے بعد مرجع عام وخاص تھے۔ ان مسائل وفرق سے انہیں دوچار ہونا پڑا اور انہوں نے اسلام کی روشنی میں رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا۔

مسئلہ قدر اور مسئلہ مرتکب کبیرہ مسلمان علماء نے یہ سلسلہ عقائد دو اہم مسئلوں پر خصوصیت کے ساتھ توجہ مبذول کی۔

(۱) ایک مسئلہ قدر وقضاء

(۲) دوسرا مسئلہ مرتکب گناہ کبیرہ۔

سیاست کے بعد جس چیز نے لوگوں کو اپنی طرف پوری شدت کے ساتھ متوجہ کر رکھا تھا وہ یہی دونوں مسئلے تھے۔

مسئلہ قضاء وقدر عصر صادق سے پہلے کی چیز ہے بلکہ اسلام سے بھی پہلے کی چیز ہے۔ ارادہ وتقدیر الٰہی کے بارے میں علمائے یہود ونصاریٰ بھی بحث وگفتگو کیا کرتے تھے اور عہد جاہلیت کے لوگ بھی اپنے شرک کی تائید میں کہا کرتے تھے۔ اگر خدا نہ چاہتا تو ہم شرک کیوں کرتے؟

یہ مسئلہ آنحضرتؐ کے زمانے میں بھی اٹھا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ قضاء وقدر پر ایمان تو رکھا جائے لیکن اس پر غور وبحث سے اجتناب کیا جائے۔

عہد صحابہ میں بھی یہ مسئلہ موجود تھا۔

عمر رضی اللہ عنہ اسے سخت سزا دیتے تھے جو اپنے کسی فعل کے ارتکاب کا عذر قضاء وقدر کو بناتا تھا۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک چور آپ کی خدمت میں حاضر کیا گیا آپ نے اس سے پوچھا۔

"تو نے چوری کیوں کی؟"

اس نے جواب دیا۔
"اللہ کا فیصلہ یہی تھا!"
آپ نے حکم دیا اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں اور کوڑے مارے جائیں؛
پوچھا گیا یہ دوہری سزا کیوں؟
جواب دیا" ہاتھ چوری کی وجہ سے کاٹے گئے اور کوڑے خدا پر جھوٹ بولنے کے جرم میں لگائے گئے"

امام علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں اس مسئلے نے اور زیادہ زور پکڑا۔ آپ لوگوں کے شبہات دور کرتے رہتے تھے۔ آپ کے نزدیک قضا نام تھا حکم تکلیفی کا اور قدر عبارت تھی علم ازلی سے۔

عصر صحابہ کے بعد عصر تابعین و تبع تابعین میں یہ مسئلہ اور زیادہ شدت کے ساتھ اُبھرا۔

اور عصر امام صادق میں تو ایسے فرقے پیدا ہو گئے جو قدر کے مسائل کو زیر بحث لاتے رہتے تھے۔

مرتکب گناہ کبیرہ اور خوارج

مرتکب گناہ کبیرہ کا مسئلہ امام علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں اٹھا، اسے خوارج نے اٹھایا تھا، وہ کہتے تھے انہوں نے آپ کا ساتھ اس لیے چھوڑا کہ آپ نے تحکیم قبول کر کے گناہ کیا تھا۔ اب آپ پر توبہ واجب ہے۔

بعد میں خوارج ان لوگوں کو کافر قرار دینے لگے جن سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوا ہو، یہ تو تھی افراط اس کے مقابلے میں فرقہ مرجیہ کی تفریط یہ تھی کہ وہ ہر گناہ کو مغفور قرار دیتے تھے، کیونکہ ایمان کے ساتھ معصیت کا ارتکاب ضرر نہیں پہنچاتا جس طرح شرک کے ساتھ طاعت نفع نہیں پہنچاتی۔

"حسن بصری سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے!
مرتکب گناہ کبیرہ فاسق ہے!"

بعض معتدل لوگ کہتے تھے، گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن اور کافر کے بیچ بیچ ہے، اسے مومن نہیں کہا جا سکتا، مسلم کہا جا سکتا ہے، اگر ثابت نہ ہوا تو عذاب دائمی کا سزاوار ہوگا۔

دوسرا گروہ جو اہل اعتدال پر مشتمل تھا کہتا تھا، گناہ کبیرہ کا مرتکب صاحب ایمان مانا جائے گا۔ معاصی سے اعتقاد کو ضرر نہیں پہنچتا، اگر اس نے توبہ کر لی تو مغفور ہوگا ورنہ سزا پائے گا۔

افکار و آراء مضطربہ

ان آراء مضطربہ کے مابین امام جعفر صادق زندگی بسر کر رہے تھے مجادلہ کرتے تھے اور مناظرہ کرتے تھے، آپ کا یہ مشغلہ خاص طور پر عراق ہی میں تھا۔ جہاں یہ مذاہب مختلفہ نمود و فروغ کی منزلیں طے کر رہے تھے۔

فرقہ جبریہ یا جہمیہ

ارادۂ انسان اور مشیت خداوندی کا باہمی تعلق

انسان مختار مطلق ہے یا مجبور محض؟ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں عہد صحابہ و تابعین میں مسلمانوں نے مسئلہ تقدیر پر غور کرنا شروع کر دیا تھا، یعنی انسان سے خیر و شر جو کچھ سرزد ہوتا ہے آیا اس میں ارادہ الہٰی بھی شریک ہوتا ہے؟ بندے کا عمل اللہ کے ارادے سے الگ اور جُدا ہے یا متصل؟ آیا وہ مختار مطلق ہے یا مجبور محض؟

جبریہ کا مسلک اس سوال کا جواب جبریہ کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق نہیں ہے جن افعال کی نسبت اس سے دی جاتی ہے ان پر وہ قدرت نہیں رکھتا، پس اس مذہب کی بنیاد نفی فعل عبد پر ہے یہ افعال کی نسبت بندے کی طرف نہیں کرتے قدر کی طرف کرتے ہیں، یعنی اللہ اپنی مشیت کے مطابق بندے سے افعال سرزد کراتا ہے' بندوں کی طرف ان کی نسبت مجازی ہے، جیسے کہتے ہیں درخت بارآور ہوا، اور پانی بہا۔ اور سورج طلوع ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔

موُرخانہ کاوش سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اوّل عصر اموی اور آخر عہد صحابہ میں یہ مسئلہ شدت کے ساتھ اُبھرا۔

کتاب" المنیتہ والامل" میں ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے شام کی ایک جماعت کو اپنے ایک خط میں اس بات پر بہت بُرا بھلا کہا کہ عقیدہ جبر کی قائل ہے خط کے آخر میں لکھا:

"کیا تم میں کوئی ایسا مفتری ہے جو اپنے جرائم اللہ کے سر تھوپتا ہو اور اپنے ذنوب کی نسبت اس کی طرف کرتا ہو!"

اس کتاب میں حسن بصری کا بھی ایک خط ہے جو انہوں نے اہل بصرہ کو لکھا تھا اور تحریر فرمایا تھا!

"جو اللہ پر اور اس کی قضاء و قدر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے اور جو اپنے گناہ اللہ کے سر تھوپتا ہے وہ بھی کافر ہے"!

اس فرقے کا موجد جعد تھا یا جہم؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقیدہ جبر شام و عراق میں یہ عہد تابعین پھیل چکا تھا۔

مسلکِ اعتزال معتزلہ کا دعویٰ

معتزلہ نے کفر و اسلام کے بین بین ایک راستہ نکالا تھا۔ یہ لوگ بصرے میں تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ امام جعفر اور آلِ بیت بھی اسی مذہب کے حامل ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر امام جعفر صادق کے معاصر فرقوں کا اختصار کے ساتھ الگ الگ ذکر کریں گے۔

کیوں کہ ان فرقوں نے ملّتِ اسلامیہ کی فکری تاریخ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور ان کے اثرات و موثرات کا عمیق نظر سے مطالعہ ناگزیر ہے۔

جس شخص نے اس عقیدے کو ایک باقاعدہ نظام کا تابع کیا اور اہل عقائد کا ایک فرقہ بنایا، وہ جعد بن درہم ہے جس نے دوسری صدی ہجری کے اوائل میں یہ پرچم بلند کیا۔

کہا جاتا ہے جعد بن درہم نے یہ تفکیر بیان بن سمعان سے حاصل کی تھی جو ائمہ آل بیت کے لیے الوہیت کا مدعی تھا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ خیالات منحرفہ کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

بہرحال اس فرقہ کا موجد کوئی بھی ہو یہ بات طے شدہ ہے کہ اس مسلک کا سب سے بڑا داعی جہم بن صفوان تھا یہ خراسان میں پرچار کرتا تھا، اسے نصر بن سیار نے قتل کر دیا لیکن اس کے پیرو نہاوند میں باقی رہے، یہاں تک کہ ابومنصور ماتریدی کا مذہب چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں غالب آگیا۔

جہم بن صفوان کے آراء منحرفہ

جہم کی دعوت یہ تھی کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے، وہ اختیار نہیں رکھتا، اس کے دوسرے آراء منحرفہ و شنگہ یہ تھے۔

- دوزخ اور جنت دونوں کو فنا ہے، کوئی شے بھی دائمی نہیں ہے، قرآن میں جس خلود (دائمی قیام جنت یا دوزخ) کا ذکر ہے اس سے مراد طول قیام ہے۔
- ایمان عبارت ہے معرفت سے، اور کفر نام ہے اللہ سے اور حقائق اسلامیہ سے جہل کا پس معرفت حقائق اور معرفت الٰہی، اذعان و تصدیق کے بغیر بھی ایمان قرار دی جائے گی، اور اس سے جہل کفر!
- حیات، علم، کلام، سمع اور بصر وغیرہ صفات سے اللہ متصف نہیں کیا جا سکتا، نہ ایسے دوسرے صفات سے متصف کیا جا سکتا ہے جو فنا پذیر ہوں۔

جہم کی دعوت اور دعایت

جہم اور اس کی دعایت و دعوت کو حضرت امام جعفر صادق کے افکار و آراء سے کوئی نسبت نہیں تھی، ویسے بیان سے بہت دور دراز فاصلے پر بھی تھا، اسی لیے اس سے کوئی مناظرہ امام صادق کا تاریخ میں نہیں ملتا، لیکن اس کے فرقے کے لوگ عراق، شام بلکہ مدینے تک میں موجود تھے۔

فرقہ قدریہ

قدریہ اور معتزلہ کے افکار و آرا میں کہاں تک ہم آہنگی تھی؟

عبدالقاہر بغدادی کا خیال

یہ فرقہ جہمیہ کی بالکل نقیض تھا کیونکہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ انسان اپنے افعال کا ذمہ دار اور کاسب ہے۔

عبدالقاہر بغدادی نے اس فرقہ کو معتزلہ کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ [1]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدریہ معتزلہ سے پورے طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں، اگر اس باب میں یہ معتزلہ سے متفق ہیں کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے لیکن دوسرے مسائل میں ان سے مختلف الآرا ہیں۔ مثلاً یہ ازلی کی نفی کرتے ہیں۔ تقادیر ازلی کے بھی قائل نہیں ہیں۔

"سراج العیون" کا بیان

یہ فرقہ بصرے میں پیدا ہوا۔

کتاب "سراج العیون" میں اس فرقہ کی نشو و نما کے بارے میں مرقوم ہے:۔

"کہتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر پر سب سے پہلے جس نے لب کشائی کی وہ ایک نصرانی تھا۔ جس نے اسلام قبول کیا اور پھر نصرانی بن گیا۔ اس سے معبد الجہنی نے یہ بات سیکھی اور غیلان دمشقی نے اسے حاصل کیا!"

اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مذاہب قدیمہ کے لوگ کس طرح مسلمانوں میں ایسے افکار پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے جن سے شک پیدا ہوا اور سرگشتگی کی کیفیت ابھرے کہ اسلامی عقیدے کو کمزور کرنے کی اس سے بہتر تدبیر نہیں تھی۔

معبد جہنی اور غیلان دمشقی نے اس دعوت کا پرچم لہرایا۔

معبد کا مرکز بصرہ تھا، یہیں یہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرتا رہتا تھا، یہاں تک حجاج بن یوسف ثقفی نے اسے قتل کر دیا۔ کیوں کہ یہ عبدالرحمٰن بن اشعث کے انصار میں تھا اور حجاج نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ امام جعفر صادق کی معبد سے ملاقات نہیں ہوئی

کیونکہ ابھی تک آپ مدینے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ نہ آپ کا اتنا سن تھا کہ بحث و مجادلے میں حصہ لیتے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی آپ کے والد ماجد بقید حیات تھے۔ اور ہدایت و ارشاد کی مسند پر وہی فائز تھے۔

غیلان کا پند نامہ عمر بن عبدالعزیز کو

لیکن غیلان برابر اپنی دعوت میں مصروف رہا۔" کتاب "والائل" کے مصنف نے اسے قدری قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس نے عمر بن عبدالعزیز سے ملاقات کی اور انہیں ایک پند نامہ بھیجا، اس میں لکھا تھا:

"اے عمر!"

کیا تونے کوئی ایسا حکیم دیکھا ہے جو اپنی صنعت کو عیب دار کر دیتا ہو؟ یا ایسی چیز بناتا ہو، جو عیب دار ہو؟ یا اپنے فیصلے پر عمل کرنے والے کو سزا دیتا ہو؟

کیا تیرا یہ خیال ہے کہ خدائے رحیم اپنے بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ کا مکلف اور پابند بنا سکتا ہے؟ اور طاعت کے "جرم" میں انہیں عذاب دے سکتا ہے؟

"کیا تونے کوئی ایسا عادل بھی دیکھا ہے جو لوگوں کو ظلم اور تظالم کی تاکید کرتا ہو"؟

"کیا تونے کوئی ایسا صادق بھی دیکھا ہے جو لوگوں کو کذب و تکاذب کی دعوت دیتا ہو"؟

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ردِّ عمل

"المنیتہ والائل" میں ہے کہ یہ خط پڑھ کر عمر بن عبدالعزیز نے غیلان کو اپنے حضور میں طلب کیا اور اس سے کہا!

"بتاؤ کیا چاہتے ہو"؟

غیلان نے جواب دیا۔

مجھے بیع خزائن اور رد مظالم پر مامور کر دیجئے!"

عمر بن عبدالعزیز نے ایسا ہی کیا، وہ ان چیزوں کو لٹاتا تھا اور کہتا تھا۔

"آؤ خائنوں کی پونجی لے لو، آؤ ظالموں کی پونجی لے لو۔

ہشام بن عبدالملک نے اس کی یہ باتیں سن کر کہا۔

" خدا کی قسم اگر میں اس پر قابو پا گیا تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گا!"

پھر جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے ایسا ہی کیا!

نیکی اور بدی کے الگ الگ خدا

غیلان کے بعد یہ مذہب ایک طرح کی ثنویت میں تبدیل ہو گیا اس فرقے کے لوگوں نے نیکی اور بدی کے خدا الگ الگ بنا لئے، خیر کے

لئے خدائے نور اور شر کے لئے خدائے ظلمت۔ خدا سے صرف فعل خیر کی نسبت کرتے تھے۔ شر کا ارتکاب وہ کسی طرح بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شر کی نسبت وسوسۂ ابلیس کے واسطے سے اپنی ذات سے کرتے تھے جس میں خدا کے ارادے کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا تھا۔

غیلان اور امام جعفر صادق

غیلان کی دعوت اور تحریک سے امام جعفر صادق گوش آشنا تھے۔ غیلان آل بیت کی طرف رغبت رکھتا تھا۔ المنیتہ والامل کے مصنف نے اسے معتزلی لکھا ہے جو آل رسول کی طرف راغب تھے، لیکن کیا اس کی تفکیر سے امام صادق نے کوئی اثر لیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ امام صادق خود صاحب تفکیر مستقل تھے، وہ دوسروں کے انکار و آراء سے صرف اس حد تک اثر قبول کرتے تھے، جہاں تک حق کا تعلق ہوتا تھا، اس مسئلے میں ان کی رائے کیا تھی اس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

اس قوت کی بنا پر جو اللہ تعالیٰ نے اسے ودلیعت کی ہے، وہ اس کا قائل نہیں ہے کہ ایک قوت خیر کی ہے ایک شر کی، وہ تمام قوتوں کا مرجع ذاتِ الٰہی کو مانتا ہے۔

واصل کی یہ رائے بھی اعتدال اور توسط کا پہلو لئے ہوئے ہے، قدریہ کی طرح انتہا پسندی پر مبنی نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ شر نفس اور شیطان کی طرف سے ہے اور خیر اللہ کی طرف سے، نہ جبریہ سے ہم آہنگ ہے جو کہتے ہیں بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں۔ واصل کے نزدیک یہ عقیدہ رکھنا قانون جرم کو منہدم کر دینا ہے جس کی رو سے مطیع کو ثواب اور عاصی کو عقاب ملتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب

واصل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کا قائل ہے!

اس باب میں لوگوں کی رائے مختلف ہے، ہر ایک کا اپنا اپنا منہاج ہے۔

فقہاء کے نزدیک بیان سنن اور محاربہ بدعت کے ذریعے علماء کے نزدیک دعوت الی الحق اور ظالم کو راہِ راست پر لانے اور التزام شرع کے ذریعے، علماء کلام کے نزدیک زندیقوں سے پیکار و رزم کے ذریعے اور جو لوگ اسلام سے برسرِ جنگ ہوں ان کا مقابلہ کرنے کے ذریعے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بروئے کار لایا جاتا ہے۔

اس منہاج کے مطابق واصل نے اپنے لئے زنادقہ سے معرکہ آرائی اور ان کے اقوال کی تردید کے لیے اپنے آپ کو وقف کر لیا تھا اور نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اس مسلک کو نبا ہا

واصل کی ایک اور خوبی برجستہ گوئی تھی۔ وقت کے وقت اسے ایسی سوجھ جاتی تھی کہ حریف مقابل کو لاجواب کر دیتا تھا۔

بانی مذہب کے پرستاروں، مجوسیوں اور زندیقوں سے واصل نے معرکہ آرائیاں جاری رکھیں۔ ان سب کا مقصد ادیان قدیمہ کی احیاء و تجدید تھا۔ اور مسلمانوں کو ریب و شک میں مبتلا کر دینا۔

کیا واصل اور امام صادق کی ملاقات ہوئی تھی؟

واصل امام جعفر صادق کا ہم عصر تھا۔ لیکن یہ بصرے میں رہتا تھا اور امام صادق مدینے میں۔ بظاہر وہ امام صادق سے کبھی نہیں ملا، کیوں کہ امام صادق عراق صرف منصور کے زمانے میں تشریف لے گئے اور واصل اس وقت وفات پا چکا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام صادق اس کی دعوت اور افکار سے بخوبی واقف تھے۔

معتزلہ

ذات باری تعالیٰ اور قرآن اور عقائد سے متعلق فکر جدید

معتزلہ اور قدریہ میں ربط فکر

افکار و آراء کے اعتبار سے معتزلہ قدریہ سے بھی قریب تھے لیکن یہ قربت اس وقت تک تھی جب تک قدریہ فرقہ مجوسیت سے قریب نہیں ہوا تھا۔

بانی فرقہ معتزلہ واصل بن عطا

فکر اعتدال بہت قدیم ہے لیکن اس نے ایک مستقل فرقے کی صورت واصل بن عطا کے عہد میں حاصل کی، واصل کا سال ولادت ۸۰ھ ہے۔ امام جعفر صادق کا تقریباً ہم عمر تھا۔

واصل کے افکار و آراء کا موازنہ

آراء منحرفہ سے اگر واصل کے افکار و آراء کا موازنہ کیا جائے تو ماننا پڑیگا کہ ان میں اعتدال تھا، اس نے متعدد افکار و آراء کو اپنے افکار و آراء میں سمو لیا تھا۔ نفی صفات کا مسئلہ اس نے جہمیہ سے لیا تھا لیکن مہذب کر کے اس کا قول تھا:

اللہ تعالیٰ قدرت، ارادے، علم، حیات، سمع اور بصر سے متصف ہے لیکن یہ صفات غیر ذات نہیں ہیں۔

جبر کے معاملے میں واصل جہمیہ سے دوسرے سرے پر تھا۔

مرتکب گناہ کبیرہ فاسق ہے

واصل کا قول ہے:

"مرتکب گناہ کبیرہ کو اس نام سے یاد کیا جائے گا جو اللہ نے اس کا رکھا ہے یعنی فاسق!"

واصل کی نظر میں فاسق نہ کافر ہے نہ مومن!

یہاں تک تو خیر وہ حد میں رہتا ہے لیکن جب وہ اس کے دائمی عذاب کا قائل نظر آتا ہے تو حد سے گزر جاتا ہے مجموعی طور پر معتزلہ کی رائے یہ ہے کہ فاسق کو اس کے جرم کے تناسب سے سزا دی جائے گی وہ دائمی عذاب کا سزاوار نہیں ہوگا۔

اس مسئلہ سے متعلق امام صادق کی رائے ہم آگے چل کر پیش کریں گے

تمام قوتوں کا مرجع ذات الٰہی ہے

واصل کا خیال ہے کہ انسان اپنے افعال خیر و شر کا مختار ہے

وہ بہ نفسِ نفیس ان دونوں کے مابین فیصلہ فرمائے۔"

خدا معاف کر سکتا ہے

مرتکب گناہ کبیرہ کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ قیامت کے دن خدائے بزرگ و برتر فیصلہ فرمائے گا۔ اگر اس نے معاف کر دیا تو یہ اس کی رحمت ہے اور اگر سزا دے تو پھر مرتکب گناہ کبیرہ نے اپنے گناہ کا پھل پا لیا۔

ایمان کے ساتھ معصیت بے ضرر ہے

لیکن بعد میں اس فرقے کے اندر وہ لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اس ڈگر کو ترک کر دیا اور مرتکب گناہ کبیرہ کے لیے قیامت کے منتظر رہے، بلکہ فیصلہ صادر کرنے لگے۔ انہوں نے کہا ایمان اقرار و تصدیق کا نام ہے، لہٰذا ایمان کے ساتھ معصیت کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ ایمان اور عمل باہم جدا جدا ہیں۔ ایمان اعتقاد بالقلب کا نام ہے اگرچہ بظاہر آدمی اپنی زبان سے کفر کا اقرار ہی کیوں نہ کرے، بلکہ بتوں کی پوجا ہی کیوں نہ کرنے لگے یا دارالسلام میں یہودیت یا نصرانیت کیوں نہ اختیار کر لے اگر وہ ایمان پر مرا ہے تو کامل الایمان ہے۔

بنیادی تعلیمات اسلام سے انحراف

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ گروہ اسلام کا جامہ پہن کر کس طرح اسلام کی بنیادی تعلیمات کا ہادم بن گیا؟

ہمارے پاس ایسے مصادر نہیں ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دعویٰ کر سکیں کہ امام صادق کی مرجیہ سے مڈبھیڑ ہوئی یا ان میں سے کسی فرد سے انہوں نے مناظرہ کیا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ امام صادق کے عم محترم امام زید نے ان سے برأت کا اظہار فرمایا تھا اور فرمایا تھا:

"میں مرجیہ سے اظہار برأت کرتا ہوں جنہوں نے فساق کو عفو الٰہی کے بارے میں غلط طور پر مبتلا کر دیا ہے"

امام زید کو ان کی ان سرگرمیوں کا علم تھا، جو یہ عراق میں انجام دے رہے تھے۔ ایسا گروہ مدینے میں کوئی مقام حاصل کر سکتا تھا کہ امام صادق اس سے واقف ہو سکتے، لیکن امام زید کئی مرتبہ عراق تشریف لے گئے اور وہاں قیام پذیر رہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس فرقے کی سرگرمیوں اور افکار و عقائد سے بخوبی واقف تھے۔

بعد میں معتزلہ ہر اس شخص کو مرجیہ کہنے لگے جو مرتکب گناہ کبیرہ کو بین بین نہیں رکھتا تھا اسی طرح جو شخص یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ فاسق کو اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم کی بنا پر معاف کر سکتا ہے اسے بھی یہ مرجیہ کہتے تھے اسی بنیاد پر یہ لوگ امام ابو حنیفہ اور ثوری وغیرہ کو بھی مرجیہ کہا کرتے تھے، جیسا کہ شہرستانی نے بیان کیا ہے۔

مرجیہ کی طرف بعض اکابر کی غلط نسبت

اس بنیاد پر بہت سے تابعین مثلاً سعید بن جبیر، حماد بن ابی سلیمان، استاذ امام ابو حنیفہ، مقاتل بن سلیمان، حسن بن محمد ابن علی بن ابی طالب وغیرہ کو بھی یہ مرجیہ قرار دیتے تھے، حالانکہ ان سب کا شمار ائمہ دین میں ہوتا تھا،

مرجئہ

ابوبکرہ کی ایک حدیث اور اس نئے فرقے کے عقائد

ایک سیاسی فرقہ ابتدا میں یہ فرقہ تمام تر سیاسی تھا، کیونکہ یہ اس وقت عالم وجود میں آیا تھا جب علی رضی اللہ عنہ اور ان کے مخالفین کے مابین قتال ہو رہا تھا۔

اس فرقے کا مسلک یہ تھا کہ جب مسلمانوں میں جدال و قتال ہو تو خاموش رہو، یہ لوگ ابوبکرہ کی حدیث سے استدلال کرتے تھے کہ آپؐ نے فرمایا:۔

"جب فتنے سر اٹھائیں تو بیٹھا ہوا کھڑے ہونے سے اور کھڑا ہوا چلنے والے سے بہتر ہے۔ خبردار جب فتنے واقع ہوں، تو جس کے پاس اونٹ ہوں اس سے چمٹ جائے، جس کے پاس بکریاں ہوں وہ ان سے لگ جائے جس کے پاس زمین ہو وہ وہیں رہے۔"

صحابہؓ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ جس کے پاس نہ اونٹ ہوں، نہ بکریاں، نہ زمین وہ کیا کرے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"وہ اپنی تلوار پتھر پر دے مارے!"

ابن عساکر کا بیان ابن عساکر نے اس فرقہ کی نشوونما کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ شک میں مبتلا لوگ تھے، قتل عثمان کے بعد جب یہ مدینے آئے تو گویا ہوئے:۔

"جب ہم یہاں سے گئے تھے تو تم متحد تھے۔ اب واپس آئے ہیں تو تم باہم مختلف ہو، تم میں سے بعض کہتے ہیں عثمان مظلوم قتل ہوئے تم میں سے بعض کا قول ہے کہ علی اولی بالحق ہیں، یہ دونوں ثقہ ہیں، اور ہم دونوں کو سچا مانتے ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں میں سے کسی سے برات کا اظہار نہیں کرتے، نہ دونوں میں سے کسی پر لعنت کرتے ہیں، نہ دونوں میں سے کسی کے شاہد بنتے ہیں۔ ان دونوں کا معاملہ خدا کو سونپتے ہیں یہاں تک کہ

ان کو قدریہ اس لیے کہا گیا کہ یہ اہل کبائر کے ایمان کو تسلیم کرتے تھے۔
شہرستانی نے مرجیہ کو دو قسموں میں منقسم کیا ہے:۔

- مرجئہ سنت۔
- مرجئہ بدعت۔

پہلی قسم کے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ مرتکب گناہ کبیرہ دائمی عذاب نہیں پائے گا بہ قدر معصیت اسے سزا ملے گی۔ اللہ اپنی رحمت سے چاہے تو معاف بھی کر دے۔

یہ لوگ مرتکب گناہ کبیرہ کو اللہ پر جری نہیں کرتے تھے، بلکہ اس پر زور دیتے تھے کہ وہ بہ قدر ارتکاب گناہ مستحق عذاب ہے، ایمان کے باوجود معصیت اسے گزند پہنچا سکتی ہے لیکن ایسا شخص دائمی عذاب سے دوچار نہیں ہوگا نہ اسے کافر قرار دیا جائے گا۔

مرجئہ کی دوسری قسم ان لوگوں پر مشتمل تھی، جو معصیت شعاروں کو گناہ کی جرأت دلاتے تھے۔ دین نام ہے اوامر، نواہی اور عقیدے کا، مرجئہ نے عقائد پر یورش کی اور تشکیک پیدا کی، مرجئہ کے علاوہ دوسرے غالی فرقوں نے امر دین منہدم کرنے کی سعی کی، ائمہ آل بیت دونوں کے سامنے آکھڑے ہوئے، ان کے عقائد باطلہ کی تصحیح کرتے رہے، امر حق کی طرف انہیں بلاتے رہے، راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتے رہے اور ان میں نمایاں ترہستی امام جعفر صادق کی تھی!

فقہ — عصر امام جعفر صادق میں

اجتہاد اور فتاویٰ کے مختلف مرحلے

فقہ عراق اور فقہ مدینہ

امام جعفر صادق اختلاف فقہا کے سب سے زیادہ ماہر تھے وہ فقہ عراق اور اس کے مناہج کے بھی رمز آشنا تھے، وہ فقہ مدینہ سے بھی بخوبی واقف تھے، خود ان کا گھر فقہ آل بیت کا مرکز تھا نیز احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی وہ بہت بڑے اور بلند پایہ مجتہد تھے، وہ اپنے ہم عصروں پر جس طرح حکمت میں فائق تھے اس طرح فقہ میں بھی سب پر بالا تھے۔

فن فقہ کے انواع مختلف

ہم کسی اندیشے یا وسوسے کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ فقہ کا فن مختلف انواع پر مشتمل ہے اور طرز استنباط بھی متعدد اور متنوع مناہج رکھتا ہے اور کوئی عالم محقق بھی ایسا نہیں ہے جس کی تفکیر و آراء پر خواہ وہ کتنا ہی عظیم و جلیل کیوں نہ ہو، اس کے علم کا اثر نہ پڑے، کیونکہ عقل علمی جملہ عناصر سے غذا حاصل کرتی ہے اور یہ اس کی عقل و فکر پر مشتمل ہوتے ہیں، اس طرح ایوان فکر میں ایک نیا رنگ ابھرتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اس کی حاصل کردہ علمی غذا اسے قریب ہو یا بعید ہو۔

اجتہاد فقہی کے مختلف سرچشمے

امام جعفر صادق کا عہد وہ ہے جس میں اجتہاد فقہی کے مختلف چشمے پھوٹے جو مناہج میں اگرچہ مختلف تھے لیکن ان کی اصل واحد تھی۔

اسی عہد میں فقہ اسلامی کے مجتہد پیدا ہوئے جو ان حوادث کے احکام مستنبط کرتے تھے جو واقع ہوئے ہوں یا واقع ہو سکتے ہوں، اسی زمانے میں اصول فقہ کے ضبط و تدوین کا سلسلہ شروع ہوا اور مناہج اجتہاد صحیح مرتب ہوئے۔

اجتہاد اور فتاویٰ کا میدان بہت وسیع تھا، اگرچہ ابھی فقہ کتابوں کی صورت میں تدون نہیں ہوئی تھی یہ سلسلہ تو کہیں جا کر دوسری صدی ہجری کے نصف ثانی میں شروع ہوا۔

آل بیت مدینے میں دراسات فقہیہ کی طرف یکسوئی کے ساتھ متوجہ تھے۔ دراسات آثار نبویہ بھی ان کا مشغلہ تھا صحابہ اور تابعین کے روایات بھی یہ قبول کر لیتے تھے۔ امام علی زین العابدین امام جعفر صادق

کہ جدِ محترم نے بہت سے تابعین سے روایت کی ہے کیونکہ اس میں کوئی حرج یا مضائقہ نہیں سمجھا۔ پس امام صادق کے جدِ محترم کا علم صحابہ کے مابین پھیلا، اور علم صحابہ و تابعین میں پہنچا، اور ان تابعین نے امام علی زین العابدین سے روایت کی، فقہ روایت میں ابن شہاب زہری ان کے شاگرد ہیں۔ امام زین العابدین نے ابن عباس، جابر، ام المومنین ام سلمہ اور دوسرے صحابہ سے جنہیں انہوں نے پایا روایت کی، ان سے ان کے صاحبزادوں، امام باقر اور زید نے روایت کی اور ان سے ان کے پوتے امام صادق نے روایت کی۔

ابن شہاب زہری اور امام زین العابدین

ابن شہاب زہری جو امام زین العابدین کے شاگرد تھے۔ ان علی بن حسین رحمہا اللہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔

"میں نے علی بن حسین سے بڑا فقیہہ کوئی نہیں دیکھا"![1]

ابن شہاب صحبت اور کثرت سے استفادہ کے باعث آپ کی مجلس میں اکثر نشست برخاست رکھا کرتے تھے چنانچہ اکثر فرمایا کرتے تھے

"میری نشست زیادہ تر علی بن حسین کی مجلس میں رہا کرتی تھی"[2]

امام باقر بھی اپنے والد امام زین العابدین کی طرح صحابہ اور تابعین سے روایت کیا کرتے تھے ان سے متعدد محدثین نے روایت کی ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ان کے متعلق لکھا ہے:

"آپ نے کئی صحابہ سے روایت کی ہے اور آپ سے کبار تابعین کی ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے، جن لوگوں نے آپ سے روایت کی ہے ان میں آپ کے صاحبزادے امام جعفر صادق، حکم بن عتیبہ، اعمش، ابو اسحاق سبیعی، اوزاعی، اعرج۔ جو عمر میں آپ سے بڑے تھے۔ ابن جریج، عطاء، عمرو ابن دینار اور زہری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں"[3]

علم کا یہ سارا چرچا امام جعفر کے گھر میں ہو رہا تھا۔ جو صحیح معنیٰ میں معدن علم تھا۔ عہد طفلی ہی سے امام صادق اپنے والد کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۳۴ سال کی تھی، یقیناً آپ نے اپنے نانا سے بھی تحصیل علم کی تھی۔ آپ کے نانا قاسم ابن محمد ابن ابی بکر صدیق، تھے قاسم کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔

---

[1] حلیۃ اولیا ج ۲۔ ص ۱۴۲۔

[2] حلیۃ اولیا ج ۲۔ ص ۱۴۲۔

[3] تاریخ ابوالفداء ج ۹ ص ۱۰۶۔

امام صادق اور مدینہ رسولؐ

امام صادق نے اپنی حیات گرامی پوری کی پوری مدینہ منورہ میں گزاری، بعد میں جب عراق تشریف لے گئے تو مقصود قیام نہ تھا، اگرچہ قیام خاصا طویل رہا۔ لیکن عراق وطن نہ بن سکا، وطن تو دیار رسولؐ ہے۔ مدینہ منورہ ہی تھا جو منزل وحی جبلین رہا ہے، احکام شرعیہ تھا، پس ضروری اور لابدی ہے کہ ہم عصر امام جعفر صادق کے مدینہ منورہ کا مرقع اپنے پیش نظر رکھیں —— مدینہ رسولؐ جس سے وہ متاثر ہوئے اور جس پر انہوں نے اپنا اثر ڈالا!

عہد امام صادق کا مدینہ

علم رسولؐ اللہ کا گہوارہ اور نشیمن

مدینے کا علم۔ علم رسولؐ کا بقایا تھا:

آثار نبویہ یہاں کے ایوان حکومت میں احکام نبویہ کے آثار باقی تھے، تنفیذ احکام میں ان کی جھلک موجود تھی، اس لیے کہ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عہد ثلاثہ خلفاء راشدین میں یہ دولت اسلامیہ کا مستقر، مرکز اور دارالحکومت رہا تھا، یہیں احکام الٰہی پر مشتمل وحی نازل ہوتی تھی اور آپؐ ان کا انطباق عملی طور پر کرتے تھے اور ان کی تنفیذ کا طریق مستقیم امت کے سامنے رکھتے تھے، نیز قرآن کے مجمل کی تفصیل بیان فرماتے تھے، اپنے اقوال سے بھی اور اپنے افعال سے بھی اور ہو بہو اس کی پیروی صحابہ کرام نے کی۔

عہد خلافت راشدہ میں علیؓ کے فیصلے عہد خلفاء راشدین میں کتاب و سنت سے عقول صحابہ نے استخراج احکام کیا، اور مجتمعات اسلامیہ کے پیش آمدہ مسائل کے سلسلے میں استنباط سے کام لیا، کیونکہ فتوحات کے بعد حدود مملکت اسلامیہ میں اضافہ ہو گیا تھا اور نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے ماہر فقہ کبار صحابہ کو مدینے میں روک رکھا تھا اور انہیں اقالیم مفتوحہ کی اجازت دے رہی تھی، تاکہ ان کے جوار سے مستفید ہوں اور اہم معاملات و مسائل میں ان سے صلاح مشورہ کرتے رہیں اس طرح ان صحابہ پر مشتمل انہوں نے مجلس شوریٰ مرتب کر لی تھی اور اسی سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ عمرؓ نے علیؓ کو مدینے سے باہر کیوں نہیں جانے دیا۔ حالانکہ ان کی تلوار بہت سے معرکوں میں دشمنوں کے سر پر بجلی بن کر گری تھی، بلاشبہ علیؓ کو مدینے میں عمرؓ نے صرف فصل قضایا اور صلاح و مشورے کے لیے روک رکھا تھا۔ جب بھی کوئی کٹھن مسئلہ سامنے آتا وہ فرماتے:۔

"کوئی ایسا مسئلہ بھی ہے کہ ابوالحسن (علی) کے پاس اس کا حل نہ ہو!"

صحابہ کرام مدینے سے باہر جب حضرت عمرؓ نے جام شہادت نوش کیا اور خلافت عثمانؓ ذوالنورین کے پاس آئی تو انہوں نے ان صحابہ کو جنہیں عمرؓ نے مدینے میں روک

رکھا تھا باہر جانے اور اقالیم و بلادِ اسلامیہ میں منتشر ہونے کی اجازت دے دی، چنانچہ بہت سے صحابہ مختلف بلاد و امصار میں چلے گئے۔

لیکن باقی صحابہ وہیں مدینے میں مقیم رہے، ارشاد و ہدایت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد تک یہی صورتِ حال قائم رہی حالانکہ وہ بذاتِ خود سیاسی حالات کے ماتحت کوفہ منتقل ہو چکے تھے، ان کے اصحاب اور بعض صحابہ کرام کوفے میں مقیم تھے مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ ان حضرات کے فتوے اور قضا یا حضرت علی کے قضایا فتاوی اور احادیث پر مبنی تھے۔

صحابہ کرام پھر مدینے میں

پھر جب اموی دورِ حکومت شروع ہوا تو بہت سے صحابہ اور تابعین پھر مدینے واپس آگئے۔ تاکہ ملوک و سلاطین کے قرب سے دور رہیں اور معاویہ کے پاس صرف وہی رہ گئے جو ایک دوسرے کے ناصر اور معاون تھے۔ جیسے عمرو بن العاص وغیرہ۔

یزید بن معاویہ کا دور

پھر یزید بن معاویہ کا دور آیا، پھر آلِ مروان کے ہاتھ میں حکومت آئی فتنے بڑھے، خروج اور شورش عام ہوئی تو اکثر علماء تابعین نے حجاز کے اندر جوارِ حرمین میں ملجا و ماوی پایا۔ خصوصاً جوارِ حرم نبوی میں، جہاں آثارِ رسولؐ اور نقوشِ صحابہ موجود تھے ان لوگوں نے اپنے آپ کو صرف دراساتِ دینیہ بیانِ امورِ دین اور استنباطِ احکامِ شرعیہ کیلئے وقف کر رکھا تھا۔

مدینہ: علم و افتا کا مرکز

عہدِ امام باقرؒ، امام صادقؒ اور امام زیدؒ میں مدینہ علم و افتا کا مرکز بن گیا تھا یہاں تک کہ حاکم عادل عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے علم اہلِ مدینہ کی تشہیر و اشاعت کی طرف توجہ کی اس لیے کہ یہ علم درحقیقت سنت اور آثار کا علم تھا اور علماء اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور تھے چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا۔

"اسلام ایک ضابطہ اور نظام ہے جس نے اس پر عمل کیا۔ اس کا ایمان کامل رہا، جس نے عمل نہیں کیا، اس کا ایمان کامل نہیں رہا، اگر میں زندہ رہا تو تمہیں اس کا رمز شناس کروں گا اور تمہیں اس پر چلاؤں گا اور اگر مر گیا تو میں تم میں رہنے کا حریص نہیں ہوں۔"!

عمر بن عبدالعزیز کا اقدام

سننِ اسلام اور اہلِ مدینہ کے علم سے انتفاع کے لیے حاکم عادل عمر بن عبدالعزیز نے دو طریقوں پر عمل کیا، اور دونوں کا آغاز مدینے سے ہوا۔

(۱) انہوں نے علماءِ مدینہ کو مختلف دیار و امصار میں منتشر کر دیا تاکہ وہ لوگوں کو تعلیم دے سکیں اور ان کی رہنمائی کر سکیں۔

(۲) موطا امام مالک میں محمد بن الحسن کی روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر محمد بن حزم کو لکھا کہ:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو حدیث یا سنت ملے اسے لکھ لو! کیوں کہ مجھے حدیث کے علم اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے![1]"

مدارک میں ہے کہ ابن حزم نے حسبِ ہدایت ایک کتاب لکھی لیکن قبل اس کے کہ وہ کتاب عمر بن عبدالعزیز کے پاس بھیجتے ان کا انتقال ہوگیا۔[2]

عمر بن عبدالعزیز نے سنن اور فقہ کی تعلیم پر بہت زور دیا، وہ اہل مدینہ کو برابر لکھا کرتے تھے کہ ان کا عمل اور معمول معاملات کے مسائل کے سلسلے میں کیا رہا ہے؟

سنّت نبوی کے آثار فراواں

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں مدینہ مدائن اسلامیہ میں علماء تابعین کی کثرت کے لحاظ سے بے انتہا یگانہ اور ممتاز تھا وہاں قدم قدم پر سنت نبوی کے آثار موجود تھے صحابہ کرام کے فتاویٰ تھے جن کی روشنی میں معاملات ومسائل کا تصفیہ کرنا بہت آسان ہوجاتا تھا، خلفائے راشدین کے فیصلے تھے جو ایک جادۂ استوار کی حیثیت رکھتے تھے جس پر رہروی مایۂ سعادت بھی تھی اور باعث کامرانی بھی۔

علامہ ابن قیم اس سلسلۂ بحث میں فرماتے ہیں:۔

دین وفقہ کی نشر واشاعت امت میں اصحاب ابن مسعود کے ذریعہ ہوئی۔ اصحاب زید بن ثابت، اصحاب عبداللہ بن عمر اور اصحاب عبداللہ بن عباس نے یہی فریضہ انجام دیا۔ یہ علم تو تھا اہل مدینہ کا باقی رہے اہل مکّہ تو ان کا علم اصحاب عبداللہ بن عباس کے خدمات کا نتیجہ تھا۔ اہل عراق میں علم دین وفقہ اصحاب عبداللہ بن مسعود نے پھیلایا![3]

ابن جریر طبری کا قول ہے:۔

علم کا انحصار اصحاب اربعہ میں

"ابن عمر نے اور صحابہ کی ایک جماعت نے جو ان کی وفات کے بعد مدینے میں زندگی بسر کرتی رہی زید ابن ثابت کے مذہب پر فتویٰ دینا شروع کیا اور ان سے وہ لوگ اخذ روایت کرنے لگے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی چیز یاد نہیں رکھی تھی!"

تصریحات بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ علم چار اصحاب میں منحصر ہوکر رہ گیا تھا جو حسب ذیل ہیں:۔

---

[1] تاریخ الفقہ للحجوی ج ۴ ص ۱۱۰۔
[2] مدارت (قلمی نسخہ) ج ۱ ورق ۳۲
[3] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۶۔

(۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔
(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔
(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔
(۴) حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ۔

اس جگہ دو امور خاص طور پر قابل غور ہیں :-

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (۱) زید بن ثابت نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے بعد علم نبیؐ حاصل کیا۔ اور اس وقت ابن عمرؓ سن شعور کو پہنچ چکے تھے، یہ بات ثابت ہے کہ آپ مدینے تشریف لائے تو ابن عمر کا سن ۱۲ سال کا تھا، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احد کے موقع پر ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی، اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں واپس کر دیا تھا، لیکن غزوۂ خندق میں لڑنے کی اجازت دے دی تھی، کیونکہ اب ان کی عمر ۱۵ سال کی ہو چکی تھی۔ آں حضرت کے قیام مدینہ کی مدت میں یہ علم حاصل کرتے رہے اور زید بن ثابت کے مقابلے میں کسی طرح کم قربت رسول اللہؐ سے نہیں رکھتے تھے اور ان سب باتوں سے بالا یہ کہ انہوں نے اپنے والد (عمرؓ) سے علم کثیر حاصل کیا، لازمی ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں یہ زیادہ اپنے والد کے فتاویٰ اور قضایا سے واقف ہوں لہٰذا یہ بات معقول نظر نہیں آتی کہ کہا جائے کہ انہوں نے زیادہ تر علم زیدؓ سے حاصل کیا تھا۔

(۲) چار اصحاب رسولؐ پر علم رسولؐ کا قصر و حصر بھی کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ ان کے علاوہ بھی بہت سے صحابہ تھے جو علم رسولؐ کے حامل تھے (خاص طور پر عمر بن الخطابؓ کہتے ہیں :-
"جب کسی مسئلے کے بارے میں لوگ مختلف الرائے ہوں تو یہ دیکھو کہ عمر نے کیا کیا تھا؟"

اسی طرح علی بن ابی طالب ہیں جو تقریباً تیس سال تک دامن رسول سے فیضیاب ہوتے رہے، ان کا کام ہی تھا فتویٰ دینا اور ہدایت کرنا، آپ کا قیام کوفے میں تقریباً پانچ سال تک رہا۔ اور لازمی ہے کہ آپ نے وہاں قضا (فتاویٰ کا بڑا ذخیرہ چھوڑا۔

علیؑ کی زندگی فقہ دین کے لئے وقف رہی حقیقت اور امر واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی ساری زندگی فقہ اور علم دین کے لیے وقف رہی۔ صحابہ میں سب سے زیادہ ذات رسول سے اتصال و قربت کا شرف آپ ہی کو حاصل رہا۔ یہ اس وقت سے رسالت مآب کے ساتھ تھے جب کم سن تھے اور ابھی آپؐ مبعوث نہیں ہوئے تھے اور اس وقت تک دامن رسالت سے چمٹے رہے جب تک انہوں نے اس دنیا سے پردہ نہیں فرمایا، پس لازمی تھا کہ کتب حدیث و سنت

میں آپ کے روایات بہت زیادہ ہوتے مگر ایسا نہیں ہے، کیوں نہیں ہے؟ اس کا سبب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ علیؓ کی قضاء افتا کو چشم مرام سے نہاں رکھنے میں اُمویوں کے حاکمانہ اقتدار کو بہت زیادہ دخل ہے، اور یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایک طرف تو بر سرِ منبر علیؓ پر لعنت بھیجتے اور دوسری طرف علماء کو آزاد چھوڑ دیتے کہ وہ ان کے علم کو پھیلائیں، ان کے فتوے اور اقوال لوگوں تک پہنچائیں۔

اور وہ تو جہاں حضرت علی رہے اور جہاں ان کا علم پھیلا۔ دولت امویہ کا بڑا اہم مقام تھا جہاں بڑے سخت مزاج اور مستبد حکام مامور رہا کرتے تھے اور یہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ آرا علی جمہور اسلام میں پھیلیں، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت علی کی کنیت "ابو تراب" تک میں تنقیص کا پہلو نکال لیا تھا، حالانکہ انہیں اس پر فخر تھا، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محبت سے علیؓ کو یہ کنیت عطا فرمائی تھی، وہ محبت جو باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے

آثار علی کو چھپانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی

لیکن آثار علی رضی اللہ عنہ کو چشم مرام سے نہاں رکھنے اور جمہور مسلمین سے مخفی رکھنے کی یہ کوششیں کیا پورے طور پر کامیاب ہوئیں؟ کیا ان سے کوئی شخص بھی واقف نہیں ہے؟

یہ کیوں کر ممکن تھا؟

حضرت علیؓ نے جام شہادت نوش کیا اور اپنے پیچھے اپنی اولاد ابرار و اطہار کو چھوڑ گئے، بلاشبہ جنہیں ائمہ علم اسلام بننا تھا، جن کی پیروی کے لیے لوگوں کو جوق در جوق بڑھنا تھا۔

آپ نے حضرت فاطمہؓ کے بطن سے دو صاحبزادے حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ چھوڑے۔ آپ کے غیر فاطمی صاحبزادے محمد بن الحنفیہ تھے، ان سب کو آپ نے اپنے علم کا امین بنا دیا، حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے۔

"کلام رسول اللہؐ کے بعد کسی کے کلام سے اتنا نفع نہیں پہنچا، جتنا کلام علیؓ سے"!

آپ کی اولاد امجاد نے اپنے والد ماجد کی فکری میراث کی حفاظت کی اور اسے ضائع ہونے سے بچا لیا اور یہ سارا علم مدینے میں ان حضرات کے ساتھ منتقل ہو گیا، جب حادثہ علیؓ کے بعد یہ کوفے سے مدینے میں منتقل ہو گئے۔

روایات علیؓ کا مرکز بیت علیؓ

چنانچہ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بیت علوی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تمام روایات جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کئے تھے موجود اور محفوظ تھے، اس طرح انکے تمام فتوے قضایا اور فقہ بھی تمام موجود اور

محفوظ تھے۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے جو کلام پردہ خفا میں مستور ہو اس میں دوسرے کچھ اضافہ بھی تو کر سکتے ہیں جواب میں ہم کہیں گے کہ ایسا ناممکن ہے، اس لئے کہ یہ اضافہ اس بیت کریم کے وہ لوگ نہیں کر سکتے جن کا صدق و قول و عمل ایک اہتمام کرنا ایک معروف و مسلم ہے جملہ شئون میں جن کا اخلاص ایک واضح اور عین مشتبہ حقیقت ہے، کیا اس بات کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ حسین یا زین العابدین، یا باقر، یا صادق جیسی مقدس ہستیوں سے ایسی خطا سرزد ہو سکتی ہے؟ یہ ناقابل تصور بات ہے کسی شخص کا مسلک اور فرقہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ ایسی گھٹیا بات سوچ بھی نہیں سکتا۔

آل بیت کے پاس سب کا علم تھا

لیکن یہ فرض کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا کہ آل بیت کے پاس جو علم تھا وہ صرف امام علی کرم اللہ وجہہٗ کا تھا اس کے سوا علم کے جو دوسرے سرچشمے تھے ان سے وہ یکسر بے نیاز تھے، امام علی زین العابدین اور امام باقر رضی اللہ عنہما نے دوسرے صحابہ اور تابعین کی مجالس علمی میں شرکت کی اور ان سے روایت بھی کی اور اخذ علم بھی کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ علم علی میں وہ کامل اور یکتا تھے، انہوں نے پھر بھی دوسروں سے اخذ علم میں کوئی عار محسوس نہیں کیا، کیونکہ علم کہیں بھی ہو اسے چھوڑا نہیں جاتا۔

مدینہ عہد امام جعفر صادق میں

ہم یہاں اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ عہد امام جعفر صادق میں مدینہ دار العلم تھا اور یہ علم صرف ان چار اصحاب تک مقصور و محدود نہیں تھا جن کا ذکر ابن قیمؒ نے کیا ہے، علم جملہ صحابہ کے پاس تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ بھی حامل علم تھیں، یہی حال حضرت ام سلمہ کا تھا۔ علم رسولﷺ صحابہ کرام کے مابین شائع و ذائع تھا ہو سکتا ہے کہ اس علم کا کچھ حصہ کسی سے مخفی رہ گیا ہو لیکن سارا علم تمام صحابہ سے مخفی رہ گیا ہو یہ ناممکن ہے۔

پھر علم صحابہ کو تابعین نے نقل کیا اور امام علی کرم اللہ وجہہٗ کا علم خصوصیت کے ساتھ آل علی نے سب کا سب نقل کیا۔

یہ تابعین جنہوں نے علم صحابہ نقل کیا، تاریخ فقہ میں "فقہاء سبعہ" کہلاتے ہیں!

فقہاء سبعہ کا مقام تاریخ فقہ اسلامی میں بہت وقیع اور ارفع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ فقہاء سبعہ کے منہاج اور انداز استنباط و استخراج مسائل کو زیر نظر رکھا جائے یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ بحث میں ان اکابر کا ذکر لازمی ہے!

مدینے کے فقہاء سبعہ

جنہوں نے سنت رسولؐ اور آثار نبیؐ کی حفاظت کی

فقہاء سبعہ کون تھے؟

یہ فقہاء سبعہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ

(۲) حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ۔

(۳) حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ۔

(۴) حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ۔

(۵) حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام رضی اللہ عنہ

(۶) حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ

(۷) حضرت عبیداللہ بن عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

علم فقہا سبعہ کے علاوہ دوسروں کے پاس بھی تھا

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ علم مدینہ صرف ان فقہاء سبعہ تک محدود تھا، کیونکہ ناقلین علم صحابہ کی تعداد کثیر ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو عراق میں مقیم تھے۔ پھر فتنوں نے سر اٹھایا اور آراء منحرفہ کا دور شروع ہوا تو یہ مدینے میں آکر پناہ گزین ہو گئے۔ جیسے صحرا کی تپتی اور جھلستی ہوئی دھوپ سے کوئی شخص سایہ دار درخت کے نیچے آکر پناہ حاصل کرتا ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے مختلف مکاتب فکر کے صحابہ سے اخذ علم کیا۔ ان میں ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان جو امام مالک کے استاد تھے اور ربیعۃ الرائے اور یحییٰ بن سعید اور ابن شہاب زہری جو امام زین العابدین کے شاگرد تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امام جعفر صادق نے صغر سنی میں ان سب کو دیکھا اور سن شعور میں ان میں سے اکثر کو پایا، بلاشبہ وہ ان کے مرویات سے واقف تھے، خاص کر ان سب سے زیادہ معمر اور بزرگ شخص سے جو ان کے نانا بھی تھے، یعنی قاسم بن محمد بن ابی بکر

اب ہم ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ اختصار کے ساتھ گفتگو کریں گے، سوا قاسم کے جن کا ذکر اس سے پہلے کر چکے ہیں۔

حضرت سعید بن المسیب

فقہاء سبعہ میں سب سے پہلا نام انہی کا آتا ہے بلکہ کہنا چاہیے مدینے کے فقہاء تابعین میں سب سے نمایاں اور ممتاز ہستی انہی کی تھی۔ یہ قریشی تھے اور قبیلہ بنی مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ امیر المومنین عمر بن الخطاب کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے ۹۳ھ میں وفات پائی۔ حضرت عثمان اور حضرت علی کا دور انہوں نے پایا، اسی طرح معاویہ، یزید، مروان اور عبدالملک بن مروان کا دور بھی دیکھا، امام جعفر صادق نے ان کا دور پایا ہے، کیونکہ جب یہ اس دنیا سے رخصت ہوئے ان کی عمر ۱۳ سال کی تھی۔

سعید بن المسیب دولت بنو امیہ کے دوستوں اور ہوا خواہوں میں نہیں تھے، اگرچہ یہ مسند درس سے چمٹے ہوئے تھے اور کسی شورش میں انہوں نے حصہ نہیں لیا، نہ کسی کے داعی بنے معاویہ کی اس بات سے بہت خفا تھے کہ انھوں نے زیاد کا الحاق اپنے خاندان سے (ناجائز طور پر) کرلیا تھا، کیونکہ یہ اقدام حدیث نبوی کے خلاف تھا، جس میں فرمایا گیا ہے!۔

"لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو، اور زانی کے لیے پتھر (سنگساری) ہے"!

امویوں کے افعال سے یہ اتنے نالاں اور بیزار رہا کرتے تھے کہ بعض لوگوں کو شبہہ پیدا ہوگیا کہ کہیں فرض حج کے علاوہ حج بیت الحرام کے لیے نکلنے سے ممانعت کا فتویٰ نہ دے دیں۔

جب بنی امیہ کے ساتھ ان کی یہ روش تھی تو لازمی ہے کہ بہت سوں سے ان کا رابطہ اور تعلق بہت زیادہ گہرا ہوگا اور ان سے علمی مذاکرات اور انتقاع کا سلسلہ جاری ہوگا۔

سعید بن المسیب نے اپنی تمام تر توجہ صرف فقہ تک ہی محدود رکھی، دوسری چیزوں پر اتنی توجہ نہیں کی۔ تفسیر طبری میں یزید بن ابی یزید سے مروی ہے کہ:-

"ہم سعید بن المسیب سے حلال و حرام کے بارے میں پوچھا کرتے تھے وہ اس علم کے بہت بڑے عالم تھے، جب ہم ان سے فن تفسیر کے بارے میں کوئی سوال کرتے تو فرماتے، مجھ سے آیات قرآنی کے بارے میں سوال نہ کرو"۔

سعید بن المسیب نے ایک گروہ صحابہ سے علم حاصل کیا۔ قضا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قضاء ابوبکر و عمر و عثمان پر خصوصیت کے ساتھ ان کی نظر بہت گہری تھی۔ زید ابن ثابت کے علم سے بھی کچھ

بہرہ رکھتے تھے، ان کے زیادہ مرویات ان کے خسر ابوہریرہؓ سے ہیں جن کی صاحبزادی سے انہوں نے نکاح کیا تھا فقہ عمر کی تعلیم اصحاب عمر سے حاصل کی تھی، چنانچہ ان کا شمار راویان فقہ عمر میں ہونے لگا تھا۔

سعید بن المسیب زیادہ تر رائے سے فتویٰ دیتے تھے کیونکہ حضرت عمرؓ کی فقہ کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ جن معاملات و مسائل سے متعلق کوئی نص موجود نہیں ہوتی تھی یعنی قرآن و حدیث میں کوئی نظیر نہیں ملتی تھی ان کے بارے میں وہ رائے سے فتویٰ دیتے تھے کیونکہ یہ عصر فقہ و قضا اور افتا کا تھا، فتوحات کا سلسلہ جاری تھا، حدود اسلام میں توسیع ہو رہی تھی، نئے نئے حوادث اور واقعات رونما ہو رہے تھے جو اس فقہ اور ان قضایا و فتاویٰ کے متقاضی تھے۔

ان کا نمبر فقہاء سبعہ میں دوسرا ہے۔

عروہ بن زبیر عصر تابعین میں فقہ مدنی کے یہ بہت بڑے عالم اور ماہر تھے۔ یہ عبداللہ بن زبیر کے سگے بھائی تھے اور ام المومنین سیدہ عائشہ کی بہن ــ اسماء ــ کے لڑکے تھے، یہ امام جعفر صادق کے ماں کی طرف سے رشتے دار تھے۔

عروہ کی ولادت خلافت عثمان بن عفان میں ہوئی ۹۴ھ میں وفات پائی، اس سال علی زین العابدین امام جعفر صادق کے جد محترم نے وفات پائی، انہوں نے فتنوں کا وہ دور پایا جب معاویہ نے امام علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف خروج کیا تھا۔ انہوں نے اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر کا دور حکومت بھی دیکھا اور اس نزاع کا بھی مشاہدہ کیا جو ان کے اور بنو مروان کے مابین قائم تھی۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ان شورشوں میں انہوں نے حصہ لیا ہو، یا اپنے بھائی کی کسی طرح مدد کی ہو۔ ان کی توجہ کا مرکز صرف فقہ اور حدیث نبوی تھی، حدیث میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، جیسا کہ ان کے شاگرد امام زہری کا بیان ہے، ابن مسیب اگر تابعین میں سب سے بڑے فقیہہ تھے تو عروہ تابعین میں سب سے بڑے ماہر حدیث تھے، فقہ دین کی تعلیم ایک جماعت صحابہ سے حاصل کی۔ خاص طور پر اپنی خالہ ام المومنین عائشہ صدیقہ سے ان سے انہوں نے اسطرح علم حاصل کیا جس طرح ان کے بھتیجے قاسم بن محمد بن ابی بکر نے حاصل کیا تھا، عروہ حدیث عائشہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔

یہ بات بھی ثابت ہے کہ عروہ اس فکر میں تھے کہ جو احادیث اور آثار فقہیہ انہوں نے صحابہ سے حاصل کئے ہیں انہیں مرتب اور مدون کرلیں، چنانچہ روایت ہے کہ انہوں نے بہت سی چیزیں قلمبند بھی کرلی تھیں لیکن پھر اندیشہ پیدا ہوا کہ کتاب اللہ کے ساتھ ایک اور کتاب کہیں موجب گناہ کبیرہ نہ ہو لہٰذا اسے تلف کر دیا۔

ابن ہشام کی روایت ہے کہ عروہ نے اپنی لکھی ہوئی کتابیں یوم حرہ کے موقع پر۔ جب یزید کی فوجیں مدینے پر حملہ آور ہوئی تھیں نذر آتش کر دیں بعد میں نادم ہوئے کہ یہ کیا کر ڈالا مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عروہ محدث بھی تھے اور فقیہہ بھی، ان کی وفات کے وقت امام صادق کی عمر ۱۴ سال کی تھی، یقیناً دونوں کے مابین قیام مدینہ اور باہمی رشتے داری کے باعث ملاقات ہوتی رہتی ہوگی، کیوں کہ دونوں ابوبکر صدیق کی ذرّیت میں تھے۔

ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث | یہ فقہا سبعہ میں تیسرے نمبر پر ہیں۔ امام زین العابدین اور حضرت عروہ کی طرح ان کی وفات بھی ۹۴ھ میں ہوئی، یہ بہت بڑے عابد زاہد اور درویش صفت بزرگ تھے۔ چنانچہ ان کا نام ہی "راہب قریش" پڑ گیا تھا، انہوں نے بہت سے صحابہ سے روایت کی ہے۔ خاص طور پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے اور ام المومنین ام سلمہ سے، یہ فقیہہ اور محدث تھے لیکن فتوے دینے کی جرأت نہیں کرتے تھے، جس طرح سعید بن المسیب گراں جانتے تھے، ان کی فقہ پر رائے کے مقابلہ میں اثر کا غلبہ تھا۔

عبیداللہ بن عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود | یہ فقہاء سبعہ میں جو تھے فقیہہ ہیں ۹۹ھ میں اور ایک قول کے مطابق ۹۸ھ میں ان کی وفات ہوئی، انہوں نے خاص طور پر ابن عباسؓ عائشہ اور ابوہریرہ سے روایت کی ہے علم حدیث میں غیر معمولی دسترس رکھنے کے باوجود بہت بڑے فقیہہ بھی تھے، فتویٰ دینے کے اصول سے واقف تھے۔ بہت اچھے شاعر بھی تھے، ان کی ذات میں فقہ، حدیث اور شعر کا اجتماع ہوچکا تھا، عمر بن عبدالعزیز ان کے شاگرد تھے، ان کی بہت زیادہ توقیر اور احترام کرتے تھے، اس لئے کہ ان کی عقل و نفس پر ان کے گہرے نقوش قائم ہو گئے تھے۔

ان کی ذات میں فقہ و حدیث کا اس طرح اجتماع ہوگیا تھا کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ دونوں میں سے کس فن میں زیادہ دسترس رکھتے ہیں۔

سلیمان بن یسار | یہ سیدہ میمونہ بنت حارث، ام المومنین کے آزاد کردہ غلام تھے، انہوں نے مکاتبت کی شرط پر انہیں آزاد کیا تھا اور شرط مکاتبت یہ تھی کہ ایک مہینہ میں رقم ادا کریں، جب رقم ادا ہو جائے تو یہ آزاد ہو جائیں گے، ان سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا:

"میں نے سیدہ عائشہ سے حاضر خدمت ہونے کی اجازت طلب کی، انہوں نے میری آواز پہچان لی اور دریافت کیا۔

"کیا سلیمان ہیں؟

"میں نے عرض کیا!"

"جی ہاں سلیمان حاضر ہے!"

"حضرت عائشہ نے سوال کیا!"

"کیا تم نے وہ مکاتبت والی رقم ادا کردی؟"

میں نے عرض کیا:

"تھوڑی سی رہ گئی ہے!"

حضرت عائشہ نے فرمایا:

"آجاؤ تم مملوک ہو، جب تک تم پر مکاتبت کی ایک پائی باقی ہے؟"

سلیمان نے زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، ابوہریرہ اور امہات المومنین میمونہ و عائشہ و ام سلمہ سے روایت کی ہے۔

سلیمان فہیم دقیق و عمیق کے حامل تھے، چونکہ لوگوں میں زیادہ گھلے ملے رہتے تھے اس لئے ان کا علم زیادہ بارآور ہوا، یہ لوگوں کے احوال و کوائف سے خوب واقف تھے۔

خارجہ بن زید بن ثابت

یہ زید بن ثابت صحابی اور فقیہہ کے فرزند ارجمند ہیں جو علم فرائض میں غیر معمولی درک رکھتے تھے چنانچہ حضرت عمران کے بارے میں فرمایا کرتے تھے!

"جسے فرائض کے مسئلے دریافت کرنے ہوں وہ زید بن ثابت کے پاس جائے!"

خارجہ اپنے والد کی طرح فقیہہ رائے تھے، یہ ان کے علم کے وارث تھے اور ان پر بھی انہی رجحانات کا غلبہ تھا، جن کے لئے ان کے والد مشہور تھے۔ یعنی رائے اور علم فرائض میں مہارت خصوصی یہی وجہ ہے کہ خارجہ کثیر الرائے بھی ہیں اور رائے کے ساتھ کثیر الافتا بھی۔ یہ کتاب اللہ کے مطابق لوگوں میں ان کے مواریث تقسیم کردیا کرتے تھے۔ مصعب بن عبداللہ ان کے بارے میں کہتے ہیں

"خارجہ اور طلحہ بن عبدالرحمن بن عوف اپنے زمانے کے مانے ہوئے مفتی تھے، لوگ ان دونوں کے قول کو فوراً تسلیم کرلیتے تھے، یہ دونوں مواریث کی تقسیم بھی کرتے تھے۔ بگھر تجبل اموال سب کچھ اور وثائق بھی کہتے تھے۔

یہ ایسے فقیہہ تھے جن کی طرف لوگ بہت زیادہ رجوع کرتے تھے، چونکہ یہ عوام میں زیادہ گھلے ملے رہتے تھے اس لئے ان کے مسائل سے بھی خوب واقف تھے اور انہیں بہت اچھی طرح حل کردیا کرتے تھے ساتھ ہی ساتھ بے انتہا عبادت گزار بھی تھے۔

آخر عمر میں لوگوں سے منقطع ہو کر گوشہ گیر ہو گئے تھے۔

فقہا سبعہ کی شہرت

غرض یہ ہیں فقہاء سبعہ جو مدینے کے یکتا و بے مثل فقیہ مانے جاتے ہیں ان کے علاوہ اور حضرات بھی اس فن میں درک اور کمال رکھتے تھے، لیکن انہیں ان جیسی شہرت نہ حاصل ہو سکی۔

اس جگہ ہم تین امور پر خصوصیت کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں:۔

(۱) ان فقہاء سبعہ میں تین بزرگ عروہ، قاسم اور سلیمان ایسے تھے، جو امہات المومنین سے یا تو قرابت رکھتے تھے یا موالات کا تعلق رکھتے تھے، لہٰذا انہیں ان سے اخذ علم کا بہت اچھا اور بہت زیادہ موقع ملا۔

ان میں سے دو ایسے تھے جو امام جعفر صادق سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ اور امام صادق ام المومنین عائشہ سے بھی قرابت قریبہ رکھتے تھے!

یہ فقہا ثلاثہ اس اعتبار سے آل نبیؐ سے متصل تھے اور ضروری ہے کہ یہ اتصال ذریت نبیؐ کے ساتھ گہرا اور مضبوط ہو، خاص طور پر امام زین العابدین کے عہد میں جبکہ معاملات میں ٹھہراؤ آ چکا تھا اور آل بیت نے یکسوئی کے ساتھ اپنی ساری توجہ نشر علم کی طرف مبذول کر رکھی تھی۔

ان فقہاء سبعہ میں کئی ایسے تھے جو بنو امیہ سے بیزار اور نالاں تھے اور آل بیت کی خدمت میں عقیدت و محبت کے جذبے سے مجبور ہو کر حاضر ہوا کرتے تھے۔

(۲) یہ فقہاء سبعہ صرف فقہاء اثر و خبر نہیں تھے بلکہ علماء فقہ اور راویان آثار بھی تھے، یہ فقہ سلف کی تعلیم دیتے تھے، اس سے تخریج مسائل کرتے تھے، جس مسئلے میں کوئی نص قرآن یا سنت، یا قول صحابی کی سند نہیں ملتی تھی اپنی فکر یا رائے سے فتویٰ دیتے تھے، جو مبنی ہوتی تھی قضا یائے نبیؐ اور قضا یائے خلفائے راشدین سے تخریج پر۔ ان اکابر سبعہ میں سے جس پر علم روایت غالب ہوتا تھا وہ فقہ و افتا سے زیادہ سروکار نہیں رکھتا تھا لیکن ان میں سے اکثر پر افتا اور رائے کا غلبہ تھا۔

مدینہ اور فقہ رائے

ان حقائق کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فقہ رائے کو مدینے میں ایک خاص مقام حاصل تھا، گو وہاں اثر کو بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رائے سے فتویٰ دینا صرف اہلِ عراق تک محدود نہیں تھا بلکہ مدینے میں بھی اس کا رواج تھا۔

اہل مدینہ اور اہل عراق کے نزدیک" رائے میں فرق یہ تھا کہ فقہاء عراق رائے کو صرف قیاس پر مبنی رکھتے تھے اور فقہاء مدینہ کے نزدیک رائے سے مراد صحابہ وقضایا اور فتا وائے ماثورہ پر تخریج تھی۔ یا جہاں نص موجود نہ ہو وہاں مصلحت اور ضرورت کی رعایت فقہاء عراق فرضی واقعات ومسائل پر بھی فتویٰ دیتے تھے اور فقہاء مدینہ صرف ان واقعات ومسائل پر فتویٰ دیتے تھے جو واقعی

(۳) یہ اکابر سبعہ اور ان کے معاصرین مثلاً نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر اور عکرمہ مولیٰ عبداللہ بن عباس اور ان کے شاگرد مثلاً ابن شہاب زہری وغیرہ، فقہ و روایت کی تدریس و تعلیم کا سلسلہ یا تو مسجد نبوی میں جاری رکھے ہوئے تھے یا اپنے گھروں پر۔ ان کے شاگرد ہر اس جگہ پہنچ جاتے تھے جہاں یہ موجود ہوں۔

امام جعفر صادق کا فقہاء سبعہ سے اخذ و تاثر

ان فقہاء سبعہ سے اخذ و تاثر حضرت امام جعفر صادق بھی کرتے رہے، یہ صرف ہمارا دعویٰ نہیں ہے اپنے اس قول پر ہم دلیل بھی رکھتے ہیں۔

(۱) امام صادق فقہ حجاز اور فقہ عراق کا علم تام رکھتے تھے۔ اختلاف فقہاء سے واقفیت پیدا کرنے کا انہیں شوق تھا، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ فقہ حجاز سے واقف نہ ہوتے، جو گھر کی چیز تھی۔

(۲) ان اکابر سبعہ میں بعض سے ان کی قرابت قریبہ تھی اور یہ ناممکن تھا کہ وہ ان کی فقہ سے سروکار نہ رکھتے جب کہ طلب علم کے حریص تھے، خواہ وہ کہیں بھی ہو اور کسی کے پاس بھی ہو۔

(۳) تدریس و تعلیم کا سلسلہ زیادہ تر مسجد نبوی میں جاری رہتا تھا اور ماننا پڑے گا کہ امام صادق برابر مسجد نبوی میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اس میں کیونکر ممکن تھا کہ وہ ان دروس سے بے خبر رہتے؟ اور یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ مسجد نبوی میں جس کے لئے خاص طور پر لوگ شد رحال کرتے تھے۔ آپ آتے جاتے نہ ہوں، آپ ضرور ان مجالس علمی میں اس طرح شرکت کرتے تھے جس طرح آپ کے دادا امام زین العابدین کا معمول تھا۔

مؤرخین فقہ نے فقہ رائے اور فقہ اثر پر کافی گفتگو کی ہے۔ اگلے باب میں مختصر طور پر ہم بھی اس مسئلے کو زیر بحث لائیں گے۔

رائے اور حدیث

فقہ اسلامی کا ایک مہتم بالشان نزاعی مسئلہ

شہرستانی کے تصریحات

شہرستانی نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے:۔
"عبادات اور تصرفات میں حوادث اور وقائع کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ان کا شمار ناممکن ہے اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر حادثے کے لئے نص موجود نہیں ہے اور یہ ممکن بھی نہ تھا، کیونکہ نصوص بہرحال محدود تعداد میں ہیں اور واقعات و حوادث غیر محدود تعداد میں۔ پس متناہی ہی غیر متناہی کو احاطہ ضبط و قید میں نہیں لایا جا سکتا، لہٰذا اجتہاد اور قیاس کو واجب الاعتبار ماننا پڑے گا!"

یہ ہے شہرستانی کا قول جس سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ اجتہاد ایک ناگزیر اور لازمی امر ہے، ہمارے برادران امامیہ اس مقدمے کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن رائے اور قیاس کی بنیاد اجتہاد کے قابل نہیں ہیں بلکہ ایک وجود معدوم کی ضرورت پر اسے مبنی قرار دیتے ہیں۔

بہر حال امر واقعہ کچھ بھی ہو، یہ ماننا پڑے گا کہ مسئلہ رائے و حدیث اس عہد میں موجود تھا جس میں امام جعفر صادق کی نشوونما ہوئی، لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم اس مسئلے کی تنقیح کر لیں۔

صحابہ نے رائے کا استعمال کیا

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کو ایسے واقعات و حوادث سے دوچار ہونا پڑا جو بے شمار تھے، پہلے وہ کتاب اللہ سے رجوع کرتے تھے، پھر حدیث نبوی سے اگر قرآن و حدیث میں مسئلے کا حل نہ ملتا تو پھر نصوص کی بنیاد پر اپنی رائے سے اجتہاد کرتے تھے، جو روح اسلام اور مقاصد عامہ قرآن و حدیث سے ہم آہنگ ہو۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ نے "رائے" کا استعمال کیا۔

لیکن رائے کو کس حد تک استعمال کیا جائے اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے اسے صرف فتاوے تک نص نہ ملنے کی صورت میں محدود رکھا، بعض اپنی رائے سے اجتہاد کرتے تھے۔ بعض ایسے تھے جو کذب

علی الرسولؐ سے ڈرتے تھے لہٰذا کسی مسئلے پر حدیث کو اس وقت منطبق کرتے تھے جب وہ متواتر ہو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ ابو عمرو الشیبانی کہتے ہیں میں کامل ایک سال تک ابن مسعود کے پاس رہا انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا ہے۔ جب ان کے منہ سے قال رسول اللہؐ نکلتا تو وہ لرزہ براندام ہو جاتے اور کہتے!

"اس طرح، یا یوں، یا اس کے مثل، یا اس کے قریب قریب رسول اللہؐ نے فرمایا!"

"یہ فتویٰ میری رائے پر مبنی ہے اگر درست ہے تو اللہ کی جانب سے ہے اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی جانب سے ہے"!

ایک مرتبہ ان کا فتویٰ رسول اللہؐ کے فیصلے کے مطابق نکلا تو اتنے خوش ہوئے جتنے قبول اسلام کے وقت سے لے کر اب تک نہیں ہوئے تھے۔

غرض صحابہ کرام میں اکثر ایسے لوگ تھے جو کتاب یا سنت سے نص ملنے کی صورت میں اجتہاد کرتے اور اپنی رائے سے فتویٰ دیتے تھے۔ مثلاً عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس کچھ ایسے تھے جو نص نہ ملنے کی صورت میں توقف کرتے تھے۔ مثلاً عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمر ابن العاص وغیرہ۔

تابعین اور رائے کا استعمال | صحابہ کے بعد تابعین کا دور شروع ہوا، تابعین کے دو گروہ تھے:۔ وہ لوگ جو نص نہ ملنے کی صورت میں توقف کرتے تھے۔

وہ حضرات جو کتاب یا سنّت سے نص نہ ملنے کی صورت میں رائے سے فتویٰ دیتے تھے۔

اول الذکر لوگ اگر رائے سے کام لیتے تھے تو شاذ صورتوں میں، اور دین کے معاملے میں اپنے سر کوئی ذمہ داری لیتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔

مؤخر الذکر لوگ نص کتاب یا سنت نہ ملنے کی صورت میں رائے سے بے تامل فتویٰ دیتے تھے۔ اگرچہ ان کا فتویٰ مبنی بر کتاب و سنت ہی ہوتا تھا، لیکن حدیث کا ذکر بیچ میں نہیں لاتے تھے یہ خطا صوریت کی ذمہ داری اپنے سر لیتے تھے۔ آں حضرتؐ کی طرف، ایسی بات منسوب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جو آپؐ نے نہ فرمائی ہو کیونکہ یہ عہد فتن تھا اور بغیر کسی تحفظ اور احتیاط کے احادیث کی نسبت رسولؐ کی طرف بعض لوگ کر دیا کرتے تھے، اس سے بچنے کے لئے یہ رائے سے فتویٰ دیتے تھے، اگرچہ ان کی رائے معتمد کتاب و سنت سے ہوتی تھی۔ یہ قیود دینی سے خروج نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے تمسک کرتے تھے اور اس پر تخریج کرتے تھے۔

عہد تبع تابعین میں فقہا کا اختلاف | تابعین کے بعد تبع تابعین کا دور آیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جس میں امام جعفر صادق نے بلوغ و شعور کے مراحل طے کئے۔

اس عصر میں فقہاء کے دونوں فریقوں کے مابین اختلاف زیادہ وسیع ہوگیا تھا اور اقالیم اسلامیہ سے ہی ہر اقلیم میں ایک مخصوص منہاج فقہ رائج ہوگیا تھا۔ چنانچہ ہمارے زمانے کے بعض مؤرخین نے تو یہ بھی لکھ دیا ہے کہ مدینہ اثر کے اعتبار سے اور عراق فقہ رائے کے اعتبار سے مشہور تھا اور یہ بات اتنی چلی کہ اس کا شمار۔ فقہیہ میں ہونے لگا۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فقہائے عراق میں بہ نسبت حجاز کے زیادہ تھے اور فقہاء اثر زیادہ تر حجاز میں تھے لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ فقہ عراق تمامتر فقہ رائے اور فقہ مدینہ یکسر فقہ اثر تھے کیوں کہ اثر کا دور دورہ عراق میں بھی تھا اور رائے مدینے میں بھی استعمال کی جاتی تھی نہ صرف مدینے میں بلکہ جملہ مدائن حجاز میں۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک رائے

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی فرماتے ہیں:۔

"ہر عالم کے لئے اس کے دیار کے شیوخ کا مذہب زیادہ مختار اور قابل ترجیح ہے کیونکہ اس کے اقوال کی صفت اور اس کے اصول تاسیسیہ سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور اس کا دل (مناسبت کے باعث) ان شیوخ کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے اور ان کے فضل و کمال کا زیادہ قائل ہوتا ہے، پس عمرؓ عثمانؓ، ابوبکرؓ عائشہؓ، ابن عباس زید بن ثابت اور ان کے اصحاب مثلاً سعید بن المسیب اور عروہ اور سالم اور عطاء اور ابن یسارؒ اور قاسم اور زہری اور یحییٰ بن سعید اور زید بن اسلم، اور ربیعہ کا مذہب، اہل مدینہ کے نزدیک دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قابل ترجیح اور قابل قبول ہے اور عبداللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب کا مذہب، نیز قضایائے علی و شیوع و شعبی اور فتاوائے ابراہیم اہل کوفہ کے نزدیک زیادہ قابل ترجیح اور قابلِ قبول ہیں![1]"

فقہ مدنی اور فقہ حجازی میں کوئی خاص فرق نہیں

شاہ صاحب کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ مدنی یا حجازی میں کوئی خاص فرق نہیں، اصول میں دونوں یکساں ہیں۔ فقہ عراقی میں اخذ سنت سے متعلق کسی طرح کا اختلاف منہاج نہیں ہے، صرف شیوخ کا اختلاف ہے۔ فقہ مدنی اور فقہ عراقی دونوں کتاب و سنت سے اخذ مسائل میں متفق ہیں، اگر ان دونوں میں سے کسی میں مسئلہ کا حل نہ ملے تو پھر اتباع آثار صحابہ اور اس کے بعد کتاب و سنت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۳

پر تخریج اور آراء صحابہ پر سب کا اتفاق ہے۔

فقہ عراقی اور فقہ مدنی کا اختلاف کن امور پر منحصر ہے؟ گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ فقہ مدنی اور فقہ عراقی کا اختلاف تین امور میں منحصر ہے۔

(۱) اہل مدینہ کے پاس ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے قضایا اور فتاویٰ ہیں علاوہ ازیں ابن عباس، زید بن ثابت اور ام المومنین عائشہؓ کے فتوے ہیں، نیز احادیث ابوہریرہ کا ذخیرہ ہے اور اہل عراق کے پاس ابن مسعود کی حدیثیں اور فتوے ہیں۔ ابوموسیٰ اشعری کے قضایا ہیں، علی کرم اللہ وجہہ کے فتاویٰ ہیں اور تشریح کے قضایا ہیں۔

(۲) اہلِ مدینہ ثروت آثار سے بہرہ ور ہیں۔

(۳) تابعین کے فتوے مدینہ میں وقعت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور اکثر و بیشتر حالات میں ان کی پیروی اور تعمیل کی جاتی تھی۔

لیکن فقہ عراق میں تابعین کے آراء کو وہ منزلت نہیں حاصل تھی۔ اگر ان سے اتفاق تھا تو یہ فکری اتفاق تھا اتباع پر مبنی نہ تھا۔

جہاں فقہ وہاں رائے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "رائے" کا چلن مدینے میں بھی تھا کیونکہ فقہ جہاں بھی ہوگی نصوص سے استنباط اور تخریج بھی پائی جائے گی، یہی رائے ہے لیکن مدینے میں اس کا مفہوم آثار مرویہ پر تخریج سے لیا جاتا ہے۔

عراق کی "رائے" قیاس اور عرف پر قائم تھی اور مدینے کی "رائے" قیاس پر نہیں عرف اہل مدینہ پر قائم تھی۔ عراق، موطن اقوام وملل اور اہواء و بدع تھا، لیکن مدینہ موطن اسلام تھا، جہاں آثار صحابہ و تابعین موجود تھے، پس اس کا "عرف" بلا شبہہ اسلام ہی سے مشتق تھا۔

دو غور طلب امور غرض عصر امام جعفر صادق میں "رائے" سے متعلق یہ تھا اختلاف، جو پایا جاتا تھا! اس جگہ دو امور خاص طور پر غور طلب ہیں۔

(۱) امام جعفر صادق فقہ عراق اور فقہ حجاز دونوں کے ماہر تھے، مدینے کے تابعین سے انہیں اتصال بھی حاصل تھا۔

لیکن فقہ مدنی کو بڑی حد تک فقہ علی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ان کا عہد حکومت زیادہ تر عراق میں گزرا، ایس ان کے جملہ فتاویٰ، قضایا اور آراء آل بیت کرام میں موجود تھے، جو خلف کو سلف سے ملتے چلے آرہے تھے جن کی تدریس و تخریج کا سلسلہ برابر جاری تھا، یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق فقہ عراق اور فقہ مدینہ دونوں

کے جامع تھے۔

(۲) فقہ عراق میں رائے کی بنیاد منہاج قیاس پر قائم تھی اور فقہ مدینہ میں منہاج مصلحت پر کیونکہ فقہ مدینہ منہاج عمر رضی اللہ عنہ سے متاثر تھی، جو عبارت تھا شئون دولت و حکومت میں مصلحت اور دفع فساد سے اس کے برعکس فقہ عراق رائے میں منہاج عبداللہ بن مسعود کی تابع تھی اور یہاں تک ممکن ہو نصوص پر عمل کو پیش نظر رکھتی تھی۔

امام جعفر صادق اور اجتہاد

ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ جعفری (شیعہ) قیاس پر مبنی نہیں ہے امام صادق اور امام باقر دونوں امام ابوحنیفہ کی اس بات پر معترض تھے کہ وہ قیاس سے زیادہ کام لیتے ہیں لہٰذا ہمارا خیال ہے کہ یہ دونوں جلیل القدر ائمہ قیاس سے زیادہ کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ان کی رائے زیادہ تر مصلحت پر مبنی ہوتی تھی۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام جعفر صادق بھی نص نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد سے کام لیتے تھے۔

خلاصۂ احوال عصر امام صادق

جدل و نظر، بحث و درس اور تحقیق و تفحص کا دور

تدوین علوم کی ابتداء امام جعفر صادق کا عہد جدل و نظر، بحث و درس اور تحقیق و تفحص کا عہد ہے۔ اسی عہد میں تدوین علوم کی ابتداء ہوئی۔ اسی عہد میں وراثت کون و فلسفہ کا آغاز ہوا، اسی عہد میں مسلمانوں اور قدیم مذاہب اور تہذیب و تمدن کی حامل اقوام و ملل میں اتصال فکری پیدا ہوا۔ اسی عہد میں مبادی اسلامیہ سلیمہ۔ جیسا کہ سلف صالح نے نقل کیا ہے۔ اور فلسفہ بندی کا بصورت تصوف اور فلسفہ یونانی کا بصورت عمق وراثت اختلاط و امتزاج پیدا ہوا، نیز آراء، فارسیہ اور آراء اسلامیہ میں اتصال کی صورتیں نمایاں ہوئیں۔

مناہج مختلفہ اور آرائے مختلفہ یہ تمام چیزیں سیاست علوم عقلیہ، افکار فلسفیہ اور دراسات دینیہ میں ظہور پذیر ہوئیں۔

اسی عہد میں مناہج مختلفہ نمودار ہوئے اور اختلاف مناہج سے اختلاف فرق اسلامیہ منظر عام پر آیا۔ اسی عہد میں ایسی نت نئی رائیں ابھریں جو اسلام کے مبادیات مقررہ و ثابتہ کی نقیض تھیں بلکہ بعض غیر مانوس اور غیر متجانس بھی۔ لیکن یہ جو کچھ بھی تھا سیاست اور فرق اعتقادیہ میں تھا۔ فقہ اور دراسات فروع میں کسی طرح کا انحراف ظہور پذیر نہیں ہوا۔

سیاست کے افکار باطلہ سیاست میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے افکار نے سر اٹھایا جو مبادی اسلام کے لیے تباہ کن تھے۔ کسی نے حلول کا مسئلہ اٹھایا اور دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ امام وقت میں حلول کر جاتا ہے۔

لیکن یہ تو آل بیت کے نادان دوستوں کا حال تھا، خود آل بیت کا عام طور پر جہاں تک تعلق تھا اور بالخصوص امام جعفر صادق کا جہاں تک تعلق تھا، انہوں نے تصحیح افکار و عقائد میں پوری سرگرمی اور جوش سے حصہ لیا اور دوست نما دشمنوں کی پیدا کی ہوئی بدعتوں کا قلع قمع کیا لیکن ان لوگوں نے داعی حق کی ندا کا جواب باصواب نہیں دیا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ طالب حق نہ تھے، طالب باطل تھے، انہیں ہدایت کے مقابلے میں گمراہی پسند تھی۔

علوم کونیہ اور علوم فلکیہ کا آغاز

اس عصر میں ہم دیکھتے ہیں کہ علوم کونیہ اور فلکیہ کا آغاز ہوا جس میں امام صادق کے ایک شاگرد جابر بن حیان خاص درک رکھتے تھے۔

اس عہد میں سرگشتگی پیدا کرنے والا فلسفہ نمودار ہوا، قدر اور ارادہ انسان کا سوال اٹھا اور کئی نئے فرقے جہمیہ، قدریہ اور معتزلہ پیدا ہو گئے، امام صادق نے اس مرحلے پر ارشاد و ہدایت کے ذریعہ بہت سے کج راہ لوگوں کو حق مستقیم پر استوار کیا۔

علوم اسلامیہ کی تدوین

اسی عہد میں علم اسلامیہ اور علوم کونیہ کی تدوین شروع ہوئی، جابر بن حیان نے کئی رسالے کونیات کے فن میں مدوّن کیے۔

یہ تھا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا عہد جس میں ان کے اور ان کے معاصرین کے مابین بحث و نظر کا سلسلہ جاری رہا جو مبنی تھا اخذ و عطاء پر، اور کوئی شبہ نہیں آپ نے ہدایت و ارشاد کا دامن کبھی نہیں چھوڑا، اور اپنے عہد کے مسائل و حوادث پر مخصوص افکار و آراء قائم کیے۔

آئندہ صفحات میں مختصراً انہی کا ذکر ہے۔

حصّہ دوم

امام جعفر صادق کے افکار و آراء

مذہب، سیاست اور اعتقادی مسائل سے متعلق

اہل مدینہ اور اہل عراق کے نزدیک "رائے" میں فرق یہ تھا کہ فقہاء عراق رائے کو صرف قیاس پر مبنی رکھتے تھے۔ اور فقہاء مدینہ کے نزدیک رائے سے مراد صحابہ وقضایا اور فتاوائے ماثورہ پر تخریج تھی۔ یا جہاں نص موجود نہ ہو وہاں مصلحت اور ضرورت کی رعایت فقہاء عراق فرضی واقعات و مسائل پر بھی فتوی دیتے تھے اور فقہاء مدینہ صرف ان واقعات و مسائل پر فتوی دیتے تھے جو اصل واقعات پر مبنی ہوتے تھے

(۳) یہ اکابر سبعہ اور ان کے معاصرین مثلاً نافع مولی عبداللہ بن عمر اور عکرمہ مولی عبداللہ بن عباس اور ان کے شاگرد مثلاً ابن شہاب زہری وغیرہ، فقہ و روایت کی تدریس و تعلیم کا سلسلہ یا تو مسجد نبوی میں جاری رکھے ہوئے تھے یا اپنے گھروں پر۔ ان کے شاگرد ہر اس جگہ پہنچ جاتے تھے جہاں یہ موجود ہوں۔

امام جعفر صادق کا فقہاء سبعہ سے اخذ و تاثر

ان فقہاء سبعہ سے اخذ و تاثر حضرت امام جعفر صادق بھی کرتے رہے، یہ صرف ہمارا دعوی نہیں ہے اپنے اس قول پر ہم دلیل بھی رکھتے ہیں۔

(۱) امام صادق فقہ حجاز اور فقہ عراق کا علم تام رکھتے تھے۔ اختلاف فقہاء سے واقفیت پیدا کرنے کا انہیں شوق تھا، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ فقہ حجاز سے واقف نہ ہوتے، جو گھر کی چیز تھی۔

(۲) ان اکابر سبعہ میں بعض سے ان کی قرابت قریبہ تھی اور یہ ناممکن تھا کہ وہ ان کی فقہ سے سروکار نہ رکھتے جب کہ طلب علم کے حریص تھے، خواہ وہ کہیں بھی ہو اور کسی کے پاس بھی ہو۔

(۳) تدریس و تعلیم کا سلسلہ زیادہ تر مسجد نبوی میں جاری رہتا تھا اور ماننا پڑے گا کہ امام صادق برابر مسجد نبوی میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اس لئے کیونکر ممکن تھا کہ وہ ان دروس سے بے خبر رہتے؟ اور یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ مسجد نبوی میں جس کے لئے خاص طور پر لوگ شد رحال کرتے تھے آپ آتے جاتے نہ ہوں، آپ ضرور ان مجالس علمی میں اس طرح شرکت کرتے تھے جس طرح آپ کے دادا امام زین العابدین کا معمول تھا۔

مؤرخین فقہ نے فقہ رائے اور فقہ اثر پر کافی گفتگو کی ہے۔ اگلے باب میں مختصر طور پر ہم بھی اس مسئلے کو زیر بحث لائیں گے۔

افکار و آراء

اپنے عہد کے احوال و کوائف پر امام صادق کے تاثرات

قول فیصل

اپنے عہد کے جملہ علوم و فنون پر امام جعفر صادق کو پوری پوری دستگاہ اور معرفت حاصل تھی اور فن فقہ میں تو انہیں یگانہ اور یکتا حیثیت حاصل تھی اور علوم اسلامیہ میں بجا طور پر وہ امام زماں تھے، ایک ایسا مرکز جس کی طرف اطراف و اکناف کے لوگ رجوع کرتے تھے، وہ صحیح معنیٰ میں فارق حق و باطل تھے اور ان کے منہ سے نکلا ہوا بول اعدا اسلام کے پیدا کئے ہوئے مشکلات میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا تھا۔

وہ مسائل جن پر امام صادق نے غور کیا

امام جعفر صادق نے بہت سے امور و مسائل پر غور و خوض کیا خاص طور پر عقائد سے متعلق مختلف پہلوؤں پر انھوں نے غور و فکر کیا اور عقیدہ اسلام کی مدافعت فرمائی، حق کو واضح کیا، جسے اسلام کے دشمنوں اور حق سے بیر رکھنے والوں نے شک و ریب کی چادر میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ جاہلوں، ناواقفوں اور لاعلم لوگوں کے سوالات کے جواب بھی تشفی آمیز پیرائے میں آپ نے دیئے۔

علوم کون میں عالمانہ اور مجتہدانہ دسترس

امام صادق کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف علوم دین پر اکتفا نہیں کیا بلکہ علم کون میں عالمانہ اور مجتہدانہ دسترس حاصل کی، تکوین انسان اور طب اجسام سے متعلق وہ مخصوص اور منفرد افکار و آراء کے حامل ہیں، آپ نے اور آپ کے آبا نے کرام نے اپنے کلام حق سے صرف روح کے روگ دور نہیں کئے بلکہ طب اجسام میں بھی مہارت حاصل کی اور بیماروں کو تندرست کیا، جس طرح انہوں نے قلوب منحرفہ کا علاج کیا، اسی طرح جسم منحرف کو بھی چنگا دیا۔

سیاسی معاملات پر رائے

امام جعفر صادق نے سیاست میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ وہ سیاسی امور پر کوئی رائے بھی نہیں رکھتے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ حالات و مصالح کے پیش نظر واشگاف طور پر ان کا اظہار و اعلان نہ کیا ہو جو کوئی اس طرح کے سوالات کرتا تھا، اسے خاموش کر دیتے تھے، اسی طرح ان کے نام سے غلط فائدہ اٹھا کر کوئی اگر در پردہ راہ اسلام سے انحراف کی دعوت دیتا تھا اسے ٹوک دیتے تھے۔

فقیہہ عالم اور مجتہد

اوران خصائص وکمالات سے بالا، وہ بہت بڑے فقیہہ تھے، ان کے تفقہ کے سامنے فقیہہ عراق امام ابوحنیفہ بھی دنگ تھے اور گو تقریباً ان کے ہم سن تھے لیکن ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنا مایۂ فخر و ناز سمجھتے تھے۔

افکار و آراء ثابتہ کا استخلاص

امام صادق کے افکار و آراء ثابتہ کا استخلاص ان سکولوں کے لکھنے والے کے لیے ایک انتہائی دشوار کام ہے۔ امام والا مقام کے بارے میں غلو پسندوں نے اتنا غلو کیا ہے کہ انہیں مرتبۂ نبوت تک پہنچا دیا ہے، اس کے مقابلے میں آپ کی ذات گرامی سے بعض لوگوں نے اس درجہ بخل روا رکھا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض محدثین آپ کے مرویات قبول کرنے میں تردد اور توقف کا اظہار کرتے ہیں، اگرچہ شک براہ راست امام صاحب کے مرویات پر نہیں بلکہ سند اور رواۃ پر ہے، ان حالات میں حق کو کھنگال کر نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

ہمیں نہ غلو پسند ہے، نہ خدانخواستہ آپ کی شان میں کسی طرح کا استخفاف روا رکھ سکتے ہیں، ہمیں نہ یہ مسلک پسند ہے نہ وہ ہم اپنے بس بھر کوشش کریں گے کہ ایسا طریقہ اس باب میں وضع کریں جو نفوس کے لیے صحیح معنٰی میں باعث اطمینان و قبول ہو۔

سب سے پہلے ہم امام صادق کے افکار سیاسی کو زیر بحث لائیں گے، پھر عقائد سے متعلق آپ کے آراء پر ایک نظر ڈالیں گے پھر دیکھیں گے علوم کونیہ و طبعیہ سے متعلق آپ کے خیالات کیا تھے؟ بعد ازاں ہم اصل مقصد اور غایت پر متوجہ ہوں گے۔ یعنی فقہ۔

امام جعفر صادق کے سیاسی افکار

حکومت وقت کے اقدام و عمل اور طرز و منہاج سے متعلق

عملی سیاست سے کنارہ کشی

ہم کہہ چکے ہیں اور بار بار کہہ چکے ہیں کہ امام صادق نے عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا نہ سیاسی امور سے متعلق واضح اور صریح الفاظ میں اپنے خیالات و افکار کا اظہار کیا، ان کے جو سیاسی خیالات تھے ان کا اظہار انھوں نے نہیں کیا بلکہ اخفا سے کام لیا اور جب اظہار کیا تو خفیہ طور پر مخصوص مجامع یا اپنے حامیوں اور طرف داروں کے گروہ یا عقیدت کیشوں کے سامنے۔

لیکن امام صادق کے سیاسی افکار کیا تھے؟

یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے، اور اس کا جواب ایسا نہیں ہو سکتا، جس پر سب کا اتفاق ہو سکے۔

امام صادق کے متبعین

امام جعفر صادق کے متبعین میں امامیہ ہیں، اور ان کے دو گروہ ہیں، ایک اثنا عشری، دوسرا اسماعیلی، اسماعیلیوں میں کچھ تو وہ ہیں جو اسلام ہی سے خارج ہو گئے اور بت پرستی کے قریب ہو گئے۔ لہٰذا ہمارے پیش نظر عشری گروہ ہے جو امام جعفر صادق کے بعد ان کے فرزند امام موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کرتا ہے، کیونکہ والد کی وفات کے وقت یہ زندہ اور موجود تھے اور اسماعیلی، اسماعیل کو مانتے ہیں اور امامت ان کی ذریت میں تسلیم کرتے ہیں بہر حال اثنا عشری اور اسماعیلیوں میں اصل فکر سیاسی سے متعلق کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ امام صادق کے بعد امامت کا سزاوار کون تھا؟ جہاں تک سلسلۂ امامت کا تعلق ہے علی سے صادق تک کامل اتفاق ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام یا خلیفہ علی تھے پھر حسن، پھر حسین، پھر علی زین العابدین پھر ابو جعفر محمد باقر، پھر صادق رضی اللہ علیہم اجمعین۔

اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ

اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ اس باب میں بھی یکسر متفق ہیں کہ امامت ایک امر دنیوی نہیں ہے بلکہ دین کا رکن رکین ہے۔ ان کا قول ہے کہ تعیین امام سے بڑھ کر کوئی امر دین اہم نہیں ہے۔ چنانچہ رسالت مآبؐ نے اس دنیا سے کوچ فرمایا اور امت سے مطمئن ہو کر کیونکہ آپؐ دفع خلافت اور اثبات وفاق کے لئے مبعوث ہوئے تھے کیوں کر ممکن تھا کہ

امت کو منتشر اور پراگندہ حالت میں اس طرح چھوڑ جاتے کہ ہر شخص اپنی اپنی رائے پر چلتا، ہر شخص کی رائے جدا ہوتی۔ ضروری اور لازمی تھا کہ آپؐ ایسے شخص کو معین کر جاتے جس کی طرف آپؐ کے بعد لوگ رجوع کرتے۔

علامہ شیخ محمد الحسین آل الکاشف فرماتے ہیں کہ امامت، اسلام کا پانچواں رکن، نماز، زکاۃ، صوم اور حج کے بعد ہے:۔

"شیعہ امامیہ نے اعتقادات میں ایک پانچواں رکن اضافہ کر لیا ہے جو امامت ہے یعنی ان کا اعتقاد ہے کہ نبوت کی طرح امامت ایک منصب الٰہی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ مختار ہے کہ اپنے بندوں میں جسے چاہے نبوّت اور رسالت پر فائز کر دے اور اس کی تائید معجزات سے کرے جیسا کہ فرماتا ہے:

وربك يخلق مايشاء و يختار ماكان لهم الخيرة من امرهم

اسی طرح وہ مختار ہے کہ جسے چاہے امام نامزد کرنے کے لئے نبیؐ کو حکم دے کر اس کے بارے میں نص کرا دے اور اس طرح مرتبہ امامت پر پہنچانے کے بعد اس سے وہ کام لے جو نبیؐ سے لیتا تھا، سوا اس کے کہ آپ پر وحی آتی تھی اور امام پر نہیں آتی، نبی اللہ کی جانب سے مبلغ ہے امام نبیؐ کی جانب سے ہے۔ امامت بارہ اماموں میں مسلسل چلی آتی ہے ہر جانے والے نے آنے والے کے لئے نص کی ہے۔"[1]

امامیہ کے نزدیک شرط امامت یہ بھی ہے کہ نبیؐ کی طرح امام کو معصوم عن الخطا ہونا چاہئے ورنہ اس کا وقار ختم ہو جائے گا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

انی جاعلك للناس اماما قال ومن ذريتي۔ قال لاينال عهدى الظالمين۔

یہ امام کے لئے لزوم عصمت کی صریح دلیل ہے، نیز اسے افضل اہل زمانہ بھی ہونا چاہیئے اور سب سے بڑا عالم بھی ہونا چاہئے، کیونکہ وہ تزکیہ نفوس اور تکمیل انسانیت اور تہذیب علم و عمل صالح کے لئے مامور ہوا ہے اور ظاہر ہے ناقص کسی کی تکمیل کیا کرے گا؟ جو خود مفلس ہو کسی دوسرے کو کیا دے گا؟ پس امام کمالات میں نبی سے کم اور باقی انسانوں سے مافوق ہوتا ہے۔ پس جو شخص امامت کے اس مفہوم پر عقیدہ رکھتا ہے وہ مومن ہے اور جو

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی۔

صرف چار ارکان - نماز، روزہ، زکات، حج پر اعتقاد رکھتا ہے وہ مسلم ہے۔ مومن قیامت کے دن منازل قرب وکرامت سے بہرہ ور ہوگا ورنہ دنیا میں مومن و مسلم یکساں ہیں اور ویسے جو مسلم ہیں ان کے درجے بھی حسب نیت واعمال متفاوت ہیں[۱]۔"

ایک اہم فکری تجزیہ

یہ عبارت طوالت کے باوجود ہم نے نقل کر دی، اور بلاشبہ یہ رائے متقدمین اور متاخرین دونوں کی ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کا انتساب ائمہ آل علی کی طرف ہوتا ہے، اس رائے کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ ہوگا:

- امامت ایک دینی عقیدہ ہے، امر دنیاوی نہیں۔
- جو ائمہ امامت کے منصب پر فائز ہوئے ان کے لئے اللہ کے حکم سے نبیؐ نے وصیت کی۔ آپؐ نے علی کے لیے وصیت کی، علی نے حسن کے لئے، حسن نے حسین کے لئے اس طرح امام صادق تک سلسلہ چلتا گیا۔
- امام صادق کے بعد اختلاف پیدا ہو گیا، جو اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ کے مابین دائر تھا اول الذکر موسیٰ کاظم کی اور مؤخر الذکر اسماعیل کی امامت کے قائل تھے۔
- امام کو خطاء اور معصیت اور لغزش سے معصوم ہونا چاہیئے، کیونکہ وہ شریعت اسلامیہ کی تبلیغ کرتا ہے۔

آل الکاشف کی تصریح

چنانچہ سید محمد الحسین آل الکاشف فرماتے ہیں:

"بندہ جن اعمال کے لئے مکلف کیا گیا ہے خواہ وہ حرکت سے متعلق ہوں یا سکون سے ان پر اللہ کے احکام خمسہ میں سے ایک حکم نافذ ہوگا اور وہ یہ ہیں۔

(۱) وجوب (ایسا کرنا واجب ہے)
(۲) حرمت (ایسا کرنا حرام ہے)
(۳) مندوب (ایسا کرنا مستحسن ہے)
(۴) الکراہت (ایسا کرنا مکروہ ہے)
(۵) الاباحت (ایسا کرنا جائز ہے)

اسی طرح معاملات عقد، نکاح اور مالیات میں بھی شرعی طور پر — پائی جائے گی

---

[۱] اصل الشیعۃ واصولہا ص ۴۰،۳۰

یا فساد، اللہ تعالیٰ نے یہ جمیع احکام اپنے نبیؐ خاتم الانبیاء کو وحی یا الہام کے ذریعہ ودیعت کر دئے، پھر آپؐ نے حسبِ وقوع حوادث یا حدوث وقائع وغیرہ انہیں لوگوں پر منکشف کیا خاص طور پر ان صحابہ پر جو ہر وقت حاضر خدمت رہتے تھے تاکہ وہ تمام مسلمانوں تک انہیں پہنچادیں، لیکن بہت سے احکام ایسے بھی تھے کہ بواعث اور دواعی اور حاجات ان کے بیان کے مقتضی نہیں ہوئے انہیں آپؐ نے اوصیا کو سونپ دیا، ہر وصی نے اپنے بعد کے وصی کو ان سے واقف کیا تاکہ وقت پر حسب حکمت ان کی تبیین کر سکے۔

عصمت امام کا مسئلہ

وصی کا یہ منصب بلند اس کا مقتضی تھا کہ وہ نہ صرف معاصی سے بلکہ خطاء انسان سے معصوم ہو، چنانچہ شریعت مرتضیٰ نے بھی اپنی کتاب "الشافی" میں یہی لکھا ہے کہ عصمت امام کا اعتبار واجب ہے[1]

شریعت مرتضیٰ کے شاگرد طوسی نے بھی لکھا ہے کہ عصمت امام ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی ہونی چاہیئے۔ نیز امامت کے وقت بھی اور امامت سے پہلے بھی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

"جب یہ ثابت ہو گیا کہ امام اپنے قول میں حجت ہے تو لابدی اور لازمی ہے کہ وہ منصب امامت پر فائز ہونے سے پہلے ہی سے (پیدائش کے وقت سے) معصوم چلا آرہا ہو، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو مورد نفرت بن سکتا ہے، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ شروع ہی سے معصوم چلے آرہے ہوں[2] تاکہ ان کا قول حجت بن سکے، اور ان کے کسی دور حیات پر انگشت نمائی نہ کی جا سکے!"

حضرات امامیہ کے ادلہ

غرض عصمت امام سے متعلق یہ ہیں حضرات امامیہ کے خیالات وتصورات اور اعتقادات، انہوں نے اس سلسلے میں جو دلیلیں پیش کی ہیں ان کے بارے میں ہم کوئی مناقشہ کرنا نہیں چاہتے، نہ عقلی اعتبار سے ان پر کوئی گرفت کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ہمارا مقصد صرف انہی امور کی تحقیق اور تفحص ہے، جو کسی نہ کسی اعتبار سے امام صادق سے متعلق ہوں لہٰذا ہماری گفتگو اسی حد تک محدود اور مقصور رہے گی۔

سطور بالا میں ہم نے جو افکار وآراء پیش کیے ہیں وہ برادران اثنا عشریہ کے متقدمین اور

---

[1] الشافی ص ۴۰ [2] تلخیص الشافی للطوسی ص ۳۱۹۔

متاخرین دونوں کے ہیں کسی طرح کا تغیر یا تبدل نہیں ہوا ہے۔

برادران امامیہ نے یہ بھی بعض مواقع پر دعویٰ کیا ہے کہ جن ائمہ سے خوارق عادات سرزد ہوئے وہ معجزہ کہے جا سکتے ہیں، جیسا کہ طوسی نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"غیر نبی کے ہاتھ پر صدور معجزات کی دلیل یہ ہے کہ وہ دعویٰ کرنے والے کے صدق کا ثبوت ہوتا ہے اس لئے کہ وہ موقع تصدیق پر واقع ہوتا ہے پس جب معجزے کا حکم یہ ٹھہرا تو یہ کسی طرح ممتنع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ امام کے ہاتھ سے معجزات کا صدور کرا دے تاکہ اس کی عصمت اور وجوب طاعت وانقیاد کی دلیل بن سکے۔"[1]

نبی اور امام میں فرق حضرات امامیہ، امام کو مرتبۂ نبیؐ تک نہیں پہنچاتے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جبریل امین نازل ہوا کرتے تھے اور امام پر جبریل نازل نہیں ہوتے لیکن وہ امام کو انبیائے بنی اسرائیل کے مرتبے پر ضرور رکھتے ہیں جیسا کہ استاذ ہبۃ الدین الحسینی الشہرستانی نے تحریر فرمایا ہے۔[2]

خواص ائمہ سے متعلق خیالات غرض یہ ہیں وہ تصورات وخیالات جو برادران امامیہ خواص ائمہ کے لئے رکھتے ہیں جن میں امام جعفر صادق بھی ہیں اب سوال یہ ہے کہ اس نسبت کی سند کیا ہے؟ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ

: اللہ کا علم وصیت الٰہی دینی پر مبنی ہے۔

: ائمہ معصوم ہیں۔

: ائمہ سے معجزات بھی صادر ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔

: امامت بذریعہ وصایت متوارث ہے

غور طلب بات یہ ہے کہ آیا یہ آرا خود ائمہ آل علی کے بھی ہیں؟ یا خاص طور پر امام جعفر صادق انہی انکار وآراء کے حامل تھے؟

وہ کہتے ہیں یہ آراء ائمہ آل بیت سے مروی ہیں اور خود امام جعفر صادق سے بھی ان کی روایت ثابت ہے، چنانچہ علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے ارشاد فرمایا:

---

[1] تلخیص الشافی ص ۳۱۰   [2] ملاحظہ ہو الدلائل والمسائل ج ۵ ص ۸

"ہم شجرِ نبوّت بیت رحمت، کلید حکمت، معدن علم اور مرجع رسالت ہیں۔
ہمارے پاس فرشتے آتے ہیں، ہم اللہ کا راز ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی ودیعت ہیں، جو اس نے اپنے بندوں کو سونپی ہے، ہم اللہ کا حرم اکبر ہیں، ہم اللہ کا ذمہ ہیں، ہم اللہ کا عہد ہیں پس جس نے ہم سے پاس عہد روا رکھا، اس نے اللہ سے عہد نباہا جس نے ہمارا ذمہ توڑا، اس نے اللہ کا ذمہ اور عہد توڑا۔"[1]

ہم خزانہ علم الٰہی ہیں۔ ہم تراجم وحی خداوندی ہیں۔ ہم اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر خدا کی حجت اور برہان ہیں۔"[2]

امام ظاہر اور مشہود بھی مخفی اور مستور بھی

یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ امام جس طرح ظاہر اور مشہود ہو سکتا ہے اسی طرح مخفی اور مستور بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

"امام کے لئے ضروری ہے کہ خواہ وہ مخفی ہو اور مستور رہے یا ظاہر اور مشہود۔"[3]

اس طرح کا کلام حضرت امام باقر علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔

حضرت امام باقر کا ارشاد

ابو حمزہ سے مروی ہے کہ مجھ سے ابو جعفر نے کہا:

"اللہ کی عبادت وہی کرتا ہے، جو اس کی معرفت رکھتا ہو، جو اللہ کی معرفت نہیں رکھتا وہ مگر اس کی حالت میں اس کی عبادت کرتا ہے۔

میں نے عرض کیا، میری جان آپ پر قربان اللہ کی معرفت کیا ہے؟

آپ نے فرمایا

اللہ عزوجل کی تصدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق اور علی سے محبت اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی محبت اور اطاعت اور اللہ عزوجل کی جناب میں دشمنان ہدیٰ سے اظہار برات، یہ ہے معرفت خدا۔"[4]

کلینی نے کہا ہے:

اس امت میں جس شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ اس کا کوئی امام نہیں ہے تو

---

[1] الکافی ج ۱ ص ۱۰۵

[2] نہج البلاغہ قسم الحکم۔

[4] الکافی ج ۱ ص ۱۰۵ طبع طہران

وہ گمراہ اور سرگشتہ ہے اور اگر اس حالت میں مرگیا تو اس کی موت کفر اور نفاق پر ہو گئی ہے[1] [2]

وصایت کی تصریح ہمارے برادران اثنا عشریہ کا یہ قول بھی ہے کہ امام ابو عبداللہ جعفر صادق نے وصایت کی تصریح فرمائی ہے اور یہ وصایت اللہ کی جانب سے ہے۔

چنانچہ کلینی نے معاذ بن کثیر سے اور انہوں نے ابو عبداللہ جعفر الصادق سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا!

"اللہ عزوجل نے اپنے نبیؐ پر قرآن اتارا تو جبریل نے کہا۔
اے محمد یہ آپؐ کی وصیت ہے نجبا کے هئے؟"
آپؐ نے دریافت فرمایا!
اے جبریل نجبا کون؟
جبریل نے جواب دیا۔
علی بن ابی طالب اور اُن کے صاحبزادے کتاب پر سونے کی انگشتریاں رکھی تھیں۔
وہ آپؐ نے علی کو دے دیں اور حکم دیا کہ ان میں سے ایک انگشتری کو کھیں انہوں نے ایسا ہی کیا پھر انہوں نے ایک انگوٹھی حسن کو دی، انہوں نے بھی ایسا ہی کیا، پھر انہوں نے ایک انگشتری حسین کو دی، انہوں نے اسے کھولا تو اس میں لکھا ہوا تھا!
"اپنی قوم کے پاس شہادت کے لئے جاؤ، اور اپنے آپ کو خدا کے لئے خرید دو!"
پھر انہوں نے ایک انگشتری علی زین العابدین کو دی، انھوں نے اسے کھولا تو یہ لکھا پایا!
خاموش رہو، گھر سے باہر نہ نکلو، اور جب تک موت نہ آ جائے اپنے رب کی عبادت کرتے رہو؟

---

[1] الکافی ج ۱ ص ۸۳ [2] اس مضمون کی ایک حدیث بھی مروی ہے:

من مات ولیس فی عنقه بیعته فمات میتة جاهلیة

یعنی: اس حالت میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت امام کا قلادہ نہ ہو، وہ گویا جاہلیت کی موت مرا۔ (جعفری)

ہے ان کی تعداد چار ہزار افراد پر مشتمل ہے جو عراق، حجاز، شام اور خراسان سے تعلق رکھتے ہیں[1]۔"
اس کے بعد ڈاکٹر ہاشمی نے ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جو امام صادق سے مرویات کا صدر مانی جاتی ہیں مثلاً "الکافی" "الاستبصار" "التہذیب" "من لا یحضرہ الفقیہ" وغیرہ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:
ہمارے پاس اب تک کوئی ایسا واضح تواتر نہیں ہے جو ہمیں امام صادق تک پہنچاوے بلکہ جو کچھ ہے اس کی حیثیت مواد خام کی ہے اور وہ دراست طویل اور تحقیق کا مل کا طالب ہے[2]!
اور اس کے بعد طوسی کے بہت سے مندرجات تہذیب ذکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ امام جعفر صادق سے جو تواتر منقول ہے وہ فی الاصل زبانی ہے۔ تدوین کا کام بعد میں ہوا[3]

اور اس کے بعد فاضل موصوف نے فرمایا ہے:
"یہ جملہ کتب نصوص دراست اور تمحیص کی محتاج ہیں، کیوں کہ ان کی تدوین عہد امام جعفر صادق میں نہیں ہوئی!"

اس رائے کا تجزیہ اور تبصرہ | یہ رائے ایک ایسے عالم و فاضل اور محقق کی ہے جو خود بھی اثنا عشری ہے اور ہم اس کی اس رائے سے اتفاق کرنے پر اپنے تئیں مجبور پاتے ہیں۔
اور ان حقائق کی روشنی میں جو رائے امام صادق کی طرف منسوب ہو ہم اسے تمام ان کی رائے ماننے سے ہچکچاتے ہیں ہمیں اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ اس نسبت کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کی تمیز ضروری ہے اور یہ ضرورت اس طرح پوری ہو سکتی ہے کہ ایک مرتبہ اس ساری سرمایہ روایات و اشار کو کھنگال ڈالا جائے۔

امامیہ کا استدلال احادیث جمہور سے | اس جگہ ہم اس بات کا ذکر بھی کر دینا چاہتے ہیں کہ زیدیہ اور اثنا عشریہ اور دوسرے امامیہ حضرات ان احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جو جمہور مسلمین کے نزدیک معروف کتب حدیث مانی جاتی ہیں، چنانچہ بعض کتب سنت میں ایک

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "الامام الصادق ملہم الکیمیا" ص ۱۵۳ (طبع ۱۹۵۰ء)
[2] "الامام الصادق ملہم الکیمیا" ص ۱۵۳ (طبع ۱۹۵۰ء)
[3] الامام الصادق ملہم الکیمیا ص ۱۶۷، ۱۶۸۔

انہوں نے بھی یہی کیا، پھر انہوں نے بھی ایک انگشتری اپنے بیٹے محمد بن علی کو دی،
انہوں نے اسے کھولا تو یہ لکھا ہوا پایا

علوم اہل بیت کو پھیلاؤ اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو، تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا!

انہوں نے انگشتری جعفر صادق کو دی، انہوں نے اس میں لکھا ہوا پایا:

فتوے دو خدا کے سوا کسی سے خوف مت کرو، علوم اہل بیت کی نشر و تبلیغ کرو
تم خدا کی طرف سے حرز و امان میں ہو!

امامت بذریعہ وصایت الٰہی

یہ خبر جو بذات خود حضرت امام صادق سے مروی ہے اگر صحیح ہے تو بلا شبہہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں:-

: امام کو امامت وصایت الٰہی سے ملتی ہے نہ کہ لوگوں کے اجتہاد اور انتخاب سے، خواہ یہ اجتہاد اور انتخاب دائرہ قرشیت یا ہاشمیت کے اندر ہی یا اس سے باہر!

: امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو اور اس سے معصیت اور خطا کا ارتکاب کبھی نہ ہوا ہو۔

: اثبات امامت کے لئے امام سے معجزات کا صدور ہو سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح رسول سے اثبات رسالت کے لئے معجزات سرزد ہوتے ہیں۔

امامیہ کے اصول امامت

بہر حال امام صادق کی رائے میں یہ ہیں امامیہ کے اصول اور ہم اس اعتقاد میں مداخلت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے نہ ان اعتقادات کی بنا پر ہم انہیں خارج از اسلام قرار دے سکتے ہیں نہ ان کے ایمان کو ناقص کہہ سکتے ہیں، لیکن ہمیں یہ حق ضرور ہے کہ ان آراء کا امام صادق کی طرف انتساب درست ہے یا نہیں اسے پرکھیں اور جانچیں۔

ہم اس سارے کلام کی نسبت امام جعفر صادق کی طرف درست نہیں سمجھتے اور اس باب میں ہم منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ بعض معاصرین کرام کو بھی یہ کہتے ہوئے پاتے ہیں کہ برادران اثنا عشریہ کے اجتہاد سنت جو ان کی کتابوں میں درج ہیں دراست اور تحقیق کے محتاج ہیں چنانچہ ڈاکٹر محمد یحییٰ الہاشمی مذہب جعفری اور مذہب حنفی کے مابین موافقات و تعارضات کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

ہمارے سامنے ایک بہت بڑی مشکل ہے اور ہمارے خیال میں اسے اہم ترین مشکلات میں شمار کرنا چاہئے، کیا اس مذہب او جامع بذات امام تواتر تو صحیح کے طریقے پر ممکن ہے؟ اس باب میں ہمارے پاس دلیل کیا ہے؟ جن لوگوں نے حضرت امام جعفر صادق سے روایت کی

حدیث وارد ہوئی ہے جو یہ ہے :-

ترکت فیکم تمسکتم بہ لن تضلوا بعدی ابداً ، کتاب اللہ و عترتی !

یعنی میں تم میں (دو) ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم ان سے وابستہ رہے تو میرے بعد کبھی بھی گمراہ نہ ہو گے۔

"کتاب اللہ اور میری اولاد !"

اس حدیث کی رو سے "عترت" (اولاد) رسول کی طرف رجوع اور اس سے تمسک گمراہی سے نجات دلانے والا اور شر سے بچانے والا ہے۔

اور چونکہ عترت کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے ساتھ ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "عترت" قرآن کی مفسر اور موضح ہے اور وہ گمراہی سے نجات دلانے والی نہیں ہو سکتی جب تک معصوم نہ ہو اور کوئی شبہ نہیں خطاء گمراہی ہے اور اس حدیث کی رو سے عترت کو معصوم عن الخطاء قرار دیا گیا ہے۔

"عترت" یا "سنت"

لیکن اس حدیث کی ایک دوسری روایت بھی ہے اور اس میں "عترت" کے بجائے "سنت" کا لفظ آیا ہے، لیکن ان دونوں روایتوں میں کسی طرح کا تعارض نہیں ہے اس لئے کہ عترت کا پیام بھی سنت پر عمل کی تلقین کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ گویا دونوں روایتیں ایک دوسری کی مفسر ہیں، یعنی عترت اور سنت کے معنیٰ واحد ہیں اور وہ سنت جس کی حامل عترت ہے وہ اس سے زیادہ صحیح اور درست ہے جس کی دوسری طریقوں سے روایت کی گئی ہو، حاصل کلام یہ کہ امامت عترت ہی میں ہو سکتی ہے۔

عترت والی روایت متواتر ہے

غرض یہ ہے استنباط حدیث، ہمارے برادران امامیہ کہتے ہیں کہ عترت والی روایت قریب قریب متواتر کے ہے بلکہ بالفعل متواتر ہے۔

لیکن لفظ کوئی بھی ہو، اس حدیث سے ان ائمہ ستہ کی تعیین نہیں ہوتی، جو امامیہ کے نزدیک متفق علیہ ہیں، نہ اولاد حسن کے مقابلے میں اولاد حسین کی تعیین ہوتی ہے، نہ اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ امامت موروثی ہے اور بہ طریق توارث منتقل ہوتی ہے، اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اشارہ امامت فقہ و علم کی طرف ہے نہ کہ امامت، انتظامی اور شئون مملکت کی طرف اور امامت فقہ اور امامت سیاست میں کوئی تلازم بھی نہیں ہے، یعنی یہ باہم لازم و ملزوم نہیں ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض امور غیر فقیہہ لوگوں کو سونپے کیوں کہ وہ انتظامی صلاحیت بہ نسبت فقہی صلاحیت کے زیادہ

رکھتے تھے۔ آپؑ نے اپنی عدم موجودگی میں مدینے کی امارت ایسے بزرگ کو سونپی جنہیں فقہ میں کوئی دسترس نہیں تھی اور اگر کارِ حکومت فہم و فقہ دین سے تلازم رکھتا ہوتا تو افواج کی سپہ سالاری بھی ایسے ہی لوگوں کو سونپی جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کا ثبوت اسامہ بن زید کی سرداری سے ملتا ہے کہ یہ اس فوج کے سردار بنائے گئے جس کے سپاہی ابوبکر و عمر تھے، حالانکہ ظاہر ہے اسامہ فقہ و علم میں ان دونوں کے ہم پایہ نہیں تھے۔

سلبی مؤقف سے گریز اس موضوع پر ہم صرف یہی موقف نہیں —— اختیار کرنا چاہتے بلکہ ہم ایسے مصادر کی بھی تلاش کریں گے جن سے امام صادق کے افکار و آراء کی صحیح نشاندہی بھی ہوئی ہو یا کم از کم یہ ثابت ہوتا ہو کہ امام یکسر لغزش سے معصوم نہیں بلکہ اس کا شمار صدیقین میں ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ مراتب مومنین پر فائز ہوتا ہے لیکن ہوتا بہر حال بشر ہے دوسرے اتباع نبیؐ کی طرح۔

کتب معتبرہ شیعہ و اہلسنت سے استفادہ اس سلسلے میں ہم کتب معتبرہ شیعہ و اہل سنت سے استفادہ کریں گے، جن کے مندرج واقعات سے آل بیت کی تنقیص نہیں ہوتی بلکہ وہ اعلیٰ مراتب اجلال و احترام پر فائز نظر آتے ہیں۔

کتاب حلیۃ الاولیاء میں امام زین العابدین کے بارے میں مرقوم ہے:

علی بن حسین لوگوں کی گردن پھلانگتے ہوئے زید بن اسلم کی مجلس (علم) میں تشریف لایا کرتے تھے ایک مرتبہ ان سے نافع بن جبیر نے کہا:

آپ سید الناس ہیں اور سب سے افضل ہیں آپ یہاں کہاں؟

امام زین العابدین نے جواب دیا:

علم اس کا مستحق ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو، اس کا تعاقب کیا جائے!"[1]

⁂

صاحب حلیۃ الاولیاء نے اس بات کو بہ سند متصل روایت کیا ہے جسے ہم سند صحیح خیال کرتے ہیں۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام زین العابدین جو سلسلہ امامیہ کے چوتھے امام تھے، طلب و اخذ

---

[1] حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۱۳۸۔

علم کے لئے دوسروں کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس میں اپنی سبکی نہیں محسوس فرماتے تھے نہ اس کی پروا کرتے تھے کہ علم صرف انہی کے پاس ہے دوسروں کے پاس نہیں، نہ یہ احساس تھا کہ خود علم لدنی سے بہرہ ور تھے اور کسی علم سے بے نیاز، نہ یہ سوچا کہ علم بالوصایا کے حامل ہیں۔"

کتاب حلیۃ الاولیاء اگرچہ کتب امامیہ میں سے نہیں ہے لیکن افاضل امامیہ نے اپنی کتابوں میں اس کے حوالے دیئے ہیں، اور اس کی عبارتیں نقل کی ہیں۔

حلیۃ الاولیاء ہی کی ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ:۔

حلیۃ الاولیاء کا بیان "امام زین العابدین جب اہل عراق کو ائمہ آل علی کے بارے میں غلو کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو فرمایا کرتے تھے۔

"اے گروہ اہل عراق! اے گروہ اہل کوفہ، ہم سے اسلام کے ناتے کی محبت رکھو ہمیں ہمارے حق سے زیادہ نہ دو۔"

ان تصریحات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ائمہ آل علی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ہر لغزش سے معصوم تھے اور ان سے معجزات سرزد ہوا کرتے تھے، ایک طرح کا غلو ہے۔

اب اس کے بعد ہم ایک اور واقعے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو امام

ایک خاص واقعہ مرویہ جعفر صادق کے بارے میں مروی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امامت وراثت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اجتہاد اور انتخاب کی چیز ہے، نہ وہ وصایت پر مبنی ہے۔ ان باتوں کا ثبوت اس مرحلے پر ملتا ہے جب بنو ہاشم محمد نفس ذکیہ کو امام بنانے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ اس پر امام صادق نے اپنے بیعت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بیان کی تھی کہ وہ کم سن ہیں البتہ اگر ان کے والد آمادہ ہوں تو ان کی بیعت پر تیار ہیں۔

اصفہانی نے اپنی کتاب مقاتل الطالبین میں لکھا ہے:

"بنو ہاشم اس لئے مجتمع ہوئے کہ اپنے میں سے کسی شخص کو امام بنالیں اس موقع پر ابوجعفر منصور[1]

---

[1] یہ ابوجعفر منصور وہی ہے جو بعد میں عباسی خلیفہ بنا اور چونکہ نفس ذکیہ کی امامت پر بیعت کر چکنے کے باوجود خلیفہ بن گیا تھا لہٰذا ان کا اور نہ صرف ان کا بلکہ ان کے پورے خاندان کا درپے آزار ہوگیا اور اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک کھدیڑ کر انہیں میدان جنگ میں لاکر قتل نہیں کردیا، یہی حشر ان کے بھائی ابراہیم کا ہوا جو نفس رضیہ کے نام سے معروف تھے۔ ان دونوں کے بوڑھے والد اور اہل خاندان پر طرح طرح کے مظالم توڑے حالانکہ ان کا جرم یہ تھا کہ یہ بے گناہ تھے (رئیس احمد جعفری)

بھی موجود تھا اس نے نفس ذکیہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، پھر ان کے والد عبداللہ بن حسن نے دوسروں کو بیعت کی دعوت دی، لیکن چونکہ اس مجمع میں امام جعفر صادق موجود نہیں تھے اس لئے لوگ متامل رہے ایک شخص نے کہا:

"یہاں ابوعبداللہ جعفر کیوں نہیں ہیں"؟

چنانچہ انہیں بلایا گیا مگر انہوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد یہ لوگ خود ان کے پاس پہنچے اور نفس ذکیہ کی بیعت کر لینے پر زور دیا، اس موقع پر امام صادق نے نفس ذکیہ کے والد عبداللہ بن حسن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"آپ بزرگ ہیں، اگر آپ چاہیں تو میں بیعت کر لوں گا، لیکن خدا کی قسم آپ کے صاحبزادے کی بیعت نہیں کروں گا۔"[1]

روایت ہے کہ عبداللہ بن حسن نے امام صادق کو ملامت کی کہ وہ ان کے بیٹے سے حسد کرتے ہیں!

اشخاص معین کیلئے خلافت کا مسئلہ

اس واقعے سے دو امور پر روشنی پڑتی ہے:۔

(۱) امام جعفر صادق کی نظر میں اشخاص معین کے لئے خلافت کے سلسلے میں وصایت نہیں تھی۔

(۲) امام صادق منصب امامت کو اپنے وجود سے وابستہ نہیں پاتے تھے یہ وقائع ۱۲۵ھ کے لگ بھگ کے ہیں، یعنی امام باقر کی وفات کے بعد کے۔ پس اگر منصب امامت پر آپ اپنے آپ کو فائز سمجھ رہے ہوتے تو نفس ذکیہ کے والد عبداللہ بن حسن کی بیعت پر کیوں آمادہ ہو جاتے؟

امام جعفر صادق اور عبداللہ بن حسن میں جو اختلاف تھا وہ اجتہاد اور بیعت کے مسئلے پر نہیں تھا بلکہ ایسے شخص پر تھا جس سے اجتہاد کیا جا رہا تھا اور جس کی بیعت کی جا رہی تھی۔

ہاشمیوں کے اجتماع سے استدلال

اگر کہا جائے کہ یہ تقیہ تھا تو ہم جواب دیں گے یہ خاص ہاشمیوں کا اجتماع تھا، یہاں تقیہ اختیار کرنے کا کوئی سبب موجود نہیں

---

[1] مقاتل الطالبین ص ۲۵۴

تھا کیونکہ کسی طرح کا خوف یا اندیشہ وامنگیر نہیں تھا، یہ خاندانی اجتماع تھا جس میں اہل خاندان تدبیرامور کے لئے جمع ہوئے تھے۔

کیا یہ واقعہ سرے سے غلط ہے | یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی صحیح نہیں ہے لیکن اسے کیا کہا جائے کہ یہ واقعہ کتب امامیہ میں موجود ہے چنانچہ کتاب "الصادق" میں تحریر ہے:۔

عبداللہ بن حسن نے اپنے صاحبزادے کی بیعت کرلینے کی امام جعفر صادق کو دعوت دی۔

آپ نے جواب میں فرمایا:

خدا کی قسم خلافت نہ آپ کے ہاتھ آئے گی نہ آپ کے صاحبزادے کے، وہ تو اس شخص (یعنی سفاح) اور پھر اس شخص (منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور اس کے بعد اس کی اولاد کو ملے گی۔"[1]

وصایت پر بحث و خفگی | بعض شیعہ معاصرین محققین بھی اسی طرف مائل نظر آتے ہیں وہ وصایت کو تسلیم نہیں کرتے، نہ یہ فرض کرتے ہیں کہ امام جعفر صادق امام سیاست تھے۔ اگرچہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ وہ امامت کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔

چنانچہ الاستاذ احمد مغنیہ نے اپنی کتاب "الامام جعفر صادق" میں جو ۱۹۵۸ء میں بیروت سے شائع ہوئی ہے، مقتل حسین و زید کی عبرت ماجرائی بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"اب رہے ہمارے باقی ائمہ جن میں ہمارے امام جعفر صادق بھی تھے، سو ان کے پاس عنداللہ اور عندالناس عذر موجود ہے۔ انہوں نے جب وہ سبق آموز واقعات و حوادث سُنے اور دیکھے جو علیؓ، حسنؓ اور حسینؓ پر گزرے تھے تو کیا ان کے لئے یہی چارہ کار نہ رہ گیا تھا کہ حمایت کا دعویٰ کرنے والوں پر بھروسا کرنا چھوڑ دیں؟ اور اپنے آپ کو مصالح مسلمین اور خدمت عاملین کے لئے وقف کردیں۔

یہی وجہ تھی کہ امام جعفر صادق نے اپنے آپ کو خلافت کے لئے نہیں پیش کیا اور خدمت دین و مذہب پر بطریق علم و اخلاق قناعت کی۔"[2]

کلینی کے بیان پر گفتگو | گزشتہ صفحات میں جو مواد پیش کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے

---

[1] کتاب "الصادق" از علامہ مظفری

[2] الامام جعفر الصادق الاستاذ احمد مغنیہ ص ۶۰

کہ امام صادق رضی اللہ عنہ سے اور آل بیت کرام سے اس امر کا ثبوت قاطع نہیں ملتا کہ وہ وصیت کے ذریعے امامت کے قائل تھے اور کلینی نے جو کچھ ان کی طرف اس سلسلے میں منسوب کیا ہے وہ قابلِ قبول نہیں ہے۔

بہر حال اس نظریے سے متعلق ہم میں اور برادران امامیہ میں جو بھی فکری اور نظری اختلاف ہو وہ صرف رائے اور نظر کا اختلاف ہے، عقیدے اور ایمان کا اختلاف نہیں ہے، ان کا جو مسلک اور رائے ہے اسے بہر حال ایک خاص مقام حاصل ہے، ہم اس کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ جو اختلاف ہو، وہ دائرہ نظریات کے اندر محدود رہے، وہ ایسا افتراق نہ بن جائے جو طائفے اور گروہ اور فرقے کی صورت اختیار کرلے، چنانچہ اس موقع پر بھی ہماری کوشش یہی ہے کہ یہ اختلاف صرف فکری و نظری حد تک رہے فرقہ وارانہ اور طائفی رنگ نہ اختیار کرے۔

امامت کے بارے میں امام صادق کی رائے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام صادق جب اپنے آپ کو امام حاکم نہیں سمجھتے تھے، نہ وصیت کے ذریعے امامت حاکمہ کے قائل تھے تو امامت کے بارے میں ان کی رائے کیا تھی؟

اس رائے کو کثرت اقوال اور منقولات کے ہجوم میں تلاش کرنا ایک بہت دشوار کام ہے۔ لیکن ہم اس کام دشوار کو ان کے، ان کے والد ماجد کے اور ان کے جد محترم کے اقوال میں تلاش کریں گے

حکومت کے خلاف خروج

سیاست اسلامیہ کے ایک اہم ترین مسئلے پر امام صادق کی رائے

ائمہ اہل بیت اور عملی سیاست

ان افکار و آراء سے وضاحت کے ساتھ جو بات نظر کے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ ائمہ اہل بیت فتنہ و فساد برپا کر کے حکام کے خلاف خروج و بغاوت کے قائل نہیں تھے، اس لئے وہ محسوس کرتے تھے کہ فتنہ و فساد کے دن میں جو مظالم واقع ہو جاتے ہیں وہ ایک غیر عادل حاکم کے عہد حکومت میں برسہا برس کے اندر بھی واقع نہیں ہوتے ان کو اپنے حامیوں پر بھروسا نہیں تھا۔ حامیان اہل بیت کی بہت بڑی تعداد عراق میں تھی اور عراقیوں کا حال یہ تھا کہ جو کہتے تھے کرتے نہیں تھے یا کہتے زیادہ تھے اور کرتے کم تھے۔ چنانچہ علیؓ زین العابدینؒ، باقرؒ، صادقؒ وغیرہ ائمہ نے فتن میں حصہ لینے اور خروج کرنے سے گریز کیا خروج صرف اسی وقت جائز اور درست ہے جب بہتر نتائج کی توقع ہو۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ امام صادق نے اپنی اولاد، محمد نفس ذکیہ ابراہیم اور ان دونوں کے والد کو خروج سے روکا اور منع کیا۔

بنو امیہ کے بارے میں امام صادق کے خیالات

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امام جعفر صادق ظالم یا غاصب کی حکومت کو جائز خیال فرماتے تھے۔ انہوں نے صراحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ بنو امیہ کی حکومت غاصبوں کی حکومت ہے، یہی حال عباسی حکومت کا تھا اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ امام صادق کی رائے جو امویوں کے لئے تھی عباسیوں کے لئے نہیں تھی۔ ان کے خلاف امام عالی مقام کے سکوت اور خاموشی کا مقصد صرف یہ تھا کہ بغیر تدبیر محکم کے اس طرح کا اقدام نفع سے زیادہ نقصان کا موجب ہوگا اور از روئے شرع ہر وہ عمل جس کی مضرت نفع سے زیادہ ہو ناجائز ہے۔ امام گرامی کی رائے تھی کہ غاصب کی حکومت بہر حال زوال پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک قوت اور طاقت اس کے ہاتھ میں ہے، پھر جب وہ زوال آشنا ہو اور اس کا

آفتاب اقبال بہ غروب ہو تو پھر اس پر بھرپور حملہ کرکے حق، شوریٰ اور بیعت صحیح کے ساتھ استیلاء حاصل کرنا چاہئے۔ ایسا استیلاء جو جبر و جور، اکراہ اور ظلم پر مبنی نہ ہو، آل عبداللہ بن الحسن سے آپ نے جو کچھ فرمایا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

فقہ کی رو سے ظالم اور غاصب حاکم کی طاعت اس وقت تک واجب ہے جب تک فتنہ و فساد کے بغیر تغییر حکومت کا امکان نہ پیدا ہو جائے، کیوں کہ اس کے خلاف خروج کیا گیا تو عوام کو سخت ترین مظالم اور مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

صحابہ کرام

امام جعفر صادق کے افکار و آراء

صحابہ کے خلاف طعن و قدح

امام جعفر صادق اپنے آبائے کرام کی طرح ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے خلاف طعن و قدح کو سخت ناپسند کرتے تھے آپ کے جد محترم امام زین العابدین اور والد ماجد امام باقر سے اور خود آپ کے طرزِ عمل سے بھی ثابت ہے یا کم از کم کوئی دلیل ایسی موجود نہیں ہے جو ہمارے اس دعوے کو باطل کرتی ہو۔

امام زین العابدین کی ایک عراقی سے گفتگو

امام زین العابدین کے بارے میں مروی ہے کہ ان کی خدمت میں چند عراقی حاضر ہوئے ان لوگوں نے حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے بارے میں ناروا اور نامناسب الفاظ استعمال کئے۔

جب یہ لوگ اپنی سی کہہ چکے تو آپ نے فرمایا۔

"کیا مجھے بتاؤ گے تم کون ہو؟ کیا تم مہاجرین اولین میں سے ہو جنہوں نے محض خوشنودیٔ خدا کے لئے جلا وطنی گوارا کی اور اپنے مال و متاع سے دستبردار ہو گئے؟ اور خدا و رسولؐ کی تائید و حمایت میں کمر بستہ رہے اور بلاشبہ یہ سچے لوگ تھے؟!"

عراقیوں نے جواب میں عرض کیا!

"نہیں ہم مہاجرین اولین میں تو نہیں ہیں!

یہ سنکر امام عالی مقام نے دریافت فرمایا:

"پھر کیا تم ان لوگوں میں ہو جو مدینے میں مہاجرین کی آمد سے پہلے بسے ہوئے تھے، جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا تھا، اس سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا تھا اس سے دل تنگ نہیں ہوتے تھے۔ اور انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے۔ اگرچہ خود فاقے ہی سے کیوں نہ ہوں اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں!"

عراقیوں نے جواب میں گزارش کی۔

"نہیں ہم ان لوگوں میں بھی نہیں ہیں!
آپ نے یہ سنکر فرمایا!
میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں بھی نہیں ہو جن کے بارے میں خدائے عزوجل نے فرمایا:۔

والذین جاءو من بعدھم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤف الرحیم"!

یعنی!
اور جو لوگ (ان مہاجرین والنصار کے) بعد آئے وہ ان کے حق میں دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب تو بڑا رؤف (اور) رحیم ہے:۔
جاؤ چلے جاؤ خدا تم سے سمجھے!"
یہ رائے ہے امام زین العابدین کی جو ابوالشہداء امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد رئیس بیت حسینی تھے۔

امام باقر کا ارشاد گرامی

جابر جعفی نے جو خود بھی شیعہ ہیں روایت کی ہے کہ امام باقر نے انہیں عراق بھیجتے وقت کہا:
اہل کوفہ تک میرا یہ پیام پہنچا دو کہ جو لوگ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے تبرا کرتے ہیں میں ان سے بری ہوں!"
روایت ہے کہ ایک مرتبہ امام باقر نے ارشاد فرمایا:۔
"جو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضل و شرف سے بے بہرہ ہے وہ سنت سے ناواقف ہے!"
جعفر جعفی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ اُن سے امام باقر نے فرمایا۔
"اے جابر مجھے معلوم ہوا ہے کہ عراق میں کچھ لوگ ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ ہم سے محبت کرتے ہیں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو برا بھلا کہتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں نے اس کا حکم دیا ہے انہیں میرا پیام پہنچا دو کہ اللہ کے ہاں میں ان سے بری ہوں،

مجھے شفاعت محمدؐ نصیب نہ ہو اگر میں ان دونوں کے لئے استغفار نہ کرتا ہوں اور بارگاہ الٰہی میں ان کے لئے رحم کی دعا نہ کرتا ہوں اگرچہ دشمنان خدا، ان سے کتنے ہی بیگانہ ہوں[1]!

یہ اقوال ہیں امام باقر کے جو استاذ اکبر تھے امام صادق کے، اور جو اپنے عہد میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے سب سے بڑے عالم تھے، پس لابدی اور لازمی ہے کہ امام صادق ابوبکرؓ و عمرؓ کا احترام زیادہ سے زیادہ کرتے ہوں جب کہ وہ خاندان صدیق سے قرابت قریبہ بھی رکھتے تھے، ان کی والدہ کے والد قاسم بن ابی بکرؓ تھے، اور ان کی والدہ کے نانا عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ تھے اور ابوبکرؓ کے جانشین عمرؓ۔ پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ ان حضرات کے احترام میں پس و پیش کرتے؟

جملہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، امام باقر اور امام جعفر کی نگاہ میں صاحب اجلال و احترام تھے

ایک مرتبہ امام باقر سے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں پوچھا گیا:

انما ولیکم اللّٰہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمو الصلٰوۃ ویوتو لزکوٰۃ!

یعنی

"تمہارے دوست تو خدا، اور اس کا رسولؐ اور ایمان والے ہیں، جو نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں!"

امام باقر نے جواب دیا! "یہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں!"

سائل نے عرض کیا، "لوگ کہتے ہیں اس آیت میں حضرت علی مراد ہیں!"

امام متبع نے جواب دیا!

"وہ بھی انہی (صحابہ) میں ہیں[2]"

اہل بیعت رضوان

اس میں تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ اصحاب محمدؐ کون تھے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ اہل بیعت رضوان راس الصحابہ ہیں، اس لئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اہل بیعت رضوان کو اپنی رضا سے نوازا ہے۔ لہذا ان کا صحابی ہونا تو خود نص (قرآن) سے ثابت ہے۔

---

[1] حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۱۳۰

[2] الاخبار الاربعہ فی حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۱۳۸

ان الذین یبایعونک انما یبایعون الله، ید الله فوق ایدیهم

یعنی جن لوگوں نے آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کی، انہوں نے (گویا) خدا کے ہاتھ پر بیعت کی، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے۔

یا یہ ارشاد الٰہی تعالیٰ

لقد رضی اللّٰہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ۔

یعنی اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوشنود ہوا جنہوں نے درخت کے نیچے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

قرآن کی اس شہادت سے بڑھ کر اور کون شہادت ہوگی؟ پھر بھلا ان میں سے کسی ایک پر طعن ولعن کو کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے خوشنودی کا اظہار فرمایا اگر ان پر کوئی لعنت کرتا ہے تو وہ خدا سے جنگ کرتا ہے!

اس اصول کی بنا پر "ولایت" ان تمام لوگوں کے لئے ثابت ہے جو بیعت رضوان میں شریک تھے اور ظاہر ہے ان میں خلفائے راشدین بھی شریک تھے۔

اس سلسلے میں دو امور خاص طور پر غور طلب ہیں!

اثنا عشریہ اور سبِ شیخین | اثنا عشریہ کا ایک بہت بڑا گروہ جو معتدلین پر مشتمل ہے شیخین (ابوبکرؓ وعمرؓ) پر طعن لعن روا نہیں رکھتا، ابن ابی الحدید نے اپنی کتاب شرح نہج البلاغۃ میں اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اس مسئلے میں ہمارے اصحاب فوز ونجات ہیں اس لئے کہ انہوں نے اختصار واقتدال کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں علی آخرت میں افضل الخلق ہیں اور جنت میں سب سے بڑا رتبہ ان کا ہے اور دنیا میں بھی افضل الخلق **میں** ان کے خصائص، مزایا، اور مناقب بے شمار ہیں، جو ان سے دشمنی رکھتا ہے، یا جنگ آزما ہوتا ہے یا بغض رکھتا ہے وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا دشمن ہے اور دوزخ کے دائمی عذاب میں مبتلا ہوگا اس کا حشر کفار اور منافقین کے ساتھ ہوگا۔ بجز اس صورت کے کہ اس نے توبہ کرلی ہو، اور ان کے حب اور ولا پر مرا ہو۔

باقی رہے، افاضل مہاجرین وانصار، جنہوں نے آپ سے پہلے امانت خلافت وامامت حاصل کی، تو اگر آپ نے ان کی امامت سے انکار کیا ہوتا، یا ان پر غضب کا اظہار کیا ہوتا،

یا ان پر خفا ہوئے ہوتے، خواہ ان پر تلوار اٹھائی ہوتی، یا انہیں اپنی طرف دعوت دی ہوتی تو بے شک ہم کہتے ہیں کہ وہ ہلاک ہوئے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غضب کے مورد بنے، کیوں کہ ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:۔

"اے علی! تیری جنگ میری جنگ ہے اور تیری صلح میری صلح ہے"!

نیز آپؐ نے فرمایا:

"اے اللہ اسے دوست رکھ جو علی کو دوست رکھے اس سے دشمنی کر جو علی کا دشمن ہو"!

نیز ارشاد فرمایا:

"اے علی، تجھ سے وہی محبت کرے گا جو مومن ہو اور وہی بغض رکھے گا جو منافق ہو"!

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی نے ان کی امامت پر رضامندی ظاہر کی، ان کی خلافت پر بیعت کی، ان کے پیچھے نماز پڑھی، ان سے رشتہ پیوند کے تعلقات رکھے۔ پھر ہمارے لئے کیونکر جائز ہے کہ ہم آپ کے جادے سے منحرف ہوں؟ کیا تم نہیں دیکھتے جب آپ نے معاویہ سے برأت کا اظہار کیا، ہم بھی اس سے بری ہو گئے۔ جب آپ نے معاویہ پر لعن کیا، ہم نے بھی لعنت بھیجی، جب آپ نے اہل شام کی اور ان لوگوں کی جو وہاں بقیہ صحابہ میں سے موجود تھے۔ مثلاً عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے عبداللہ بن عمرو بن العاص کو گمراہی کا حکم لگایا تو ہم نے بھی ان کی گمراہی پر مہر تصدیق کر دی۔

الحاصل ہم علیؓ اور نبیؐ کے مابین نبوت کے مرتبے کے سوا کوئی فرق نہیں دیکھتے۔ اس فضل نبوت کے علاوہ دوسرے تمام فضائل میں دونوں کو مشترک مانتے ہیں۔ اور ہم ان اکابر صحابہ پر طعن و لعن نہیں کرتے جن کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ آپ نے لعن طعن نہیں کیا، لہٰذا ہم بھی وہی طریقہ اور وطیرہ اختیار کرتے ہیں جو علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے"!

کوئی شبہ نہیں اس رائے کی روشنی میں بہت سے صحابہ موضع طعن سے خارج ہوتے جائیں۔ اور کوئی شبہ نہیں ابن ابی الحدید کی یہ رائے بہت زیادہ معتدل ہے۔

کبار صحابہ پر لعن طعن کی رائے

ہمارے برادران اثنا عشری میں سے اکثر اصحاب قلم اور تصنیف و تالیف نے بھی کبار صحابہ پر لعن طعن کو سخت ناپسند کیا ہے۔ خاص طور پر شیخین یعنی ابوبکرؓ و عمرؓ پر لعن طعن کی مذمت کی ہے۔ چنانچہ ہماری نظر سے "الامام جعفر الصادق" گزری ہے، جس میں متقدمین شیعہ کے بارے میں طعن شیخین کی نفی کی گئی ہے، خاص طور پر عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں[1]

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "الامام الصادق" الاستاذ احمد مغنیہ ص ۱۱۳-۱۱۴ الطبع بیروت ۱۹۵۸ء)۔

ایک بادشاہ تسلیم کیا جائے گا، جو دنیوی اعتبار سے فرماں روا ہوگا۔

و: مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر کوئی عادی قرشی از روئے تغلب و غصب مسند امامت پر فائز ہو جائے لیکن اس کے بعد مسلمان اس کی بیعت خوشی خوشی کرلیں تو وہ خلیفہ تسلیم کرلیا جائے گا۔ اگرچہ اس کا انتخاب خلافت پر قبضے اور تصرف کے بعد ہوا ہو۔

ز: لیکن احناف کی رائے میں منہاج نبوت والی خلافت کے لئے لازمی ہے کہ مسند خلافت پر متمکن ہونے سے پہلے انتخاب کرلیا جائے، اسے متاخر نہ ہونا چاہیئے۔

ان ائمہ اصحاب مذاہب کی مثالوں کو پیش نظر رکھ کر امام جعفر صادق کا جو مسلک مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ:

: خلافت پر منہاج نبوت کے لئے مبایعت شرط ہے، جیسا کہ انہوں نے محمد نفس ذکیہ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ان کے والد عبداللہ بن حسن کی بیعت پر آمادہ ہوگئے تھے۔

: ان کے نزدیک بیعت لازمی اور لابدی ہے، انہوں نے کبھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ امامت بغیر بیعت کے ہو سکتی ہے۔

: خلیفہ کا عادل اور امین ہونا بھی ضروری ہے لیکن یہ ایسی شرط ہے جو محتاج بیان نہیں ہے

: امام کو بہت بڑا عالم ہونا چاہیئے۔

یہاں علم سے مراد اسلام کا علم ہے جو مشتمل ہے قرآن و سنت نبوی پر، نیز نظام مملکت اور حسن سیاست سے بھی اس کی واقفیت ضروری ہے کہ وہ دولت اسلامیہ کو صحیح اسلوب پر عمرؓ بن خطاب، ابوبکرؓ صدیق اور علیؓ ابن ابی طالب کی طرح چلا سکے۔

یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام جعفر صادق انتخاب کو ولایت پر مقدم رکھتے تھے: جیسا حنفیہ کا مسلک ہے؟ یا وہ اسے جائز سمجھتے تھے کہ امام مسند آرا ہو جائے اور عوام کی پسند اور بیعت بعد میں حاصل کی جائے؟

محمد نفس ذکیہ کی بیعت کے سلسلے میں امام جعفر صادق کی روش سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ولایت سے پہلے بیعت ضروری خیال کرتے تھے اگرچہ اس دعوے پر کوئی قطعی دلیل نہیں رکھتے، لیکن ہمارا خیال یہی ہے

شرائط امامت

افکار امام جعفر صادق کا استنباط

امامت از روئے نص

ہم اپنے اس خیال کا اظہار کر چکے ہیں کہ برادران امامیہ کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ امامت از روئے نص ہوتی ہے، اس سلسلے میں انہوں نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ ہمارے نزدیک قطعی نہیں بلکہ محل نظر ہیں، لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اس باب میں ہمارا ان کا اختلاف آخری حد تک پہنچ جائے ہم تو صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ آپ اپنے مسلک پر عامل رہئے۔ ہم اپنے مسلک پر قائم ہیں۔

پھر جب صورت احوال یہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود امام جعفر صادق کی رائے اس باب میں کیا تھی؟ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے امام گرامی کی کوئی قطعی رائے ہماری نظر کے سامنے اس باب میں نہیں ہے، لیکن ابوالخطاب نے اور ان کے بعد آنے والے لوگوں نے اس بارے میں بکثرت جو کچھ کہا ہے، وہ امام صادق کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ نہیں ہے، لیکن ان اخبار کثیرہ کے ہجوم میں تعیین اور قطعیت کے ساتھ ہم امام صادق کی رائے کا تعین نہیں کر سکتے۔ لیکن تحقیق و تفحص کے بعد جو کچھ ہماری نظر کے سامنے آتا ہے اس کے بعض پہلو اگر ایجابی ہیں تو بعض سلبی۔

جمہور مسلمین کا مسلک

جمہور مسلمین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس امام کی خلافت منہاج پر مانی جا سکتی ہے جو:

الف:- قریشی النسب ہو۔

ب:- عادل ہو۔

ج:- مسلمانوں کے شوریٰ سے اس کا انتخاب عمل میں آیا ہو۔

د:- جب تک وہ راہِ عدل پر گامزن ہے اس وقت تک اس کی امامت قائم رہے گی۔

ھ:- اگر راہِ عدل سے منحرف ہو گیا تو اس کی امامت منہاج نبوت پر نہیں مانی جائے گی بلکہ وہ

اس پر ہم مطمئن ہیں۔

امامت صرف قریش میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ امام جعفر صادق قریش کے اندر امامت کے محدود ہونے کے قائل تھے، لیکن آیا وہ ہاشمیت کی شرط رکھتے تھے، یا فاطمی اولادِ علی کو؟ یا حسینی اولادِ علی کو؟

امام صاحب کے اسلوب حیات اور اقوال سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت کے سزاوار بیت علوی فاطمی کے لوگ تھے، لیکن انہوں نے بیت حسینی کی تخصیص نہیں کی ہے جیسا کہ امامیہ جعفریہ کا خیال ہے، عام اس سے کہ وہ اثنا عشری ہوں یا اسماعیلی!

یہ بات کہ امام جعفر صادق امامت کے لئے بیت حسینی کی تخصیص و تحدید ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے ثابت ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن حسن کی بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ حالانکہ وہ حسنی تھے۔ حسینی نہیں تھے ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اس مسئلے میں امام صاحب کی رائے وہی تھی، جو ان کے عم محترم زید کی تھی، بلاشبہ یہ ایک نظریہ ہے اگر اس کے خلاف کوئی ثبوت مل جائے تو ہم اسے قبول کر لیتے۔ ہماری یہ رائے ظن راجح پر مبنی ہے، نہ کہ نص قاطع پر۔

آخر میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے اور برادران امامیہ کے مابین اختلاف جب کہ صرف نظری ہے، عقیدے کا اختلاف نہیں ہے اور اگر وہ اسے عقیدہ قرار دیتے ہیں اور ہم نہیں قرار دیتے تو اسے ہمارے ایمان کے نقص پر محمول نہ کریں اور اگر وہ اس کا اعلان کر دیں یا کم از کم ایسی کتابوں سے اخذ و استناد ترک کر دیں، تو ماضی کی ساری تلخیاں خلوص اور مودت میں تبدیل ہو سکتی ہیں!

مسائل اعتقادی سے متعلق

امام جعفر صادق کے افکار و آرا اور دلائل و براہین

تقدیر اور ارادۂ انسان

عہد امام جعفر صادق میں اعتقادی مسائل کا چرچا شروع ہوا۔ چنانچہ تقدیر اور ارادۂ انسان سے متعلق چہ میگوئیوں کا آغاز ہوا کہ آیا انسان آزاد مطلق ہے کہ جو چاہے کرے یا مجبور محض؟ یا ان دونوں کے بین بین؟

جعفر بن درہم نے خلقِ قرآن کا مسئلہ اٹھایا کہ قرآن کو مخلوق مانا جائے یا اسے کلام اللہ کے ساتھ منفصل قرار دیا جائے؟ آیا وہ ذات الٰہی کی طرح قدیم ہے یا اس کے برعکس؟ اس کے بعد صفاتِ الٰہی کے بارے میں بحث و گفتگو شروع ہوئی، آیا صفات خداوندی اور ذاتِ خداوندی شئے واحد ہیں یا صفاتِ ذات سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں؟ جہم بن صفوان کے اقوال بھی اس باب میں موجود ہیں۔ اسی طرح مسائل اعتقادیہ سے متعلق اختلاف رونما ہوا، جو ایسے مباحث تھے جن کا بنیادی اعتقادات سے درحقیقت کوئی تعلق نہ تھا۔

واصل بن عطا اور امام صادق

جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے عہد ہی میں جبریہ، قدریہ، معتزلہ، مختلف اعتقادی فرقے معرضِ وجود میں آئے، معتزلہ کے سرخیل، واصل بن عطاء امام صادق کے ہم عصر تھے۔ ان دونوں کا سن ولادت بھی ایک ہے یعنی ۸۰ھ۔ لیکن واصل بن عطاء کا انتقال امام صادق سے سولہ سال قبل ہوگیا۔ ان کی معتزلہ سے معرکہ آرائیاں ہوئیں اور محمد نفس ذکیہ کی امامت کے بارے میں اُن سے مناظرہ بھی کیا۔ امام صادق رضی اللہ عنہ کا مجادلہ اُن سے ثابت نہیں۔ اس مناظرہ کے اہم مباحث کو ہم نے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے یہ بات تاریخی حیثیت سے پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ امام زید کی واصل بن عطاء سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اس عقیدہ سے متعلق اپنا نقطۂ نگاہ ان کے سامنے پیش کیا۔

معتزلہ اور ائمہ اہل بیت

معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ آل بیت اپنے عہد میں معتزلیت کے روح رواں رہے ہیں قدیم و جدید دور میں ہمیں ایسے اصحاب ملتے ہیں جن کے خیال میں اثنا عشریہ اور معتزلہ ہم عقیدہ تھے۔ اس بات سے معتزلہ کی رائے کو تقویت ملتی ہے۔

مسئلہ قدر اور ارادۂ انسان

مسئلہ زیر بحث کے مالہ وما علیہ پر گفتگو

قدر اور ارادہ قدر کے خیر و شر پر ایمان لانا جو اسلام نے پیش کیا ہے اور جس کی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صراحت فرمائی ہے۔ ایسا موضوع ہے جس پر متعدد احادیث مروی ہیں:۔

: حدیث جبریل علیہ السلام میں مروی ہے کہ ایمان کی تعریف میں خیر و شر کی تقدیر پر ایمان لانا شامل ہے۔

: ایک اور روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ہر شے قضا و قدر کے ساتھ وابستہ ہے حتیٰ کہ عجز اور بلند حوصلگی بھی۔

: جب یہ بات مسلم ہو گئی کہ ہر شے قضا و قدر کے ساتھ وابستہ ہے تو پھر ارادۂ انسان کی حیثیت کیا ہے؟

: کیا انسان اپنے فعل میں آزاد اور خود مختار ہے؟

: یا خیر و شر کی تقدیر پر ظاہری ایمان رکھتے ہوئے مجبور محض؟

امامیہ اس بات کو امام صادق کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ انسان کی طرف صرف اس کے اختیاری افعال منسوب کئے جائیں گے اور وہ انہی اعمال کا مسئول ہوگا۔ اگر اس نے بھلا کام کیا ہے تو اچھا بدلہ پائے گا اور اگر برائی کا بیج بویا ہے تو اُسی کا ثمرہ حاصل کرے گا۔

امامیہ اور معتزلہ امامیہ اور معتزلہ اس بارے میں متحد الخیال ہیں۔ اس بارے میں الشیخ المفید محمد بن النعمان متوفی ۴۱۳ھ کا ارشاد ہے کہ ابو جعفر[1] نے فرمایا:

بندوں کے افعال مخلوق ہیں۔

اور یہ افعال کا مخلوق ہونا خلق تقدیری ہے نہ کہ خلق تکوینی!

---

[1] ابو جعفر - ابو جعفر محمد بن بابویہ قمی المعروف بہ "الصدوق" متوفی ۳۸۱ھ

ابن ابی الحدید نے نہج البلاغہ کی شرح میں لکھا ہے کہ عقائد کے بارے میں اثنا عشریہ اور معتزلہ ہم رائے تھے لیکن یہ اس لئے نہیں کہ وہ معتزلہ کے نقش قدم پر چلنے والے تھے اور ان کی پیروی اور تقلید کرنے والے تھے، بلکہ امر واقعہ یہ تھا کہ معتزلہ نے اپنی بنیاد ان کے افکار و آراء پر رکھی تھی۔ البتہ ہم بعض اوقات عقائد سے متعلق معتزلہ اور امامیہ کے آراء میں تھوڑا سا فرق پاتے ہیں اور اس رائے کے قائم کرنے میں حق بجانب ہیں کہ امام صادق کے بھی وہی آراء و افکار تھے جو اثنا عشریہ کے تھے۔ البتہ اگر کوئی ایسی دلیل مل جائے جس سے اس بات کی تردید ہوتی ہو تو یہ الگ بات ہے ہم نے جس مسلک کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جس چیز کو علماء نے متفقہ طور پر قبول کر لیا ہو اُسے بے تامل لے لیا جائے۔ بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی دلیل مانع نہ ہو۔

قرآن و سنّت کی روشنی میں

اب ہم دیکھیں گے کہ قرآن و سنّت کی روشنی میں زیر بحث موضوعات و مسائل سے متعلق ان کے دلائل و براہین کی پونجی کیا حیثیت رکھتی ہے؟ کیوں کہ شرع الٰہی سے جو کچھ ثابت ہو جائے وہ دلیل قطعی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس بات سے کہیں بلند اور ماوراء ہے کہ وہ دوسرے طائفوں اور اصحاب علم کے ردّ و قبول کو بنیاد بنا کر کوئی رائے قبول کی جائے۔

اب ہم ان چند مسائل سے آغاز کلام کرتے ہیں جو عہد امام صادق میں غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے۔

ان مسائل میں ایک بہت ہی ہنگامہ خیز اور طوفان بدوش مسئلہ ہے۔ تقدیر اور ارادۂ انسان اور عدلِ خدائے بزرگ و برتر کا۔ آئیے اب ہم اس موضوع کو پرکھیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے افعال کا علم خدا کو ہے جو تقادیر کا جاننے والا ہے۔
ابو عبداللہ کہتے ہیں کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدت کے ساتھ جو مسلک منسوب ہے وہ یہ ہے کہ افعال عباد غیر مخلوق ہیں اور ابوجعفر نے جو کچھ کہا ہے وہ اسی حدیث پر مبنی ہے۔ جو نہ صرف صحیح السند نہیں بلکہ نا قابل عمل بھی ہے اور احادیث صحیحہ کے یکسر خلاف۔

عربی زبان میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ کسی چیز کا عالم اس کا خالق بھی ہو۔ بالفرض اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے جیسا کہ مخالفین حق کا اصرار ہے تو لازماً ماننا پڑے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن چیزوں کا علم رکھتے تھے، اُن کے خالق بھی آپ تھے۔ اور جسے ارض وسماء کے بارے میں کچھ علم بھی ہو تو اسے ان دونوں کا خالق بھی ماننا پڑے گا، جس نے کارخانہ قدرت کو دیکھ کر اپنا مقام متعین کیا اور قدرت خداوندی کا اقرار کیا وہ اس کا خالق بننے کا بھی حق دار ہو گیا۔

یہ ایک ایسی انہونی بات ہے، جن کا مقلدین وپیروان ائمہ کے بارے میں بھی تسلیم کرنا غلط اور نادرست ہے چہ جائیکہ خود ائمہ کی طرف اس چیز کو منسوب کیا جائے۔ یہ تو جسارت کی انتہا ہے!

القمی کی روایت پر تبصرہ

اس بحث سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) ابن بابویہ القمی کی وہ روایت جس میں انھوں نے ائمہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تقدیر علم اور پھر خلق کا نام ہے۔ یہ ایسی حدیث ہے جو خود اُن کے نزدیک بھی نا قابلِ عمل اور ضعیف السند ہے۔

پھر القمی جیسے شخص کی روایت جس میں وہ خود دوسرے راوی ہیں اور جنہیں صدوق بھی کہا جاتا ہے، ائمہ خصوصاً امام صادق کی طرف ایسی احادیث کا انتساب قطعاً اور بلاشبہ قابلِ رد یکسر غیر مقبول رہا ہے

۲۔ تقدیر کے علم کا مطلب اس بات کا ہرگز مقتضی نہیں کہ اللہ سبحانہ کو بندوں کے افعال کا خالق مان لیا جائے، جبکہ اس نے یہ اور اسی قبیل کے دوسرے تصوّرات کو باطل ٹھہرایا ہے۔ اسی لئے الشیخ المفید اس ذیل میں لکھتے ہیں:-

"ابوالحسن محمد بن موسیٰ الرضا (صلوٰت اللہ علیہم) سے بندوں کے افعال کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ آیا وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں؟
آپ نے جواب دیا اگر اللہ ان کا خالق ہوتا تو اُن سے براءت کیوں کرتا؟ اور اللہ کا واضح ارشاد ہے ان اللہ بری من المشرکین (یعنی اللہ تعالیٰ مشرکین سے بری ہے)!

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی پیدائش سے برات نہیں کی بلکہ اُن کے شرک اور بُرے افعال سے برات کی ہے، ابوحنیفہؒ اور ابوالحسن موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے افعالِ عباد سے متعلق سوال اور استفسار کیا گیا؟ انہوں نے جواب دیا: بندوں کے افعال تین حالتوں سے خالی نہیں ہو سکتے۔

(۱) یا تو انہیں خدا کی طرف سے مانا جائے۔

(۲) یا خدا اور بندے دونوں کی طرف سے۔

(۳) یا صرف بندے کی طرف سے۔

اگر انہیں صرف خدا کی طرف سے مانا جائے تو پھر یقیناً اچھے افعال پر تعریف اور بُرے افعال پر مذمت نہ کی جائے گی اور اس کے علاوہ کوئی تعریف یا مذمت کا مستحق نہ ہو گا۔

اور اگر خُدا بندے دونوں کی طرف سے مانا جائے تو دونوں تعریف اور مذمت کے حقدار ہوں گے۔

جب یہ دونوں باتیں باطل ٹھہریں تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ دونوں مخلوق ہیں۔

اب اگر اللہ انھیں گناہ پر عذاب دے تو وہ قادرِ مطلق ہے اور اگر معاف کر دے تو اس کی بخشش کے خزانے بے حد و حساب ہیں۔

یہ بحث اس باب میں بالکل واضح ہے کہ بندوں کے افعال خدا کی طرف منسوب نہیں کیے جا سکتے کہ پھر جزا و سزا میں عدل ممکن نہیں بلکن الشیخ المفید اس کے باوجود اس بات کو مستحسن نہیں گردانتے کہ مخلوق پر خلق کا حکم لگایا جائے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کے ایک اور مقام پر لکھا ہے۔

"میں کہتا ہوں کہ مخلوق سے فعل، احداث، اختراع، اکتساب تو صادر ہوتا ہے لیکن اس کا حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ مخلوق میں خلق کرنے کی بھی صلاحیت ہے یا یہ کہ وہ خود اپنے افعال کی خالق ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس بارے میں جو ارشاد فرمایا ہے میں اس میں ذرہ بھر اضافہ کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا، اور نہ قرآن مجید کے اُن مقامات سے تجاوز کا حق رکھتا ہوں جن میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ اس باب میں مصریوں نے معتزلہ سے اختلاف کیا ہے۔ اور انہوں نے بندوں پر مطلقاً خلق افعال کا حکم لگایا ہے حقیقت یہ ہے کہ اتنی بڑی بات کہہ کر انہوں نے اپنے آپ کو اجماع مسلمین کے دائرے

سے خارج کر لیا ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ وہ صرف اسی بات کے قائل ہیں جو قرآن سے ثابت ہو، کیوں کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے بندے کو افعال کا فاعل اور عامل قرار دیا ہے، نہ کہ خالق۔ ان کا تسمیہ فاعل اور عامل سے کیا ہے، خالق سے نہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی تقدیر عدالت کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ موصوف اس باب میں اور زیادہ سخت ہیں، وہ صرف اسی کو مان سکتے ہیں جس کی توثیق و تائید قرآنِ حکیم سے ہوتی ہو۔

اس جگہ پر ایک انتباہ ضروری ہے۔

ایک بہت ضروری انتباہ | شیخ المفید رحمہ اللہ نے قرآن مجید کو احادیث کی کسوٹی قرار دیا ہے یعنی وہ احادیث ترک کر دی جائیں گی جو مخالفِ قرآن ہوں اور انہیں بے تامل قبول کر لیا جائے گا جو قرآن سے معارض نہ ہوں۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ جس میں ابو جعفر القمی کی اُن احادیث کو رد کیا ہے جس میں علم کو سببِ خلق مانا یا بتایا گیا ہے۔ الشیخ موصوف اس باب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ کی کتاب احادیث اور روایات پر مقدم ہے۔ کھری اور کھوٹی حدیثوں کی پرکھ اسی سے ہوگی اُن کے حق ہونے کے بارے میں قرآن ہی کا فیصلہ ناطق ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

الذی احسن کل شیء خلقہ وابداء خلق الانسان من طین

(یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے ہر چیز کو اچھی شکل میں پیدا کیا اور انسان کی پیدائش مٹی سے کی)؛

چنانچہ باری تعالیٰ نے خود ہمیں بتایا ہے کہ اس نے جو چیز بھی پیدا کی ہے وہ حسن ہے قبیح نہیں اگر اس نے ہمارے لئے بُری چیزیں پیدا کی ہوتیں تو انہیں اچھا کیونکر کہتا؟

اللہ کے اس ارشاد میں کہ اس نے تمام چیزوں کو اچھا پیدا کیا، ان لوگوں کے مزعومات کی بھی تردید ہو جاتی ہے، جن کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ نے بُری چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قول ہے:۔

ماتری فی خلق الرحمٰن من تفاوت (یعنی آپ اللہ کی پیدائش میں کسی قسم کا

تفاوت نہیں دیکھتے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں تفاوت ہونے کی نفی فرمائی ہے۔

اور یہ بات ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ کفر اور جھوٹ متفاوت ہیں اور متضاد کلام بھی متفاوت ہوتا ہے۔ پھر یہ کس طرح جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کا انتساب کیا جائے حالانکہ بندوں کے افعال میں تضاد اور تفاوت دونوں پائے جاتے ہیں [1]

ناقابل قبول اور قابل قبول کا معیار

یہاں ہم ذرا توقف کرتے ہیں تو اپنے آپ کو اس جلیل القدر عالم کا ہم رائے پاتے ہیں کہ قرآن احادیث کی کسوٹی ہے جو حدیث مخالف قرآن ہوگی اسے ضعیف تصور کیا جائے گا اور جو مخالف قرآن نہ ہوگی اور اس کی سند بھی درست ہوگی تو اسے صحیح تصور کیا جائے گا۔ اس لئے ہم بھی اُسی راستے پر گامزن ہیں جس پر یہ جلیل القدر عالم رہبری کر رہا ہے یعنی یہ کہ جو قرآن کے موافق ہو اُسے تو ائمہ خصوصاً امام صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا صحیح ہے۔ لیکن جو چیز قرآن کی لائی ہوئی ہدایت کے خلاف یا اس سے متضاد ہو تو وہ ناقابل قبول اور ضعیف قرار پائے گی، خواہ یہ اعتقادی مسائل سے متعلق ہو یا فروعات سے، کیونکہ اللہ کی کتاب زیادہ قابلِ اعتبار اور اس کے احکام زیادہ مبنی بر عدل ہیں، بلکہ حقیقت میں عدل وہی ہے اس کے سوا سرے سے کوئی عدل ہی نہیں۔

انسان مرتبۂ خلق وابداع پر فائز نہیں

اس تمام بحث سے یہ بات منقح ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ امام صادق بھی دوسرے ائمہ آل بیت کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ کی طرف بندوں کے افعال کو منسوب نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اُن سے افعال قبیحہ بھی سرزد ہوتے ہیں جن کا انتساب خدا کی طرف کسی شکل میں بھی درست نہیں۔

لیکن یہ بات بھی نہیں کہی جا سکتی کہ وہ ان افعال کے خالق ہیں کیونکہ قرآن مجید نے اُن کے فاعل ہونے کی تو صراحت کی ہے، خالق ہونے کی نہیں کی۔ بات یہ ہے کہ ذات خداوندی خلق اور تکوین دونوں میں یکتا ہے اور اس نے اپنے سوا کسی کو خالق نہیں کہا کیوں کہ خالق تو وہ ہوتا ہے جس کی تخلیق قدرتِ تکوینی سے نہیں بلکہ قدرتِ ذاتی سے وابستہ ہو۔

اور انسان تو اپنے اعمال میں اُسی طاقت سے کام لیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اُسے ودیعت کی ہے۔ چنانچہ اُس کے تمام افعال اسی کی قدرت کے مرہون منت ہیں لیکن جو دوسرے کی قدرت کا دریوزہ گر ہو اُسے کیونکر خالق کہا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے بندے کو فاعل، صانع کاسب اور مکتسب تو کہا ہے لیکن اُسے ایسا کوئی

---

[1] شرح عقائد الصدوق ص ۴۴، ۴۳

نام نہیں دیا، جو اس بات پر دال ہو کہ وہ مقام خلق و ابداع پر فائز ہے!

جبر اور تفویض کا فرق

اسی ضمن میں الشیخ المفید فرماتے ہیں کہ انسان کے پاس تو بس وہی طاقت ہے جو اللہ نے اُسے ودیعت فرمائی ہے، کہتے ہیں:۔

"خدائے پاک نے بندوں کو افعال پر قادر تو بنایا ہے لیکن اُن کی بجا آوری میں کچھ حدود اور رسوم مقرر کر دیئے ہیں۔ انہیں قبائح سے اجر و تخویف کے ذریعہ نیز وعدہ اور وعید کے ذریعہ روکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اختیار دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان افعال کے بجا لانے پر مجبور کر دیا ہے۔ اعمال کی تفویض اس لئے نہیں ہے کہ انہیں اکثر کاموں سے روک دیا ہے۔ اس نے تو ان اعمال کے بارے میں بندوں کے لئے حدود مقرر کر دئے ہیں۔ اچھے کاموں کا حکم دیا اور بُرے کاموں سے روکا ہے۔ جبر اور تفویض میں یہی فرق ہے جسے ہم نے بیان کیا ہے۔"

بلاشبہ اس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ انسان میں کام کرنے کی طاقت اللہ تعالیٰ کی ودیعت کی ہوئی ہے۔ انسان میں اُسی نے اسے پیدا کیا ہے، اس سے ان لوگوں کے تصوّرات کی بھی نفی ہوتی ہے جو مجوسیوں کی سی بات کرتے ہیں کہ خیر اور شر کے الگ الگ خدا ہیں، کیوں کہ امامیہ کی رائے میں ہر فعل کا مرجع اللہ کی ذات ہے بندے کا ہر کام خواہ اچھا ہو یا بُرا وہ اُسی قوت سے انجام دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو ودیعت کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلق و ابداع کی نسبت اس کی طرف نہیں کی جائے گی کیوں کہ اس کا تعلق محض قدرت ذاتی سے ہے اور انسان قدرت ذاتیہ سے یکسر تہی دامن ہے

امر، ارادہ، رضا
ایک اہم ترین اور معرکۃ آرا بحث

اللہ کے امر و نہی کے مضمرات یہ موضوع بھی گزشتہ موضوع سے پیوستہ ہے اور اسی سے متفرع ہے۔ امامیہ نے ائمہ آل بیت خصوصاً امام صادق کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ اچھے اور بُرے افعال بندے کی طرف منسوب ہوتے ہیں، تاکہ اس پر جزا و سزا کا اصول مرتب ہو سکے لیکن یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی حکمت پر متفق ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور حکم لازم و ملزوم ہیں، جس چیز کا وہ ارادہ نہیں کرتا اس کا حکم بھی نہیں دیتا اور جس کا ارادہ کرتا ہے اسی سے منع نہیں کرتا۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ حکم اور ارادہ باہم متصل ہیں ایک دوسرے سے منفصل نہیں۔

جہاں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے وہاں اس کا ارادہ بھی ہوتا ہے اور جہاں وہ منع کرتا ہے وہاں اُس کا ارادہ نہیں پایا جاتا۔ اس ضمن میں الشیخ المفید نے ان لوگوں پر تنقید بھی کی ہے، جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ہر چیز اللہ کے ارادے سے ہوتی ہے، خواہ وہ کسی کام کا حکم دے یا اُس سے روکے، فرماتے ہیں:

"اُن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عام مخلوق کو اپنی معصیت کے لیے پیدا کیا ہے اور صرف چند بندوں کو اپنی عبادت کے لئے مخصوص کر لیا ہے، بندوں پر اپنی نعمت کو عام نہیں کیا۔ اکثر کو اپنی اطاعت کا مکلف بنا دیا، جس کے وہ متحمل نہیں۔ تمام افعال کو اس نے اپنے ارادہ سے پیدا کیا، نافرمانوں کو نافرمانی پر عذاب دیا اور ایسے کام کا حکم دیا جس کا ارادہ اللہ نے خود نہیں کیا تھا اور جس کا اللہ نے ارادہ کیا تھا اس سے منع کر دیا۔ اس نے ظلم عباد کا فیصلہ کیا اور ان کے فساد کو پسند کیا اور بندوں کی اکثریت کا راہ یاب ہو جانا اس نے مکروہ اور نامرغوب جانا، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کے بہتان سے بہت بلند و اعلیٰ ہے۔"

بلاشبہ اس سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ ارادہ اور امر لازم و ملزوم ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کا اقرار معتزلہ بھی کرتے ہیں اور امامیہ نے بھی اسے اپنے ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

علم اور مشیت کا تعلق ارادہ، محبت اور رضا یہ تمام امور امامیہ کے نزدیک لازم و ملزوم ہیں اور اسی

یعنی اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے سامنے کھول کر بیان کرے اور تمہیں تم سے پہلے لوگوں کا راستہ دکھائے۔

یہ بھی ارشاد فرمایا

واللہ یرید ان یتوب علیکم ویرید الذین یتبعون الشہوات ان تمیلوا میلاً عظیماً۔

اس بحث سے تین چیزیں کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں:۔

امورِ سہ گانہ

(۱) بعض علماء روایات کے ظاہری مفہوم پر اکتفا کرتے ہیں نہ تو اُن سے کسی قسم کا تجاوز کرتے ہیں اور نہ کسی تاویل سے کام لیتے ہیں۔

(۲) جو روایات ائمہ سے مروی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ارادہ علم کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور علم کی طرح وہ بھی ازلی ہے۔ نیز یہ کہ اللہ کا علم اور اس کا ارادہ لازم وملزوم ہیں۔

(۳) امامیہ میں سے اکثر منصوص روایات کی تاویل کر لیتے ہیں اور ان کے ظواہر کو چھوڑ دیتے ہیں اس تاویل ہی کی وجہ سے وہ علم اور ارادے میں ربط قائم نہیں رکھ سکتے، وہ اس بات کو بطور مفروضے کے مان لیتے ہیں کہ اللہ کا علم ہر دو امور پر شامل ہے۔ اس امر پر بھی اس کے ارادے کے مطابق ہو اور اس پر بھی جو اس کے ارادے کے خلاف ہو۔

الشیخ المفید فرماتے ہیں جو لوگ علم اور ارادے کو لازم وملزوم سمجھتے ہیں وہ جبریہ کے ہم عقیدہ ہیں بلکہ وہ خود جبریہ ہیں۔

کیا اللہ کا ارادہ اور علم لازم وملزوم ہیں

یہ ہیں امامیہ کی آراء افعال انسانی اور ارادۂ الٰہی کے بارے میں۔

کیا ہمیں یہ زیب دیتا ہے کہ ہم بھی انہیں امام صادق کی آراء قرار دیں؟

جبکہ امامیہ امام صادق کی طرف انہی آراء کو منسوب کرتے ہیں؟

ہمیں "من لا یحضرہ الفقیہ" کے مصنف ابو جعفر القمی کی ان روایات پر نگاہ رکھنی چاہیے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صادق کا نقطہ نظر اس سے مختلف تھا جس کی ان کی طرف نسبت کی جاتی ہے امامیہ بعض اوقات ضعیف اسناد کی وجہ سے حدیث کو رد کر دیتے تھے، جیسا کہ انھوں نے اس حدیث کو رد کیا کہ اللہ کی تقدیر ہی اس کی تکوین ہے یا پھر وہ تاویل سے کام لیتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے اس روایت کی تاویل کی ہے کہ اللہ کا ارادہ اور علم لازم وملزوم ہیں۔

الشیخ المفید کا کہنا ہے کہ ابو جعفر روایات کے ظاہری معنی کو لے لیا کرتے تھے، اس کے علاوہ ہم

کو وہ امام جعفر صادق اور آل بیت کے دوسرے ائمہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

لیکن کیا علم اور ارادے کی حدیں ملتی ہیں ؟ "من لا یحضرہ الفقیہ" کے مصنف ابوجعفر القمی نے کہا ہے کہ علم اور ارادہ باہم ملے ہوئے ہیں، جو کچھ اس کے علم میں ہے، اس کی مشیت ہے۔ اور یہ چیز اس نص سے ہم آہنگ ہے جو اس سے پہلے نقل کی گئی کہ تقدیر، خلق اور تکوین دونوں کی متقاضی ہے۔ الشیخ المفید نے اس بات کی مخالفت کی ہے اور اسے امامیہ کا مذہب نہیں قرار دیا، نیز اس امر کی بھی صراحت کی ہے کہ امامیہ کے نزدیک اللہ تعالٰی کے علم اور ارادے میں کوئی تلازم نہیں، اس بارے میں الشیخ المفید کا بیان ہے کہ:۔

"اللہ کا ارادہ اس کی مشیت ہے الشیخ ابوجعفر فرماتے ہیں جو اسکی مشیت نہیں اس کا ارادہ بھی نہیں"

الشیخ المفید نے کہا وہ بات جس کا ذکر ابوجعفر نے اس باب میں کیا ہے، لاحاصل ہے اس کے معانی مختلف اور متناقض ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مختلف احادیث کے ظاہری منشاء کو پیش نظر رکھا، وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو کسی چیز کا بنظر عمیق مطالعہ کر کے حق و باطل میں تمیز کر لیتے ہیں، جس نے مذہب کے معاملے میں تقلید رواۃ اور اسانید و قصص پر بھروسہ کیا تو اس کی زبوں حالی کا بہ آسانی تصور کیا جا سکتا ہے۔

اللہ اور بندے کا تعلق

اس بارے میں سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالٰی اچھے اعمال اور پاکیزہ افعال ہی کو پسند کرتا ہے۔ وہ نہ بُرے کاموں کا ارادہ کرتا ہے اور نہ فواحش کو چاہتا ہے، باطل پرست جن چیزوں کو اللہ تعالٰی کی طرف منسوب کرتے ہیں اللہ ان سے بہت بلند و بالا ہے۔

اس بارے میں اللہ تعالٰی کے ارشادات یہ ہیں۔

وما اللہ یرید ظلماً للعباد

یعنی اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا

علاوہ بریں:۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر

یعنی اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، تنگی نہیں چاہتا۔

نیز ارشاد فرمایا:۔

یرید اللہ لیبین لکم ویھدیکم سنن الذین من قبلکم۔

دیکھتے ہیں کہ ابوجعفر وہی ہیں جو امامیہ کے نزدیک، بہت بڑے راوی ہیں بلکہ صدوق ہیں۔ وہ امام صادقؑ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ تقدیر میں کھوج لگانے اور اس میں جدال کا باب باز کرنے سے منع کرتے تھے۔ چنانچہ الشیخ المفید فرماتے ہیں:۔

ابوجعفر نے قضا و قدر کے بارے میں کہا ہے:۔

"مسئلہ تقدیر پر بحث کرنا ممنوع ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک حدیث بھی بیان کی، جس کی سند کا ذکر نہیں کیا ہے"۔

روایات ابوجعفر کی نوعیت

اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ابوجعفر ایسی روایات بیان کرتے ہیں، جن سے مسئلہ تقدیر میں الجھنے سے روکا گیا ہے۔

الشیخ المفید نے اگرچہ روایت کی صحت اور نہی کے اسباب کے بارے میں مصنف سے اختلاف کیا ہے لیکن امام صادق کے دوسری مرویات، نیز ائمہ کے اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ تقدیر میں بحث و تمحیص نامناسب ہے، یہی وجہ ہے کہ الشیخ المفید اس کی تاویل پر مجبور ہوئے۔ کہ یہ نہی خاص معانی یا اُس شخص کے لئے ہے جو غور و فکر کی صلاحیت سے عاری ہو چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ابوجعفرؒ نے قضا و قدر کے بارے میں بحث و تمحیص سے روکنے والی جن روایات کو نقل کیا ہے وہ توضیحاً ذیل کا مورد بن سکتی ہیں:۔

تاویلات و توجیہات

(۱) یہ نہی ان لوگوں کے لئے ہے جن کو بحث و تمحیص سے اُن کے فساد عقیدہ دین سے گمراہی اور عبادات سے بے رغبتی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، جو لوگ اس کی اہلیت رکھتے ہیں اُن کے لئے مخالفت نہیں۔ بسا اوقات ایک چیز ایک شخص کے لئے مفید ہوتی ہے، لیکن دوسرے کے لئے مضر، بعض لوگ ایک چیز کے اہل ہوتے ہیں جب کہ دوسرے اسے بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

اب غور فرمائیے کہ ائمہ نے دین میں اس کی اشاعت کی اسی حد تک اجازت دی جس حد تک انہوں نے مناسب سمجھا۔

(۲) قضا و قدر میں بحث و تمحیص سے روکنے کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اس کے اسباب اور علل پر گفتگو نہ کی جائے، کیوں کہ جب مخلوق کے بارے میں غور و بحث کا سلسلہ شروع ہو جائے گا تو معاملہ خطرہ میں پڑ جائے گا، اسلئے کہ اس راز کو اللہ تعالیٰ نے اکثر مخلوق سے پوشیدہ رکھا ہے کیا آپ اس سے ناواقف ہیں؟ کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا اس کی تفصیلات اور علل میں جانا مخلوق کے لئے جائز نہیں کیوں کہ اس طرح اندیشہ ہے کہ انسان مخلوق کے بارے میں یہ کہنا شروع

کردے کہ اس نے ایسا کیوں پیدا کیا ہے؟ ویسا کیوں پیدا کیا ہے؟ یہاں تک کہ سب مخلوق کو شمار کر ڈالے نہ یہ جائز ہے کہ آدمی یہ کہنا شروع کردے کہ اللہ نے ایسا کیوں حکم دیا ہے؟ یا اس کا کیوں حکم دیا ہے؟ اور اس سے کیوں روکا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو اپنی مخلوق کے لیے بہتر سمجھا اسی کا حکم دیا، کیونکہ وہی زیادہ جاننے والا ہے۔

اس نے خلق کی پیدائش کے اسباب وعلل سے کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ اگرچہ وہ سب سے زیادہ جاننے والا ہے پھر بھی اس نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی جو بے کار اور عبث ہو بلکہ ہر چیز کی پیدائش حکمت اور مصلحت کے تحت ہوئی۔ انسان کے دل و دماغ اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وما خلقنا السماء والارض وما بینھما الا عبثین۔

یعنی ہم نے آسمان، زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے بطور کھیل پیدا نہیں کیا۔

افحسبتم انما خلقنٰکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون

یعنی کیا تم یہ گمان کر بیٹھے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟

انا کل شیء خلقنٰہ بقدر

یعنی ہم نے ہر چیز اندازے کے مطابق پیدا کی[1]

پھر کہتے ہیں:

"اگر ہم ان اخبار و روایات کو تسلیم کرلیں جو ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہیں تو ان کی دو صورتیں ہیں:

: یا تو وہ باطل ہیں۔

: یا اُن کی سند درست نہیں ہے۔

"اور وہ حدیث جسے زرارہ نے روایت کیا ہے صحیح ہے، اس کا مفہوم واضح ہے۔ اہل عقل سے پوشیدہ نہیں اور وہ قولِ عدل کی تائید کرتا ہے اور یہ قول جبر کے فساد پر دال ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام سے مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ جب خلائق کو حشر میں جمع کرے گا تو ان سے اس عہد و پیمان کے بارے میں

---

[1] تصحیح الاعتقاد ص ۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲

سوال کرے گا، جو ان سے لیا گیا تھا، اور ان امور کے بارے میں سوال نہیں کرے گا جو قضا و قدر سے متعلق تھے!

یہ ہے الشیخ المفید کا ارشاد

چند غور طلب امور | اس ارشاد کے سلسلے میں امور ذیل خاص طور پر غور طلب ہیں۔

(۱) جو حدیثیں مسئلہ قدر سے متعلق غور و خوض کو منع کرتی ہیں ان کے ضعف

ضعف اسناد | اسناد کو اس معروف طریقے سے واضح نہیں کیا ہے جو نقد روایت کے سلسلے میں مسلم ہے۔ حالانکہ اس کی سخت ضرورت تھی۔

۲- انھوں نے حدیث کا مخاطب خاص لوگوں کو ٹھیرایا ہے یا

حدیث کے عموم معنی کا قصر | عموم معنی کو ایک خاص طائفے کے اندر قصر کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ بات خود ائمہ کے اپنے الفاظ کے لحاظ سے بے دلیل ہے۔ کیوں کہ ائمہ کے اقوال بھی جو مرتبہ تقدس پر فائز ہیں۔ یہ درست نہیں کہ کسی چیز کو خاص کیا جائے جب تک خصوص کی کوئی دلیل نہ ہو۔

ایسے کام میں بحث و تحیص سے روکنا جس پر کوئی عمل مترتب نہ ہوتا ہو اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی عبادات سے متعلق ہو ایک ایسی نہی ہے جس کے لئے کسی خصوصیت کی ضرورت نہیں کیونکہ ایسے مسائل میں بحث و تحیص شک کی وادیوں میں لے جاتی ہے۔ یہ نہی کسی رائے سے روکنے والی نہیں بلکہ یہ ایک امر خاص کی نہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں جدال بلا وجہ دین کے حقائق میں شک پیدا کر دیتا ہے۔

(۳) وہ روایت جو امام صادق سے مروی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ حشر میں

روایت امام جعفر | جب تمام خلائق کو جمع کرے گا تو اس عہد کے بارے میں سوال کرے گا جو ان سے لیا گیا تھا، لیکن ان فیصلوں کے بارے میں سوال نہ کرے گا جو قضا و قدر کے ماتحت تھے۔

قضا و قدر کے مسائل میں وجوب غور و خوض پر دلیل نہیں ہے۔ اس سے تو صرف اس بات کی تائید و توثیق ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف اسی چیز کا محاسبہ کرے گا جس کا اس نے ان سے مطالبہ کیا تھا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اس لئے کہ اسے تمام فرق اسلامیہ بلا اختلاف تسلیم کرتے ہیں۔

مسائل تقدیر میں بحث و تمحیص سے روکنا اس حدیث کے عین مطابق ہے

روایت آل بیت | جو صادق رضی اللہ عنہ اور آل بیت سے مروی ہے۔ شہرستانی الملل والنحل

یں ایک روایت لائے ہیں، جس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"امام صادق فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا، ہمیں پیدا کرنے سے اس کا کوئی مقصد تھا، اور ہم سے بھی وہ کچھ مطالبات رکھتا تھا، ہمیں پیدا کرنے سے اس کا مقصد و منشا کیا تھا؟ یہ اس نے نہیں بتایا۔ لیکن جو کچھ ہم سے چاہتا تھا وہ سب چیزیں وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان فرمادیں، اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم سے جو مطالبات ہیں ان کے بارے میں تو ہم نہیں سوچتے، اور جن باتوں پر غور و خوض کے لئے ہم مکلف نہیں انہی کی فکر میں غلطان و پیچاں ہیں!"[1]

اور کوئی شبہ نہیں کہ ان تصریحات سے یہ بات واضح اور منقح ہو جاتی ہے کہ قضا و قدر کے مسائل میں بحث و گفتگو اور غور و خوض نہ صرف غیر مفید ہے بلکہ جدال و خصومت کا موجب ہے، جس سے ریب و نفاق پیدا ہوتا ہے۔

امام صادق کے تلامذہ اور معاصر فقہا

امام صادق رضی اللہ عنہ کے ہم عصر فقہا اور تلامذہ بھی قضا و قدر کے بارے میں بحث و تمحیص اور غور و خوض سے روکتے تھے۔ امام مالکؒ اور امام لیثؒ امام ابو حنیفہؒ سب کا یہی حال تھا۔

امام ابو حنیفہؒ نے بعض قدریہ سے مناظرہ کرتے وقت یہ بھی فرمایا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تقدیر کے مسائل میں ٹوہ لگانے والا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سورج کی شعاعوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہو۔ جوں جوں وہ دیکھے گا ویسے ویسے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا؟"

امام ابو حنیفہ جو اوائل عمر ہی سے علم کلام میں مناظرہ کیا کرتے تھے وہ بھی نہایت بلیغ اور احسن طریقے سے تقدیر کے مسائل میں بحث و تمحیص کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔ غرض اس بات پر منتج ہوئی کہ امام صادق قضا و قدر میں بحث و تمحیص سے روکتے تھے اور یہی وہ روایت ہے جو اہل سنت کی روایت سے مطابقت رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ اُن اقوال سے بھی مطابق ہے جو امامیہ کے بارے میں امام صادق سے مروی ہیں۔ نیز امام موصوف کی اس رائے سے بھی موافق ہے جس میں دین کے بارے میں خصومت سے منع کیا گیا ہے۔

---

[1] الملل والنحل ج ۲ ص ۲، بحاشیہ الفصل فی الملل والنحل لابن حزم۔

نہ جبر درست ہے نہ تفویض

امام جعفر جیسا کہ امامیہ نے نقل کیا ہے تقدیر کے بارے میں بحث و تمحیص سے منع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کا قول ہے:۔

"نہ جبر درست ہے نہ تفویض بلکہ اعتدال کی راہ ان کے درمیان ہے۔"

اگر ہم ظاہری طور پر اس کلام کو سمجھنا چاہیں تو یقیناً اس نکتے پہ پہنچیں گے، جس کی جعفر بن محمد نے صراحت کی ہے، فریقین میں سے حق کسی کے پاس نہیں، نہ تو جبر صحیح ہے اور نہ مطلقاً تفویض کو درست تصور کیا جا سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قدریہ سے ہم رائے نہیں ہیں، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اپنے اختیاری افعال کا خود خالق ہے۔

شہرستانی کے تصریحات

شیخ حسنی شہرستانی نے اس روایت کے بارے میں فرمایا ہے:۔
"تاریخ اور حدیث صحیح السند سے جو شیخ الائمہ و مذاہب مطارع گرامی قدر جعفر بن محمد سے جو کلمۂ زریں منقول ہے، اس نے ہمارے لیے مختصر ترین عبارت میں عقائد کی اچھی بنیاد استوار کر دی ہے!

جبر و تفویض کے بارے میں ایک سائل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:۔

"نہ جبر، نہ تفویض، بلکہ بات جو کچھ ہے وہ ان دونوں۔ جبر و اختیار۔ کے بین بین!"

ان الفاظ میں موصوف نے اختیار مطلق کی نفی فرمائی ہے، اسی طرح اجبار بھی جو بصورت مطلق متصور ہو۔ جبر، اختیار۔ پر حاوی ہے، یعنی جبر، مگر صرف ایک حد تک اسی طرح اختیار مگر وہ بھی صرف ایک حد تک جیسا کہ ہمارے اہل سنت محققین کا مسلک ہے، جو انہوں نے اعمال میں جزا اختیاری سے متعلق اختیار کیا ہے۔

حق صرف جبر اور اختیار کے مابین ہے

ہمیں علامہ جلیل کی رائے سے اتفاق ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حق صرف جبر اور اختیار کے درمیان ہے۔ واٹرہ سائرہ جیسا کہ امام جعفر رضی اللہ عنہ نے صراحت فرمائی ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ امام جلیل سے منقول یہ حدیث انسان کے بارے میں بحث و تمحیص سے مانع ہے، جس سے بعض لوگ متحیر ہیں لیکن ایک مومن اپنے عمل میں اس کا محتاج نہیں۔

مرتکب گناہ کبیرہ

کیا گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا کافر اور دوزخی ہے؟

ایک ہنگامہ خیز مسئلہ مرتکب گناہ کبیرہ کے ناجی یا غیر ناجی ہونے کا مسئلہ سب سے پہلے جنگ صفین کے موقعے پر رونما ہوا جو امام ہدایت علی بن ابی طالب اور معاویہ بن سفیان کے درمیان برپا ہوئی تھی۔

پھر بعد میں جب خوارج نمودار ہوئے تو انہوں نے خطائے تحکیم پر کفر کا فتویٰ دینا شروع کیا اب عام لوگوں میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث آ گیا، خوارج کا قول تھا جس سے گناہ کبیرہ سرزد ہوا وہ کافر ہو گیا، جس نے ایسے شخص کی مدد کی ساتھ دیا، حکم مانا وہ بھی کافر۔ چنانچہ انہوں نے بے تامل جمہور مسلمین کو کافر قرار دیا۔

مرتکب گناہ کبیرہ کے بارے میں امام حسن بصری کی رائے ہے کہ وہ کافر نہیں ہے۔

معتزلہ کا قول ہے کہ معصیت کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا نہ جنت میں جائے گا۔ نہ دوزخ میں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ ایسے شخص کو مومن نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ مسلم اور فاسق کہا جا سکتا ہے۔

اس سے قبل کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی رائے معلوم ہو، ہم حضرات امامیہ کی رائے کا جائزہ لیتے ہیں پھر ہم اس کا موازنہ کریں گے کہ امام صادق کی طرف اس رائے کو منسوب کرنے میں کہاں معقولیت ہے؟

حضرات امامیہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن اور کافر کے بین بین نہیں بلکہ فاسق ہے وہ معتزلہ سے متفق نہیں کیوں کہ ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب بقدر گناہ سزا بھگتنے کے بعد بالآخر نجات حاصل کرے گا اور یہی ایک منصفانہ فیصلہ ہے۔ الشیخ المفید نے بھی اپنے رسالہ "اوائل المقالات" میں اسے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:۔

"امامیہ کے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ "خلود فی النار" کی وعید صرف کفار کے لئے ہے۔

وہ مسلمان جو معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں مگر ساتھ ساتھ معرفت خداوندی اور فرائض کا اقرار بھی کرتے ہیں اس کے مخاطب نہیں، مرجئہ اور اصحاب حدیث تمام کے تمام اس باب میں ان سے متفق ہیں معتزلہ کا اجماع اس کے برعکس ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ خلود فی النار کی وعید کفار اور جملہ مسلمان

فساق کے بارے میں ہے۔

حضرات امامیہ کا مسلک

امامیہ کا خیال ہے کہ جس نے معرفتِ خداوندی کا اقرار کیا اور اسے گناہوں کی پوری پوری سزا بھی مل گئی پھر وہ دائمی عذاب کا سزاوار نہیں وہ دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا اور وہاں وہ ہمیشگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوگا۔ معتزلہ کا قول اس کے برعکس ہے یعنی بس جو ایک دفعہ جہنم میں داخل ہو گیا پھر وہاں سے اس کا خروج ممکن نہیں۔ بلاشبہ یہ پہلی رائے معتدل رائے ہے جو جمہور کی رائے سے مطابقت رکھتی ہے اور اسی اعتدال کے باعث اسے امام صادقؒ کی طرف منسوب کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اللہ کے عدل کا اقتضاء

ابو جعفر القمی نے تو اپنی روایات میں اسے امام موصوف ہی کی طرف منسوب کیا ہے اور کسی نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ بلکہ الشیخ المفید نے تائید کی ہے ان دونوں کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے پر مہربانی کرتا ہے پھر نیکی کرنے والے کو مزید نعمت سے نوازتا ہے اور گنہ گار کو اپنی بخشش کی چادر میں ڈھانپ لیتا ہے۔ تائید میں قرآن کریم سے دلائل بھی نقل کیے ہیں۔

یہ بات اللہ کے عدل کے بھی منافی نہیں کیوں کہ عدل تو یہی ہے کہ کام کرنے والے کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے۔ وہ اللہ کے فضل کو بند نہیں کرتا اس کے برعکس ظلم یہ ہے کہ کسی حقدار کو اس کا حق دینے سے روکا جائے۔

اللہ سبحانہٗ فضل اور مہربانی کرنے والا ہے، وہ سخت گیر ہونے کے باوجود گناہوں کو بخش دیتا ہے جو دلائل الشیخ المفیدؒ اللہ کی مغفرت اور اس کی مزید رحمت کے ثبوت میں لائے ہیں درج ذیل ہیں:۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، للذین احسنوا الحسنی وزیادۃ۔

یعنی ان لوگوں کے لیے جنہوں نے نیک کام انجام دیے، بھلائی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

اللہ سبحانہٗ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ نیکی کرنے والوں کو وہ ثواب بھی ملے گا جس کے وہ مستحق ہیں نیز اس کی طرف سے مزید عنایت بھی ہوگی، اور زیادتی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں یوں ارشاد فرمایا ہے:۔

من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا ومن جاء بالسیئۃ فلا یجزیٰ الا مثلہا وھم لا یظلمون۔

یعنی جس نے ایک نیکی کی اس کو دس نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا اور جس نے ایک

برائی سرزد ہوتی اُسے صرف اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا اور کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔
اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تاکید فرمائی کہ قیامت کے دن اُس کی رحمت نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہوگی چنانچہ فرمایا:۔

قل بفضل اللّٰه وبرحمته فبذلك فليفرحوا هو خير مما يجمعون

یعنی کہہ دیجیے کہ اللہ کی رحمت اور فضل سے خوش ہوں وہ اس سے بہتر ہے جسے وہ اکٹھا کر رہے ہیں۔
دوسری جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے۔

ان ربك لذو مغفرة للناس على ظلمهم وان ربك لشديد العقاب

یعنی بے شک تیرا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود بخشش کرنے والا ہے اور تیرا رب سخت سزا دینے والا ہے۔

ان اللّٰه لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما دون ذٰلك لمن يشاء۔

یعنی اللہ شرک کو نہیں بخشتا البتہ جن چھوٹے (معمولی) گناہوں کو چاہے گا بخش دے گا۔

ایمان واخلاص کا صلہ مغفرت

ان تمام آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی بخشش و درگزر کا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہوا ہے جو ایمان و اخلاص کے صفات سے متصف ہو اور خدا کی طرف رجوع و انابت کرنے والا ہو کیونکہ اللہ کی بے پایاں رحمت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اس بات کو بطور مفروضہ کے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ بندے نے ان تمام حقوق کو بدرجۂ اتم پورا کر دیا ہے جو منعم حقیقی کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں کیونکہ خدا کتنا ہی دل کی گہرائی سے ادا کیا جائے اللہ کے حق سے فروتر ہے۔

الشیخ المفید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں یہ اللہ کے جود و کرم کا تقاضا تھا کہ اُس نے بندے کے حق کو تسلیم کیا۔ اگر وہ منصفانہ محاسبہ کرتا تو اللہ کی نعمتوں کے مقابلے میں بندے کا کوئی حق نہیں رہ جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش ہی سے بندوں پر اپنی نعمتوں کی بارش شروع کر دی اور اُن کے لیے شکر کو واجب ٹھہرایا اس کائنات میں کوئی نہیں جو اپنے عمل سے اللہ کی نعمتوں کا کماحقہٗ شکر ادا کر سکے۔

ایک مجمع علیہ مسئلہ

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس نے حقوق اللہ کو پورا کر دیا ہے اور اس کی تمام نعمتوں کا کماحقہٗ شکر بجا لایا ہے وہ گمراہ ہے، نیز

صفاتِ باری تعالیٰ

مسئلہ صفات سے متعلق امامیہ کا مسلک

صفاتِ ذات اور صفاتِ افعال | امامیہ نے بھی اللہ تعالیٰ کے لیے انہی چیزوں کو مانا ہے جنہیں قرآن مجید نے ثابت کیا ہے اور قرآن کی ثابت کردہ باتوں کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں :-

(۱) اللہ تعالیٰ کے وہ ذاتی صفات جو اس کی ذات کی وجہ سے اس کے لئے ثابت ہیں مثلاً علم حیات۔

(۲) صفات افعال۔ یہ وہ صفات ہیں جو اُس کے افعال کی وجہ سے معرض وجود میں آئیں مثلاً : پیدا کرنے والا۔ رزق دینے والا، زندہ کرنے والا، مارنے والا، آغاز کرنے والا، لوٹانے والا۔

صفات ذات اور صفات افعال میں فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صفات ذات وہ ہیں جن کی اضداد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف نہ کیا جا سکے۔ وہ قادر ہے، عاجز نہیں۔ عادل ہے ظالم نہیں، عالم ہے جہل کی نسبت اُس کی طرف ناممکن ہے، وہ زندہ ہے اس پر موت طاری نہیں ہو سکتی۔

رہے صفاتِ افعال تو اُن کے اضداد کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ وہ دیتا بھی ہے روکتا بھی ہے، زندہ بھی کرتا ہے، مارتا بھی ہے، وجود میں بھی لاتا اور فنا بھی کرتا ہے[۱]

بس یہی ایک فرق کرنے والی چیز ہے جس سے انھوں نے صفاتِ افعال اور صفات ذات میں فرق کیا، اور اس کی بنیاد، اس کی قدرت، علم، حیات، سمع، بصر اور دوسرے ذاتی صفات ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو متصف ٹھہرایا ہے اور جن کے بغیر ذات کا تصور محال ہے۔ اور یہ ایسے صفات ہیں جن کا ثبوت ہمیں قرآن مجید سے بطریق سماع ملتا ہے۔

---

[۱] تصحیح الاعتقاد ص ۱۵۶۔

اُن کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ انسان حقوق اللہ کو ادا کرنے سے قاصر ہے، اس لیے کہ خدا کے حقوق کا سلسلہ لامتناہی ہے اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی عمروں کو بقائے زمانہ تک بھی دراز کر دے تو بھی وہ اُن حقوق کو پورا نہیں کر سکتے جو اللہ کی طرف سے اُن پر عائد ہوتے ہیں۔

اس تمام بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کا جو حق تسلیم کیا ہے وہ محض اس کی بخشش و احسان ہی کا فیض ہے۔

عقلی طور پر بھی ایک شکر گزار باعمل شخص کی حالت اس سے مختلف ہوتی ہے جو عمل سے تہی دامن ہو، یہی وجہ ہے کہ شکر گزار تعریف کا مستحق ہے جب کہ بے عمل شخص کے لئے کوئی حمد و ستائش نہیں۔ جب ایک باعمل اور بے عمل شخص میں امتیاز ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے باعمل شخص کی تعریف ہی کو اُس کا حق قرار دے دیا اور یہاں اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔ جب عقلی طور پر اُسے بے عمل شخص پر فوقیت حاصل ہو گئی تو یہ اللہ تعالیٰ کا عین عدل تھا کہ اس کے حق کو تسلیم کر لیا جائے، اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اللہ کا فضل و کرم ہی ہے کہ اُس نے بندوں کے حق کو تسلیم کر لیا، ورنہ بندوں کا اللہ پر کوئی حق قطعاً نہیں۔

مسئلہ اطاعت میں اللہ تعالیٰ باعمل اور بے عمل شخص کو مساویانہ حیثیت نہیں دیتا۔ جیسا کہ شکر گزار اور کفران نعمت کرنے والے کو ایک درجے میں نہیں رکھتا اور عقل ہی نے اس فرق کو لازم ٹھیرایا ہے۔

معتزلہ اور امامیہ کے مسلک میں مماثلت

یہ اللہ تعالیٰ کا عدل ہے کہ اُس نے ایک باعمل شکر گزار کا درجہ بے عمل، کفران نعمت کرنے والے سے بلند کر دیا۔ یہ بات سہولت و عنایت کے طور پر کہی گئی کہ بندے کا بھی کچھ حق ہے اور یہی بات صائب اور درست ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نقطہ نظر امام جعفر صادق کے علم سے لیا گیا ہے اور ہمیں اس کی نسبت امام جعفر صادق کی طرف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوتی۔

اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جملہ مختلف فیہ اعتقادی مسائل میں معتزلہ اور امامیہ کی آراء یکساں ہیں، عمومیت کے ساتھ صحیح نہیں۔ ہاں اگر یہ بات کہی جائے کہ امامیہ اکثر آراء میں معتزلہ کے قریب تر ہیں تو یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ واللہ سبحانہ، و تعالیٰ اعلم۔

اُن میں سے کچھ صفات ایسے ہیں جن کی نسبت انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے اور وہ مخلوق کے افعال سے متعلق ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کسی تشبیہ یا مثل سے بلند ہے۔

صفات میں انھوں نے ارادہ اور کلام کو بھی شمار کیا ہے چنانچہ اللہ تعالےٰ کے ارادے کے بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے افعال کا ارادہ نفس افعال ہیں اور مخلوق کے افعال کا ارادہ انہیں حکم دینا ہے۔ اسی طرح ارادہ کرنے والا مطلوب شے کے ساتھ وابستہ ہوجاتا ہے جس طرح پیدا کرنا مخلوق کی ذات سے متعلق ہے۔ اس بارے میں اوائل المقالات کا مصنف کہتا ہے۔

> اپنے افعال کے لئے خدا کا ارادہ اس کے نفس افعال ہیں اور مخلوق کے افعال کا ارادہ انہیں افعال کا حکم دینا ہے اور اسی کی تائید میں آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ائمہ سے روایات منقول ہیں۔
>
> یہ اکثر امامیہ کا مسلک ہے سوا ان چند لوگوں کے جو اُن سے علیحدہ ہو گئے اور اسلام کی تعلیمات کو چھوڑ دیا۔
>
> اللہ کو صرف اسی نام سے پکارا جا سکتا ہے جو اُس نے خود اپنی کتاب یا اپنے نبیؐ کی زبان سے رکھا ہے۔ یا نبیؐ کے خلفا نے۔
>
> اسی کے مطابق آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایات ہیں اور یہی امامیہ کا مذہب ہے[1]!"

انھوں نے صفاتِ افعال میں کلام کو بھی شمار کیا ہے یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ کو حادث جانتے ہیں "الشیخ المفید" اس بارے میں کہتے ہیں کہ اللہ کا کلام حادث ہے اور اس کے حق میں آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایات منقول ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ارادے کو صفت فعل اور اللہ کی طرف منسوب کلام کو حادث مانتے ہیں وہ اس کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ آل محمد سے ماثور ہے۔ جو چیز آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ماثور ہوگی وہ امام صادق رضی اللہ عنہ کی رائے متصور ہوگی، کیوں کہ انہوں نے امام موصوف کے قول کو آل محمد کا قول کہا ہے:

امامیہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کلام کو حادث مانتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن حادث ہے لیکن قرآن کو مخلوق کہنے سے گریز کرتے رہتے ہیں؛ اور یہ اس لئے کہ قرآن کو گھڑا ہوا نہ کہا جائے۔ اور حق تعالیٰ

---

[1] اوائل المقالات ص ۴۵

کا ارشاد ہے :۔

انما تعبدون من دون اللہ اوثاناً وتخلقون افکا

یعنی: اللہ کے سوا تم جن چیزوں کی عبادت کرتے ہو وہ تو بُت ہیں اور تم سب جھوٹ گھڑتے ہو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے منکرین توحید کے قول کو نقل کیا ہے:۔

ما سمعنا بھذا فی الملۃ الاخرۃ ان ھذا الا اختلاق

یعنی ہم نے یہ بات کسی ملّت میں نہیں سنی یہ تو جھوٹ ہے۔

امامیہ نے قرآن کے حادث ہونے کو اپنے ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے قرآن کے مخلوق ہونے کی نسبت کو اپنے ائمہ سے روکا ہے۔ اوائل المقالات میں ہے۔

"میں کہتا ہوں کہ قرآن اللہ کا کلام یعنی وحی ہے اور وہ حادث ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا ہے اور میں اُس پر مخلوق کا اطلاق نہیں کرتا۔ پہلے لوگوں سے اسی کے بارے میں روایات منقول ہیں اور چند امامیہ کے سوا سب اس پر متفق ہیں"۔

یہ مسئلہ کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ امام صادق کے عہد میں شہرت پذیر ہوا، جعد بن درہم نے اس مسئلے پر لب کشائی کی اور بات چل پڑی، علماء علم کلام نے اس پر غور و خوض کیا اور لوگوں کو اس پر بحث و گفتگو سے روکا۔

امام ابو حنیفہؒ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قول ان دنوں مجالس فقہاء کا موضوع بنا ہوا تھا اور اس کے حاملین اس پر خوب خوب طبع آزمائیاں کرتے تھے۔

ابن عبدالبر کی کتاب الانتقاء میں ہے کہ :۔

"امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ابو یوسف بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن ایک شخص کوفہ کی مسجد میں آیا اور قرآن کے بارے میں سوال کرنے لگا، امام ابو حنیفہؒ مکہ تشریف لے گئے تھے۔ لوگوں نے اس بارے میں بہ انداز مختلف اظہار خیال کیا۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے حلقے میں پہنچ گیا۔ اور ہم سے پوچھنے لگا۔ ہم نے ایک دوسرے سے استفسار کرنا شروع کر دیا تو کچھ تو بالکل خاموش رہے؟ پھر ہم نے متفقہ طور پر کہا کہ ہمارے استاذ موجود نہیں اور ہم اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ ان کی عدم موجودگی میں ایسی بات کریں

امت کا اتفاق ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں[1]

"میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کے وجود سے پہلے اس کا علم رکھتا ہے، کوئی ایسی وقوع پذیر شے نہیں جس کے واقع ہونے سے پہلے اللہ کو علم نہ ہو اور نہ کوئی معلوم چیز ایسی ہے جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ نہ جانتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے لئے زمین و آسمان کی کوئی شے پوشیدہ نہیں، عقلی و نقلی دلائل کا یہی تقاضا ہے قرآن مجید، احادیث اور آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ چیزیں منقول ہیں اور یہی تمام امامیہ کا مذہب ہے۔

یہ کلام سچ ہے جھوٹ نہیں، اس کا فیصلہ قرآن نے کر دیا ہے جب کہ اس نے اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر شے کو محیط ہے اور ہر چیز کا اندازہ اُسی کے پاس ہے، وہ عالم الغیب ہے اور بہت بڑا اور بلند ہے۔

ان چیزوں کی نسبت امام صادق کی طرف حقائق میں سے ہے، ان کی تردید کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر امت کا اجماع ہے، عقلی و نقلی دلائل اس بارے میں پورے طور پر مطابقت رکھتے ہیں۔

---

[1] اوائل المقالات، ص ۵۶۔

جو اُن کی مرضی کے خلاف ہو۔
جب امام صاحب تشریف لائے تو کچھ دیر کے بعد ہم نے کہا:
ایک مسئلہ درپیش ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور ہم نے آپ پر ہی
تکیہ کیا ہے۔
امام صاحب نے پوچھا "کونسا مسئلہ ہے؟"
ہم نے بیان کیا وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر ارشاد فرمایا:
"تم نے کیا جواب دیا؟"
ہم نے عرض کیا: "ہم نے تو سکوت ہی اختیار کیا۔" ہم اس بات سے ڈرتے تھے کہ کوئی
ایسی بات نہ کہہ جائیں جسے آپ ناپسند کرتے ہوں۔
امام صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا جزاکم اللہ۔
سنو۔ میری وصیت یاد رکھو، اس بارے میں کبھی بحث نہ کرنا اور نہ اس سلسلے میں
کسی سے سوال کرنا۔ اتنا یاد رکھو کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور بس، یہ بات بغیر کسی
کمی بیشی کے کہو۔[1]
اس تفصیل سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اس موضوع کا عہد امام صادق میں بہت چرچا تھا۔
بلاشبہ امام صادقؑ اور ائمہ آل بیت سے منقول ہے کہ انھوں نے قرآن کو مخلوق کہنے سے روکا ہے
امامیہ نے اس بات کو اپنے ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے اور اسکی شہادت اس دور کے فقہاء کے اجتماع
سے ملتی ہے انہوں نے اپنے ائمہ خصوصاً امام صادق کی طرف اسے منسوب کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن حادث
ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی حدیث اس کے خلاف نہیں جس سے اس کی نفی کی جا سکے۔
یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی بات کو رد نہیں کرتے، کیونکہ ہم یہ بات تسلیم کر چکے ہیں کہ علماء نے جس چیز کو
متفقہ طور پر لے لیا وہ عقلی یا نقلی سند کے بغیر مسترد نہیں کی جا سکتی۔

اللہ تعالیٰ کا علم

امامیہ نے اللہ تعالیٰ کو علم کی صفت سے متصف ٹھہرایا ہے اور کسی بھی مومن
کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو علم سے متصف نہ مانے، انھوں نے بیان کیا
ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم گزشتہ اور آئندہ چیزوں کے علم کو محیط ہے اور ہم اس بات پر الشیخ المفید کے افکار پر ایک
نظر ڈالتے ہیں، موصوف امامیہ کی تائید کرتے ہیں اور وہ اس باب میں اس چیز سے متفق ہیں جس پر تمام

[1] الانتصار ص ۱۱۶

آیات ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وبدا لھم من اللہ ما لم یکونوا یحتسبون۔

یعنی: اور نظر آئے ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال بھی نہ رکھتے تھے۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی آیات ہیں جو فریقین کی کتب میں موجود ہیں اور جن کے طرق بھی صحیح ہیں اگر یہ آیات نہ ہوتیں تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کا اطلاق جائز نہ ہوتا۔ فریقین کے اہل تحقیق نے اسے انہی معانی پر محمول کیا ہے جس سے نسخ ثابت ہو۔ اس کی بہت سی مثالیں خود مصنف نے ذکر کی ہیں اور انہوں نے تکوینی امور میں اس کا وہی مقام رکھا ہے جو امور تشریعی میں نسخ کا ہے[1]

بداء کی مثالیں

ان معانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے بداء کی تعریف یہ ہوگی کہ لوگ کسی ایسی چیز سے دوچار ہوں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو، جیسے فقر کے بعد تونگری صحت کے بعد مرض اور مرض کے بعد تندرستی۔

لیکن وہ کہتے ہیں بداء یہ ہے کہ عمر اور رزق میں زیادتی ہو اور اعمال کی وجہ[2] سے ان میں کمی بھی واقع ہو۔

بلاشبہ اگر عمر میں زیادتی سے مراد وہ زیادتی کی جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی علم میں مقدر کردی بلکہ اس پر بھی مزید ہو تو یہ تغیر علم اللہ کو لازم ہے اور اگر یہ معنی لئے جائیں کہ لوگوں کی توقعات سے زیادہ تو اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی منطبق ہوتا ہے:۔

وبدا لھم من اللہ ما لم یکونوا یحتسبون۔

اور نظر آئے ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال بھی نہ رکھتے تھے۔

اسی کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ اگر بداء کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی توقعات کے خلاف کوئی چیز واقع ہو جائے تو اس پر اجماع ہے۔

اور اگر اس سے مراد تقدیر میں تغیر ہے تو یہ بات اہل سنت میں سے کسی سے ثابت نہیں۔

---

[1] التعلیقات علی کتاب اوائل المقالات ص (۹۴)

[2] اوائل المقالات۔

مسئلہ بداء

امورِ تکوینی میں ناسخ و منسوخ کا تصوّر

بداء کی نسبت حضرات امامیہ کی طرف کی جاتی ہے۔

بداء کی تعریف بداء سے مراد ارادۂ الٰہی کا تغیر ہے وہ کہتے ہیں خلق میں بداء وہی چیز ہے جو احکام میں نسخ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے پیش نظر اپنے احکام منسوخ کر دیتا ہے۔ اسی طرح تکوینی امور میں اپنے سابقہ ارادے کے برعکس تغیر اور تبدل کر دیتا ہے۔

بداء مختار ثقفی کی ایجاد ہے بداء کے بارے میں گفتگو کا آغاز مختار ثقفی نے کیا۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ غیب کے چہرے سے نقاب کشائی کرتا ہے۔ جب کوئی کام اس کے دعوے کے خلاف ہو جاتا تو کہتا یہ تمہارے رب نے کیا ہے

ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں اب ہم اس بات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ حضرات امامیہ اس بارے میں کس رائے کے حامل ہیں؟

علامہ فضل اللہ زنجانی کتاب "اوائل المقالات" کی تعلیقات میں لکھتے ہیں:۔

"لفظ بداء کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔

(۱) کسی شے کا ظاہر ہونا اور لغوی اعتبار سے یہی اصل ہے۔

(۲) بداء کے اس معنی کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز نہیں، کیوں کہ اس سے اس کے علم کا حادث ہونا ثابت ہوتا ہے اور دلائل قطعیہ اس کی نفی کرتے ہیں۔

جہاں کہیں اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے تو اس سے مراد ایسے امر کا ظاہر ہونا ہے جو خلافِ توقع ہو یا کسی ایسی شے کا واقع ہونا جو کسی کے حاشیۂ خیال میں نہ ہو۔

قرآن کریم میں اس لفظ کا اطلاق جہاں کہیں بھی ہوا ہے اُس کے یہی معنی ہیں اور جس چیز نے لفظ بداء کے اطلاق کو اس معنی میں جائز قرار دیا ہے وہ کتاب اللہ کی سماعی

اس لئے کہ اُس سے اللہ کے علم میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور یہ کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔

اُن اقوال کا جو امام صادق کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو آدمی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بداء کے معنی یہ ہیں کہ وہ دُعا وغیرہ سے اللہ کی تقدیر کو بدل دے۔

چنانچہ کتاب تصحیح الاعتقاد میں مذکور ہے:

"اس بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت مروی ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹے اسماعیل کے بارے میں فرمایا: اسماعیل پر دو مرتبہ قتل واجب ہوا۔ میں نے اللہ سے اُس کی برأت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اُسے بری کر دیا۔"

بعض دفعہ کوئی چیز فرض ہوتی ہے لیکن مشروط پھر اُس کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ثم قضى أجلا وأجل مسمى عنده

یعنی۔ پھر مقرر کر دیا ایک وقت اور ایک مدت مقرر ہے اللہ کے نزدیک۔

یہ روایت جو ابو عبداللہ الصادق کی طرف منسوب ہے صراحت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر لکھ دی ہے اُس میں تبدیلی رونما ہو سکتی ہے لیکن وہ اس روایت کی تاویل کرتے ہیں اور اس کے معنی ظہور کے لیتے ہیں۔

لیکن "الکافی" میں اُس کلام کی صراحت موجود ہے جو بداء کے سلسلے میں امام صادق کی طرف منسوب ہے۔ چنانچہ اُس میں ہے۔

ہشام بن سالم، حفص بن البختری اور اُن کے علاوہ دوسرے راوی ابو عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اس آیت کے بارے میں فرمایا:

يمحو الله ما يشاء و يثبت وعنده ام الكتاب۔

یعنی: "مٹا دیتا ہے جو اللہ چاہے اور باقی رکھتا ہے اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب"

اللہ اسی چیز کو مٹاتا ہے جو ثابت ہو۔

دوسری روایت ہشام بن سالم سے ہے وہ محمد سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابو عبداللہ سے:

اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا یہاں تک کہ اس سے تین باتوں کا عہد نہ لے لیا ہو۔

(۱) اپنی عبودیت کا اقرار۔

(۲) شرک سے بیزاری۔

(۳) اور یہ کہ اللہ جسے چاہے آگے کر دے اور جسے چاہے پیچھے کر دے۔

یونس سے ایک مرفوع روایت ہے کہ ابوعبداللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا۔ یہاں تک کہ اُس سے بداء کا اقرار نہ لے لیا ہو۔

حازم بن حکیم کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا۔

اللہ تعالیٰ کسی کو اس وقت تک خلعت نبوت سے سرفراز نہیں فرماتا۔ جب تک کہ اُس سے پانچ چیزوں کا اقرار نہ لے لے۔

بداء، مشیت، سجدہ، عبودیت، طاعت۔

مالک بن جہنی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوعبدہ کو یہ کہتے ہوئے سُنا۔

"اگر لوگوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ بداء میں کتنا بڑا اجر ہے تو اس پر گفتگو کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔

علم الٰہی کی دو قسمیں ابوبصیر ابوعبداللہ سے بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ علم ہے جو پوشیدہ ہے صرف وہی جانتا ہے اور کسی کو معلوم نہیں اور بداء بھی اس قسم میں ہے۔ اور دوسرا علم وہ ہے جو اس نے فرشتوں، رسولوں اور اپنے نبیوں کو سکھایا اور ہم بھی اُسے جانتے ہیں۔

منصور بن حازم کہتے ہیں میں نے ابوعبداللہ سے دریافت کیا۔

کیا آج کوئی ایسی چیز واقع ہو سکتی ہے جو کل تک اللہ کے علم میں نہ ہو۔

انہوں نے جواب دیا نہیں! جو کہے گا اللہ اسے رسوا کرے گا۔

میں نے عرض کیا، مجھے بتائیے کہ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے وہ اللہ کے علم میں نہیں ہے۔

فرمایا۔ کیوں نہیں، بلکہ مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے [1]

ان تمام روایات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ امام صادقؒ کے نزدیک بداء کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے جو کچھ پوشیدہ رکھا ہے وہ لوگوں کے لئے ظاہر کر دے اور یہ بات اللہ کے علم کے منافی نہیں۔

بداء اور عقیدہ اسلامی حقیقت یہ ہے کہ بداء جب مخلوق کے بارے میں بولا جائے گا تو اس کے

---

[1] المسند ج ۱ ص ۳، طبع بیروت۔

معنی یہی ہوں گے کہ اُن پر کوئی ایسی چیز واقع ہو جائے جس کا انہیں گمان نہ ہو، اس سے عقیدہ اسلامی پر کوئی آنچ نہیں آتی، اور اللہ تعالیٰ کا علم مامون و مصؤن رہتا ہے اور اگر بداء اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تغیر چاہتا ہے اور یہ بات بلا شبہ اللہ کے علم کے منافی ہے، ہم اس باب میں سبقت کرتے ہیں اور اُن تمام روایات کو غلط ٹھہراتے ہیں جو امام صادق کی طرف منسوب ہیں اور جن میں بداء کا مطلب اللہ تعالیٰ کے علم میں تغیر لیا گیا ہے، کیوں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے علم میں نقص واقع ہو گا اور اللہ کی ذات بہت بلند و برتر ہے۔

ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ حضرات امامیہ کا کلام بداء کے ان معنوں میں محصور رہے کہ لوگوں کے لئے وہی چیز ظاہر ہو جس کا انہوں نے گمان نہیں کیا۔

لیکن ان کا یہ قول کہ بداء بھی تکوینی امور کی طرح نسخ ہے جس طرح احکام میں نسخ ہوتا ہے نیز یہ کہ استجابت دُعا کا ذریعہ ہے اور اس سے مقصد بدل جاتا ہے۔

بداء اپنے ظاہر ہی میں منحصر نہیں رہتا کہ جو لوگوں کے لئے ظاہر ہو وہ جانتا ہے پھر مقدر کئے ہوئے کو ایک دوسرے تکوینی امر سے منسوخ کر دیتا ہے۔

اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارادہ متغیر ہو جاتا ہے اور اللہ کے ارادہ کا تغیر ان کے نزدیک جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ان کے نزدیک حادث ہے، ازلی اور قدیم نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ہے وہ چیزوں کو اُن کے وجود سے بھی پہلے جانتا ہے، گزشتہ، آئندہ، ممکن الوجود بھی کچھ اس کے علم میں ہے۔ جب یہ بات طے ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ہے تو وہ لازماً تغیر کے منافی ہو گا۔

ہم یہ بات قطعاً فرض کرنے کے لئے تیار نہیں کہ امام صادق نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تبدیلی جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس بارے میں مروی خبر کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی نسبت امام جعفر صادق کی طرف صحیح نہیں ہے۔

رجعت

عقائد اسلامی کا ایک مہتم بالشان مسئلہ

دو خاص عقیدے

ہمارے برادران اثنا عشریہ امامیہ کے دو خاص عقیدے ہیں:

(۱) بارھویں امام جو اس وقت پردۂ غیب میں ہیں عنقریب ظاہر ہوں گے اور دنیا جو اُس وقت ظلم وستم کا تختۂ مشق بنی ہوگی اس میں عدل وانصاف کا پرچم لہرائیں گے۔

۲۔ ظالم لوگ مظلوموں کو قصاص دینے کے لئے خود حاضر ہوں گے۔

اساسی اور بنیادی فکر

یہاں ہم ان دونوں امور سے متعلق چند اشارات کریں گے اور امام صادق رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کا بھی تجزیہ کریں گے۔

عقیدہ اول کا جہاں تک تعلق ہے، یہ اس جماعت کی اساسی فکر ہے کیوں کہ ان کا ایمان ہے کہ امامت بارہ ائمہ میں منحصر ہے جن کے اسماء یہ ہیں:-

علی کرم اللہ وجہٗ، حسن[2] اور حسین[3] رضی اللہ عنہما، علی زین العابدین[4]، بزرگ محمد باقر[5]، جعفر الصادق[6] رضی اللہ عنہم اجمعین۔

امام صادق کے بعد امامت اثنا عشریہ کی طرف منتقل ہوگئی اور اُن کے امام یہ ہیں:-

موسیٰ الکاظم[7]، علی الرضا[8]، محمد الجواد[9]، علی الہادی[10]، حسن العسکری[11] پھر ان کے بیٹے محمد[12] جو پردۂ غیب میں ہیں اور جن کے لئے دنیا چشم براہ ہے وہ مہدی ہیں جو آخری زمانے میں عدل وانصاف کا دور دورہ کریں گے۔

ہونے والے امام مہدی ۲۵۵ھ میں تولد ہوئے۔ ابھی دو ہی سال کے تھے کہ سایہ پدری سر سے اٹھ گیا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب اُن کے والد کا انتقال ہوا تو اُن کی عمر چار یا پانچ سال کی تھی۔

ایک روایت کے مطابق وہ ابھی آٹھ نو یا دس سال کے تھے کہ والد دنیا سے رخصت فرما گئے اگر آخری روایت کو بھی تسلیم کرلیا جائے تو ان کے والد کا انتقال ۲۶۵ھ میں ہوا۔

عقیدہ مہدی کے بارے میں حضرات شیعہ نے اپنے اپنے فرقوں کے لحاظ سے مختلف آراء ظاہر کی ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ آپ کیسانی تھے۔ کچھ دوسرے ہیں جو امام زید کے بعد آپ ہی کا درجہ مانتے ہیں اور انہیں زیدیہ کہتے ہیں۔

بعض کی آراء میں وہ اسماعیلیہ سے وابستہ تھے، لیکن اُن کے نزدیک شخصیت میں اختلاف تھا یعنی یہ کہ مہدی کون ہے؟

بعض حضرات اہل سنت نے بھی مہدی آخرالزمان کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے بعض اس عقیدہ ہی کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔ بعض نے کتب عقائد سے اس کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ حدیث کی بعض کتب میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے

مثلاً سنن ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

علمائے اہل سنت نے ان روایات پر نقد و جرح کی ہے جو امام مہدی کے بارے میں مروی ہیں۔ اور ان کی اسناد کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ اس بنا پر ہم اسے اہلسنت کا مسلمہ عقیدہ نہیں مانتے۔

رہے حضرات شیعہ تو اُن کے ہاں یہ عقیدہ مسلم ہے البتہ زیدیہ کی اکثریت اس کی قائل نہیں۔

حضرات اثناعشریہ نے مہدی یا امام غائب کے بارے میں گفتگو کو امام صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

چنانچہ کلینی "الکافی" میں امام موصوف سے روایت کرتے ہیں کہ امام صاحب نے فرمایا:

"میں نے آج صبح کتاب جفر میں دیکھا جسے اللہ نے محمد اور اُن کے بعد آنے والے ائمہ کے لئے مخصوص کیا ہے اور اس میں امام مہدی کی جائے پیدائش، عمر اور اُس دور کی خانہ جنگی کا بغور مطالعہ کیا، نیز لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا اپنے دین سے ارتداد اور اپنی گردنوں سے اسلام کے حلقے کو اتار دینا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے و لکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ یعنی ولایت ہم نے عرض کیا اے ابن رسول اللہ جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے ہمیں بھی مشرف فرمائیے۔

مسئلہ رجعت اور امام صادق

اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرات امامیہ امام مہدی کے بارے میں اپنی آراء کو بواسطہ کلینی امام صادق رض کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بات اُن کے ہاں مشہور و معروف ہے ہم اس پر تنقید کر کے الجھنا نہیں چاہتے اس لئے کہ امامت کے بارے میں یہی چیز مذہب اثناعشریہ کا خلاصہ ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات عرض کرنے میں تامل نہیں کہ ہم اس عقیدہ کے حامل نہیں اور نہ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ امام صادق

اس کے قائل تھے۔

اب ہم مسئلہ رجعت کو لیتے ہیں اور یہ دوسرا عقیدہ ہے۔ رجعت کا اطلاق امام مہدی کے مبعوث ہونے پر نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ تو زندہ ہیں اور لوگ اُن کے منتظر ہیں البتہ رجعت کے یہ معنی ہوں گے کہ اس دنیا میں مرنے والے دوبارہ زندگی حاصل کریں اور اپنی پہلی شکل میں لوٹ آئیں جو موت سے پہلے تھی۔ اللہ تعالیٰ بعض کو عزت و سرخروئی سے سرفراز فرمائے گا جب کہ دوسرے کو ذلیل و خوار کرے گا۔ باطل کے مقابلے میں اہل حق کی مدد فرمائے گا اور ظالمین کے خلاف اس کی نصرت و تائید مظلومین کے ساتھ ہوگی۔

یہ تمام چیزیں آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مہدی امت کے زمانے کے قریب قریب ہوں گی اس حیثیت سے دنیا کی طرف پلٹنے والوں کی دو قسمیں ہو جائیں گی۔

(۱) وہ جو ایمان اور اعمال صالحہ کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ظلم سے کلی اجتناب کرتے ہیں، اللہ انہیں حق کی دولت عطا کرے گا اور اسی کے ساتھ وہ عزت حاصل کریں گے، یہ لوگ بلند درجات کے مالک ہوں گے

(۲) وہ جنہوں نے اس دنیا کو فساد سے بھرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اہل حق کی مخالفت کی، اولیاء اللہ پر مظالم ڈھائے اللہ تعالیٰ کے سامنے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی موت سے پہلے ہی مظلومین کو حق دلوائے گا اور ان کے غصے کو فرو کرے گا، پھر یہ مرنے اور دوبارہ اٹھنے تک دو گروہوں میں بٹ جائیں گے اور ثواب یا عذاب جس کے بھی وہ مستحق ہوں گے انہیں ملے گا اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رجعت کا یہ نقطہ نظر حضرات اثنا عشریہ کے نزدیک متفق علیہ امر نہیں بلکہ ان میں ایک فریق ایسا موجود ہے۔ جو اس پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ اسی لئے الشیخ المفید نے فرمایا ہے قرآن نے اسے صحیح کہا۔ احادیث نے اس کی تائید کی اور امامیہ کا اس پر اجماع ہے۔ صرف چند نفوس ایسے ہیں جو صرف ہماری مخالفت کی وجہ سے اس بارے میں وارد شدہ امور کی تاویل کرتے ہیں۔

اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ امامیہ میں ایسے بھی ہیں جو رجعت کا انکار کرتے ہیں اور الشیخ المفید کا دعویٰ ہے کہ وہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ کیوں کہ وہ اس نقطہ نظر کا قلع قمع کرنے میں متشدد ہیں۔ لیکن ظاہر یہی ہوتا ہے کہ وہ زیادہ ہیں کم نہیں، جیسا کہ عبارت سے پتہ چلتا ہے۔ کیوں کہ اکثر مورخین کی رائے یہ ہے کہ جو لوگ صلحا و اخیار کی رجعت کے قائل نہیں۔ وہ اثنا عشریہ

بی کی ایک جماعت ہیں، اور اس بارے میں اُن کے مابین اختلاف نہیں الشیخ المفید نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ قرآنی آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے۔

ان الذی فرض علیك القرآن لراٰدّك الی معاد

یعنی جس نے حکم بھیجا تجھ قرآن کا وہ پھیرلانے والا ہے تجھ کو پہلی جگہ۔

انہوں نے اس آیت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رجعت کا استدلال کیا ہے۔ بعض نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

واذا وقع القول علیهم اخرجنا لهم دابةً من الارض تکلمهم ان الناس کانوا بآیاتنا لا یوقنون۔ (۸۲۔النحل)

یعنی" اور جب پڑ چکے گی اُن پر بات نکالیں گے ہم ان کے آگے ایک جانور زمین سے اُن سے باتیں کرے گا اس واسطے کہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں کرتے تھے"

جابر الجعفی نے اس آیت سے امام کی رجعت کا استدلال کیا ہے۔

اسی طرح آل محمد میں سے بعض ائمہ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔

اصفہانی صاحب اغانی نے اس باب میں تذکرہ کیا ہے کہ سید الحمیری شاعر رجعت پر ایمان رکھتا تھا۔ ایک شخص نے اس سے کہا میں نے سنا ہے کہ تو رجعت کو مانتا ہے اس نے جواب دیا جس نے تجھے بتایا ہے اس نے ٹھیک کہا، یہی میرا مذہب ہے۔

پھر اس نے کہا کیا آپ مجھے ایک دینار دیں گے کہ میں سو دینار لوٹا دوں؟ کہا اس سے بھی زیادہ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ انسان ہی بن کر لوٹے گا۔

اس نے کہا اس کے علاوہ ہیں اور کیا بن سکتا ہوں؟

جواب دیا کہ مجھے ڈر ہے کہ تو کتے یا خنزیر کا روپ دھار کر نہ آ جائے اور میرا مال لے جائے۔

تناسخ ارواح اور رجعت یہی چیز ہے جس نے تناسخ ارواح اور مذہب رجعت کو گڈمڈ کر دیا ہے میں کہتا ہوں ہمارا میلان تو اثنا عشریہ میں سے اسی فریق کی طرف ہے جو رجعت کا قائل نہیں اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ یہی لوگ امام صادق کے ہم مذہب ہیں۔

تقیہ

کب اور کن حالات میں تقیہ جائز ہے؟

ایک مذہبی مصلحت تقیے کی تعریف یہ ہے کہ انسان اپنے اعتقاد کو دکھ اور اذیت سے بچنے کے لیے چھپائے۔

علامہ مظفری اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"تقیہ وقایہ سے ہے، وہ ایک ڈھال ہے جس سے خطرات اور اندیشوں سے بچا جاتا ہے

اثبات تقیہ کی بنیاد اثبات تقیہ کی بنیاد اس پر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ مسلمان جب کمزور رہیں تو وہ اعداء کی دوستی کا دم بھر سکتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ شیء الا ان تتقوا منھم تقاۃ و یحذرکم اللہ نفسہ۔

یعنی نہ بنادیں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر اور جو کوئی یہ کام کرے تو نہیں اُس کو اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ کرنا چاہو تو تم اُن سے بچاؤ۔ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنے سے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امر کی بھی اجازت دی ہے کہ جب کوئی شخص کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کردیا جائے تو وہ ایسا کرسکتا ہے جب کہ اُسے اپنی جان کا خطرہ ہو۔

چنانچہ فرمایا: "الامن اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان"

یعنی مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اُس کا دل برقرار رہے ایمان پر۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آل یاسر کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ کلمۂ کفر کہہ سکتے ہیں جب کہ اُن کے دل ایمان پر راضی ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کیا گیا کہ دو شخصوں کو تلوار کے سایے کے نیچے کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کردیا گیا، ایک نے کہہ دیا لیکن دوسرا رک گیا۔ چنانچہ اُسے قتل کردیا گیا۔ آپ نے پہلے کو معذور گردانا

اور دوسرے کے لیے فرمایا کہ اُسے اجر ملے گا۔

حضرات شیعہ سلطنت امویہ کے وقت سے مصائب و آلام کا شکار رہے۔ ائمہ آل بیت پر ہر قسم کے مظالم توڑے گئے۔ اُن میں سے جس نے بھی حق کی دعوت دی تلواروں نے بادل بن کر ان کا استقبال کیا، اگر تقیہ نہ ہوتا تو اُن کے لئے کوئی وجہ جواز نہ تھی کہ وہ مظالم امویہ کے خلاف سکوت اختیار کرتے جس تکلیف سے وہ دوچار تھے۔ اُسی نے انہیں تقیے کی راہ دکھائی۔ فتنوں کے خلاف خروج بہت سے مفاسد کا حامل ہے کہ پھر سرکشی کا دور دورہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرات شیعہ نے عام مسلمانوں سے پہلے تقیہ کو اختیار کیا۔

ان کا یہ قول بھی ہے کہ حضرات ائمہ نے نہ صرف اس کی اجازت دی ہے بلکہ ترغیب بھی دی ہے۔ یہی چیز انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی ہے۔

طبری کی روایت ہے کہ حضرت علی نے فرمایا۔

"میں تجھے دینی معاملات میں تقیہ کو اپنانے کا حکم دیتا ہوں، اس سے ہمارے اولیاء کی شہرت کو بچانا۔ کیوں کہ یہ بات اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ تو موت کے منہ میں چلا جائے اور دین کے کاموں اور اپنے مسلمان بھائیوں کی اصلاح سے منقطع ہو جائے۔ دیکھنا! اس تقیہ کو نہ چھوڑنا جس کا میں حکم دے رہا ہوں، اس طرح تو اپنی اور اپنے بھائیوں کی جان کھو بیٹھے گا۔"

بلکہ انہوں نے اس بات کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت علیؓ کا خلفائے ثلاثہ کے ادوار خلافت میں سکوت اختیار کرنا اور خلافت کا مطالبہ نہ کرنا بھی تقیہ کے قبیل سے تھا۔

کیونکہ انھیں حامی و مددگار میسر نہ تھے اگر انہیں حسبِ منشا، چالیس نفوس بھی مل جاتے تو وہ عَلم بغاوت بلند کر دیتے اور موقع نہ کھوتے۔

ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ حضرت علیؓ کا عہد خلفائے راشدین میں سکوت اختیار کرنا، تقیہ تھا، بلکہ ہم آپ کی اور دوسرے خلفاء کی زندگی میں یگانگت و یک جہتی پاتے ہیں۔

جب انصار و اعوان تو وہ عہد عثمانؓ میں ہزاروں کی تعداد تک پہنچ گئے تھے، لیکن اس کے باوجود حضرت علیؓ آپ کے ساتھ مکمل تعاون اور خیر خواہی کرتے رہے۔

نہ صرف آپ نے اُن کے خروج کو پسند نہیں کیا بلکہ آپ نے حسینؓ کو ان کی مدافعت اور محاصرین کو پسپا کرنے کے لیے بھیجا۔

امام صادق سے مرویات امام صادق سے بہت سی روایت مروی ہیں جن میں انھوں نے تقیہ کی دعوت و ترغیب دی ہے چنانچہ آپ سے روایت ہے :۔

تقیہ میرا اور میرے آباء کا مذہب ہے جو تقیہ کا قائل نہیں اُس کے دین کا کوئی اعتبار نہیں، نیز ہماری اس بات کی تشہیر کرنے والا ایسا ہی ہے جیسا اس کا انکار کرنے والا!

آپ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے رفقا سے فرمارہے تھے "ہمارے اس معاملہ کی تشہیر نہ کرتے پھرو، خصوصاً کسی نااہل سے اس کا تذکرہ تک مت کرو، جو ہمارے راز کی تشہیر کرتا ہے وہ ہمارے دشمن سے بھی بدتر ہے۔ اس سے رک جاؤ، اللہ تم پر رحم فرمائے گا، پھر دیکھو! اس راز کی تشہیر نہ کرتے پھرنا۔

آپ سے یہ الفاظ بھی مروی ہیں" ہمارے ظلم کی وجہ سے کسی مظلوم کا سانس لینا ایسا ہی ہے جیسے وہ تسبیح کررہا ہو، اس کا ہمارے لئے غم کرنا عبادت ہے، اور ہمارے اس راز کو سربستہ رکھنا اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

اسی طرح تقیہ کے بارے میں صادق رضی اللہ عنہ سے بہت سی روایات مروی ہیں اگر ان کی صحت مان بھی لی جائے تو پھر ان کی تشریح کی ضرورت ہے۔ میرے دین اور میرے باپ دادا کے دین کے معنی، ہمارا مبداء اور ہمارے آباؤ اجداد کا مبداء ہے۔

ہم نے اس دین کو اس لیے اپنایا ہے کہ ہم حکام وقت میں جو برائی کھلم کھلا دیکھیں، اس کے اظہار سے باز رہیں، تاکہ فتنہ وفساد کا باب نہ کھلے۔ جب تک کہ نفوس نصرت کے لئے آمادہ نہ ہوں۔

تقیہ کی دو قسمیں اس تمام بحث سے یہ بات آسانی سے اخذ کی جاسکتی ہے کہ تقیہ جس کے داعی امام صادق رضی اللہ عنہ تھے، دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے :۔

(۱) ان خطرات اور اذیتوں کو دور کرنا جو مومن کو بغیر کسی قوت مدافعت کے پیش آتی ہیں :۔
اور اسی سے جہاد اور تقیہ کی سرحدیں ملتی ہیں۔

جہاد اعدائے اسلام کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ نصرت اسلام کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن اس وقت کیل کانٹے سے پوری طرح تیاری ہو، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد کیا جب اسلام کو شوکت وغلبہ حاصل ہو گیا۔

تقیہ وہیں ہوتا ہے جہاں مومن دو دولتوں کے درمیان ہو کیوں کہ اس وقت خروج کے فوائد کم

اور نقصانات زیادہ ہوں گے جن سے حق بلند اور باطل سرنگوں نہیں ہوگا۔ فتنہ وفساد ہوگا ظلم اور شر پھیلے گا۔ ظالم کے پنجے مضبوط ہوں گے۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جہاد کا ایک موقع ہوتا ہے اس طرح تقیہ کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور ان دونوں۔ جہاد اور تقیہ۔ کا مقصد حمایت حق ہے۔

اعلان حق کی صورت میں اگر باطل کی سربلندی کا اندیشہ ہو تو تقیہ جائز ہے، جیسا کہ امام صادق کی نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں تھی بمقتل حسین رضی اللہ عنہ اور مقتل زید رضی اللہ عنہ محمد نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کے مقتل سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی تھی۔

حسب موقع اور حسب مصلحت

بلاشبہ امام جعفر صادق کے عہد میں اور بعد کے زمانے میں تقیہ ایک حسب مصلحت اور حسب موقع چیز تھی۔ اس میں اسلام کی بھی مصلحت تھی، کیوں کہ وہ فتن مستمرہ کا مانع ہے، اس کا موضوع ہے اعلان تشیع پس تقیہ کا مطلب یہ ہوا کہ ایک شیعہ اپنی شیعیت کا اعلان واظہار نہ کرے۔ اپنے اعمال وافعال سے یہ ثابت نہ ہونے دے کہ آل علی سے وہ موالات ولایت رکھتا ہے یعنی ان کی حکومت اور اقتدار تسلیم کرتا ہے ورنہ جہاں تک موالات محبت کا تعلق تھا اس کے لئے تقیہ کی ضرورت نہ تھی، نہ لوگ اس سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ مشہور شعراء اور علماء نے آل بیت سے محبت وعظمت کا اظہار کیا ہے، البتہ ان کی حکومت اور اقتدار کو تسلیم کرنے کا اعلان نہیں کیا ہے، جیسے شاعر فرزوق نے آل بیت سے اپنے اشعار میں محبت کا اظہار کیا یا مشہور شاعر کثیر عزہ نے اپنے شعروں میں اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی محبت کا اعلان کیا یا جس طرح امام ابوحنیفہ نے امام زید کے لئے اپنی عقیدت والفت کا والہانہ اظہار کیا اور امام باقر اور امام جعفر صادق سے برملا شیفتگی اور عقیدت کا اظہار فرمایا۔

قابل غور بات

اس جگہ ہم بعض امور کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، امام جعفر صادق سے متعلق جو روایتیں مروی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خفیہ خفیہ لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ ہم نہیں جانتے یہ دعوت کیا تھی؟ لیکن ظاہر ہے یہ ولایت اور حکومت ہی کی طرف دعوت ہوگی لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت ایسا نہیں ہے جس سے ثابت ہوسکے کہ انہوں نے حکومت کی خواہش کی تھی، ہاں یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ اموی فرماں رواؤں اور حاکموں کی جفاکاریوں اور سیتموں کو دیکھ کر وہ کڑھتے ہوں اور اپنے اتباع کے سامنے اپنے

دلی خیالات ظاہر کر دیتے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ انہیں منع کر دیتے ہوں کہ ان خیالات کا افشا نہ کریں تاکہ فتنے نہ اُبھریں، جفا کاری کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے۔

"تقیہ درحقیقت مظلوموں کا آسرا اور سہارا ہے جب ظلم و جور کو دور کرنے کی سکت نہ ہو اور ایمان اس کا ساتھ دینے سے بھی انکار کر رہا ہو تو آدمی کے لئے صرف ایک ہی چارہ کار رہ جاتا ہے!

تقیہ :-

یہ خیال کہ تقیہ صرف امامیہ کے ہاں جائز اور مباح ہے یکسر غلط ہے!

یہ دوسرے فرق اسلامیہ میں بھی حسبِ ضرورت و مصلحت اسی طرح جائز اور مباح ہے جس طرح امامیہ کے ہاں!

علم طبیعیہ اور کونیہ

امام صادق کی دست گاہ علوم مختلفہ و کثیرہ ہیں

طب اور دیگر علوم

علماء کا بیان ہے کہ امام صادق رضی اللہ عنہ علوم کثیرہ میں دستگاہ رکھتے تھے ان کے ارشادات صرف علوم اسلامیہ ہی تک محدود نہیں ہیں، نہ متعلقات اسلامیہ تک منصور ہیں، بلکہ طب اور علوم طبیعیہ میں بھی انہیں ید طولیٰ حاصل تھا، بعض امامی حضرات نے فن طب پر اور اس کے متعلقہ علوم پر امام صاحب کی کتابوں کا ذکر کیا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے، لیکن ہم اس دعوے کی تردید بھی نہیں کر سکتے، بلکہ اس کے اعتراف پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام صادق کے لئے یہ بات وجہ اختصاص نہیں تھی کہ وہ فن کیمیا میں ماہر تھے یا طبیعیات اور فن طب میں دستِ گاہ کامل رکھتے تھے۔ ان کا مقام کبریٰ یہ ہے کہ وہ ائمہ اسلام میں نمایاں اور یکتا خصوصیات اور کمالات کے حامل تھے اور اپنے وقت میں علوم اسلامیہ کے اندر وہ مرتبۂ امامت پر فائز تھے جن کے آستانے پر لوگ حاضر ہونے اور کسبِ فیض کرتے تھے دور دور سے لوگ سفر کر کے اس مقصد کے لئے حاضر ہوتے تھے۔

علم کونیات میں امام صاحب کی دسترس قدیم و جدید محققین کے لئے سرمایہ تلاش و تفحص بنی رہی ہے۔ چنانچہ امام صاحب کے تلمیذ جابر بن حیان کے رسائل کے بارے میں خاص طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ تمام تر آپ ہی کے نتائج فکر کا نتیجہ تھے۔

ان رسائل کی نسبت جابر کی طرف یا امام صاحب کی طرف تحقیق طلب ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر اختصار کے ساتھ ہم گفتگو کریں گے۔

ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں کہا ہے کہ جابر بن حیان کے پانچسو رسالے اس موضوع پر تھے جو امام صادق رضی اللہ عنہ کے علم سے ماخوذ تھے۔

جرمنی میں ایسے کچھ رسالے پائے گئے ہیں جو جابر کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور اس بات

پر تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ مسلمانوں میں جابر پہلے شخص ہیں جنہوں نے کیمیا کے فن پر خصوصی توجہ مبذول کی، یا کم ازکم ان پہلے لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس طرف عنان توجہ مبذول کی، چنانچہ کتب تاریخ علوم اسلامیہ میں اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے:

ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں لکھا ہے:

"جابر بن حیان کے بارے میں لوگوں کا اختلاف رائے ہے۔ حضرات شیعہ انہیں اپنے کبار رجال میں شمار کرتے ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ جابر امام صادق رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے اور کوفے کے باشندے تھے[1]"

ابوریحان البیرونی نے بھی جابر بن حیان کو کیمیا اور طبیعیات کا ماہر تسلیم کیا ہے، اگرچہ ان کا اور امام صادق کا صلہ اور تعلق ذکر نہیں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

جابر بن حیان نے اپنی کتاب الرحمۃ میں لکھا ہے کہ ہمارے پاس ایک مقناطیس کا ٹکڑا تھا جو سو درہم کے برابر لوہے کا بوجھ اٹھالیتا تھا، لیکن اب کچھ عرصے کے بعد سو کے بجائے اسی درہم کے برابر لوہے کا بوجھ اٹھانے لگا، حالانکہ خود اس کا وزن جوں کا توں تھا اس میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، البتہ اس کی قوت کمزور پڑ گئی تھی[2]

مسلمان مورخین کا اتفاق خیال ان تصریحات سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمان مورخین دو حقیقتوں پر متفق ہیں۔

(۱) "یہ کہ جابر بن حیان کیمیا اور طبیعیات سے غیر معمولی دلچسپی اور شغف رکھتے تھے۔

(۲) یہ کہ جابر بن حیان کا امام جعفر صادق سے گہرا ربط و تعلق تھا، وہ ان کے شاگرد تھے اور آل بیت کے شیعہ تھے۔"

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ جابر بن حیان معتدل قسم کے اسماعیلی تھے، اثنا عشری نہیں تھے۔

علماء شرق و غرب کا اس پر اتفاق ہے کہ جابر بن حیان کی طرف منسوب رسائل علم کیمیا، طبیعیات جو پائے جاتے ہیں، علماء شرق اس نسبت کی تکذیب نہیں کرتے نہ ظنون و شبہات کی وادی میں بھٹکتے ہیں لیکن علماء غرب شک و اشتباہ کے دائرے میں محصور ہیں ان میں سے اکثر نے ان رسائل کی جابر کی طرف نسبت تسلیم نہیں کی ہے، وہ انہیں الحاقی اور جعلی قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ دوسری

---

[1] الفہرست ج ۱ ص ۳۵۴ [2] الجماہر فی معرفۃ الجواہر طبع حیدرآباد ۱۳۵۵ھ

صدی ہجری میں نہیں لکھے گئے ، تو جابر کی کتابوں میں ان کا شمار کرتے ہیں ، بلکہ انہیں مجہول النسبت چھوڑ دیتے ہیں۔

بہرحال بات کوئی بھی ہو ، یہ رسالے ایک ہی شخص کا کلام معلوم ہوتے ہیں ان میں وحدت فکر موجود ہے ، مشہور مستشرق کراؤس نے ان کے بارے میں لکھا ہے :-

جابر کے رسائل میں ایک طرح کی وحدت پائی جاتی ہے جو الگ نہیں کی جا سکتی۔ اسی لئے یہ بات نا قابل قبول ہے کہ ان میں سے کوئی بھی جعلی یا الحاقی ہے ![1]

ہمیں مستشرق کراؤس کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے ، البتہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ان رسائل میں سے ایک رسالے کا بطلان بھی ثابت ہو جائے تو یہی حکم جملہ رسائل پر صادق آئے گا ، ہو سکتا ہے کچھ الحاقی ہوں اور لکھنے والے نے حکایت و تقلید میں نقل کو اصل کر دکھایا ہو ، اور امام صادق کی تحریر یا بیان کا پورا چربہ اتار لیا ہو۔

اب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ ان رسالوں سے امام صاحب کا تعلق کس حد تک ہے ! ہم دیکھتے ہیں کہ جابر نے ان رسائل میں امام صاحب کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے جن سے ان کے اور امام صاحب کے ذاتی روابط اور تعلقات پر گہری روشنی پڑتی ہے اور یہ کہ ان کے رسائل کی تسوید و تحریر اور مضمون و موضوع سے امام صاحب برابر آگاہ رہے ہیں ، بلکہ بعض میں تو یہ اشارہ ملتا ہے کہ جابر نے انہیں امام صاحب کو سنایا ، وہ اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں کہ میرے سردار (امام صادق) نے میرے اس کام پر سرزنش کی ! پھر آگے چل کر کہتے ہیں :

"میرے سردار (امام صادق) نے فرمایا :

"اے جابر ؟

"میں نے عرض کیا" !

"لبیک یا سیدی !"

آپ نے فرمایا :

"یہ کتابیں جو تو نے لکھی ہیں ، جن میں فصلیں قائم کی ہیں مذاہب مختلفہ اور اسرار خاص کا ذکر کیا ہے ، ابواب قائم کئے ہیں اور ہر کتاب کو درجہ خاص پر پہنچا دیا ہے لیکن یہ بات بعید از کار

---

[1] الامام الصادق ملہم الکیمیا (ڈاکٹر محمد یحییٰ الہاشمی)

ہے کہ "واصل" کے سوا ان سے کوئی اور فائدہ حاصل کر سکے۔ اور "واصل" کو تیری ان کتابوں کی حاجت نہیں، میں خود بھی معادن اور عقاقیر وغیرہ پر بہت سی کتابیں لکھ چکا ہوں جنہوں نے طلاب کو سرگشتہ کر دیا، وہ مال گنوا بیٹھے، یہ سب کچھ مجھ سے پہلے کی باتیں ہیں اور اب اے جابر میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں اور ان کی رہنمائی عمل قریب کی جانب کرتا ہوں، جو سہل اور واضح ہوتا ہے
"میں نے عرض کیا یا سید فرمائیے، آپ کس باب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟"
فرمایا: "تو نے کوئی باب بھی ایسا نہیں لکھا ہے جو مرموز نہ ہو، تیری ساری کتابوں کا یہی حال ہے ان میں "واصل" کے سوا کوئی بہرہ مند نہیں ہو سکتا اور "واصل" ان سے مستغنی ہے، لیکن اے جابر! ایسی کتاب لکھ جو بلا رمز کے ہو اور مختصر ہو، جب یہ کر لے تب میرے سامنے پیش کرنا"
میں نے عرض کیا بسر و چشم!

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صادق نے جابر بن حیان کو اس بات کی ترغیب دی کہ تحریر میں تسہیل و توضیح کا رنگ اختیار کریں، مرموز باتوں کے کہنے سے منع کیا اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ اس ہدایت کے بعد جابر نے اس پر عمل کیا، انہوں نے تکوین کی بحث وضاحت کے ساتھ کی ہے اور امام صاحب کی ہدایت اور رہنمائی سے مستفید ہونے کا کتاب الاحجار میں اعتراف بھی کیا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جابر کے اکثر رسائل کا آغاز امام جعفر صادق کے ذکر اور توجیہات و ہدایات سے ہوا ہے[1] اور متعدد مقامات پر ان کے ذکر سے برأت حاصل کی ہے۔

رسائل جابر بن حیان

بہرحال ان رسائل سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہیں۔
(۱) یہ رسائل جابر بن حیان کی تالیف ہیں۔
ان رسائل سے امام صادق واقف تھے، یہ جن مضامین پر مشتمل ہیں ان کے بارے میں وہ ہدایت اور رہنمائی بھی فرمایا کرتے تھے۔ یہ رسالے امام صاحب کے املا کرائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ تمام تر جابر کے لکھے ہوئے ہیں۔ البتہ جابر موافقت امام کے بوقت تالیف و تحریر جو یار ہتے تھے اور وہ ان کے ارشادات سے برکت حاصل کیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ امام صاحب کو یہ معلومات بطریق الہام حاصل ہوتی ہیں۔

---

[1] یہ معلومات الامام الصادق ملہم الکیمیا سے ماخوذ ہیں۔

یہ عام مباحث جو علمی، فکری اور تحقیقی موضوعات پر مشتمل تھے اب پایہ اختتام کو پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مباحث اور موضوعات زیرِ بحث آ رہے ہیں جو اپنی افادیت، عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں!

یہ مباحث مسائل تفقہ اور اجتہاد سے متعلق ہیں!

درحقیقت اسلامی فقہ کسی ایک علم کا نام نہیں یہ مجموعہ علوم ہے، یہ مجموعہ علوم کثیرہ ہے!

اور اس علم کا سرچشمہ بیت علیؑ ہے۔ یہیں سے فقہ کے ابواب کھلتے اور عوام کو اجتہاد کے ذریعے ان مسائل سے روشناس کیا گیا جنہوں نے ان کی مشکلیں آسان کر دیں!

تفقہ اور اجتہاد

امام جعفر صادق کے خصوصیات فکر و نظر

ظاہر ہے اگر جابر کو امام صاحب کی خدمت میں شرف قربت و اتصال نہ حاصل ہوتا تو وہ ان کی ہدایت اور رہنمائی کیوں فرمایا کرتے۔

(۲) امام صادق علوم کونیہ و طبیعیہ پر دستگاہ کامل رکھتے تھے کبھی وہ ان کے صدق کا حکم لگاتے تھے کبھی غموض کا اور بلاشبہ یہ ایک ایسے عارف کا تصرف ہے جو موضوع پر اچھی طرح حاوی ہے نہ کہ ایک جاہل کا۔

(۳) جابر نے یہ علوم بہ طریق ترجمہ یونانی اور ہندی زبانوں سے حاصل کئے تھے ان کی عبارات و اصطلاحات طبیعیہ وہی ہیں جو فلاسفہ مسلمین کے قلم پر ترجمۂ فلسفۂ یونانی و ہندی کے بعد جاری ہوئے ان میں کبھی کبھی ایسی باتیں بھی ملیں گی جو طیور اور حیوانات کی زبان سے کہلائی گئی ہیں جو کتاب کلیلہ ودمنہ میں موجود ہیں، علاوہ ازیں فارسی افکار کی آمیزش بھی ان کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ ان عبارتوں میں ہندو فلسفہ کی آمیزش بھی ان کتابوں میں نظر آتی ہے چنانچہ کتاب "الحاصل" میں ہے:

"عالم میں کوئی ایک چیز نہیں ہے وہ تو مجموعہ اشیاء ہے"

یہ جملہ فلسفۂ ہندیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی بنیاد وحدت الوجود ہے اور جو تصرف کے انتشار و تشہیر کے زمانے میں صوفیہ کے ہاں رائج ہو گیا۔

آخر میں ہم کہنا چاہتے ہیں کہ یہ رسائل جو جابر بن حیان کی طرف منسوب ہیں ان کی صحت نسبت کے بارے میں علمائے اسلام متفق ہیں۔ ان کی تدوین جابر ہی نے کی ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی شک و شبہ سے بالا ہے کہ وہ امام جعفر صادق سے غیر معمولی ربط و تعلق رکھتے تھے اور یہ اتصال مرید اور مرشد کا تھا وہ امام صاحب کی قدسیت اور ان کے قول و توجیہہ کی قدسیت پر اعتقاد رکھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ اسی قدسیت کے طفیل کتابت و ترجمے کا کام الہامی طور پر انجام پایا، اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ان رسائل کو امام صاحب کی طرف منسوب کیا اور چونکہ امام جعفر صادق کی نسبت نبوت حاصل تھی لہٰذا انہیں علم نبوی سے بھی نسبت حاصل تھی

فقہ صادق

امام جعفر صادق کے خصوصیات و ممیزات فقہ

سب سے بڑے فقیہ بلاشک و ریب یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ امام جعفر صادق اپنے عہد کے سب سے بڑے فقیہ تھے اس کی شہادت امام ابو حنیفہ نے بھی دی ہے، جن کے بارے میں امام شافعی کا قول ہے:

"فقہ میں لوگ ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے عیال ہیں امام صادق فن فقہ کے ساتھ ساتھ علوم حدیث میں بھی یکتا اور یگانہ تھے، علماء سنت کے بلند پایہ محدثوں نے ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا، ان کے ہم عصر فقہا اور محدثین نے ان سے روایت کی، امام صادق سے سفیان بن عُیَیْنَہ نے اور ان سے سفیان ثوری نے روایت کی ہے. نیز مالک، ابو حنیفہ، یحییٰ بن سعید انصاری اور دوسرے بہت سے اکابر نے ان سے روایت کی ہے.

اصحاب سنن کی ایک بڑی جماعت نے امام صادق سے روایت کی ہے. مثلاً ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، نیز مسلم۔

اہل حدیث کے ہاں امام موصوف کو ثقاہت میں شمار کیا جاتا تھا. ابن حبان ان کے بارے میں کہتے ہیں.

"امام جعفر صادق سادات اہل بیت میں سے تھے، جو اپنے علم اور فقہ میں یکتا تھے ان کی حدیث سے حجت لائی جاتی ہے"۔ ساجی نے ان کے بارے میں کہا ہے:۔

امام جعفر صادق، مامون اور صدوق تھے اگر ان سے روایت کرنے والے ثقہ ہوں تو وہ حدیث مستقیم مانی جائے گی"۔

امام بخاری اور امام جعفر صادق کہتے ہیں کہ بخاری امام صادق کی طرف منسوب احادیث قبول نہیں کرتے تھے لیکن یہ دعویٰ محل نظر ہے. یہ کس طرح ممکن ہے

کہ امام بخاری جیسا شخص ایسی ہستی کے روایات کو جسے سلمان "الصادق" کے لقب سے یاد کرتے ہیں ، محل کلام و نظر قرار دے، بات یہ ہے کہ بخاری امام صاحب کے صدق روایت میں تو کسی طرح کے شک و شبہ کی جہات نہیں کر سکتے لیکن ان کے نزدیک موضع شک وہ سند ہے جو امام صاحب تک پہنچتی ہے، یعنی راویوں کا وہ سلسلہ جو امام صاحب سے روایت کرتا ہے، اس کے بعض افراد ان کی نظر میں مجروح ہیں دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ امام صاحب کی روایت میں وہ کوئی نقص نہیں پاتے، نقص اس راستے میں پاتے ہیں جو ان کی طرف پہنچتا ہے۔

اور اس کی معقول وجہ بھی ہے :

امام صاحب کے عہد میں ان کے بارے میں اکاذیب کا سلسلہ چل پڑا تھا لوگ ان کی ذات سے طرح طرح کے خیالات منسوب کرتے تھے اور ان کی تردید بار بار آپ کو کرنا پڑتی تھی، اس طرح کی چیزیں آپ کی وفات کے بعد بھی باقی رہ گئیں، لہٰذا ان سے اور آل اکرمین سے جو لوگ روایت کرتے تھے ان کی بہت زیادہ چھان بین کی اور روایت قبول کرنے میں احتیاط کی ضرورت تھی، بخاری ان لوگوں میں تھے جنہوں نے غایت احتیاط میں آپ سے مروی روایتوں کو قبول کرنا ہی چھوڑ دیا، کیوں کہ جو راستہ امام صاحب تک پہنچتا تھا وہ پتھروں اور روڑوں سے بھرا ہوا تھا جس پر روز روشن میں بھی رہروی کرنا دشوار ہے۔

لیکن فقہا اور محدثین میں سے جن لوگوں نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور براہ راست آپ سے شرف ملاقات حاصل کیا انہوں نے بے تامل آپ کی روایتیں قبول کیں اور آپ کی فقہ سے استفادہ کیا۔

ذیل میں ہم بعض احکام فقہیہ سے متعلق امام ابوحنیفہ کی روایت درج کرتے ہیں جسے ابویوسف نے کتاب الآثار میں نقل کیا ہے

"یوسف اپنے والد سے اور وہ ابوحنیفہ سے اور وہ جعفر بن محمد سے اور وہ سعید بن جبیر سے اور وہ عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی آیا، اس نے کہا۔

میں نے طواف کے سوا حج کے تمام مناسک ادا کر لئے تھے کہ اپنی بیوی سے مباشرت کر لی۔

یہ سنکر فرمایا:

"جو مناسک باقی رہ گئے ہیں انہیں پورا کرے قربانی کرے اگلے سال کا حج تجھ پر واجب ہے۔[1]"

---

[1] کتاب الآثار ص ۱۲۴

مذکورہ بالا واقعے سے تین امور پر روشنی پڑتی ہے:۔

(۱) امام صادق اپنے عہد سے منقطع نہیں تھے اور کبار تابعین سے روایت کیا کرتے تھے۔ یہ سند شک وشبہ سے بالا ہے، اس کے ایک راوی امام ابوحنیفہ ہیں اور ظاہر ہے ان کے بارے میں غلط گوئی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا، خاص طور پر امام صادق کی طرف تو وہ غلط بات کی نسبت کسی حالت میں نہیں کر سکتے۔ ان کا شمار ثقات میں ہوتا ہے جو ان کی روایت میں شک کرے وہ خود کاذب اور دروغ گو ہے اس کا قول مسائل دین اور فقہ میں قابل قبول نہیں ہے

(۲) امام صادق رضی اللہ عنہ علم اہل مدینہ، حضرات مدینہ سے حاصل کیا کرتے تھے، کیوں کہ فقہ ابن عمر کا شمار فقہ اہل مدینہ میں ہوتا ہے اور امام ابوحنیفہ نے یہ فقہ یا تو آپ سے مدینے میں حاصل کی یا جب آپ عراق تشریف لے گئے تھے وہاں حاصل کی، کیوں کہ یہ ثابت ہے کہ امام ابوحنیفہ نے آپ سے دونوں مقامات پر ملاقات کی تھی، بہر حال مقام کوئی بھی ہو اہمیت لقا کو ہے اور وہ ثابت ہے۔

(۳) اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام جعفر صادق صحابی کے فتوے کو قبول فرماتے تھے کیوں کہ یہ حدیث یا خبر عبداللہ بن عمر پر منقطع ہو جاتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نہیں پہنچتی لہٰذا اسے عبداللہ بن عمر کا فتویٰ قرار دینا پڑے گا اور بلاشبہ اس فتوے پر حرف زنی نہیں کی جا سکتی۔

اور صحابی کے فتوے پر عمل ورآمد ائمہ اربعہ اور فقہاء امصار کے نزدیک متفق ہے، اور یہ ثابت ہوگیا کہ فقہ امام جعفر صادق فی الجملہ فقہ اہل سنت سے ہم آہنگ ہے۔

امام جعفر صادق سے سنیوں کی روایت امام صادق سے روایت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان میں بہت بڑی تعداد سنیوں کی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جمہور اہل سنت امام صادق کے مرویات قبول کرتے ہیں، اس کے معنیٰ فقہ صادق کی نفی نہیں ہیں کیوں کہ رواۃ فقہ امام موصوف سے احادیث وقرآن کا درس لیا کرتے تھے اور جو کچھ ان دونوں سے مستنبط ہوتا تھا اسے بھی اخذ کرتے تھے اور جن احکام کی ان دونوں پر تفریع ہوتی ہے انہیں بھی تسلیم کرتے تھے اور ان احکام سے جن امور کی تخریج ہوتی تھی انہیں بھی لیتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام جعفر صادق کے بھی دوسرے ائمہ فقہ کی طرح شاگرد اور تلامیذ تھے جو اُن سے اخذ مسائل کرتے تھے، فروع فقہیہ نقل کرتے تھے، ان کے عصر میں جو مسائل رونما ہوتے تھے انہیں حل کرتے تھے۔ یہ بات ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ امام صاحب کے اپنے عہد کے مدارس فقہیہ جس علم کے حامل تھے، وہ اس پر پوری دستگاہ اور بصیرت رکھتے تھے پس ضروری تھا کہ جو لوگ آپ کے دامن تحقیق سے وابستہ تھے وہ ان سے مسائل نقل کرتے۔

بہر حال امام صاحب کی فقہ کا عرفان صحیح اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم ایک دوسری جہت سے اس کا جائزہ نہ لیں۔ وہ جہت ہے برادران شیعہ کی!

فقہ امام صادق نزد اصحاب تشیع

احادیث سے مراد احادیث نبوی اور اقوال ائمہ ہیں

فقہ امامیہ اثنا عشریہ | اصحاب شیعہ کے ہاں امام جعفر صادق کی فقہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں ہم امامیہ اثنا عشریہ تک اپنی فکر و نظر کو محدود رکھیں گے۔

اس سلسلے میں دو امور خاص طور پر قابل ذکر و غور ہیں:

(۱) امام کے آراء بجائے خود احادیث ہیں اور ہمارے برادران اثنا عشریہ کے نزدیک حدیث سے مراد احادیث نبیؐ اور احادیث ائمہ ہیں، ان کے اقوال آراء نہیں ہیں بلکہ سنت متبعہ سے استنباط ہیں بلکہ نصوص ثابتہ ہیں اور بجائے خود حجت ہیں اور یہ احادیث کسی ایک امام کی نہیں بلکہ جملہ ائمہ کی یکساں طور پر ہیں۔

کافی میں لکھا ہے:-

"حماد بن سالم اور حماد بن عثمان عیسیٰ وغیرہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ابو عبداللہ علیہ السلام کو کہتے سنا کہ وہ فرماتے تھے میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے اور میرے والد کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے اور میرے دادا کی حدیث حسین کی حدیث ہے اور حسین کی حدیث حسن کی حدیث ہے اور حسن کی حدیث امیرالمومنین حضرت علیؓ کی حدیث ہے اور امیرالمومنین کی حدیث رسول اللہ کی حدیث ہے اور رسول اللہؐ کی حدیث اللہ کا کلام ہے"[۱]

برادران اثنا عشریہ کی نظر میں یہ خبر صحیح صراحت کے ساتھ ائمہ کے نزدیک وحدت احادیث پر دلالت کرتی ہے جو حدیث امام صادق بیان کرتے ہیں وہ عین وہی ہے جس کی ان کے والد اور جد امجد محترم نے تحدیث کی ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب تک پہنچ جائے

---

[۱] المسند وطریق الخبر بہ الکافی ج ا ص ۵۳ طبع بیروت۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات ائمہ کا کلام حدیث ہے اوران کی حدیث جو ہے وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ امام صادق کی کوئی مستقل فقہ ہے جو فقہ ائمہ سے الگ کوئی چیز ہے، علامہ مظفری نے اپنی کتاب الامام الصادق میں تحریر فرمایا ہے:۔

"شیعہ آپ سے اسی طرح حدیث حاصل کرتے تھے، جس طرح گویا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے حاصل کی، کیوں کہ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ رسول ؐ کی طرف سے بغیر کسی تصرف اور اجتہاد کے ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے اقوال و ارشادات کو بغیر کسی شک اور اعتراض کے بے چون وچرا قبول کر لیتے تھے اور جس مسئلے میں ذرا بھی کھٹک محسوس ہوئی ہے آپ سے دریافت کر لیتے تھے، کیوں کہ ان کی حدیث مروی تمام چیزوں پر حاوی ہے"؎

یہ ہیں ہمارے برادران امامیہ کے معتقدات امام صادق اور اُن کے آباء کرام کے اقوال گرامی کے بارے میں ہم اس طرح غور نہیں کرتے کہ یہ ایک مخصوص فرقے کے امام کے اقوال ہیں بلکہ ائمہ مسلمین کے امام اکبر کی حیثیت سے ان ارشادات کو دیکھتے ہیں جو بلاشبہ جملہ طوائف اسلامیہ کے نزدیک فقہ و دین کے امام تھے۔

لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ اس امام جلیل پر امام اجتہاد کی حیثیت سے نظر ڈالیں۔ نیز یہ کہ آپ رواۃ و محدثین میں سب سے زیادہ صادق تھے۔ آپ تابعین سے روایت کرتے تھے۔ آپ کی مرویات صرف آل بیت تک مقصود نہیں ہیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ آپ تابعین۔ مثلاً سعید بن جبیر سے بھی روایت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم علم امام کو وہبی سے زیادہ کسبی مانتے ہیں۔

یہی کیفیت آپ کے والد ماجد امام باقر کی تھی، نیز آپ کے بعد محترم امام زین العابدین کی بھی۔ چنانچہ کتاب الآثار میں ان لازوال ائمہ جلیل سے امام ابوحنیفہ کی روایت درج ہے جو تابعین سے اور بواسطہ تابعین صحابہ سے اور بواسطہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بہ سند متصل یا مرسل مروی ہے۔

نیز کتاب الآثار میں ابو یوسف نے امام زین العابدین اور امام محمد الباقر سے روایت کی ہے۔

؎ الصادق ج ۱ ص ۱۵۱

ہتھی یا یہ فرض کرلیں کہ ان کے پاس سند متصل غیر منقطع ان تلامیذ کی ہتھی جن کا ان کی زندگی میں انتقال ہوا۔ جیسے معلی بن خنیس۔

کہا جاتا ہے کہ یہ احادیث واخبار تلامیذ امام صادق نے مرتب اور مدون کر لیے تھے، کلینی نے انہیں صرف نقل کیا ہے۔ لیکن اگر ایسا تھا تو ان مدونات کو مشہور اور معروف ہونا چاہیے تھا اور اسے اصل کی حیثیت سے باقی رہنا چاہیے تھا، لیکن اصل جو کچھ ہے وہ بس "الکافی" ہی ہے۔ یا وہ کتابیں جو بعد میں لکھی گئیں مگر اصل وہی قرار دی جائے گی جو ان کے اصحاب نے مدون کی ہیں، جیسے وہ مجموعے جن کی سند امام زید سے لائی جاتی ہے۔ ان کی جمع وتدوین ان کے شاگرد ابو خالد نے کی ہے اور یہ نسلاً بعد نسلٍ مشہور ومعلوم چلے آرہے ہیں۔

بہر حال اب ہم فقہ امام صادق کی روایت کو زیر بحث لائیں گے۔

"ہم سے یوسف نے انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے ابوحنیفہ سے، انہوں نے ابوجعفر محمد بن علی سے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی کہ آں حضرتؐ نماز عشاء آخرہ کے بعد سے فجر تک آٹھ رکعات پڑھا کرتے تھے اور تین رکعتوں سے وتر کرتے تھے پھر فجر کی دو رکعت پڑھتے تھے۔"[1]

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی طرح روایت کرتے تھے جس طرح دوسرے رواۃ اور ان کا کلام بجائے خود اللہ کا قول نہ تھا نہ قول رسولؐ تھا۔

ان تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ علماء سنن اور فقہاء غیر شیعہ کی نظر میں امام صادق کے اقوال بجائے خود حجت نہیں تھے اور اس سے ان کے مرتبۂ جلیل میں کوئی فرق نہیں آتا کیوں کہ وہ بہر حال علم اور فقہ کے آخری درجے تک اپنے کمال کے اعتبار سے پہنچے ہوئے تھے، بہر حال ہر فرد ان کی تعظیم و تکریم اپنے اپنے طور پر کرتا ہے۔ حضرات شیعہ کے نزدیک ان کی عظمت الہام کی وجہ سے ہے۔ اور الہام بہت بڑی نعمت ہے جس پر شکر واجب ہے، اس کے برعکس دوسرے ان کی تعظیم امام مجتہد کی حیثیت سے کرتے ہیں اور مجتہد سے خطا و صواب دونوں کا صدور ہو سکتا ہے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ خطا و صواب دونوں صورتوں میں اسے اجر دیتا ہے۔ اس بحث سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ہم اہل مذہب سے ان کے تعبیر طریق کے جواب میں الجھیں ہم نے تو صرف وہ بات کہی ہے جو ہمارا اعتقاد ہے۔

روایات کی سند متصل کا مسئلہ

دوسری چیز جس سے ایک طالب حقیقت دوچار ہوتا ہے یہ ہے کہ امام صادق سے جو روایات مروی ہیں انہیں اگر اسناد کے ساتھ اصولوں پر جانچا جائے جو علمائے حدیث نے مقرر کر رکھے ہیں تو وہ جملہ احوال میں امام صاحب تک سند متصل نہیں پائے گا"!

قدیم ترین مؤلفین احادیث و افعال و اقوال امام صادق میں سر فہرست کلینی صاحب "کتاب الکافی" ہیں، ان کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی یعنی امام صادق کی وفات کے ۱۸۱ سال بعد اور کلینی تمام صورتوں میں امام صادق تک سند متصل نہیں پہنچاتے۔ ہم مانتے ہیں کہ وہ زیادہ تر امام صاحب کے تلامیذ سے روایت کرتے ہیں لیکن یہ بات قطعی ہے کہ امام صاحب کے تلامیذ میں سے کسی سے بھی ان کا لقا ثابت نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ یہ فرض کر لیں کہ امام صاحب کے تلامیذ کی عمر سو سال سے متجاوز

---

[1] الآثار ص ۳۴

خصوصیت یہ ہے کہ فن اصول میں یہ ہر دو منہاج کے عالم تھے، یعنی امامیہ اور اہل سنت دونوں کے روایات احادیث میں کبھی یہ سند بھی لاتے ہیں، لیکن ہماری نظر میں وہ مکمل نہیں ہوتی، مثلاً،

"ابن ابی عبیدؒ علی الصیرفی سے اور وہ فضل بن عمر الجعفی سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ابو عبداللہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ان کے سامنے درہم پیش کیے گئے ان میں سے ایک درہم انہوں نے میری طرف پھینکا اور کہا "یہ کیا ہے"؟

جواب دیا گیا یہ "ستوف" ہے۔

پوچھا "ستوف کیا"؟

کہا گیا "اس کے دو پرت ہوتے ہیں ایک چاندی کا، دوسرا تانبے کا!"

فرمایا، اُسے توڑ ڈالو اس لیے کہ نہ اس کی بیع جائز ہے نہ انفاق!"

اور ان دراہم کے عدم انفاق کی توجیہہ یہ ہے کہ جب تک صورت واقعہ بیان نہ کردی جائے، ایسا کرنا جائز نہیں ہو سکتا، کیوں کہ عدم بیان کی صورت میں لینے والا اس کھوٹ کو کھرا سمجھے گا۔

محمد بن مسلم کہتے ہیں میں نے ابو عبداللہ سے عرض کیا۔

ایک شخص درہم بناتا ہے اور اس میں تانبا یا کوئی اور دھات بھی شامل کر دیتا ہے تو کیا اس کا لین دین جائز ہے"؟

حضرت امام نے فرمایا!

اگر اس سے یہ صورت بیان کردی ہے تو لین دین میں مضائقہ نہیں[1]

اس عبارت سے دو امر مستفاد ہوتے ہیں:

(۱) جو سند اس روایت میں ہے وہ غیر کامل ہے۔

پہلی روایت میں تین راوی ہیں، ابو عبیدؒ علی الصیرفی اور الفضل الجعفی، صورت حال یہ ہے۔ کہ ابو جعفر طوسی ۳۸۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ۴۶۰ھ میں وفات پائی اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ان کے اور امام جعفر صادق کے مابین صرف تین راویوں کا واسطہ ہو جبکہ حضرت امام کی وفات ۱۴۸ھ میں ہوئی تھی، کیوں کہ دونوں کی وفات میں تین صدیوں سے زیادہ کا فرق ہے بالتعیین ۳۱۲ سال کا اور اگر یہ مدونات قرن سابق کے مان لئے جائیں تو ضروری تھا کہ ان

---

[1] التہذیب ج ۵ ص ۱۲۸ طبع سنگی، ایران۔

کتب حدیث و فقہ نزد امامیہ

کتب فقہ و روایت کی جامعیت

تفریعات فقہیہ حضرات امامیہ کے ہاں کتب فقہ و روایت ساتھ ساتھ ہیں ان کتب اصول کے بعد تفریعات فقہیہ ہیں جو ائمہ کرام سے مروی ہیں، لیکن ہم کتب اصول کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس لئے کہ ان میں جو آراء ہیں ان کی نسبت امام جعفر صادق کی طرف کی جاتی ہے

جو کتابیں اصول مذہب شیعہ میں شمار کی جاتی ہیں چار ہیں:۔

(۱) الکافی۔
(۲) من لا یحضرہ الفقیہ۔
(۳) التہذیب۔
(۴) الاستبصار

کافی کے مؤلف کلینی ہیں یعنی ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلینی۔

شیخ عباس قمیؒ نے اپنی کتاب" الکنی والالقاب" میں لکھا ہے کہ ابو جعفر کلینی کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی اور مذہب اثنا عشری کے اصول معروفہ میں ان کی کتاب الکافی سب سے قدیم مانی جاتی ہے۔

کتاب"من لا یحضرہ الفقیہ" کے مؤلف ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی ملقب بہ" الصدوق" ہیں یہ خراسان کے رہنے والے تھے اور ان کا شمار اکبر علماء شیعہ میں ہوتا ہے ۳۵۵ھ میں بغداد آئے۔ ۳۸۱ھ میں بہ مقام رے ان کا انتقال ہوا، یعنی کلینی کی وفات کے تقریباً ۵۲ سال بعد۔

آخری دو کتابیں۔ التہذیب اور الاستبصار۔ علامہ طوسی کی تالیف ہیں، یعنی محمد بن الحسن الطوسی یہ رمضان ۳۸۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ۴۶۰ھ میں اس دنیا سے کوچ کیا، یہ ۴۰۸ھ میں عراق آئے اور مرتضیٰ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا، ان سے بہت کچھ علم حاصل کیا اور فقہ امامیہ میں دسترس پیدا کی۔ علم فقہ سنت کے بہت بڑے رواۃ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی نمایاں اور ممتاز

رجال کا بیان ہے کہ صرف ابان بن تغلب نے امام صادق سے تیس ہزار حدیثیں روایت کی ہیں، محمد ابن مسلم نے سترہ ہزار اور امام باقر سے تیس ہزار اور جابر جعفی کی روایات کے بارے میں تو سوال کرنا ہی بیکار ہے کیونکہ ان کے مرویات کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے اس صورت میں کیا روایات اور فنون مرویہ کا احصار ممکن ہے؟[1]

مذہب جعفری کی کتب اصول

مذہب جعفری کی کتب اصول میں ان مذکورہ کتب اربعہ کا وہی مقام ہے جو مذہب حنفی میں کتب ظاہر الروایۃ دا زامام محمد کا ہے، کتب ظاہر الروایہ ان کتابوں پر مشتمل ہیں۔

(۱) الاصل
(۲) الزیادہ
(۳) الجامع الصغیر
(۴) الجامع الکبیر
(۵) السیر الکبیر
(۶) السیر الصغیر

مذکورہ کتب اصول شیعہ کی جمع کا کام ملا محسن الفیض کا شانی نے کیا ہے، جن کا شمار متاخرین علمائے امامیہ میں ہوتا ہے ان کا سال وفات ۱۰۹۱ھ ہے، انہوں نے اپنے مذہب سے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں، ان میں ایک کتاب "الوافی" ہے، اس میں انہوں نے مذکورہ چاروں کتابیں جمع کردی ہیں، ایک دوسری کتاب "الصافی" ہے، جو تفسیر میں ہے ایک اور ایک "الشافی" ہے جو صافی کا اختصار ہے، علاوہ ازیں "المحجۃ البیضاء" "الحقائق المحضہ" "مفاتیح الشرائع فی الفقہ" "علم الیقین" اور "عین الیقین" ہیں۔

محمد بن حسن الحر العاملی نے بعض دوسری کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو مذہب امامیہ میں مصادر احکام کی حیثیت رکھتی ہیں، انہوں نے مذکورہ کتب اربعہ کے علاوہ دوسرے تمام مصادر اپنی کتاب میں جس کا نام "وسائل الشیعہ" ہے درج کر دیے ہیں۔

---

[1] الصادق ج ۱ ص ۱۵۳۔

کا ذکر ملتا۔

(۲) ان روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوسی اخبار کی روایت کرتے تھے اور ان اخبار سے فقہ کا استنباط کرتے تھے اور اخبار مختلفہ کے درمیان جمع و توفیق کی کوشش کرتے تھے، انہوں نے ان دراہم کے استعمال کی نہی بیان کی جو ستوق کہلاتے ہیں، پھر بیان کرتے ہیں کہ یہ نہی اس صورت میں ہے کہ امر واقعہ کی وضاحت نہ کردی ہو، اگر وضاحت کردی ہوتی تو ایسے دراہم کا تعامل جائز ہوتا، کیوں کہ پھر کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ اور اعتبار "غش" (فریب) کا ہے۔ وہ ایسے اخبار وارده بھی جمع کرتے ہیں جو ایک دوسرے کی تفسیر کرتے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ طوسی کی دونوں کتابیں۔ التہذیب اور الاستبصار۔ امام صادق سے مروی اخبار، فقہ، استنباط اور تفریع ہیں۔

الاستاذ محمد جواد کے افکار عالیہ الاستاذ محمد جواد نے مذکورہ کتب اربعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ الکافی مشتمل ہے ۱۶۰۹۹، اخبار پر اور کتاب "من لایحضرہ الفقیہ" مشتمل ہے ۹۰۴۴، اخبار پر اور طوسی کی کتاب "التہذیب" ۱۳۰۹۵، اور "الاستبصار" ۵۵۱۱، اخبار پر۔

ہم دیکھتے ہیں ان چاروں کتابوں میں کثیر الاخبار "الکافی" ہے۔ اسی باعث اس کا شمار اہم ترین مصادر میں ہوتا ہے، نیز اس لئے بھی کہ وہ قدیم ترین کتاب اپنے موضوع پر ہے، اکثر اہل الرائے کا قول ہے "کافی اصحاب شیعہ کے ہاں وہی حیثیت رکھتی ہے، جو اہل سنت کے ہاں بخاری کی ہے!"[1]

بلاشبہہ یہ چاروں کتابیں شیعی مصادر میں اصل کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اس سے اس کی نفی نہیں ہوتی کہ ان اخبار کے علاوہ بھی امام جعفر صادق سے بہت سے اخبار مروی ہیں جن کا حصر غیر ممکن ہے، خصوصاً اس صورت میں کہ ہمارے برادران امامیہ امام صادق کے راویوں کی تعداد چار ہزار سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔

علامہ مظفری اس سلسلۂ بحث میں فرماتے ہیں:-

"جب کہ رواۃ کی تعداد چار ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ تو روایات کی تعداد کیا ہوگی؟ ارباب

---

[1] مع الشیعۃ الامامیہ ص ۲۷، ۲۷۷

بحار الانوار" رکھا،[1]

غرض یہ ہیں فقہ جعفری کے ادوار مختلف

کتب مدونہ معروف السند یا روایات غیر مدونہ | جن سے اسے گزرنا پڑا.

کتب اصول شیعہ میں جو اضافے ہوئے ان کی بنیاد کیا تھی؟ کیا کتب مدونہ معروف السند یا روایات غیر مدونہ؟

دوسری صورت ممکن نہیں لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ زیادات ان کتابوں سے لئے گئے جو شیعہ امامیہ کے ہاں معروف اور متداول تو تھیں لیکن تصدیق و شہرت میں مذکورہ کتب اربعہ تک نہ پہنچ سکیں!

---

[1] ان کتابوں اور ان کے مؤلفین سے متعلق معلومات علامہ مظفری کی کتاب "الصادق" ص ۱۵۱-۱۵۲- ۱۵۳ سے ماخوذ ہیں.

اس مصنف کے بارے میں علامہ مظفری فرماتے ہیں:

"انھوں نے امام صادق سے بلا واسطہ ۸۰ اور بواسطہ ۷۰ ابواب روایت کئے ہیں،"

یعنی امام صادق سے بغیر سند کے جو روایتیں کی ہیں وہ ۸۰ ابواب پر اور سند کے ساتھ جو روایتیں کی ہیں وہ ۷۰ ابواب پر مشتمل ہیں۔

حر العاملی کا شمار متاخرین علمائے امامیہ میں ہوتا ہے، ان کی وفات ۲۱ رمضان ۱۱۰۴ھ کو ہوئی یہ خراسان کے رہنے والے تھے۔

حر العاملی کے بعد، علامہ مرزا حسین آتے ہیں۔ انہوں نے بھی کئی کتابیں لکھی ہیں جن کا شمار کتب مصادر میں ہوتا ہے۔ اپنی کتابوں میں انہوں نے فقہ کا بہت سا مواد رکھنا شروع کر دیا ہے لیکن صرف احکام پر اقتصار کیا ہے انھوں نے کتاب "الرسائل" کے اسلوب پر تالیف کی ہے اور اپنی کتاب کا نام "مستدرک الوسائل" رکھا ہے، مرزا صاحب کا شمار اس زمانے کے یگانہ فقہا میں ہوتا تھا، ان کی وفات ۱۳۲۲ھ میں ہوئی گویا یہ شیخ محمد عبدہ کے ہم عصر تھے۔

شیخ الاسلام محمد باقر بن شیخ محمد تقی مجلسی نے ایک کتاب "بحار الانوار" مرتب کی، یہ کتاب ان تمام اخبار پر مشتمل ہے جو امام صادق سے مروی ہیں۔

اس کتاب کے بارے میں علامہ مظفری کا کہنا ہے کہ اس میں کھوٹا کھرا سب کچھ جمع کر دیا گیا ہے جیسا کہ طویل و ضخیم کتاب میں ہوا کرتا ہے۔

مجلسی کا شمار متاخرین علماء امامیہ میں ہوتا ہے، ان کی وفات ۱۱۱۰ھ میں ہوئی، ایک اور روایت کے مطابق ۱۱۱۱ھ میں۔

شاہ حسین صفوی کے عہد حکومت میں انہیں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا ان کی مجالس علمیہ میں تقریباً ایک ہزار تلمیذ حاضر رہتے تھے۔ بحار انوار کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں موجود ہیں۔

مرزا محمد طہرانی مجلسی کے بعد نمودار ہوئے انہوں نے کتاب بحار الانوار کا استدراک لکھا اور اس میں جو کمی رہ گئی تھی اسے پورا کیا۔ ائمہ اثنا عشریہ کے بہت سے اخبار اس میں رہ گئے تھے۔ مرزا طہرانی نے انہیں مرتب کیا اور اپنی کتاب کا نام "مستدرک"

امام صادق کا منہاج واصول

کیا امام صادق کے لئے نہ منہاج کی ضرورت ہے نہ اصول کی؟

نقطہ نظر کا اختلاف امام صادق رضی اللہ عنہ اوران کے آباءکرام کے بارے میں ہمارا اور برادران شیعہ کا نقطہ نظر مختلف ہے۔

برادران شیعہ امام صادق اور دیگر ائمہ کے علم کو علم الہامی قرار دیتے ہیں وہ ان کے پاس وصایت نبیؐ کے ذریعہ پہنچا، لہٰذا اس کے لئے نہ منہاج کی ضرورت ہے نہ اجتہاد کی، کیونکہ یہ علم لدنی ہے جو منہاج اور اجتہاد سے مستغنی ہے۔ اس کے برعکس مجتہد اپنے اجتہاد کا ایک خاص منہاج رکھتا ہے جو حلال وحرام کے عرفان کے لئے مقیاس کا کام دیتا ہے لیکن جسے علم القا ہوتا ہو اس کا کلام صواب دائمی کی حیثیت رکھتا ہے اس کے بارے میں خطا اور لغزش کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا، نہ صواب تک پہنچنے کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے اس کی زبان پر جو علم جاری ہوتا ہے وہ فیض ربانی ہوتا ہے، جیسے اس کی طرف وحی کی گئی ہو۔ سوا اس کے کہ اب وحی نہیں رہی، وفات نبیؐ کے ساتھ اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا، یہ ہے امام صادق کے بارے میں ہمارے برادران شیعہ کا نقطہ نظر۔

لیکن ہمارا نقطہ نظر مختلف ہے، ہم انہیں مجتہد مانتے ہیں، اور مجتہد سے خطاء وصواب دونوں چیزیں ممکن ہیں۔ وہ غلطی سے معصوم نہیں ہوتا، لیکن یہ رائے رکھ کر ہم اس کے مقام اور مرتبے کی تنقیص نہیں کرتے نہ معاملات دین میں اس کے مرتبہ امامت کا استخفاف کرتے ہیں۔

جب کہ امام صادق ہماری نظر میں مجتہد ہیں۔ تو ضروری ہے کہ وہ صاحب منہاج بھی ہوں، اگرچہ اس کی تدوین انھوں نے نہ کی ہو، کیونکہ عصر امام عصر تدوین منہاج نہیں تھا، بلکہ وہ عہد تھا مسائل واقعی میں افتاد کا، اہل عراق نے مسائل واقعی کے ساتھ مسائل متوقع کا اضافہ بھی کر لیا اور اس کا نام فقہ تقدیری رکھا، اس فن میں امام ابوحنیفہ کو غیر معمولی دسترس حاصل تھی اور ان کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے حد معقول سے اس سلسلے میں کبھی تجاوز نہیں کیا۔

ہمارا یہ خیال ہے کہ امام صادق نے اپنی فقہ کے کچھ خاص اصول مقرر کر رکھے تھے جنہیں وہ استنباط

مسائل کے وقت پیش نظر رکھتے تھے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تدوین احکام جزئیہ کو تدوین منہاج پر سبقت ہو کیونکہ مناہیج جمع و تدوین سے پہلے ذہن میں موجود ہوتے ہیں، جیسے منطق عروض اور نحو وغیرہ علوم کے ساتھ یہ ماجرا گزر چکا ہے۔

سنیّوں اور شیعوں کا فکری اختلاف

گو ہمارے برادران امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ امام صادق کا علم الہامی تھا، لیکن وہ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ اصول فقہ میں سب سے پہلے جس نے جنبش لب کی وہ امام صادق اور ان کے والد ماجد امام باقر ہیں، ان کے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بھی الہام کی ایک صورت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بزرگوں۔ امام صادق اور امام باقر کے دل میں ڈال دیا تھا کہ لوگوں کو صحیح اسلوب پر تعلیم دے سکیں، جیسے فرائض اور احکام کا علم ان کے دل میں ڈال دیا تھا، یا جس طرح اقتضاء نصوص، تخریج اور تفریع کا اصول القا کر دیا تھا۔

اس سلسلے میں علامہ آیت اللہ الصدر فرماتے ہیں:

جس نے سب سے پہلے اصول فقہ کی بنیاد رکھی اور اس کا دروازہ کھولا اور اس کے مسائل بیان کئے، وہ امام ابو جعفر محمد الباقر ہیں۔ اس کے بعد ان کے صاحبزادے امام ابو عبداللہ الصادق، ان دونوں بزرگوں نے اس فن کے قواعد اپنے اصحاب کو املا کرادئے اور ایسے مسائل جمع کئے جنہیں متاخرین نے ترتیب مصنفین کے طرز پر روایات مسندہ متصلہ کے ساتھ مرتب کیا!

ان دونوں بزرگوں سے مروی جو کتب مسائل فقہ ہمارے سامنے ہیں ان میں کتاب اصول آل السید الرسول ہے جسے سید شریف موسوی ہاشم بن زین العابدین خونساری اصفہانی رضی اللہ عنہ نے جمع کیا ہے، اسی طرح ایک کتاب الاصول الاصلیہ ہے، اس کے مؤلف سید عبداللہ العلامۃ المحدث عبداللہ بن محمد رضا الحسین ہیں ایسی ہی ایک اور کتاب "الفصول المہمۃ فی اصول الائمہ" ہے۔ اس کے مؤلف شیخ المحدث محمد بن الحسن ابن علی حر العاملی صاحب کتاب وسائل الشیعہ ہیں، جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ اصول فقہ میں امام شافعی پر بھی مقدم ہشام بن الحکم یکے از اصحاب امام صادق ہیں! پھر یوسف بن عبدالرحمٰن ہیں جنہوں نے امام موسیٰ کاظم بن جعفر علیہ السلام سے روایت کی!"

مرویات غیر مدون املا کی صورت میں

ان تصریحات سے ہمیں اختلاف نہیں ہے، لیکن ہم امام جعفر اور امام

موسیٰ کاظم کی کسی تصنیف کا وجود تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے ان سے جو کچھ مروی ہے وہ غیر مدوّن املا کی صورت میں ہے، لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ امام صادق اور امام کاظم تفکیر اصول فقہ میں امام شافعی پر سبقت رکھتے تھے تو ہم مان لیں گے البتہ باقاعدہ تصنیف کی صورت میں ان اصولوں کی تدوین میں امام شافعی سبقت رکھتے ہیں اور اس سے ان دونوں ائمہ جلیل کے مرتبے اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ یہ حضرات تالیف و تصنیف کے خوگر نہیں تھے، یہ تو بحث و توجیہہ اور تلقین و ارشاد میں مصروف و منہمک رہتے تھے اور ان دونوں حضرات کے زمانے میں تالیف و تصنیف کا کوئی خاص چلن بھی نہیں تھا۔ کسی حد تک تدوین تو تھی لیکن اسے تالیف نہیں قرار دیا جا سکتا اور تدوین مذاکرات و اقوال کا سلسلہ تو درحقیقت عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔

علامہ سیوطی کے خیالات

علامہ سیوطی نے ذکر کیا ہے کہ ہشام بن الحکم شافعی پر بہ حیثیت مصنف کے سبقت رکھتے ہیں جو انھوں نے فن لفظ پر لکھی تھی اور یونس بن عبدالرحمٰن شافعی پر اس اعتبار سے سبقت رکھتے ہیں کہ انھوں نے ان سے پہلے حدیث پر کتاب لکھی تھی۔

بلاشبہ یہ دونوں موضوعات علم اصول فقہ کا جز ہیں لیکن انہیں علم فقہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ مباحث الفاظ کا تعلق علوم لغت سے ہے اسی طرح اختلاف حدیث کی بحث علم حدیث کا جز ہے لہٰذا ان دونوں کو علم اصول کا موسس ماننا مشکل ہے، تاسیس کا فریضہ تو شافعی نے انجام دیا لیکن تاسیس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ شافعی نے جو کچھ لکھ دیا وہ حرف آخر تھا، ان کے بعد کے لوگوں نے اس علم کو اور زیادہ جامع اور مکمل بنا دیا۔

اگرچہ ہمارا خیال یہ ہے کہ امام صادق نے اپنا منہاج استنباط مدوّن نہیں کیا لیکن ایک ڈھب بنا دیا۔ مثلاً وہ اس کے قائل ہیں کہ:

: دین میں اصل و اساس کتاب اللہ ہے۔
: کتاب اللہ سنت پر مقدّم ہے۔
: سنت اگر مخالفِ قرآن ہو تو ترک کر دی جائے گی۔

"الکافی میں ابوعبداللہ سے روایت ہے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہر چیز کھول کر بیان کر دی ہے اللہ نے کوئی ایسی چیز ترک نہیں کی ہے جس کے جاننے کے بندے محتاج ہوں[1]"

---

[1] المسند ص ۱۴ - طبع بیروت۔

"الکافی" میں ہشام بن الحکم وغیرہ ابو عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ :۔

"نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منیٰ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا :

"اے لوگو! میری طرف سے تم تک جو بات آئے اگر وہ کتاب اللہ کے موافق ہے تو میں نے کہی ہے اور اگر کتاب اللہ کے مخالف ہے تو وہ میرا قول نہیں![1]"

ان ہدایات سے تین امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) احکام شرعیہ میں اصل قرآن کریم ہے۔ احادیث میں جو کچھ وارد ہوا ہے وہ قرآن کی طرف لوٹایا جائے گا۔

(۲) علم قرآن عمیق نظر کا طالب ہے۔

(۳) قرآن سنت پر مقدم ہے وہ سنت پر حاکم ہے، اگرچہ سنت اس کی وضاحت کرتی اور تفسیر بیان کرتی ہے۔

ہمارے خیال میں امام جعفر صادق کا یہی منہاج استنباط ہے جس کا وہ التزام فرمایا کرتے تھے۔

ناسخ و منسوخ سنت میں بھی ہے قرآن میں بھی

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ امام صادق نے ناسخ اور منسوخ کے بارے میں گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ ناسخ اور منسوخ سنت میں بھی ہے اور قرآن میں بھی۔

حضرات امامیہ مناہج استنباط میں جو اصول اور مباحث رکھتے ہیں ان کی نسبت ائمہ کرام کی طرف کرتے ہیں اس سلسلے میں انہوں نے بہت سی کتابیں تحریر کی ہیں اور ان کتابوں میں ان کے جو نظریات ہیں، ان کا بڑا حصہ قواعد عامہ میں متکلمین سے ملتا ہوا ہے کہیں وہ فقہاء سنت سے بھی ہم آہنگ نظر آتے ہیں کہیں متکلمین سے!

[illegible]

امامیہ کی تاریخ اصول فقہ

علم اصول فقہ پر امامیہ علماء اور فقہا کی کتابیں

امامیہ اور جمہور مسلمین کے مابین تبادلۂ فکر تحقیق و تفحص سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امامیہ اور جمہور مسلمین کے مابین تبادلۂ تفکیر کا سلسلہ جاری رہا ہے صرف اصول فقہ ہی میں نہیں بلکہ ان تمام علوم مشترکہ میں جو بہ شکل عام اصول دین سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور چونکہ تبادلہ فکری قائم تھا خصوصاً تیسری صدی ہجری کے بعد، لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء امامیہ مثلاً طوسی وغیرہ اہل سنت کی فقہ و اصول کا مطالعہ کرتے اور اس سے دلچسپی لیتے ہیں اور یہ چیز اصول استنباط میں ہمیں بہت زیادہ واضح اور نمایاں نظر آتی ہے۔ یہاں اگر ہم ٹھٹکتے ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا امامیہ کے علماء اصول مسلک حنفیہ پر گامزن رہے جو یہ تھا کہ اصول فروع کے خادم ہیں، یا وہ متکلمین کے مسلک پر گامزن رہے جو یہ تھا کہ اصول کی حیثیت موازین ضوابط کی ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ امامیہ کے علماء اصول گو ان دونوں مسلکوں میں سے کسی ایک مسلک پر گامزن رہے لیکن ان کی حیثیت تابع کی نہیں تھی بلکہ وہ تفکیر مستقل کے حامل تھے ان کا منہاج قائم بالذات تھا جو مذکورہ ہر دو منہاجوں میں سے کسی ایک کے ساتھ متحد رہتا تھا یا دونوں میں سے کسی ایک کے قریب اور دوسرے سے بعید تر!

برادران امامیہ کے ان کثیر مؤلفات کے مطالعہ کے بعد جو انہوں نے اصول فقہ پر مرتب کئے ہیں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان میں سے اکثر علم کلام کے ماہر تھے چنانچہ انھوں نے متکلمین کی وضع و اسلوب پر اپنی کتب اصول کی تدوین کی ہے، ان میں سب سے پہلا مؤلف جس نے اس موضوع پر کتاب تالیف کی ایک معتزلی عالم تھا۔ سید آیت اللہ حسن الصدر کا بیان ہے کہ ہشام بن حکم ان لوگوں میں سرفہرست ہے، جنہوں نے ابواب اصول پر خامہ فرسائی کی ہے، اس کی کتاب الالفاظ ہمارے دعوے کی بہترین شاہد ہے، اور یہ ہشام متکلمین میں سے تھا، اسی طرح یونس بن عبداللہ نے اختلاف الحدیث نامی کتاب لکھی جس میں مسائل تعارض احادیث اور مسائل جرح و تعدیل ہیں، جو انھوں

نے امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق سے روایت کیے تھے اور یہ یونس بھی متکلمین میں سے تھے۔

دوسری صدی ہجری کے نصف ثانی کے ہر دو علماء اصحاب ابوحنیفہ کے معاصر تھے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء شیعہ اب اصول استنباط میں بھی غور و فکر کرنے لگے تھے بلکہ بعض نے تدوین کی طرف بھی توجہ شروع کر دی تھی اور اس زمانے میں جب یہ دونوں عالم نمودار ہوئے، اصول فقہ وضع مناہج استنباط کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ اور کسی خاص اور معین مذہب و مسلک کی تائید و حمایت کے بغیر وضع مقائیس کی جانب قدم اٹھنے لگے تھے، کیونکہ فروع استنباط مسائل حنفیہ کا طریق ہے، جو باقاعدہ طور پر جدل فقہی کے ساتھ ساتھ تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری میں ظہور پذیر ہوا۔

اصول فقہ کی تدوین و تبویب

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب امامیہ میں اصول فقہ کی تدوین و تبویب منہاج عام پر مبنی تھی، مفصل اور مکمل طور پر نہیں۔ چنانچہ یہ حضرات امامیہ مباحث الفاظ میں قواعد عامہ پر اور روایت میں جرح و تعدیل کے قواعد پر اکتفا کرتے تھے۔ ان کے یہ اصول جمہور مسلمین سے متفق بھی ہوتے تھے اور مختلف بھی، کیونکہ اتحاد منہاج اور اتحاد تفکیر لازم و ملزوم نہیں ہیں!

رواۃ کے بارے میں بھی شیعوں اور سنیوں کے نقطہ نظر میں فرق تھا۔ شیعہ حضرات غیر شیعہ راوی کی روایت قبول کرنے میں تردد کرتے تھے۔ اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اعتراف کریں کہ سنّی بھی اس شخص کی روایت قبول نہیں کرتے تھے جو سنی نہ ہو، لیکن یہ ایک قسم کی جماعتی کشمکش ہے جو بہر حال جلد یا بدیر زائل ہو جائے گی اور راوی پر اس حیثیت سے غور کیا جائے کہ اس کا پایۂ ثقاہت کیا ہے۔ نہ یہ کہ وہ کس طائفے سے تعلق رکھتا ہے؟

کامل غور و فکر اور تحقیق و تفحص کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ علماء امامیہ فی الجملہ اصول فقہ کے منہاج میں بڑی حد تک شافعیوں سے متفق اور ہم آہنگ تھے۔

اصول فقہ پر لکھنے والوں کے مختلف طبقات

حضرات امامیہ میں اصول فقہ پر لکھنے والوں کا پہلا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اصولی مباحث کی طرف زیادہ متوجہ رہے انہوں نے کوئی ایسی باقاعدہ اور مکمل کتاب تصنیف نہیں کی جو تمام اجزاء علم کی جامع ہوتی۔

اس کے بعد مؤلفین کا دوسرا طبقہ نمودار ہوا۔

اس طبقے کے لوگوں نے ابواب اصول پر کلی طور پر بھی اور جزئی طور پر بھی کتابیں تالیف کیں۔ یہ تیسری

ہجری کے علماء عقائد و تفسیر میں ہوتا ہے۔ ابطال قیاس پر انہوں نے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

اصحاب تحقیق کی مؤلفات و مصنفات

یہ ہیں وہ نمایاں شخصیتیں جنہوں نے فقہ امامی پر تیسری صدی ہجری کے آخر تک کتابیں لکھیں۔ ان کے بعد اصحاب تحقیق نمودار ہوئے جن کا بھر وسا بھی تالیف و تصنیف میں زیادہ تر انہی کتابوں پر تھا!

آگے بڑھنے سے پہلے ہم تین اہم نکات پر گفتگو کر لینا چاہتے ہیں۔

متکلمین اہل قلم و اہل علم

(۱) تیسری صدی تک جن لوگوں نے فن اصول پر کتابیں لکھیں ان کی اکثریت متکلمین پر مشتمل ہے۔

ہشام بن حکم متکلم تھے، آل نوبخت کے لوگ فلسفی بھی تھے اور متکلم بھی۔

فقہا۔ فروع کا دور

(۲) کثرت متکلمین کے ساتھ ساتھ فقہاء فروع بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے تحریر اور کا کام طریق امامیہ پر جاری رکھا، جیسے ابن جنید، جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں، یہ صرف فقہ شیعی سے متاثر تھے۔ قیاس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے اور امام صادق کی طرف قیاس سے متعلق نسبت اجتہاد کی نفی کرتے تھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فن اصول کے یہ بلند مرتبت علماء اگرچہ بیان حقائق علم اور موازین استنباط میں مصروف تھے باایں ہمہ اپنے مذہب و مسلک سے بھی پورے طور پر متاثر تھے۔

بنابریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصول فقہ پر جن علماء امامیہ نے کتابیں لکھیں، اگرچہ وہ منہاج متکلمین سے قریب تھے لیکن مذہب امامی سے بھی پورے طور پر متاثر تھے۔

اور یہ چیز امامیہ کی کتب اصول میں بہت وضاحت کے ساتھ ہمیں نظر آتی ہے ان کتابوں میں آپ کو استنباط فقہی کے لئے موازین و ضوابط محکمہ ملیں گے اور ساتھ ہی ساتھ ان اصولوں کی مدافعت بھی ملے گی جن پر ان کے فروع فقہیہ قائم ہیں اور جن میں فقہ جمہور سے اختلاف ہے۔ مثلاً امام علی کے اقوال کو یہ واجب الاتباع قرار دیتے ہیں۔ وہ شریعت کی ایسی تفسیر ہیں جس میں خطا اور لغزش کا کوئی امکان نہیں۔ جن کی حیثیت سنت متبعہ کی ہے، کتب امامیہ میں اس اصل کا دفاع برابر ملے گا۔ جس طرح نقص قیاس وغیرہ مباحث ملیں گے۔

قیاس پر داؤد ظاہری کے حملے

تیسری صدی ہجری ان فقہاء سے مملو ہے جو قیاس سے اختلاف کرتے اور اسے بے بنیاد قرار دیتے ہیں۔ فقہاء شیعہ کی طرف سے قیاس کی مخالفت کے علاوہ اس صدی میں داؤد ظاہری بھی پیدا ہوئے جنہوں نے قیاس پر تابڑ توڑ

صدی ہجری کے لوگ ہیں۔

ان میں ایک ابوسہل نوبختی ہیں جن کا شمار شیوخ متکلمین میں ہوتا ہے، انھوں نے فن اصول پر ایک کتاب الخصوص والعموم لکھی ہے، ابن ندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں لکھا ہے اور ان کے ذیل میں "کتاب ابطال القیاس" اور "کتاب نقض اجتہاد الرائے" لکھی ہے جس میں علی ابن الراوندی کے خیالات کا رد کیا ہے۔ انہیں امام حسن عسکری کا لقا حاصل تھا، جو ائمہ اثنا عشریہ میں گیارھویں امام اور ائمہ ظاہرین میں آخری امام ہیں ان کے بعد محمد بن عسکری مسند آرائے خلافت ہوئے، جو پردۂ غیب میں چلے گئے، یہی مہدی منتظر مانے جاتے ہیں۔

آل نوبخت میں حسن بن موسیٰ نوبختی بھی ہیں، انھوں نے علم الاصول میں "کتاب خبر الواحد والعمل بہ" اور "کتاب العموم والخصوص" لکھی ہے، یہ فیلسوف، متکلم، فقیہہ اور شیعہ تھے، ابن ندیم نے اپنی "الفہرست" میں ان کے متعلق لکھا ہے۔

"متکلم اور فیلسوف تھے، ان کی خدمت میں ایک بہت بڑی جماعت نقل فلسفہ کے لئے حاضر رہتی تھی، جس میں ابوعثمان دمشقی اور اسحاق و ثابت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ معتزلہ انہیں معتزلی بتاتے ہیں اور شیعہ انھیں شیعہ قرار دیتے ہیں، لیکن ثابت یہ ہے کہ یہ شیعہ تھے۔ کیوں کہ آل نوبخت کو حب علی و آل بیت میں شہرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں ہم نے ان کا ذکر کیا ہے۔"

تیسری صدی ہجری میں جن لوگوں نے علم اصول پر کتابیں لکھیں ان میں فقیہہ شیعی محمد ابن جنید خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ فقیہہ تھے، لیکن متکلم نہیں تھے۔ فقہ امامیہ اور فقہ جمہور مسلمین دونوں پر گہری نظر رکھتے تھے دراست فقہیہ میں ان کا منہاج نظائر متشابہہ جمع کرنا تھا، شاید یہ پہلے شخص ہیں، فقہ اسلامی میں جنھوں نے اشتباہ و نظائر پر ایک مستقل کتاب لکھی؛

اصول فروع کا بیان بھی انہوں نے کیا ہے، جس طرح ان کی کتابیں اصول فقہ پر ہیں اسی طرح اصول فروع پر بھی ہیں:-

بااین ہمہ تفسیر نصوص میں یہ کوشش کرتے تھے کہ اصول احکام کا استخراج عقلی بنیاد پر کریں۔ یہ قیاس کے مخالف تھے اس لئے ابطال قیاس پر انھوں نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام ہے "کشف السمویہ والالتباس فی ابطال القیاس"؛

کتب اصول لکھنے والوں میں ایک بزرگ ابومنصور خرام نیشاپوری بھی ہیں ان کا شمار تیسری صدی

حملے کئے، جو ان علمائے شیعہ کے ہم عصر تھے اور قریب قریب ہم عمر بھی، یہی وجہ ہے کہ اس صدی میں قیاس کی مخالفت زیادہ بھرپور نظر آتی ہے۔

اپنے مسلک کی تائید میں حضرات امامیہ کہتے ہیں کہ امام صادق اور امام باقر قیاس کے مخالف تھے۔

اور جہاں تک جمہور کا تعلق ہے وہ اس زمانے میں دراست آثار کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ماثورہ کی تدوین کی، صحابہ کے فتاویٰ مدون کئے، فقہ تابعین کی تدوین کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مبنی بر اثر فقہ کی کثرت نظر آتی ہے، ایسے متعدد فقہاء ملیں گے جنہوں نے اپنی فقہ کی بنیاد فقہ پر رکھی۔ اگرچہ قیاس کی نفی نہیں کی جیسے بقی بن مخلد وغیرہ فقہا اندلس۔

شیعہ امامیہ کا معاملہ صاف اور واضح ہے، وہ اقوال ائمہ کو منصوص علیہ اور سنت متبعہ مانتے ہیں وجود ائمہ اعلام نے انہیں ہر قسم کے اجتہاد سے بے نیاز کر دیا تھا۔ بقول ان کے ان ائمہ نے بڑا ذخیرہ ترکہ احکام و فتاویٰ کا چھوڑا تھا جس کی حیثیت اُن کے ہاں آثار و نصوص کی ہے، آخری امام ظاہر کا انتقال تیسری صدی ہجری کے نصف ثانی میں ہوا۔ لہٰذا انہیں قیاس کی ضرورت لاحق ہی نہیں ہوئی، کیوں کہ قول امام بذات خود حجت ہے، کیوں کہ وہ معصوم عن الخطا ہوتا ہے، وہ اگر کوئی بات کہے تو اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا۔

"آپ نے کس بنیاد پر یہ بات کہی؟ - یا - ایسا آپ نے کیوں کہا؟"

اس صورت میں ان کے ہاں قیاس ایک امر باطل اور بدعت فی الدین ہے۔

گو امامیہ کے ہاں قیاس ایک بے اصل اور بے حقیقت چیز ہے لیکن اکثر فقہا اہل سنت خاص طور پر ائمہ اربعہ کے ہاں یہ اصول فقہیہ کی ایک اصل ہے، کیونکہ فقہ نص پر یا محمول نص پر قائم ہوتی ہے، اور قیاس نام ہے نص پر عمل کرنے کا، چنانچہ شیخ فقہائے عراق ابوحنیفہؒ تو قیاس کے سلسلے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

علم اصول کا غیر معمولی عروج و فروغ

حضرات امامیہ کے ہاں تیسری صدی ہجری میں یہ تھی کیفیت اصول فقہ کی۔

پھر چوتھی صدی آئی، اس صدی میں امامیہ کے ہاں علم اصول فقہ نے غیر معمولی طور پر عروج و فروغ حاصل کیا۔

اس کے دو۲ سبب تھے۔

(۱) غیبت امام

جب تک امام موجود تھا احکام میں اس پر تکیہ کیا جاتا تھا، لیکن اس کی غیبت کے بعد وہ ضوابط استنباط اور موازین آراء کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہوئے، تاکہ اُن کا اجتہاد دلیل و

برہان پر قائم ہو، محض اندھے کی لاٹھی نہ ہو جس کے بارے میں نہیں معلوم کہ سانپ کے سر پر لگتی ہے یا لکڑی کے سر پر۔

(۲) اکثر امامیہ کے نزدیک باب اجتہاد مفتوح ہے — چنانچہ اگر کسی مسئلے میں اقوال ائمہ کی نص نہیں ملتی تو وہ اجتہاد کر لیتے ہیں، اس معاملے میں وہ اتنے کشادہ فکر ہیں کہ ان کا اجتہاد قیاس کے بغیر اور اقوال ثابتہ ائمہ پر تخریج سے بے نیاز ہو کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اس موضوع پر بہت سی کتابیں بعد کی صدیوں میں مرتب اور مدوّن ہوئیں، ان سب کا احصاء بھلے لئے مشکل ہے، لیکن ان میں سے چند کی طرف ہم ضرور اشارہ کریں گے جو اصول فقہ کے موضوع پر ہیں اور جن میں گراں بہا ورثہ اخلاف کے لئے موجود ہے۔

السید شریف المرتضیٰ — چوتھی صدی ہجری اور پانچویں صدی ہجری کے نصف اول میں جن اعیان علماء نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں ان میں السید شریف المرتضیٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، انھوں نے اصول فقہ پر نہایت اہم معرکۃ الآراء اور فکر آفرین کتابیں لکھی ہیں، جن میں "الذریعۃ فی علم اصول الشریعۃ" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں اس علم کے تمام مباحث خوبی اور قابلیت کے ساتھ سمیٹ لئے ہیں۔ شاید حضرات امامیہ کے ہاں علم اصول کی یہ پہلی جامع مانع، مکمل اور مفصل اور ہر کوتاہی سے مبرا کتاب ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے السید حسن الصدر فرماتے ہیں:۔

"یہ کتاب اس علم میں مرجع اور مصدر رہی ہے"[1]

اور شریف مرتضیٰ اپنے وقت کے اکابر شیعہ میں بہت بڑا مرتبہ رکھتے تھے، ان کا نسب امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق سے ملتا ہے ۳۴۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

موسوعات فقہیہ کا عصر — اب پانچویں صدی ہجری آتی ہے۔ یہ صدی موسوعات فقہیہ کا عصر ہے، بلکہ کہنا چاہئے جملہ علوم اسلامیہ کے موسوعات کا عہد، حضرات شیعہ میں ایسے اعلام پیدا ہوئے جنہوں نے فقہ اصول میں طویل و ضخیم کتابیں تحریر کیں۔

شیخ طوسی کی ہمہ گیر شخصیت — ان میں سر فہرست الشیخ ابو جعفر محمد بن الحسن بن علی الطوسی ہیں جن کی وفات ۴۶۰ھ میں ہوئی، یہ شریف مرتضیٰ کے شاگرد تھے، السید الصدر ان کے بارے میں لکھتے ہیں

---

[1] کتاب تاسیس الشیعہ ص ۳۱۳۔

"یہ علی الاعلان شیخ الطائفہ کے منصب پر فائز ہیں۔ فقہ وحدیث اور تفسیر و کلام کے امام ہیں ایسی کتابیں لکھیں کہ مسلمانوں میں ان سے کوئی سبقت نہیں لے جا سکا، جن میں ایک کتاب "المبسوط فی التفریع علی الاصول الفقہیۃ" ہے، جو ایک ترتیب خاص کے ساتھ جمع ابواب فقہیہ پر مشتمل ہے، ان کی ایک اور کتاب "الخلاف فی الفقہ" ہے ایک اور کتاب "النہایۃ" ہے' یہ فقہ پر حاوی ہے، جو فروع مستنبط از احادیث اہل بیت علیہم السلام پر ترتیب حکم کے ساتھ مبنی ہے۔[1]"

ان کی ایک اور کتاب "العدۃ" ہے، یہ جملہ مباحث و مسائل کی جامع ہے' اس میں اس علم کی وضاحت عمومی طور پر اور منہاج شیعہ کا بیان خصوصی طور پر موجود ہے۔

محمد بن علی الحمصی | الطوسی کے معاصرین میں محمد بن علی الحمصی الرازی بھی ہیں، جو کتاب المصادر فی اصول الفقہ" اور کتاب تنقیح عن التحیین والتقبیح کے مصنف ہیں۔

چھٹی صدی ہجری اور قرون ملحقہ حضرات شیعہ کی کتب اصول سے بھرپور ہیں۔

آیت اللہ علامہ جمال الدین المطہر | ساتویں صدی ہجری اور آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں آیۃ اللہ العلامہ جمال الدین حسن بن یوسف بن علی المطہر المتوفی ۷۲۶ھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اس علم میں ایک کتاب "النہایۃ" لکھی جو علم اصول میں ایک مبسوط کتاب ہے۔ اس کا اختصار ایک دوسری کتاب میں کیا جس کا نام "التہذیب الاصول" ہے۔ اس کتاب کی بہت سی شرحیں اور حاشیے لکھے گئے ہیں، اسی علم میں ایک اور کتاب "المبادی" بھی انھوں نے قلمبند کی، نیز ایک اور کتاب لکھی جس کا نام ہے کتاب شرح غایۃ الرسول الی علم الاصول[1]"

امامی فقہ کا تاریخی جائزہ | فقہاء امامیہ کے علم اصول کے ادوار کا یہ تاریخی جائزہ تھا جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ اصول اور مناہج انھوں نے ائمہ سے حاصل کئے ہیں۔

۱۔ اخذ: از کتاب تاسیس الشیعہ ص ۴۴،۴۳ ملخصاً

اصول فقہ امامیہ
کتاب و سنّت اور عقل و اجماع پر تکیہ

آل کاشف الغطاء کا بیان جب ہم برادران امامیہ کی کتب اصول پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ کتاب و سنت اور عقل و اجماع پر تکیہ کرتے ہیں اس بحث پر گفتگو کرتے ہوئے السید محمد آل کاشف الغطاء نے اپنی کتاب "اصل الشیعہ و اصولہا" میں لکھا ہے:

مسلمان اس بات پر بالکل متفق ہیں کہ اولہ احکام شرعیہ پہلے کتاب و سنت پر پھر عقل و اجماع پر منحصر ہیں اس باب میں امامیہ اور دوسرے مسلمانوں کے مابین کوئی خاص فرق نہیں ہے ہاں یہ سچ ہے کہ دوسرے امور میں امامیہ غیر امامیہ سے مختلف ہیں۔ مثلاً امامیہ قیاس پر عمل نہیں کرتے، کیوں کہ ان کے ائمہ سے بصورت تواتر منقول ہے کہ اگر شریعت میں قیاس نے دخل پایا تو شریعت گئی۔ علاوہ ازیں امامیہ صرف ان حدیثوں کو صحیح مانتے ہیں جو طریق اہل بیت سے ان تک پہنچی ہوں یعنی جس حدیث کی روایت الصادق نے اپنے والد الباقر سے اور انھوں نے اپنے والد زین العابدین سے اور انھوں نے الحسین سبط الرسولؐ سے اور انھوں نے اپنے والد امیر المومنین سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کی ہو۔ علاوہ ازیں امامیہ کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے بخلاف جمہور مسلمین کے لہ!"

اس عبارت مندرجہ بالا سے دو امر مستفاد ہوتے ہیں۔

(۱) اگر نص نہ ہو تو عقل پر اعتماد۔

(۲) نفی قیاس۔

لہ اصل الشیعہ و اصولہا ص ۹۲۔

جہاں تک اعتماد بر عقل کا تعلق ہے امامیہ کے ہاں یہ بات متفق علیہ نہیں ہے، کیوں کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو قول امام پر فتویٰ دیتے ہیں یہ صرف اخبار پر تکیہ کرتے ہیں، انہیں دوسرے فقہی اصولوں کی ضرورت نہیں یہ عقل سے فیصلہ طلب نہیں کرتے نہ باب اجتہاد کو مفتوح مانتے ہیں۔

یہ حضرات کتب اخبار معروفہ اربعہ یعنی الکافی من لایحضرہ الفقیہ التہذیب، اور الاستبصار کو قطعی السند مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ احادیث کو اقسام معروفہ صحیح، حسن، موثق ضعیف اور مرسل وغیرہ کی صورت میں تقسیم کیا جائے۔ ان کے نزدیک یہ کتابیں ہر حیثیت سے کافی ہیں۔ کسی دوسرے اصول فقہی کی ضرورت نہیں اور اگر ہے تو صرف قرآن اور اخبار کی اجماع اور عقل کی ہرگز نہیں۔

ان کا خلاصہ مذہب یہ ہے کہ قیامت تک امت کو جن چیزوں کی ضرورت ہوگی وہ مصادر قطعیہ یعنی قرآن اور اخبار میں موجود ہیں نسخ، تقیید، تخصیص اور تاویل کے تمام مسائل عترت طاہرہ نے بیان کر دئے ہیں، قرآن صرف طریق ائمہ سے سمجھا جا سکتا ہے، جو لوگ اپنی فہم سے سمجھنا چاہتے ہیں سو ان کا فہم ناقص ہے مفتاح، تفسیر ذات امام ہے اور علم ائمہ کتب اخبار مذکورہ میں مدون ہو چکا ہے۔ احکام شرعیہ خواہ وہ اصول دین سے تعلق رکھتے ہوں یا فروع سے وہی صحیح ہیں جو ائمہ اطہار سے مسموع ہوں، نیز احکام عملیہ کا استنباط ظواہر کتاب اللہ اور ظواہر سنت نبیؐ سے جائز نہیں ہے کہ ان کی تفسیر اہل ذکر ہی کر سکتے ہیں اور وہ ائمہ ہیں مجتہد سے اگر اجتہاد میں غلطی ہوتی ہے تو اللہ پر جھوٹ بولتا ہے جس کی اُسے سزا ملے گی، اور اگر صحیح اجتہاد کرتا ہے تو اس سے مواخذہ نہیں ہوگا۔[1]

دوسرا فریق وہ ہے جس کی ترجمانی سید آل کاشف الغطاء کرتے ہیں جن کی رائے ہم اوپر نقل کر چکے ہیں

روایاتِ ضعیفہ وقویہ کی موجودگی

لیکن یہ اخباری فریق تعداد میں زیادہ نہیں ہے، کیوں کہ اکثر شیعہ ایسے ہیں جو ان کتابوں میں روایات ضعیفہ اور روایات قویہ کی موجودگی تسلیم کرتے ہیں، نیز یہ کہ ان روایات کو علم مصطلح الحدیث کے اعتبار سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔

کتاب "اعیان الشیعہ" میں مذکور ہے کہ اکثر اخبار مرویہ کی سند قطعی نہیں ہے اور ان کتابوں کی حدیثیں مختلف المراتب ہیں، ان میں صحیح بھی ہیں، حسن بھی، موثق بھی، ضعیف بھی اور مرسل بھی۔

---

[1] مقدمہ شرح دیوان الشریف المرتضیٰ الاستاذ رشید رضا، ص ۲، ۳، ۷، بہ تصرف قلیل

ہر دو مناہج کا فرق ان ہر دو منہاجوں کے مابین جو فرق ہے وہ واضح ہے۔

(۱) اخباری حضرات کتب اربعہ کی تمام چیزوں کو بغیر تحیص کے صحیح مانتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اصولی ہیں وہ تحیص اخبار کو ضروری خیال کرتے ہیں، ان کے نزدیک ضعیف حدیث قابل قبول نہیں، تحلیل وتحریم میں احتیاط لابدی ہے، ہر چیز کی اصل برأت ہے اور اباحت ہے جب تک اس کے خلاف کوئی دلیل نہ ہو۔

اخباریوں کے نزدیک اجتہاد کی اہمیت نہیں (۲) اخباری حضرات کے نزدیک اجتہاد کوئی اہمیت نہیں رکھتا، وہ ائمہ کی تقلید کرتے ہیں، جہاں نص نہیں ملتی توقف کرتے ہیں۔ اخبار کو کتاب اللہ پر پیش نہیں کرتے، ان کا دعویٰ ہے کہ جو کچھ اخبار میں ہے وہ کامل ہے کافی ہے، اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں، اس میں ہر حکم موجود ہے۔

لیکن اکثر امامیہ کے نزدیک باب اجتہاد کھلا ہوا ہے اور اخبار ہر مسئلے کے لئے کافی نہیں ہیں۔

اس امر پر ہر دو فریق متفق ہیں کہ جو کچھ ائمہ سے عام طور پر اور امام جعفر صادق اور امام باقر سے خاص طور پر مروی ہے۔ اگر اس کی صحت ثابت ہے تو وہ حجت ہے، کیونکہ وہ مفسر قرآن اور عموم قرآن کے مخصص ہیں۔ اس لئے کہ وصایت امامت کی رُو سے وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ علم نبوت کا حصہ ہے۔

امامیہ حضرات اور فرقہ ظاہریہ برادران امامیہ کا معاملہ فرقہ ظاہریہ سے یکسر مختلف ہے۔ ظاہریہ اجتہاد بالرائے کے بالکل مخالف ہیں لیکن حضرات اثنا عشری اجتہاد بالرائے کا انکار نہیں کرتے وہ صرف قیاس کا انکار کرتے ہیں اور بس!

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم قیاس سے کام لیتے ہو؟"

ابوحنیفہ نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا:

قیاس سے کام مت لو، سب سے پہلے جس نے قیاس سے کام لیا وہ ابلیس تھا کہ اللہ تعالیٰ سے کہا تو نے مجھے آگ سے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پس اس نے آگ اور مٹی کے درمیان قیاس کیا اگر وہ نوریت آدم کا نوریت نار سے قیاس کرتا تو دو نور، نوروں میں سے ایک کے فضل کا عرفان حاصل کر لیتا!"

بہرحال یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ امام صادق رضی اللہ عنہ۔ اور امام باقر بھی۔ اجتہاد بالقیاس کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔

"التہذیب" میں وارد ہے۔

"التہذیب" کا بیان "حنان بن سدیر کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوعبداللہ نے کہا کہ ابن شبرمہ نے مجھ سے دریافت کیا:

"قسامت دم کے بارے میں آپ، کیا فرماتے ہیں؟"

"میں نے جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا بتا دیا، انھوں نے کہا۔

"یہ بتائیے اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اس باب میں آپ کا قول کیا ہوتا؟"

میں نے جواب دیا:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل بتا دیا اور جو کچھ انہوں نے نہیں کیا اس کا مجھے علم نہیں ہے[1]

یہ روایت طوسی نے اپنی کتاب "التہذیب" میں درج کی ہے، اس سے دو امر سامنے آتے ہیں۔

(۱) امام صادق قیاس کی نفی کرتے ہیں وہ توقف کرتے ہیں قیاس نہیں کرتے، گویا اپنی رائے سے فتویٰ نہیں دیتے، سنت اور قرآن پر توقف کرتے ہیں، اگر نص ناطق یا فعل نہیں ملتا تو خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔

---

[1] المسند ص ۱۴۱۔

امام صادق اور قیاس و اجتہاد

تقلید کی ممانعت، اجتہاد کی دعوت

امام صادق کے آثار مرویہ

یہ سوال کہ کیا حضرات اثنا عشری نفی قیاس اور فتح باب اجتہاد کے سلسلے میں اقوال امام صادق پر تکیہ کرتے ہیں؟

ہمارا جواب یہ ہے کہ الکافی میں امام جعفر صادق سے جو آثار مروی ہیں وہ تقلید سے روکتے ہیں، ایسے آثار بھی ملتے ہیں جن سے قیاس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے پس اجتہاد بغیر قیاس امام جعفر صادق کی خبر سے ثابت ہے اب ہم ان اخبار پر ایک نظر ڈالیں گے۔

الکافی میں وارد ہوا ہے کہ امام صادق ان لوگوں کو جو تقلید کرتے ہیں مگر اجتہاد نہیں کرتے ان لوگوں سے تشبیہ دی ہے جو احبار اور رہبان کی اندھا دھند پیروی کرتے ہیں، اس سے صریحی طور پر تقلید کی برائی واضح ہوتی ہے، اور ضرورت اجتہاد کا لزوم ثابت ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق کی طرف اس ارشاد کی نسبت میں ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں ہے اس لئے کہ ان کا زمانہ عصر اجتہاد تھا نہ کہ عصر تقلید، امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے!

"ہم سے کوئی چیز اس وقت تک نہ لو جب تک معلوم نہ کر لو کہ ہم نے اسے کہاں سے لیا ہے"؛

امام شافعی اپنے تلامیذ کو تاکید کیا کرتے تھے کہ اس حدیث کو اختیار کر لیں جو ان کے نزدیک صحیح ہو اور ان کے (شافعی کے) قول کو اگر مخالف حدیث ہو ترک کر دیں، ان کا قول تھا!

"صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے"!

پس امام صادق جب تقلید سے منع کرتے ہیں تو روح عصر کی ترجمانی کرتے ہیں، اور اپنے ہم عصر فقہاء کی نمائندگی فرماتے ہیں۔

نفی قیاس کے بارے میں الکافی کا بیان

نفی قیاس کے بارے میں "الکافی" کی عبارت یہ ہے:

عیسیٰ بن قرشی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ابوحنیفہ ابوعبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان سے فرمایا:

(۲) اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام صادق کا کلام ہمائے خود سنت نہیں تھا، وہ بغیر نص واضح کے حلال و حرام کا فیصلہ نہیں کرتے، اس خبر سے اس بات کی بھی صراحت ہوتی ہے کہ وہ اپنے قول کو شرع نہیں خیال کرتے تھے۔

جہاں تک قیاس کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ امام صادق اخذ بالقیاس پر عامل تھے۔ وہ حسب ضرورت و مصلحت رائے اہل مدینہ کے مطابق توقف یا قضا سے کام لیتے تھے۔ اگر وہ رائے زیر مصلحت ہوتی تھی جیسے شئون دولت اسلامیہ میں عمرؓ اپنی رائے استعمال کرتے تھے یا جس طرح حضرت علیؓ فتویٰ دیا کرتے تھے۔

امام صادق کی طرف سے اجتہاد کا حکم ائمہ کے بعد یعنی بارھویں امام کی غیبت کے بعد لازمی اور لابدی تھا کہ اصحاب اثنا عشری اجتہاد سے کام لیتے، سوا ان لوگوں کے جو اخباریہ کی حد سے متجاوز نہیں کرتے، لیکن اجتہاد کے وقت، وہ قیاس کو منہاج نہیں بناتے بلکہ عقل کو سبیل بناتے ہیں۔

امام صادق نے اجتہاد کا حکم دیا ہے اور تقلید سے منع کیا ہے، لیکن اجتہاد میں قیاس سے کام نہ لیا جائے تو کسی اور چیز سے اس کی جگہ کام لینا پڑے گا اور ظاہر ہے وہ عقل مدرک ہے جو اچھے اور برے میں تمیز کرتی ہے۔

بہر حال ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو اصول امام صادق نے ہمارے برادران امامیہ کے بیان کے مطابق اختیار کیا تھا وہ تھا قرآن و سنت نیز اقوال ائمہ اور عقل سے استمداد۔ اول اور ثانی یعنی کتاب و سنت جمہور مسلمین کے نزدیک متفق علیہ ہیں بلکہ ان پر اجماع ہے جس نے سنت کا انکار کیا وہ جادۂ صحیح سے منحرف ہوا۔

اب ان اصولوں میں سے ہر ایک پر ہم الگ الگ گفتگو کریں گے۔

القرآن

جس کی حجیّت پر عامۃ المسلمین کا اجماع ہے

دستاویز شریعت

قرآن بر اجماع مسلمین اسلام کی سب سے پہلی حجت ہے وہ مصدر المصادر ہے وہ سجل (دستاویز) شریعت ہے اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے قیامت تک کے لئے لیا ہے وہ نور ہادی ہے سبیل نجات ہے جس نے اس سے تمسک کیا اس نے نجات پائی، جس نے اسے ترک کیا ہلاک ہُوا۔

ہمارے برادران امامیہ اختلاف مسلک کے باوجود، قرآن کی وہی حیثیت تسلیم کرتے ہیں جو تمام مسلمانوں کے ہاں ہے۔ "الکافی" میں وارد ہے کہ ابو عبداللہ سے مروی ہے۔ امیرالمومنین (علی) نے فرمایا:۔

"اے لوگو! اللہ نے تمہارے پاس اپنا رسول صلعم بھیجا اور تم پر اپنی کتاب حق کے ساتھ نازل کی، حالانکہ تم کتاب اور اس کے نازل کرنے والے سے رسول اور اس کے بھیجنے والے سے یکسر ناآشنا تھے، اس قرآن میں عہد گزشتہ کا علم ہے اور قیامت تک کے لئے آنے والی باتوں کا علم ہے، تمہارے معاملات و مسائل کا حکم ہے، جس میں تم مختلف ہو ان کا بیان ہے!"

امام صادق سے مروی امام علی کی طرف منسوب یہ کلام بلیغ قرآن کریم کی منزلت پر شاہد اور دال ہے!

قرآن میں ہر چیز کا شافی اور کافی بیان موجود ہے

اخبار میں امام صادق سے روایت ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا شافی اور کافی بیان موجود ہے۔ "الکافی" میں ہے،

"معلی بن خنیس سے روایت ہے کہ ابو عبداللہ نے کہا:

کوئی ایسی بات جس میں دو آدمی باہم مختلف ہوں نہیں ہے کہ قرآن میں اس کی اصل موجود نہ ہو البتہ عقول رجال کی پہنچ وہاں تک نہیں ہے"[1]

علاوہ ازیں امام صادق سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہر چیز کا بیان کر دیا ہے، یہاں تک کہ خدا کی قسم اللہ نے کوئی ایسی چیز ترک

---

[1] المسند ج ا ص ۱۵۔

نہیں کی ہے جس کے بندے محتاج ہوں، کوئی بندہ بھی کسی بات کے لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ کاش یہ بات بھی قرآن میں موجود ہوتی"!

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صادق کا یہ عقیدہ تھا کہ قرآن میں شریعت اسلامیہ سے متعلق تمام چیزیں موجود ہیں۔

امام صادق کے اس ارشاد سے دو باتوں پر روشنی پڑتی ہے:۔

قرآن جملہ احکام کلیہ پر مشتمل ہے

(۱) یہ کہ قرآن جملہ احکام کلیہ پر مشتمل ہے۔ اور سنت کسی نئی چیز کی حامل نہیں ہوتی، وہ صرف اسی صورت میں قبول کی جاسکتی ہے کہ اسے قرآن کا بیان مان لیا جائے اور اگر اس کی اصل کتاب الٰہی میں موجود نہ ہو تو جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ "الکافی" میں ہے:۔

ابو عبداللہ سے مروی ہے کہ جو حدیث قرآن سے مطابق نہ ہو، وہ مزخرفات میں سے ہے[۱]۔

بہر حال توفیق نصوص مختلفہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر حدیث معارض قرآن نہ ہو تو قبول کی جائے گی، اور اگر دو حدیثیں آپس میں معارض ہوں تو ان میں سے اسے ترجیح دی جائے گی جس کی شہادت قرآن سے ملتی ہو۔

اس سے ثابت ہوا کہ امام صادق اور ان کے متبعین کے نزدیک ہر شے کی اصل قرآن ہے اور سنت اس کا بیان ہے۔

سنّت کی قوت احتجاج قرآن ہے

(۲) امام صادق کے اس ارشاد کا کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن شریعت کلی کا حامل ہے، ہر اصل کلّی اس کے اندر موجود ہے۔ مرجع اوّل وہی ہے دوسرا مرجع سنّت ہے، سنّت حجت قائمہ ہے لیکن اسے قوت احتجاج قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے اور کوئی شبہ نہیں امام صادق کی یہ توجیہ سراسر راست اور برحق ہے۔ امام شافعی نے بھی "الرسالہ" اور "الام" میں اس نقطۂ نظر کی تائید کی ہے اور اسے سراہا ہے۔

شاطبی کا بیان "الموافقات" میں

شاطبی نے بھی اپنی کتاب "الموافقات" میں یہی معنی لئے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

"قرآن میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔"

---

[۱] المصدر ص ۲

اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو شخص عالم قرآن ہے وہ جملہ شریعت کا عالم ہے اور اس کی دلیل یہ ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم ۔ الآیہ

یعنی ہم نے آج کے دن تمہارا دین مکمل کر دیا۔

(ب) دوسری دلیل خود حدیث نبوی ہے۔ آپ نے فرمایا:

یہ قرآن اللہ کی رسی ہے، نور مبین ہے شفا نافع ہے جو اس سے تمسک کرے اس کا محافظ ہے، جو اس کی پیروی کرے اس کے لئے باعث نجات ہے۔[1]

ج:۔ ایک دلیل تجربہ بھی ہے، علماء میں سے کوئی عالم بھی ایسا نہیں ہے جس نے کسی مسئلے میں قرآن سے رجوع کیا ہو، اور کوئی اصل نہ پائی ہو۔

ابن حزم ظاہری کہتے ہیں:

"ابواب فقہ میں سے کوئی باب ایسا نہیں ہے جس کی اصل کتاب و سنت میں سے ہمیں معلوم نہ ہو۔[2]"

پھر ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں۔

سنت قرآن کے مجمل کی تفصیل اور اس کی مشکل کا بیان ہے! حضرت عائشہ رض کا قول ہے کہ آپ کا اخلاق قرآن ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا قول، فعل، عمل قرآن کی طرف راجع ہے۔[3]"

اس نظریے کا مقتضا قبول سنت نبویہ ہے اس لئے کہ وہ قرآن کی طرف راجع ہے جو لوگ اقوال نبی ص کو حجت تسلیم نہیں کرتے وہ گمراہ ہیں، کیونکہ فہم مجملات قرآن سنت کا محتاج ہے۔ مطرف بن عبداللہ کا قول ہے!

"خدا کی قسم ہم قرآن کا بدل نہیں چاہتے لیکن اس کے طالب ہیں جو ہم سے زیادہ قرآن کا عالم ہے۔[4]"

یعنی ہم علم نبی ص کے طالب ہیں کہ اس کی مدد سے قرآن کی تفسیر کر سکیں۔

قرآن شریعت سے متعلق تمام چیزوں پر مشتمل ہے | غرض امام صادق کے کلام سے اس کی تخریج ہوتی

---

[1] یہ حدیث ترمذی میں حضرت علی رض سے مروی ہے
[2] الشاطبی ج ۳ ص ۳۶۹۔
[3] الموافقات ج ۴ ص ۱۲۔
[4] الموافقات ج ۴ ص ۲۲۔

ہے کہ قرآن شریعت سے متعلق تمام چیزوں پر مشتمل ہے، کتاب الصافی میں وارد ہے:

"اموریں سے کوئی امر ایسا نہیں ہے، جو قرآن میں مذکور نہ ہو یا لنفسہٖ یا مقدمات اسباب مبادیات اور غایات کے اعتبار سے"!

امام صادق رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنن کی روایت کرتے اور ان کے قبول کا اعلان کرتے تھے۔

روایت ہے کہ امام صادق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیل وقال، فساد مال اور کثرت سوال سے منع فرمایا ہے"۔

امام صاحب سے عرض کیا گیا۔

"اے ابن رسول اللہ یہ بات کتاب اللہ میں کہاں ہے"؟

آپ نے فرمایا:

کیوں نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

(۱) "لاخیر فی کثیر من نجواھم الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس"!

نیز اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

(۲) "ولا تؤتوا السفھآء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما"!

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے!

(۳) "لا تسئلوا عن اشیآء ان تبد لکم تسؤکم"!

یعنی

(۱) عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی، ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ خیرات کی اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں۔

(۲) اور کم عقلوں کو اپنا وہ مال نہ دو جسے خدا نے تمہارے لئے مایۂ زندگانی بنا دیا ہے!

(۳) ایسی فضول باتیں مت پوچھو کہ اگر تم سے ظاہر کر دی جائیں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو!

علم قرآن اور اُس کا بیان

امام جعفر صادق کا ارشاد مسئلہ زیر بحث میں

الصافی کا بیان کتاب الصافی میں امام جعفر صادق کی طرف منسوب، یہ عبارت وارد ہوئی ہے:۔ "اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو مبعوث فرمایا اور آپؐ کی ذات پر انبیاء کا آنا ختم کر دیا۔ اب کوئی نبی نہیں آئے گا، کتاب نازل فرمائی، اب اس کے بعد کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی اس کے ذریعے حلال کو حلال اور حرام کو حرام کر دیا اور اپنے نبیؐ کو علم باقی کی حیثیت سے ائمہ کی صورت میں برقرار رکھا، لیکن لوگوں نے انہیں ترک کر دیا۔ ان سے روگردانی اختیار کر لی، انہیں قتل کیا، انہیں چھوڑ کر دوسروں کی پیروی کی۔ ان لوگوں نے منسوخ سے احتجاج کیا اور اسے ناسخ قرار دیا۔ متشابہ سے دلیل لائے۔ اور اسے محکم سمجھا خاص سے حجت پکڑی اور اسے عام تصور کیا، انھوں نے گمراہی اختیار کی اور دوسروں کو گمراہ کیا۔ جو شخص کتاب اللہ کے ناسخ کو منسوخ سے، خاص کو عام سے، محکم کو متشابہ سے، رخصت کو عزیمت سے مکی و مدنی، اسباب تنزیل، الفاظ منقطعہ و مؤتلفہ میں مبہم کو اور اس کے علم قضا و قدر کو، تقدیم و تاخیر کو، مبین و عمیق کو، ظاہر و باطن کو، ابتداء کو انتہاء سے، سوال و جواب کی، قطع و اصل کو، مستثنیٰ اور جاری کو، مؤکد اور مفصل کو، موضع فرائض و احکام کو، یعنی حلال و حرام کو، موصول و محمول کو نہیں جانتا وہ قرآن کا عالم نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کا اہل نہیں اور اگر وہ ان اقسام کی معرفت کا دعویٰ کرتا ہے، تو اس کا یہ دعویٰ دلیل کے بغیر ہے، وہ جھوٹا، مرتاب اور مفتری ہے، اللہ اور رسول پر جھوٹ بولتا ہے، اس کا ٹھکانا جہنم اور وہ بڑی بُری جگہ ہے!"[1]

فہم قرآن کے لئے امور سہ گانہ امام صادق سے منسوب اس کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ فہم قرآن کے لئے امور سہ گانہ کا عالم ہونا ضروری ہے:

---

[1] تفسیر الصافی ص ۱۰۔

حروف، مقطعات اللہ اور رسولؐ کے مابین راز ہیں، حروف مفردہ سے خطاب، دنیائے محبت کی سنت ہے، یہ دوست، دوست کا راز ہے، جس سے رقیب واقف نہیں ہو سکتا ہے!

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ متشابہات، کا ادراک صرف، اصفیا و اوصیا کے بس کی چیز ہے، باقی دوسرے لوگوں کی طاقت، سے باہر ہے!

اس نظریے کے متضمنات، پر ہم آگے چل کر دوسرے موقع پر گفتگو کریں گے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک روایت

ان حضرات نے حضرت، علی سے روایت، کی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی ایسی آیت نہیں اتری کہ آپؐ نے مجھے اس کی تعلیم نہ دی ہو، اور اس کا املا نہ کرایا ہو، میں نے اُسے اپنے خط سے لکھا اور آپؐ نے اس کی تاویل اور ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ سے آشنا کیا اور اللہ سے دعا کی کہ مجھے اس کا فہم و حفظ عطا کرے۔ چنانچہ پھر میں نے قرآن کی کوئی آیت، بھی فراموش نہیں کی نہ وہ علم فراموش کیا جو مجھے آپؐ نے املا کرایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حرام و حلال امر و نہی اطاعت، و معصیت، کے بارے میں، جو کچھ بتایا آپؐ، نے مجھے سکھا دیا اور میں نے اسے حفظ کر لیا اور اس کا ایک حرف، بھی میرے حافظے سے نہیں اترا، پھر آپؐ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر رکھا اور اللہ سے دعا فرمائی کہ میرے قلب کو علم و فہم اور حکمت و نور سے مملو کر دے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ، آپ پر قربان، جب سے آپ نے میرے لئے خدا سے دعا کی ہے میں کچھ بھی نہیں بھولا۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ نے تیرے اور تیرے شرکا کے لئے میری دعا قبول کر لی، جو تیرے بعد ہوں گے۔

"میں نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ میرے بعد کے شرکا کیسے"؟

آپ نے فرمایا۔

وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ سے اور مجھ سے مقرون کر لیا ہے۔

لہ الصافی ص ۲۰

(۱) سب سے پہلی اور اہم چیز ناسخ و منسوخ کا علم ہے جس کے لئے تاریخ نزول قرآن کا علم ضروری ہے۔

(۲) عام و خاص کا علم ناگزیر ہے تاکہ احکام کے معانی و مرامی و غایات کا عرفان ہو سکے اور ان پر تخریج کی جا سکے اور انہی معانی و غایات کے حسب مقتضا فتوی دیا جا سکے کہ گمراہی سے دور رہنے کا یہی راستہ ہے۔

(۳) اسلوب بیان عربی سے واقفیت بھی ضروری اور لابدی ہے کہ بغیر اس کے مؤکد اور غیر مؤکد مجمل اور مفصل، مستثنیٰ اور جاری کا مقتضائے کلام کے مطابق علم نہیں ہو سکتا۔ امام صادقؑ کے ان ارشادات میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جسے رد کیا جا سکے۔

صاحب "الصافی" نے تحریر فرمایا ہے :۔

صاحب "الصافی" کا ارشاد مزید "اس قرآن میں مختلف طوائف اور عقول مختلفہ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ پس لازمی ہے کہ ہر ایک سے اس کی بہ قدر فہم و مقام کلام کیا جائے!"

جب صورت احوال یہ ہے کہ ہر انسان کتاب اللہ کا ادراک اپنی قوت فہم و استعداد ہی کے لحاظ سے کر سکتا ہے۔ تو کوئی ایسا بھی ہے جسے قرآن کا ہر جہتی علم حاصل ہو؟ لوگ اپنے علوم و مدارک کے لحاظ سے کیسا ہی پایہ رکھتے ہوں۔ امام سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، ان کی رسائی صرف قرآن کے ظاہر تک ہو سکتی ہے اور ظاہر بھی پورا نہیں، قرآن میں متشابہات ہیں ان کا علم عامۃ الناس میں سے کسی کو نہیں ہے، پھر قرآن کا ایک باطن ہے اور یہ سر قرآن ہے جسے تمام لوگوں پر منکشف نہیں کیا جا سکتا یہ شرف صرف ائمہ کو حاصل ہے۔

ائمہ قرآن کے ظاہر و باطن کے عالم ہیں ائمہ کو قرآن کے ظاہر و باطن کا پورا علم ہے نہیں محکم اور متشابہ کا پورا پورا علم ہے، وہ محکم اور متشابہ سے بخوبی واقف ہیں۔ بلکہ متشابہ تو صرف عوام کے لئے متشابہ ہے۔ جہاں تک ائمہ کا تعلق ہے ان کے لئے کوئی چیز بھی متشابہ کے ذیل میں نہیں آتی، حروف مقطعات تک ائمہ پر منکشف ہیں کیوں کہ وہ راسخون فی العلم ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :۔

وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم!

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ ائمہ راسخون فی العلم ہیں، اور :۔

وہ فرماتا ہے !

"اطاعت کرو خدا کی اور رسولؐ کی، اولی الامر کی جو تم میں سے ہوں"!

"میں نے عرض کیا وہ کون لوگ ہیں"؟

آپ نے فرمایا۔

"میرے اوصیاء یہ سب ہادی اور مہدی ہوں گے، امت ان سے نصرت پائے گی۔ شاداب ہوگی، ان کے ذریعے بلا رفع ہوگی اور ان کی دعا مستجاب ہوگی"!

یہ کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علم قرآن حضرت علی کے پاس تھا اور ان کے بعد اوصیاء اثنا عشریہ کے پاس ان میں سے ہر ایک امام تھا اور ہر ایک کے پاس علم قرآن کریم تھا۔

ہمارے برادران امامیہ کا خیال ہے کہ قرآن کے دو پہلو ہیں!

قرآن کے دو پہلو ظاہر و باطن | ایک ظاہر ایک باطن۔ عام لوگ صرف ظاہر سے آشنا ہیں، رہا باطن سو وہ بعید اور عمیق ہے اس کا علم یا تو اللہ کو ہے، یا ان لوگوں کو جو ان سے فیض یاب ہوں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا!

"قرآن کا ایک ظاہر ہے ایک باطن۔ اس کی ایک حد ہے اور ایک مطلع"!

امام علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

قرآن کی کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس کے چار معنی نہ ہوں"!

(۱) ظاہری معنیٰ

(۲) باطنی معنیٰ

(۳) حد کا مفہوم۔

(۴) مطلع

پس ظاہر تلاوت ہے اور باطن فہم اور حد، عبارت ہے حلال وحرام سے اور مطلع کا مطلب ہے عبد سے اللہ تعالیٰ کی مراد!"[۱]

اس عبارت کا مفہوم یہ ہوا کہ علم باطن صرف اوصیاء کے لئے مخصوص ہے، علم ظاہر عام لوگوں کے

---

[۱] - الصافی ص ۸، ۲۱

لئے ہے موعظت و عبرت کے مدلولات سے متجاوز نہیں، اسی لئے قرآن کو "مبین" کہتے ہیں اس کا علم حاصل کر لینا ہر شخص کے بس میں ہے، لیکن علم باطن متشابہہ کی طرح ہے بلکہ متشابہہ اس کی ایک شاخ ہے، اس کا علم، اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ اور ائمہ اخیار کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

حضرات امامیہ نے فہم قرآن کو چار مراتب پر تقسیم کیا ہے!

(۱) فہم عبارت | یہ عام لوگوں کے لئے ہے۔

(۲) فہم اشارہ غایات الفاظ بعیدہ | یہ مرتبہ مخصوص علماء کے لئے ہے جو رساسات الفاظ میں اور ان کے اشارات و غایات پر عبور کامل رکھتے ہیں، یہ دلالات الفاظ کا ایک حصہ ہے۔

(۳) ادراکات لطائف و دقیقہ | یہ مرتبہ پہلے اور دوسرے سے برتر اور اعلیٰ ہے، یہ عبارت ہے ادراکات لطائف و دقیقہ سے جو ماوراء الفاظ ہوتے ہیں اس مرتبے پر صرف وہ اولیاء متاثر ہوتے ہیں جو اوصیاء کے دامن سے وابستہ رہیں، پس انہیں علم اوصیاء کا کچھ حصہ مل جاتا ہے۔

مذکورہ مراتب ثلاثہ مدلولات الفاظ میں داخل ہیں، اس لئے کہ بہرحال یہ اشارات، عبارات اور لطائف پر مشتمل ہوتے ہیں!

(۴) باطن کے دروازے پر دستک | تیسرا مرتبہ گویا باطن کے دروازے پر دستک ہے، اور چوتھا مرتبہ بجائے خود عبارت ہے باطن سے!

قرآن کا باطن اور باطن کے باطن کا باطن | یہ ہے ہمارے برادران امامیہ کا کلام قرآن کے باطن اور باطن کے باطن کے بارے میں بلا شبہہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ قرآن میں اسرار ہیں، اور ان اسرار تک رسائی کون واجتماع اور نفس انسان کی دراست سے ممکن ہے۔

لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان اسرار تک صرف بعض مخصوص نفوس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ یا یہ علم اسرار ایسا علم ہے جو نبوت سے ماخوذ ہے، چنانچہ ابوالائمہ علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں ارشاد نبوی "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" سے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا۔

"اس سے مراد وہ علم نہیں ہے جس سے دوسرے محروم ہیں، صرف وہ فہم مراد ہے جو مجھے دی گئی ہے!"

بہر حال یہ ہیں ہمارے اور برادران امامیہ کے افکار وخیالات اس بارۂ خاص میں اس مرحلے پر آکر ہماری اور ان کی فکر و نظر میں افتراق ہو جاتا ہے۔ لیکن تکفیر و تفسیق کے ساتھ نہیں!

قرآن کا باطن غزالی کے نزدیک

غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ قرآن کریم کے کچھ اسرار ہیں جن کا علم راسخون علوم عربیہ و نقہیہ و کمہینۂ دانسانیہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، ادراک و فہم میں لوگ متفاوت ہوتے ہیں اور ہر ادراک اگر وہ قرآن کے دائرہ عبارت کے اندر ہے صحیح ہے!

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں:۔

"ظاہر تفسیر میں سب سے پہلے نقل و سماع لازمی چیز ہے، تاکہ انسان مواقع غلط سے بچ سکے۔ اس کے بعد تفہیم استنباط اور استخراج غرابت کا وسیع میدان آتا ہے، جس کا فہم بغیر سماع کے ممکن نہیں اور احکام ظاہر سے واقف ہوئے بغیر باطن تک پہنچنا ممکن نہیں جو شخص فہم اسرار قرآن کا مدعی ہے لیکن تفسیر ظاہر سے ناواقف ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو دروازے پر قدم رکھے بغیر گھر میں داخل ہو جانے کا مدعی ہے یا ترکوں کا مفہوم و مقصد سمجھ لینے کا مدعی ہے حالانکہ ترکی زبان سے ناواقف ہے پس ظاہر تفسیر بیان و زبان کی طرح ہے جس کے بغیر اصل مفہوم کا سمجھ لینا ناممکن ہے۔[1]"!

پھر آگے چل کر امام موصوف نے فرمایا ہے:

اسرار قرآن کا انکشاف راسخین علم پر بہ قدر پایۂ علم اور صفا قلب اور وفور تدبر اور تجرد طلب ہوا کرتا ہے، ہر شخص کے لئے درجہ اعلیٰ تک پہنچنے کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ جہاں تک استیفاء کامل کا تعلق ہے کوئی شخص بھی جملہ اسرار پر عبور نہیں حاصل کر سکتا اگرچہ سارے سمندر روشنائی اور درخت قلم بن جائیں، کیوں کہ اسرار حکمات الٰہی کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس اعتبار سے معرفت ظاہر تفسیر کے بعد مخلوق فہم میں متفاوت ہے[2]!"

گویا حجۃ الاسلام امام غزالی قرآن کے ظاہر و باطن کے سلسلے میں عقیدۂ صریحہ سے متعلق ہمارے برادران شیعہ سے متفق الرائے ہیں۔

---

[1] الاحیاء العلوم ج ا ص ۲۶۳۔

[2] الاحیاء ج ا ص ۲۶۳۔

قرآن کی تفسیر بالرائے نزد امامیہ

قرآن کی تفسیر بالرائے کے معاملے میں جمہور کا مسلک یہ ہے کہ سنت ماثورہ یا قول صحابی سے ہٹ کر بھی جائز ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو رائے کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں وہاں ایسے بھی ہیں جو اسے بند کر دیتے ہیں ان کے نزدیک تفسیر صرف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرویات کی بنا پر یا اقوال صحابہ و تابعین کی بنا پر کی جاسکتی ہے، یہ آخری رائے ابن تیمیہ کی ہے اس خیال کے لوگ قرآن کی تفسیر پہلے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں تلاش کرتے ہیں وہاں اگر نہ ملے تو صحابہ کے ہاں جستجو کرتے ہیں کیوں کہ انہوں نے براہ راست آنحضرتؐ سے تفسیر کا علم حاصل کیا تھا، انہی کے مابین قرآن نازل ہوا تھا۔ اگر انہیں کوئی بات مبہم نظر آتی تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کر لیتے۔

اگر صحابہ کے ہاں بھی کسی آیت کی تفسیر نہ ملتی تو اقوال تابعین پر مشتمل تفسیر ماثور کی جستجو کرتے جنہوں نے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ اور تابعین میں سے کسی کے ہاں کوئی چیز نہ ملے اور اگر صحیح طور پر ان سے کوئی چیز ماثور نہ ہو تو پھر توقف کرتے ہیں، توقف کی دلیل یہ قول الٰہی ہے:۔

ولا تقف ما ليس لك به علم ان السمع والبصر والفؤاد كل اولئك كان عنه مسئولا

یعنی "جس چیز کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو بے شبہ سمع بصر اور قلب سب سے باز پرس ہوگی!"

ان کا خیال ہے کہ اس عموم نہی میں قرآن کی تفسیر بالرائے شامل ہے۔

غرض یہ کلام جمہور اور اختلاف علماء تفسیر بالرائے کے بارے میں سے اکثر کے نزدیک قرآن کی تفسیر و فہم بالرائے جائز ہے بلکہ اگر اثر موجود نہ ہو تو واجب ہے۔ اس لئے کہ قرآن مبین ہے۔

لیکن ہمارے برادران امامیہ کے نزدیک قرآن کی تفسیر بالرائے جائز نہیں ہے یہ کام صرف وہ کر سکتا ہے جو علم اوصیاء سے بہرہ مند ہو، اس لئے کہ قرآن کا علم کلی صرف اوصیاء کے پاس ہے اور فہم بالنص کا دائرہ ان کے ہاں زیادہ وسیع ہے کیوں کہ نص صرف حدیث نبوی تک مقتصر نہیں ہے بلکہ اقوال ائمہ بھی اس میں داخل ہیں۔

(۱) آثار نبویہ سے استدلال

امامیہ آثار نبویہ سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔"

تفسیر قرآن کی جرأت بھی ممنوع ہے جب کوئی الفاظ مبہم، اقتصار، حذف و اضمار، تقدیم و تاخیر، ناسخ و منسوخ، خاص و عام، رخصت و عزیمت، محکم اور متشابہ وغیرہ سے واقف نہ ہو، جو درجہ آیات کی معرفت نہ رکھتا ہو اور تفسیر کے لئے فوراً آمادہ ہو جاتا ہو اور مجرد فہم عربیت کے باعث استنباط معانی کی سعی کرنے لگتا ہو، وہ زیادہ سے زیادہ غلطیاں کرے گا اور ان لوگوں کے زمرے میں داخل ہوگا جو تفسیر بالرائے کے مجرم ہیں[1]۔!"

انکار غزالی سے ہم آہنگی

یہ کلام ہے صافی کا جو امامیہ میں ایک مرتبہ خاص پر فائز ہیں یہ خیالات بڑی حد تک غزالی کے ان افکار سے ہم آہنگ ہیں جن کا اظہار انھوں نے الاحیاء میں کیا ہے۔

امام صادق کی رائے اس باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ تفسیر قرآن کا حق اُسے دیتے ہیں جو ناسخ و منسوخ اور خاص و عام وغیرہ سے بخوبی واقف ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صادق کی رائے میں تفسیر قرآن اس شخص کے لئے جائز ہے جو قرآن اور اس کے اسالیب اور اسباب نزول اور تاریخ نزول قرآن اور ناسخ و منسوخ وغیرہ سے واقف ہو، جو اس مرتبے پر فائز ہو وہ اپنی رائے سے تفسیر کر سکتا ہے بشرطیکہ ذاتی رائے اس کی تفکیر پر غالب نہ ہو اور اپنی بدعت یا سابق رائے کی تائید کا قرآن سے طالب نہ ہو!

---

[1] الصافی ص ۱۰۔

امام جعفر صادق سے عیاشی نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ

(ب) امام صادق کی روایت | انھوں نے فرمایا:-

"اگر کسی نے اپنی رائے سے تفسیر قرآن درست بھی کی تو اُسے اجر نہیں ملے گا اور اگر غلطی کی تو آسمان سے دُور ہو گیا!"

ابو جعفر امام باقر سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

(ج) امام باقر کا ارشاد | "جس نے قرآن کے بعض حصے کو بعض پر دے ٹپکا اس نے کفر کا ارتکاب کیا!"

یعنی جس نے قرآن کی تفسیر ہوائے نفس سے کی اس نے کفر کا ارتکاب کیا:

رائے سے، مراد وہ رائے ہے جو ائمہ کے علم و اثر سے مستفاد اور ماخوذ نہ ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ برادران اثنا عشریہ مطلق طور پر تفسیر بالرائے کے خلاف نہیں ہیں

تفسیر بالرائے | وہ اس تفسیر کے خلاف ہیں جو اقوال اوصیاء کے خلاف ہو، وہ اس رائے کی مخالفت کرتے ہیں جو ائمہ کے علم و اقتدار سے بہرہ ور نہ ہو۔

گویا یہی سمجھنا چاہیئے کہ تفسیر بالرائے کی ممانعت دو وجوہ

تفسیر بالرائے سے اختلاف کے وجوہ | پر مبنی ہے۔

(۱) مفسر کسی امر شرعی میں پہلے سے کوئی رائے رکھتا ہو اور اس کا میلان اس رائے کی تائید و نصرت کی حمایت میں ہو اور وہ قرآن سے ایسی آیت تلاش کر لائے جو اُس کے میل و خیال کے مطابق ہو جیسے بعض فرقوں کے لوگ اپنی بدعت کو درست ثابت کرنے کے لئے قرآن کی آیتیں تلاش کر لیتے ہیں، حالانکہ جانتے ہیں آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے لیکن حریف مقابل کو مغالطہ دینے کے لئے ایسا کر گزرتے ہیں کبھی جہل کے باعث بھی اسی طرح کی حرکت کا ارتکاب کر جاتے ہیں، اگر آیت متحمل ہوتی ہے تو ان کی فہم اس طرف جھکتی ہے جو ان کے مدعا کے مطابق ہو، باطنیہ فرقے کے لوگ اپنے مقاصد فاسدہ کے لئے لوگوں کو مبتلائے فریب کرنے اور اپنے مذہب باطل میں داخل کرنے کی خاطر قرآن سے وہ مراد لیتے ہیں جو قطعاً اس کا منشا نہیں ہوتا[1]!"

(۲) قرآن سے متعلق نقل و سماع سے بے بہرہ ہوتے ہوئے محض عربی دانی کے بھروسے پر

---

[1] الصافی ص ۱۰ -

قرآن کریم میں
نہ کوئی نقص ہے نہ تبدیلی ہوئی ہے

قرآن متواتر ہے قرآن متواتر طور پر چلا آرہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے اس کے سامنے سے یا پیچھے سے باطل نہیں آسکتا، جب عقل گمراہ ہو جائے اور فتنے سر اٹھانے لگیں وہ مسلمانوں کا مرجع ہے، وہ ظلمت شب میں روشن چراغ ہے، وہ ظلمات شر میں نور ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ رہنے والی حجت ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے۔

اصحاب نبی نے صرف قرآن کی عبارت حفظ نہیں کی بلکہ اس کی قرأت اور ترتیل بھی حفظ کی، کہاں غنہ ہے، کہاں مد ہے۔ کہاں وقف ہے۔ وغیرہ تک۔

جہاں تک کہ اہل علم کا اس پر اجماع ہو گیا کہ قرأت سنت متبعہ ہے جس میں تغیر اور تبدیلی نا جائز ہے حفظ قرآن کا سلسلہ متواترہ عہد نبیؐ سے ہمارے زمانے تک یکساں اور غیر منقطع چلا آرہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھایا تھا، جیسے جبریلؑ نے انہیں پڑھایا تھا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے مرتب کیا تھا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کے ساتھ اس کا مذاکرہ فرمایا تھا کوئی کتاب اپنے وجود کے ساتھ ایسا تواتر اور تسلسل نہیں رکھتی۔

اتحاد مسلمین و اسلام کی کوشش قرآن کو اس مرتبہ عظمت وقدسیت پر فائز دیکھنے والوں کو یہ بات پسند نہ آئی جو لوگ افتراق اسلام و مسلمین کے لئے کمر باندھے بیٹھے تھے۔ قرآن ہمیشہ ان کے لئے ہدف بنا رہا لیکن وہ اس کے خلاف کوئی بات نہ کہہ سکے، وہ ان کی پہنچ سے بہت اونچا تھا اس پر جو تیر پھینکے گئے وہ الٹے انہی لوگوں کے سینے پر آکر لگے۔

اور یہ لوگ جب ہر طرح سے عاجز اور درماندہ ہو گئے تو انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ قرآن جتنا کچھ ہے اس سے زیادہ تھا مگر وہ حذف ہو گیا اور اس میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو اصل میں نہیں تھیں، اور عام کا ذب سے بڑھ کر سہل کوئی چیز نہیں، کیونکہ استدلال دشوار اور مستحیل ہے۔ اور ادعا سہل اور میسر ہے۔

ان لوگوں نے کوشش کی کہ اپنے دروغ اور افتراء کو اپنی اختراع کی ہوئی اسناد میں شامل کر کے پھیلا دیں۔ ہمیں

سنیوں کی بعض کتابوں میں ایسی عبارات موہمہ ملتی ہیں لیکن انہوں نے ان باطل دعاوی کو بہرحال رد کر دیا اور ان کا اقرار نہیں کیا، اور انہیں اس طرح نکال پھینکا جیسے سونے سے کھوٹ نکال پھینکی جاتی ہے۔

اس طرح کی روایات ہمارے برادران اثنا عشریہ کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں اور غضب یہ ہے کہ ان کی نسبت امام جعفر صادق کی طرف کی جاتی ہے حالانکہ وہ ان چیزوں سے قطعاً بری ہیں۔

جن لوگوں نے یہ روایات منسوب بہ امام صادق بیان کی ہیں وہ اہل شیعہ کے ہاں ایک مقام رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ امر واقعہ ہے کہ جمیع مومنین امامیہ نے ان روایات کی تکذیب کی اور امام صادق اور ان کے آباء کرام اور اہل بیت اطہار کی طرف سے بھی مذکورہ روایات کی تکذیب کو روایت کیا۔

جن لوگوں نے یہ غلط ترین دعویٰ کیا ہے ان میں سر فہرست ابو جعفر کلینی ہیں جو اخبار ائمہ کے راوی اوّل ہیں:۔

اب ہم اس مسئلے پر ذرا وضاحت کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

کلینی کی روایت امام صادق سے (۱) کلینی نے امام صادق سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

محمدؐ پر سات ہزار آیتیں نازل ہوئی تھیں اور ہم جن آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں، ان کی تعداد چھ ہزار دو سو تریسٹھ ہے۔ باقی آیتیں آل بیت کے پاس مخزون ہیں"!

کلینی کا قول ہے:

"پورا قرآن صرف ائمہ نے جمع کیا ہے، وہی اس کے علم کلی سے واقف ہیں، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے سارا قرآن جمع کیا ہے وہ دروغ گو ہے، اس کے جمع وحفظ کا کام بالکل اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا تھا، علی بن ابی طالب اور ائمہ بعد کا کارنامہ ہے[۱]"

(۲) کلینی نے امام جعفر صادق سے یہ روایت بھی کی ہے کہ:

"جو قرآن علی کرم اللہ وجہہ نے جمع کیا تھا وہ تمہارے قرآن سے تین گنا زیادہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت فاطمہ رضی ۷۵ دن زندہ رہیں اس عرصے میں ان پر مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، اللہ نے ان کے پاس جبریلؑ کو بھیجا کہ انہیں تسلی دیں۔ ان سے تعزیت کریں۔ علی یہ سب کچھ سنتے تھے اور جو کچھ سنتے تھے لکھ لیتے تھے، یہاں تک کہ یہ مصحف قرآن سے تین گنا زیادہ ہو گیا۔ اس میں حرام وحلال کا کوئی مسئلہ نہیں ہے

---

[۱] الکافی ج ۱ ص ۱۱۰۔

لیکن پیش آنے والے حوادث اور واقعات کا علم ہے[1]۔"

(۳) صافی کی عبارت توجہ طلب ہے :۔

طریق آل بیت سے جو روایت مروی ہیں ان سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو قرآن ہمارے پاس ہے یہ پورا نہیں ہے۔ جیسا کہ محمد صلعم پر نازل ہوا تھا بلکہ اس میں اس کے خلاف بھی ہے جو اللہ نے نازل کیا تھا، موجودہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اور تغیر کیا گیا ہے اور بہت سی چیزیں حذف کر دی گئی ہیں مثلاً بہت سے مواضع پر علی کا نام تھا وہ حذف کر دیا گیا۔ آل محمدؐ کا ذکر متعدد جگہ تھا وہ نہیں رکھا گیا، منافقین کے نام کئی جگہ تھے وہ بھی حذف کر دئے گئے، اس کی وہ ترتیب بھی نہیں ہے جو خدا اور رسولؐ کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے تھی۔ وغیرہ وغیرہ[2]۔

قرآن میں حذف کثیر کا دخل بہر حال یہ ہیں بعض علماء امامیہ کے خیالات قرآن کریم کے بارے میں وہ اس کے قائل ہیں کہ قرآن کریم میں حذف کثیر کو دخل ہے اس کی ترتیب میں تغیر کر دیا گیا ہے اس میں تحریف کی جا چکی ہے۔

جو لوگ اس عقیدے کے حامل ہیں ان میں سر فہرست کلینی ہیں صاحب کتاب "الصافی" نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے :۔

"ہمارے مشائخ کا اعتقاد ثقۃ اسلام محمد بن یعقوب کلینی طاب ثراہ سے ظاہر ہے، وہ قرآن میں تحریف و نقصان دونوں کے قائل ہیں کیوں کہ اس مفہوم کی روایات انھوں نے اپنی کتاب "الکافی" میں روایت کی ہیں اسی طرح ان کے استاذ علی بن ابراہیم القمی ہیں ان کی تفسیر انہی خیالات سے مملو ہے، بلکہ اس باب میں انہیں کافی غلو ہے اس طرح شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی ہیں۔ اپنی کتاب "الاحتجاج" میں وہ بھی اس مسلک پر نظر آتے ہیں جس پر کلینی اور قمی دکھائی دیتے ہیں[2]۔"

جب کہ کلینی کا یہ اعتقاد ہے جو امامیہ کی ایک بہت بڑی جماعت کی نظر میں ثقات الروایۃ ہیں اور جن کی کتاب اخبار المحضرت امام صادق کے سلسلے میں مصدر اول کی حیثیت رکھتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اعتقاد رکھنے کے بعد کیا وہ ثقہ مانے جا سکتے ہیں؟ اور ان کا کلام نقل میں حجت تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

---

[1] الکلینی ج ۱ ص ۱۱۵   [2] الصافی ص ۱۳

بہر حال فال نیک یہ ہے کہ برادران امامیہ میں اب ایک بڑی جماعت ایسی پیدا ہو رہی ہے جو رفتہ رفتہ تعصب شدید سے خلاصی حاصل کر رہی ہے، یہ لوگ اپنے آپ کو بجا اور درست طور پر ایک فرقے کے بجائے ایک مسلک کا حامل ثابت کر رہے ہیں، جس پر ہم مبارک باد دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں، بلکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ تمام مسلمانوں کے دل اس بات پر کھل جائیں کہ مومنین امت واحدہ ہیں اور ان کی یہ وحدت اٹوٹ ہے۔

تنقیہ مذہب اثنا عشری کلینی کو چھوڑ کر اب ہم تنقیۂ مذہب اثنا عشری کرتے ہوئے، ان روایات منحرفہ کے سلسلے میں شیعہ اہلِ حق کے افکار و خیالات پر نظر ڈالتے ہیں انھوں نے اپنے مسلک سے اس غبار کو دھونے کی دیانت دارانہ سعی کی ہے اور اپنا عمل ان روایات صحیحۂ ماثورہ پر قائم کرتے ہیں جو امام جعفر صادق اور ان کے آبائے کرام سے مروی ہیں:۔

تفسیر "الصافی" میں نقول سابقہ کے بعد مرقوم ہے:۔

"شیخ ابو علی طوسی نے اپنی کتاب "مجمع البیان" میں لکھا ہے کہ قرآن میں اضافے کی روایتیں یکسر غلط ہیں۔ ان کے بطلان پر ہمارا اجماع ہے، باقی رہ گیا قرآن میں نقصان (کمی)، کا مسئلہ تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے اصحاب کی ایک جماعت کا اور حشویہ عوام کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں تغیر اور نقص واقع ہو چکا ہے لیکن ہمارے اصحاب مذہب کا صحیح مسلک یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ چنانچہ السید المرتضیٰ نے لکھا ہے کہ قرآن معجزۂ نبوت اور ماخذ علوم شرعیہ و احکام دینیہ ہے۔ علماء مسلمین نے اس کے حفظ و حمایت میں جان لڑا دی ہے، یہاں تک کہ اس کے اعراب اور قرأت وغیرہ کو بھی پورے طور پر محفوظ رکھا ہے، پس یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ ہم اس میں تغیر یا نقص کو قبول کر لیں؟ جب کہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس طرح مرتب اور مؤلف تھا۔ جیسا آج نظر آ رہا ہے، اور صحابہ کی ایک جماعت مثلاً عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب وغیرہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کئی ختم سنائے اور یہ تمام باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ وہ مجموع، مرتب اور غیر منقطع چلا آ رہا ہے لہٰذا امامیہ اور حشویہ میں جو لوگ اسکے خلاف ہیں، ان کے اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔[1]"

---

[1] الصافی ص ۱۴

امامیہ کا تواتر قرآن پر اتفاق ہے

امامیہ حضرات اور خاص طور پر ان کے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن متواتر ہے اور یہ تواتر شک و شبہ سے بالا ہے پس ماننا پڑے گا کہ اس باب میں جو روایتیں امام صادق سے منسوب ہیں وہ بالکل غلط ہیں :۔

طوسی نے اپنی کتاب البیان میں لکھا ہے :۔

"قرآن میں زیادتی یا کمی کی بات ناقابل التفات ہے، کیوں کہ زیادتی کے بطلان پر اجماع ہے اور کمی کے بارے میں بھی ہمارا صحیح مذہب یہ ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے ۔

السید المرتضیٰ نے بھی اسی خیال کی تائید فرمائی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کا رد آج تک کسی نے نہیں کیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

" میں تم میں دو گراں بہا چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، اگر تم ان دونوں سے وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ کتاب اللہ اور میری عترت، میرے اہل بیت اور ان دونوں میں کبھی جدائی نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر لوگ مجھ سے آن ملیں گے[1]"

غرض علماء امامیہ کا اونچا طبقہ ان روایات کی تضعیف کرتا ہے جو امام صادق سے منسوب ہیں اور جن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن میں نقص، تغیر، تبدیلی یا تحریف کی گئی ہے۔ شریف مرتضیٰ نے صاف الفاظ میں انہیں ضعیف قرار دیا ہے، طوسی کا قول ہے کہ قرآن میں کسی طرح کا تغیّر یا تبدل واقع نہیں ہوا ہے، نہ نقص اور زیادتی کو اس نے قبول کیا ہے اگر یہ روایتیں قبول کر لی جائیں تو تواتر قرآن کی عمارت منہدم ہو جائے گی اور بلا شبہ اس طرح دین اور اس کی بنیاد کا انہدام واقع ہو جائے گا۔

بہر حال یہ تو مرتضیٰ اور طوسی وغیرہ کبار علماء شیعہ کے خیالات ہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ بعض حضرات امامیہ ان روایات کا رد کرتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے راوی کلینی ہیں، لہٰذا کوشش کرتے ہیں کہ ان روایات اور سلامتی قرآن کے مابین توافق پیدا کریں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر یہ اخبار صحیح ہیں تو ان کی تفسیر یوں کی جائے گی کہ جو کمی کی گئی ہے اس سے اصل مقصود یہ نہیں کہ قرآن پر حرف آتا ہے بلکہ

---

[1] الصافی ص ۱۵۔

علی اور آلِ محمدؐ کا نام حذف کیا گیا ہے، اسماءِ منافقین بھی چھانٹ دیئے گئے ہیں لیکن عموم لفظ سے انتفاع بھی آیات کے حذف وکتمان کے باوجود باقی ہے! [1]

—— ۴ ——

ظاہر ہے یہ تاویل حد درجہ کمزور ہے۔ اس کی اہمیت اس وقت اور زیادہ ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے کہ علماء اثنا عشریہ کے اکابر اور ثقات اوصیاء کرام خصوصاً امام صادق کی طرف ان روایات کی نسبت کو غلط اور دروغ قرار دیتے ہیں، وہ تاویل کس طرح قبول کی جا سکتی ہے جو اصل تنزیل میں شک کی موجب ہو؟

سیوطی کا اعتراف "اتقان" میں

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کلینی کی طرح کی روایت سیوطی کی کتاب "الاتقان" میں بھی ملتی ہے۔ گویا اگر یہ بات شیعہ کہتے ہیں تو سنی بھی کہتے ہیں ہم نے "الاتقان" کا مطالعہ کیا اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ الاتقان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے غلط نہیں ہے۔ لیکن ایک فرق ضرور ہے

اور وہ فرق یہ ہے کہ الاتقان میں روایات متعلق بہ زیادتی و نقصان قرآن کو لغو اور باطل قرار دیا گیا ہے۔

پھر بھی ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ سیوطی کے لئے یہ زیبا نہ تھا کہ وہ اس طرح کے روایات کو داخل کتاب کرتے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تضعیف وتردید کے باوجود ضعیف الایمان لوگوں کے قلوب میں شک وشبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ملاحدہ اور مفسدین کو حقائق اسلامیہ اور امور متیقنہ کا روئے زیبا مسخ کرنے کا موقع ملتا ہے اور اس کا موقع دینے سے گریز کرنا چاہئے تھا۔

جہاں انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ کلینی اور سیوطی کے روایات کا ذکر ساتھ ساتھ کرتے وہاں انصاف اس امر کا بھی متقاضی تھا کہ ان دونوں کے انداز روایت میں جو فرق ہے اسے بھی واضح کرتے!

---

[1] الصافی ص ۱۴۔

کی گردن ماری جاسکتی ہے، کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔

عام کی تعریف سے خاص کی تعریف خود بخود واضح ہو جاتی ہے، خاص سے مراد وہ لفظ ہے جو معنی واحد پر دلالت کرتا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے احکام کیا ہیں؟ آیا یہ قطعی ہیں یا ظنی ہیں؟

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ خاص قطعی الدلالت ہے۔

عام کے بارے میں فقہاء سنت اور علماء شیعہ نے غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خبر آحاد سے قرآن کے عام کی تخصیص ہو جاتی ہے۔

اب ہم اس مسئلے پر ذرا وضاحت سے گفتگو کریں گے۔

عام کی دلالت اور اس کی قطعیت اور ظنیت

عام کی دلالت اور اس کے قطعی یا ظنی ہونے کے بارے میں فقہا کی دو رائیں ہیں:

(۱) قرآن میں عام ظنی ہے خبر آحاد سے اس کی تخصیص ہو جائے گی۔

(۲) حنفیہ کی رائے میں قرآن عام قطعی الدلالت ہے اور قرآن متواتر لہٰذا قطعی الثبوت ہے، لہٰذا خبر آحاد قرآن کے عام کی تخصیص نہیں کر سکتی کیوں کہ قرآن کا عام قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے اور خبر آحاد ظنی الثبوت ہے اور ظنی قطعی کی تخصیص نہیں کر سکتا۔

فقہا سنت کے یہ دو معروف منہاج ہیں۔

فقہا سنت کے دو معروف منہاج

اب سوال یہ ہے کہ امامیہ کا منہاج کیا ہے؟ اور یہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ امام صادق کے اقوال سے مستفاد ہے؟

اس مسئلے میں جس طرح سنیوں میں اختلاف رائے ہے اسی طرح امامیہ میں بھی ہے، شریف مرتضیٰ اور اُن کے شاگرد طوسی کے خیال میں دلالت عام قطعی ہے، خبر آحاد سے اس کی تخصیص نہیں ہو سکتی[۱]، وہ اس سلسلۂ بحث میں کہتے ہیں۔

"خبر واحد عام کی تخصیص نہیں کر سکتی کیوں کہ عموم قرآن موجب علم اور خبر واحد موجب ظن ہے اور کسی حال میں بھی ظن کی خاطر علم کو ترک نہیں کیا جا سکتا پس لازم آیا کہ خبر آحاد سے عموم قرآن کی تخصیص نہ کی جائے۔

---

[۱] عدۃ الاصول - ج - ص ۱۹

قرآن میں عام اور خاص

مناہج فقہاء وائمہ مجتہدین کے دو اہم منہاج

امام جعفر صادق سے انتساب

یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر فقہا نے گفتگو کی ہے اور کھول کر بیان کیا ہے کیوں کہ اس کی دراست منہاج فقہا ائمہ مجتہدین میں سے دو منہاجوں کو خاص طور پر اجاگر کرتی ہے۔

قرآن کے عام اور خاص کا ذکر امام جعفر صادق سے منسوب روایات میں بھی آیا ہے چنانچہ "الصافی" میں امام موصوف کے بارے میں وارد ہے کہ انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں جو قرآن سے استخراج احکام کرتے ہیں فرمایا کہ یہ لوگ عام اور خاص کے فرق سے ناآشنا ہیں اور استخراج احکام کے وقت ان دونوں میں تمیز نہیں کر پاتے چنانچہ یہ خاص حکم کو عام سمجھ لیتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم خاص اور عام کی حقیقت بیان کریں گے۔

جمال الدین الحلی نے بتایا ہے کہ جو لفظ وضع واحد کے اعتبار سے کسی مجموعے پر حاوی ہو، وہ عام ہے لفظ عام بطریق تبادل دلالت نہیں کرتا، مثلاً لفظ "عین" اس کے معنی چشم نگران چشمۂ آب اور جاسوس کے ہیں۔ لیکن یہ معنی مجتمع پر دلالت نہیں کرتا۔ اگر جاسوس مراد ہو گا تو چشم نگراں اور چشمۂ آب مراد نہیں لیا جائے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ لفظ مشترک ایسے مجموعے کے لئے وضع نہیں کیا گیا ہے جو استعمال واحد پر دلالت کرتا ہو بلکہ ہر ایک کے لئے الگ الگ معنیٰ مراد لئے جائیں گے۔

بعض لوگ عام اور مطلق میں التباس پیدا کر دیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں کا فرق واضح ہے، مطلق بغیر کسی قید کے اپنے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے جس میں اعداد اور استغراق کا کوئی سوال نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے جہاں "عتق رقبۃ" (غلام آزاد کرنا) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے مطلب صرف یہ ہے کہ غلام آزاد کیا جائے خواہ وہ مومن ہو یا غیر مومن، اس کے برعکس عام استغراق اور تعدّد پر دلالت کرتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فضرب الرقاب" یعنی جو تم سے جنگ کریں ان کی گردن اڑا دو، یہ عام لفظ ہے۔ ہر جنگ جو دشمن

اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عام قطعی الدلالت ہے۔ وہ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ قیاس عام کی تخصیص کر سکتا ہے۔

شوافع اور حنابلہ کے ہاں قیاس کسی صورت میں بھی قرآن وسنت کے عام کی تخصیص نہیں کر سکتا: کیوں کہ شافعی کے نزدیک صرف نص کی عدم موجودگی میں قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے اور اگر نص ہو تو گو وہ ظنی الدلالت ہی کیوں نہ ہو، اس کے سامنے قیاس نہیں ٹھہر سکے گا۔

صرف مالکیہ کے نزدیک قیاس، قرآن کے عام کی تخصیص کر سکتا ہے۔ اس پر امام شافعی نے امام مالک پر اعتراض کیا کہ انھوں نے فرع کو اصل بنا دیا اور اصل کو فرع کر دیا کیوں کہ قیاس فرع ہے اسے نص پر حاکم کر کے مخصص بنا دیا اور یہ کسی طرح بھی جائز نہیں۔

امامیہ کی طرف سے قیاس کی نفی

یہ مسلک جمہور کا تھا، امامیہ حضرات سرے سے قیاس کی نفی کرتے ہیں اور اسے اصول استنباط کی اصل تسلیم نہیں کرتے نہ دین کی حجت مانتے ہیں، لہٰذا ان کے ہاں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، امام جعفر صادق سے کتب امامیہ میں نفی قیاس ثابت ہے۔

عام کا خاص سے تعارض

اگر دو نص موجود ہوں، ان میں سے ایک عام ہو دوسری خاص اور دونوں ایک ہی حکم میں ہوں اور ان میں باہم تعارض نہ ہو تو خاص کو مؤکد مانا جائے گا جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"نماز کی اور خاص طور پر صلوٰۃ وسطیٰ (عصر) کی نگہداری کرو!"

گویا نماز عصر خاص ہے اور یہ عموم میں داخل ہے اور جو تخصیص ہے وہ امر عام کے بعد ہے، لہٰذا اس میں تعارض نہیں۔

لیکن اگر حکم عام کا حکم خاص سے تعارض ہو یعنی عام ایک حکم کا موجب ہو اور خاص دوسرے کا تو یہاں تعارض کا وجود تسلیم کیا جائے گا۔ مثلاً قرآن کہتا ہے چور کے ہاتھ کاٹ دو اور سنت کہتی ہے کہ چار دینار کی کم کی چوری پر ہاتھ نہ کاٹو۔

فقہاء جمہور کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ تخصیص دلالت عام سے اخراج کا نام نہیں ہے بلکہ عام اس حکم میں شامل ہے اور تمام افراد اس ذیل میں آتے ہیں پھر تخصیص وارد ہوتی ہے وہ بعض کو اس دائرہ عام سے نکال دیتی ہے بلکہ غزالی اور علماء اصول کا۔ بجز ظاہریہ کے۔ خیال ہے کہ اول امر میں نصوص کا ارادہ کار فرما ہوتا ہے اور عام میں شروع ہی سے بعض افراد مراد ہوتے ہیں سب نہیں۔

خاص عام کی تخصیص کب کریگا؟

یہ تو فقہاء کے اقوال تھے، امامیہ کا مسلک اس باب میں کیا ہے؟

امور سہ گانہ اس عبارت سے ذیل کے امور سہ گانہ پر روشنی پڑتی ہے:۔

۱۔ عام قطعی الدلالت طوسی کی رائے میں عام قطعی الدلالت ہے اور عام مفید علم ہوتا ہے اور علم قطعی اور ہر احتمال کا مانع ہوتا ہے لہٰذا طوسی جو امامیہ کے ایک راوی مذہب ہیں۔ عام کو قوت دیتے ہیں جو حنفی نہیں دیتے

۲۔ عام کی قطعیت مستمر ہوتی ہے اگرچہ اس کی تخصیص بھی کیوں نہ ہو گئی ہو، کیوں کہ تخصیص کے بعد بھی اس کی قطعیت باقی رہتی ہے۔ اگر دلیل متصل نے اسے خاص کیا ہو۔ تو اس کی قطعیت زائل ہو جاتی ہے اور وہ محتمل ہو جاتا ہے۔

خبر آحاد عام کی تخصیص بذات خود نہیں کرتی اس لئے کہ وہ ظنی ہے قطعی نہیں ہے، البتہ اگر اس کے ساتھ کوئی قوی کرنے والی چیز مثلاً قول معصوم شامل ہو جائے تو وہ قرآن کے عام کو خاص کر سکتی ہے۔

جمال الدین الحلی کی رائے عام اور خاص کے بارے میں امامیہ کی یہ پہلی رائے تھی، دوسری رائے جمال الدین الحلی کی ہے، اس کا مورد یہ ہے کہ قرآن کے عام کی دلالت ظنی ہے لہٰذا خبر آحاد سے اس کی تخصیص ہو جائے گی، کیوں کہ خبر آحاد اگرچہ اپنی سند میں ظنی ہے لیکن اگر وہ خاص کرنے والی ہو تو قطعی الدلالت ہے، اس طرح ظنی کا ظنی سے تعارض ہو جاتا ہے اور توفیق کی صورت یہ ہے کہ حکم خاص جاری کر دیا جائے گا اور حکم عام اس وقت جاری ہو گا کہ وہ دائرہ خاص میں قدم نہ رکھے۔ اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ آیات مواریث عام ہیں، لیکن اثر سے یہ ثابت ہے کہ کافر مسلم کا وارث نہیں ہو سکتا۔

امام جعفر صادق کی رائے فقہ امامی میں عام و خاص سے متعلق یہ دو رائیں ہیں، سوال یہ ہے کہ امام جعفر صادق کی طرف ان میں سے کونسی رائے صحیح طور پر منسوب کی جا سکتی ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ طوسی کی رائے امام صادق سے زیادہ قریب ہے اس لئے کہ طوسی فقہ جعفری کے اہم راویوں میں سے ایک ہیں ان کی دونوں کتابیں۔ "التہذیب" اور "الاستبصار"۔ فقہ اثنا عشری کے ستون کا کام دیتی ہیں۔

طوسی کے برعکس علی کا یہ مقام مذہب جعفری میں نہیں ہے، وہ متکلم ہیں، ان کی رائے شافعی، حنبلی اور اکثر مالکی علماء اصول سے ملتی ہے، اس لئے کہ وہ ان کے مناہج سے متاثر تھے انہیں منہاج فقہ جعفری کا بیان کنندہ نہیں مانا جا سکتا۔

قیاس اور عام جمہور مسلمین کے ہاں قیاس اصول استنباط کی ایک اصل ہے اور وہ عام سے متعارض ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عام کی دلالت ظنی ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قیاس عام کی تخصیص کر سکتا ہے

بیان قرآن

قرآن شریعت اسلامیہ کا بیان کلّی ہے

بیان قرآن کے اقسام قرآن شریعت اسلامیہ کا بیان کلّی ہے، امام جعفر صادق کا ارشاد ہے کہ امر شریعت سے متعلق کوئی امر ایسا نہیں ہے جو قرآن میں موجود نہ ہو اور جب قرآن کی حیثیت یہ ہے تو لازمی ہے کہ اس کا بیان کہیں اجمالی ہو، کہیں واضح، مجمل کی تفصیل کرتا ہو اور مبہم کی وضاحت کرتا ہو اور مشترک کو متعین کرتا ہو۔

پس ہم قرآن کو دو قسموں میں منقسم کر سکتے ہیں۔

(۱) **بیان مفصل** جیسے احکام مواریث، احکام نکاح وطلاق، پاک دامن عورتوں پر تہمت اور زنا کی سزا یا جیسے بیان لعان، قرآن میں جو کچھ آیا ہے اس کا بیان مکمل ہے، سنت نے صرف عملی طور پر اس کی وضاحت کی ہے۔

(۲) **یہ بیان تفسیر کا محتاج ہے** اور یہ اجمال کبھی لفظی ہوتا ہے، جیسے لفظ مشترک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"والمطلقات یتربصن بانفسهن ثلاثة قروء" (یعنی مطلقہ عورتیں تین "قروء" تک انتظار کریں۔

اور لفظ "قروء" حیض اور دو حیضوں کے مابین طہر پر مشترک ہے۔

بعض فقہا اس کی تفسیر "طہر" سے اور بعض حیض سے کرتے ہیں، پہلا مسلک شافعی کا اور دوسرا امامیہ زیدیہ اور حنفیہ کا ہے۔

اجمال کی صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ لفظ حقیقت شرعیہ کے لئے موضوع ہوتا ہے اور رسول پر اس کا عملی بیان چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ وغیرہ کا لفظ، یہ الفاظ حقائق شرعیہ اسلامیہ کے لئے وضع کئے گئے ہیں، لیکن ان کے مدلول کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اس کا بیان سنت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کہ اس کا بیان نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احکام نافذ کر کے اور امراء کے نام جو فرا ہمی زکوٰۃ پر مامور تھے مکاتیب لکھ کر کیا، اسی طرح صلوٰۃ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

امامیہ کا خیال ہے کہ اگر خاص عام کے ساتھ ایک ہی زمانے میں وارد ہو تو وہ اس کی تخصیص کردے گا خواہ قطعی ہو یا ظنی۔

اس مسئلے پر حضرات امامیہ کی دو رائیں ہیں!

(۱) تاخیر مبین کے جواز کے لئے مخصص مانا جا سکتا ہے۔

(۲) یہ کہ وہ ناسخ ہو۔

اگر خاص عام پر متقدم ہو تو طوسی اور حلی کے نزدیک عام خاص پر محمول ہوگا، اس کے برعکس حنفیہ کا خیال ہے کہ عام خاص کا ناسخ ہوتا ہے۔

امامیہ کا استدلال یہ ہے کہ اگر ہم نسخ کو مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دو نصوص میں سے ہم نے ایک کو ترک کر دیا اور اگر تخصیص مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر دو نصوص کو مانتے ہیں اور ظاہر ہے یہ صورت ترک سے بہتر ہے[1]

لیکن طوسی اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتے اور وہی مذہب امام جعفر صادق سے قریب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عام بھی خاص کی طرح قطعی ہے۔

لیکن یہ سب اس صورت میں ہے کہ عام و خاص کی تاریخ معلوم ہو، اگر نہ معلوم ہو تو امامیہ کے نزدیک عام خاص پر محمول ہوگا۔ تاکہ ہر دو نصوص پر عمل ہو سکے اور کسی ایک کو ترک نہ کرنا پڑے۔

امامیہ اور حنفیہ کا اتفاق امامیہ کا مسلک یہ بھی ہے اور اس مسلک میں وہ حنفیہ سے ہم آہنگ ہیں کہ خاص اگر عام سے متاخر ہو تو وہ عام کا ناسخ مانا جائے گا، اور ہماری رائے میں یہ معقول بات ہے۔ اس لئے کہ خاص عام کے بعض احکام کو متغیر کردیتا ہے اور ان پر عمل درآمد سے روک دیتا ہے، ظاہر ہے نسخ اس کے سوا اور کیا ہے؟

امامیہ کا مسلک یہ بھی ہے کہ امام معصوم نصوص عامہ کی تخصیص کر سکتا ہے، کیونکہ وہ منزہ عن الخطاء ہے، دوسرے الفاظ میں یہی سمجھنا چاہیئے کہ امام قرآن کے عام کو منسوخ کر سکتا ہے کیونکہ وہ معصوم ہوتا ہے۔ لہٰذا نصوص قرآنیہ و نبویہ کے عام کی تخصیص کر سکتا ہے

---

[1] التہذیب ص ۷۴۔

تو معاف ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ کا ارشاد:

لاجناح علیکم ان طلقتم النسآء ما لم تمسوھن او تفرضوا لھن فریضۃ

آخری چاروں امور میں امامیہ کے نزدیک کوئی ابہام نہیں ہے، کیوں کہ یہ افعال ہیں، اور افعال میں ابہام نہیں ہوا کرتا اور جمہور کے نزدیک بیان سنت کی ضرورت بعض وقت ان امور میں بھی لاحق ہوتی ہے، امامیہ کا قول امام جعفر صادق کی طرف منسوب ہے۔[1]

مجمل کا بیان صرف سنّت کر سکتی ہے

امامیہ اور اہل سنت کے نزدیک مجمل کا بیان صرف سنت کر سکتی ہے، امامیہ کے ہاں سنت کا مفہوم زیادہ عام ہے کیوں کہ اس میں اقوال ائمہ بھی شامل ہیں اور اہل سنّت کے ہاں لفظ سنت اس اعتبار سے وسیع مفہوم کا حامل ہے کہ اس میں اقوال صحابہ اور فتاوائے صحابہ بھی شامل ہیں اگرچہ ان دونوں کی حیثیت اقوال رسولؐ سے کم ہے امامیہ اقوال صحابہ کو قبول نہیں کرتے، حالانکہ ہم بتا چکے ہیں کہ امام جعفر صادق عبداللہؓ بن عمر کے قول سے دلیل لایا کرتے تھے

عام از روئے لغت مجمل ہے

السیّد مرتضیٰ کے نزدیک عام از روئے لغت از قبیل مجمل ہے لیکن اس کے ظاہر پر عمل جائز ہے جب تک مبین نہ آ جائے اور یہی مبین دراصل مخصّص ہے[2]۔ اور اس طرح کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔

بعض علماء امامیہ کا خیال ہے کہ خطاب سے بیان کو مؤخر نہیں ہونا چاہئے، بلکہ واجب ہے کہ دونوں پہلو بہ پہلو ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کا وصف بیان کیا ہے کہ وہ بیّن ہے، پس ضروری ہے کہ یہ بیان بنفسہٖ ہو یا شارح یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم یعنی ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے کہ لوگوں کے سامنے آپ اس کا بیان کریں۔

---

[1] التہذیب ص ۴۹، ۵۰

[2] معالم الدین ص ۱۵۲۔

"جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھو اسی طرح پڑھو!"

اختلاف فکر ۲ دو امور ہیں	قرآن شریف کے مشتمل بر مجمل ہونے کا جہاں تک تعلق ہے امامیہ اور جمہور فقہاء میں اتفاق رائے ہے لیکن اختلاف دو امر میں ہے۔

(۱) یہ کہ بیان کرنے والے صرف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں بلکہ ائمہ بھی جنہیں یہ علم ودیعت کیا گیا ہے بیان کر سکتے ہیں، نیز لفظ سنت میں اقوال ائمہ بھی شامل ہیں۔

(۲) بعض آیات کے اجمال کے بارے میں بھی علماء امامیہ اور فقہاء سنت میں اختلاف ہے، امامیہ بعض ایسے مقامات پر جہاں اہل سنت اجمال کے قائل ہیں اس کی نفی کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں چند امور غور طلب ہیں:۔

(الف) تحلیل و تحریم ذوات کی طرف مضاف ہیں یہ مجمل نہیں ہو سکتے۔ نہ کسی رمز یا تفصیل کے محتاج ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ والنطیحۃ وما اکل السبع الا ما ذکیتم۔

علماء امامیہ کہتے ہیں اس آیت میں جن چیزوں کو حرام کیا گیا ہے وہ مجمل نہیں ہیں اور بیان سے بے نیاز ہیں۔ جمہور کا کہنا ہے کہ بیان کی ضرورت ہے۔ مثلاً "خون" جو حرام ہے تو کیسا خون حرام ہے؟ جامد یا بہا ہوا؟ نیز پاک کرنے کا جو حکم ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟

قرآن نے فورع دم (خون) بیان کر دی ہے اور طریق تزکیہ سنت پر چھوڑ دیا ہے۔

(ب) آیۃ سرقہ میں اجمال نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کے لئے بالفاظ واضح ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ یہ مسلک امامیہ کا ہے۔ لیکن فقہاء امصار کہتے ہیں کہ اس حکم میں اجمال ہے مثلاً کتنی چوری پر ہاتھ کاٹے جائیں گے، اس کا بیان سنت کے ذمے ہے اور خود لفظ سرقہ بھی محتاج بیان ہے اس کی تعریف کیا ہے؟ آیا اس میں اُچکے اور ڈاکو شامل ہیں یا نہیں؟

(د) لا جناح علیھما فیما افتدت بہ

امامیہ کے نزدیک اس میں کوئی اجمال نہیں ہے لیکن اکثر فقہاء کی رائے ان کے خلاف ہے۔

(کا) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد کہ میری امت سے خطاء اور نسیان سرزد ہو

بیان عام کی تاخیر جائز ہے

بہرحال امامیہ کا مذہب راجح یہ ہے کہ یہاں عام کی تاخیر اگر اس کا ظاہر قابل تاویل ہو جائز ہے۔ لیکن جو عام استغراق کو مفید ہو، چونکہ وہ حقیقت شرعیہ پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس کی تاخیر بیان جائز نہیں ہے کیونکہ ایسے الفاظ صرف بیان شارع سے اپنے اصل مفہوم پر دلالت کرتے ہیں لہٰذا نزول ہی کے وقت ان کا بیان ضروری اور لابدی ہے۔

ان تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امامیہ کے نزدیک جو عام دلالت لغوی سے عموم کا حامل ہو وہ تخصیص کا متحمل ہو سکتا ہے لیکن اگر احتمال کی دلیل نہ ہو تو تاخیر بیان وقت حاجت تک جائز ہے اور یہ درست نہیں ہے کہ وقت حاجت تاخیر بیان پائی جائے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرات امامیہ کے نزدیک اقوال ائمہ عصر قرآن کے مبین ہیں۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد امام ہی عموم قرآن کا مخصص ہے۔

حضرات امامیہ کہتے ہیں کہ حوادث ناس لاتتناہی ہیں اور ہر حادث کے لئے قرآن میں حکم ہے۔ اس صورت میں یہی موزوں تھا کہ سارے کے سارے احکام حوادث دفعتًہ کے بجائے بالاجمال نازل کئے جاتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حوادث کا بیان کر دیا جن کی آپؐ کے زمانے میں ضرورت تھی اور جن کی فی الوقت ضرورت پیش نہیں آئی انہیں وقت ضرورت کے لئے چھوڑ دیا اگرچہ یہ حاجت آپؐ کے انتقال کے بعد ہی کیوں نہ پیش آئے، کیونکہ وقت حاجت کا مبین امام تو موجود ہی ہے پس لازمی ہے کہ تاخیر بیان وقت حاجت تک کے لئے جائز ہو!

مطلق کو مجمل قرار دیا جاتا ہے کہ وہ تقیید کا متحمل ہو، اس پر عمل علی الاطلاق ہوتا ہے، یہاں تک کہ امام جان لے کہ اس کی تقیید کا وقت آگیا ہے۔ پھر وہ اس کی تقیید کرے گا، یہ بیان وقت حاجت کا ہو گا اور امام کا یہ قول سنت مانا جائے گا جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔

السید المرتضیٰ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حقائق شرعیہ جو اسلام کے حقائق کبریٰ ہیں۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ حج وغیرہ ان کا بیان خطاب سے مؤخر نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ علم ہے جو علم اوصیاء سے بھی بالا ہے۔ اس لئے کہ یہ حقائق عمود دین اور قوام اسلام ہیں۔ اختلاف وقت سے ان میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امت سے مفارقت عمود دین کا بیان کئے بغیر گوارا کر لیتے کیوں کہ ان حقائق پر احداث و نوازل کا اثر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہ اسلام

کا لب لباب ہیں۔

علامہ شوکانی کا بیان وقت خطاب سے وقت حاجت تک تاخیر بیان کے جواز پر امامیہ کے خیالات سطور بالا میں پیش کر دئے گئے، جمہور کے نزدیک بھی یہ اقوال مشہور ہیں چنانچہ علامہ شوکانی "ارشاد الفحول" میں رقمطراز ہیں:۔

"اگر آپ شریعت اسلامیہ کے موارد کا کھوج لگائیں تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کے خطاب کے وقت تاخیر بیان کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا جسے ذرا بھی دراست اور خبر شریعت مطہرہ کی ہوگی وہ اسے ظاہر اور واضح تسلیم کرے گا۔"[1]

---

[1] ارشاد الفحول الی تحقیق الحق فی علم الاصول۔ ص ۱۵۴۔

السنّت

جس میں نبیؐ کا قول و فعل اور آثار ائمہ شامل ہیں

تعصرف احکام دو منہاج | ائمہ اثنا عشریہ کے بعد جو لوگ آئے انھوں نے تعرف احکام کے لئے دو منہاج وضع کئے :۔

(۱) اخبار واردہ پر انحصار، یہ لوگ سنّت سے۔ جس میں اقوال ائمہ بھی شامل ہیں۔ سر مو تجاوز نہیں کرتے۔

(۲) فریق ثانی وہ ہے جو اجتہاد کو ضروری قرار دیتا ہے اور اس کی بنیاد آثار آئمہ پر رکھتا ہے۔ یہ لوگ اصولی کہلاتے ہیں، کیونکہ یہ اجتہاد کی بنا اصول مقررہ ثابتہ پر رکھتا ہے۔

اس فریق کی حجت یہ ہے کہ امام جعفر صادق نے اجتہاد کی دعوت دی ہے اور اجتہاد ان ائمہ کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ یہ بارھویں امام کی غیبت کے بعد ہی ممکن تھا، لہٰذا اجتہاد کے بارے میں امام صادق کا جو ارشاد ہے وہ اس زمانے کے لئے ہے، جب ائمہ ظاہر کا دور ختم ہو چکا ہو۔

ان لوگوں نے اجتہاد کے جو اصول وضع کئے ہیں، وہ چار ہیں :۔

(۱) کتاب اللہ

(۲) سنّت رسول اللہ اور اقوال ائمہ

(۳) اجماع مومنین

(۴) عقل۔

یہ قیاس کو اجتہاد کی اصل نہیں مانتے کیوں کہ امام صادق سے اس کی نہی وارد ہوئی ہے

ان حضرات کا کہنا ہے :۔

"اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خبر قاطع طور پر قبول نہیں کی جا سکتی، جب تک وہ اللہ یا سنت متواترہ رسولؐ یا ائمہ معصومین سے ثابت نہ ہو، ایسی ضرورت سے متعلق نہ ہو۔ خلاف عقل نہ ہو اور جس سے تکذیب قرآن و رسولؐ نہ ہوتی ہو کہ یہ کفر ہو اور تکذیب

اختیار ائمہ معصومین بھی نہ ہوتی ہو کر یہ فسق ہے!"[1]

اس عبارت سے دو امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) سنت میں ائمہ معصومین کے اقوال بھی شامل ہیں۔ اس کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔

(۲) یہ کہ تواتر کے ساتھ جو سنت نبویہ ماثور ہوا اس کا انکار کفر ہے اس لیے کہ یہ انکار رسالت محمدیہ کا انکار ہے لیکن اقوال ائمہ کی حجیت کا انکار سلسلہ فسق ہے، کفر نہیں قرار دیا جائے گا۔

متواتر اور غیر متواتر کی تقسیم

سنت میں اقوال ائمہ معصومین شامل ہیں، لیکن قوت کے اعتبار سے یہ مرتبہ واحد پر نہیں ہے اس میں متواتر اور غیر متواتر کی تقسیم موجود ہے

قبل اس کے کہ ہم سنت کی ان دونوں قسموں پر گفتگو کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھیں کہ اصولیوں نے سنت کو کس طرح ضبط کیا ہے؟ اس کے بعد ہم اس کے اقسام پر گفتگو کریں گے اور دیکھیں گے کہ ان خیالات کی نسبت امام صادق سے کس حد تک درست ہے، پھر ہم ان قواعد کی کتب سنت پر تطبیق دینے کی کوشش کریں گے۔

---

[1] رسائل ابی المعالی۔ ص ۳۸۵

سنّتِ متواترہ

تواتر علم قطعی کا موجب اور حجّت ہے

علم قطعی کے شرائط امامیہ کے نزدیک ایک بلا اختلاف سنّت متواترہ حجت ہے، ان کے نزدیک تواتر علم قطعی کا موجب ہے۔

شیخ طوسی نے تحقق معنی تواتر کے لئے تین شرائط ذکر کئے ہیں جن کے بعد علم قطعی حاصل ہو جاتا ہے۔

وہ شرائط یہ ہیں:۔

(۱) راوی اتنی کثیر تعداد میں ہوں کہ ان کا کذب و دروغ پر اتفاق کر لینا عقلاً محال ہو۔ اہل سنت بھی اس شرط میں ان سے متفق ہیں۔

(۲) راویوں کے بارے میں اس بات کا بھی علم قاطع ہونا چاہئے کہ انھوں نے کسی کذب پر اجماع نہیں کیا ہے۔

گویا دوسرے الفاظ میں وہ قبول روایت کے لئے ان طرق کثیرہ ہی پر اکتفا نہیں کرتے جو صدق مطلق کا ثبوت ہوتا ہے بلکہ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ منع تواتر اور اتفاق پر دلیل قاطع بھی ہونی چاہیے۔

۳۔ جو خبر مروی ہو، وہ واضح ہو اس میں کسی طرح کا اشتباہ اور لبس نہ ہو

تواتر کی دو قسمیں امامیہ کے ہاں تواتر کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) ایک تواتر وہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

(۲) دوسرا تواتر وہ جو امام معصوم سے ثابت ہو۔

امام معصوم سے تواتر امامیہ کے ہاں اصل دین ہے اس لئے کہ کلام بھی اس طرح حجّت ہے جس طرح قول رسول، وہ جو کچھ کہتا ہے نبی کی طرف سے کہتا ہے اور اللہ کی طرف سے کہتا ہے فرق یہ ہے کہ اس پر وحی نازل نہیں ہوتی لیکن جو کچھ ہوتا ہے از روئے الہام کہتا ہے جو کچھ کرتا ہے اس میں معصوم ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ تواتر عن الرسولؐ کے بھی قائل ہیں اور اسے اصل دین تسلیم کرتے ہیں کہ اعتقاد امامت کی بنیاد اسی پر قائم ہے وہ حضرت علی کی افضلیت کے تمام انسانوں پر قائل ہیں کیونکہ حدیث "غدیر خم" تواتر سے ثابت ہے۔ پس افضلیت امام علی کرم اللہ وجہٗ پر تمام انسانوں کے لئے حجت ہے[1]۔"

امامیہ اور جمہور کے تواتر میں فرق

اس سے معلوم ہوا کہ امامیہ کے ہاں خبر تواتر مقبول ہے لیکن ان کے اور جمہور کے تواتر میں تھوڑا سا فرق ہے۔

جمہور کے ہاں تواتر کے لئے اتصال سند ضروری ہے، لیکن امامیہ کے ہاں اتصال سند شرط نہیں ہے۔ جیسا کہ طوسی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ بڑے بڑے واقعات وحوادث اس کثرت سے لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں کہ وہ سند سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

حدیث غدیر کے بارے میں یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اہل سنت کے ہاں سند کے اعتبار سے یہ متواتر نہیں ہے اور دلالت کے اعتبار سے بھی اس کا مفہوم وہ امامیہ کے خلاف لیتے ہیں کیوں کہ اسے امامت علی کی نص وہ نہیں مانتے کیونکہ آپکا یہ ارشاد - جس کا میں مولا ہوں علی اس کا مولا (دوست) ہے۔ محبت پر دلالت کرتی ہے نہ کہ وصیت پر اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو شخص علی سے بغض رکھتا ہے۔ حدیث غدیر میں ہے اے اللہ جو علی سے بغض رکھے تو بھی اس سے بغض رکھ۔ وہ اللہ کا موالی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ امام ہدیٰ علی کی ذات گرامی وہ ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا!

اور بلاشبہ وہ ان میں سے ہیں جن سے اللہ کو اور اس کے رسولؐ کو محبت تھی، جس کا ثبوت فتح خیبر کا واقعہ ہے۔

اور یہی ہے کہ جب سیدہ ام سلمہ ام المومنین کو یہ خبر پہنچی کہ معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے مساجد کے منبروں پر حضرت علیؓ کو سب وشتم سے یاد کرنا شروع کیا ہے تو انہوں نے معاویہ سے کہلا یا!

"تم اللہ اور رسولؐ پر لعنت کرتے ہو جب بر سر منبر علی بن ابی طالب پر اور ان کے محبوں پر لعنت کرتے ہو میں اس کی گواہی دیتی ہوں کہ اللہ اور رسولؐ علی سے محبت رکھتے تھے!"

---

[1] ملاحظہ ہو تلخیص الشافی ص ۳۳۴

یہی وجہ ہے کہ امامیہ نے ان بہت سے اخبار کو رد کر دیا جنھیں جمہور متواتر مانتے ہیں کیونکہ وہ ان کے شروط تواتر پر پورے نہیں اترتے۔

لیکن اس کے باوجود بعض اخبار سے مروی ہے علم کو وہ ضروری مانتے ہیں کہ ان کا علم محسوسات کی طرح ہے جیسے واقعہ بدر، واقعہ صفین، خبر غدیر خم وغیرہ، یہ بظاہر نظر و استدلال کے محتاج نہیں ہیں بلکہ سند تک کے محتاج نہیں ہیں۔ سند سے ان کی قوت میں اضافہ نہیں ہوتا اور سند نہ ہونے کی صورت میں ان کی قوت میں ضعف نہیں آتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ امامیہ کے ہاں تواتر سے جو علم مستفاد ہوتا ہے اس کے دو مراتب ہیں:۔

(۱) یہ علم ضروری ہی ہو سکتا ہے جو نظر و استدلال کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ امور محسوسہ کی طرح ہوتا ہے جیسے علم نبوت، آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اس بات کا علم کہ قرآن کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ پانچ وقت کی نمازوں کا اور ان کے ارکان کا علم۔

اس باب میں امامیہ اور جمہور مسلمین کے مابین پورا اتفاق ہے۔

لیکن امامیہ علم ضروری میں خبر غدیر خم اور خبر اوصیا ء اثنا عشری بھی شامل کرتے ہیں۔ اس باب میں امامیہ اور جمہور مسلمین کے مابین اختلاف ہے۔

(۲) ایسے متواترات بھی ہیں جو متصل السند متواترات کے مقابلے میں کم مشہور ہیں۔

پس غدیرِ خم کے موقع پر آپؐ نے موالات کا جو لفظ استعمال فرمایا تھا، اس سے مراد اہل سنت کی نظر میں محبت تھی۔

افادۂ تواتر کی نوعیت میں علماء کا اختلاف جس طرح جمہور کے یاں تواتر علم قطعی کو مفید ہے اسی طرح امامیہ کے یاں بھی ہے۔

لیکن علماء کا اختلاف افادۂ تواتر کی نوعیت میں ہے آیا یہ عیاں (مشاہدہ) کی طرح علم قطعی ہے یا یہ قطعیت نظر و استدلال کو مفید ہے؟

اس باب میں علماء باہم مختلف الرائے ہیں۔

اکثریت کا خیال یہ ہے کہ یہ علم ضروری کو مفید ہے جیسے آنکھوں دیکھا ماجرا، پس انسان خبر متواترہ کی تکذیب نہیں کر سکتا جیسے وجود کعبہ کا انکار نہیں کر سکتا، کعبے کا مکے میں ہونے سے انکار نہیں کر سکتا، نزول قرآن کا انکار نہیں کر سکتا۔

بعض دوسرے علماء کا خیال ہے کہ متواتر سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ طریق استدلال سے ثابت ہوتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا علم، یہ علم استدلال سے حاصل ہوا ہے نہ کہ مشاہدے سے۔

بعض دوسرے علماء کا خیال ہے کہ تواتر سے علم قطعی نہیں حاصل ہوتا، نہ یہ طریق ضرورت، نہ بہ طریق استدلال، بلکہ اس سے طمانیت حاصل ہوتی ہے جو اخبار آحاد سے ماوراء ہے۔

تواتر سے مستعار علم ضروری ہے یا استدلالی؟ غرض متواتر سے علم مستعار کے بارے میں یہ ہیں علماء کے قول ثلثہ۔

سوال یہ ہے کہ ان میں سے امامیہ کا مسلک کس قول پر قائم ہے؟

امامیہ اس مسلک میں سختی کے ساتھ قائم ہیں کہ تواتر سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قطعی ہے اس میں کسی احتمال کی گنجائش نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ شروط تواتر پر پورا اترتا ہو۔

لیکن ایک سوال پھر بھی رہ جاتا ہے۔

آیا یہ علم جو تواتر سے حاصل ہوتا ہے ضروری ہے یا استدلالی؟

طوسی وغیرہ کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ شریعت میں علم متواترہ بہ شکل عام علم نظری استدلالی ہے، کیونکہ انھوں نے جو شروط ثلاثہ لکھے ہیں وہ نظر و استدلال کی مقتضی ہیں، اس کے برعکس علم ضروری اس علم کی طرح ہے جو جس سے ثابت ہوا اور نظر و استدلال کا محتاج نہ ہو، بلکہ سلامتی حواس و ادراک کے سوا کسی چیز کا محتاج نہ ہو۔

خبرِ واحد

کیا غیر متواتر حدیث سے حجت لانا جائز ہے؟

خبرِ واحد کی تعریف | خبرِ واحد وہ ہے جس کے رواۃ حدِ تواتر تک نہ پہنچے ہوں، اگرچہ راویوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہو، امام شافعی اس کا نام "خبر خاصہ" رکھتے ہیں اور خبر متواتر کو "خبر عامۃ" کا نام دیتے ہیں۔

خبر خاصہ یا خبر واحد سے احتجاج علماء کے مابین موضع خلاف ہے۔

جمہور اس سے احتجاج کرتے ہیں لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف خبر متواتر سے احتجاج کرتے ہیں، خبر واحد سے نہیں کرتے، جو لوگ خبر آحاد سے احتجاج کرتے ہیں وہ اس صورت میں کرتے ہیں کہ خبر آحاد مجمل قرآن کی تفصیل بیان کرتی ہو، یا اس کے خفی کو جلی کرتی ہو۔

یہ آخری رائے اس حدیث پر مبنی ہے جو رسول اللہؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"تمہیں جو کچھ مجھ سے ملے، اسے کتاب اللہ پر پیش کرو۔ اگر وہ کتاب اللہ سے موافق ہے تو میرا قول ہے، اور اگر موافق نہیں ہے تو پھر میرا قول نہیں ہے، بھلا کیونکر میں کتاب اللہ کے خلاف کہہ سکتا ہوں جس نے مجھے ہدایت دی ہے!"

اس حدیث کو بعض علماء نے قبول کیا ہے، ان میں امامیہ بھی ہیں لیکن علماء سنت نے اسے رد کیا ہے۔ عبد الرحمٰن معروف بہ مہدی کا قول ہے۔

"زنادقہ اور خوارج نے اس حدیث کو وضع کیا ہے!"

اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو پھر جو حدیث قرآن کریم پر زیادتی کرتی ہو اور جو ان کے معنیٰ سے مشتق ہو اور اس کے غایات و مقاصد سے متفق ہو اسے مخالف کتاب اللہ نہیں مانا جا سکتا۔

جو لوگ احادیث کو مطلق طور پر قبول نہیں کرتے وہ گمراہ ہیں، امام شافعی نے اپنی کتاب "الام"

ہیں سے ان سے مناقشہ کیا ہے اور ان پر زبردست حجت قائم کی ہے۔

بہر حال فقہاء مسلمین کا جمہور اعظم خبر آحاد سے اخذ کا قائل ہے، وہ اسے ظنی مانتے ہیں قطعی تسلیم نہیں کرتے، کیوں کہ اگر وہ غیر متواتر ہو تو وہ احتمال کذب کے باوجود صحیح مانی جائے گی، کیونکہ عدالت کذب کو دور کر دیتی ہے، پس گو اس میں احتمال کذب ثابت ہے، لیکن عدالت نے جانب صدق کو ترجیح دے دی ہے۔

پس چونکہ خبر آحاد کی مفید ظن سمجھتے ہیں۔ اگرچہ مفید علم قطعی نہیں ہے۔ لہٰذا تکلیفات شرعیہ عملیہ میں اسے واجب العمل قرار دیتے ہیں لیکن اکثر لوگ اس پر اعتقاد نہیں رکھتے، چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں۔

"جو احادیث آحاد قبول نہ کرے اس سے توبہ نہ کراؤ!"

اس لئے کہ اس نے ایسی خبر کی مخالفت نہیں کی ہے جس پر اعتقاد واجب ہو اس نے ایسی خبر کی مخالفت کی ہے جو واجب العمل ہے واجب الاعتقاد نہیں ہے!

اور حنفیہ کے نزدیک اخبار آحاد ظنی ہیں جن سے ظن راجح پیدا ہوتا ہے۔ وہ ان احادیث سے اخذ کے قائل ہیں اور ان کی دو قسمیں کرتے ہیں۔

(۱) اخبار آحاد مشہورہ مستفیضہ | جس کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک شخص نے کی ہو، یا ایک صحابی سے اس کی روایت کی گئی ہو پھر وہ مشہور ہو گئی ہو اور صحابی سے ایک سے زیادہ لوگوں نے اس کی روایت کی ہو اور ان راویوں کی کثرت حد تواتر کو پہنچ گئی ہو۔

یا پھر تابعی سے اس کی روایت کی گئی ہو اور پھر کثرت رواۃ کے باعث تواتر کے درجے پر پہنچ گئی ہو۔

یہ احادیث صفت شہرت یا استفاضہ نہیں حاصل کر سکیں اگر عہد تابعین تا تبع تابعین میں مستفیض نہ ہو گئی ہوں اور جو اس عہد کے بعد مشہور ہوئی ہوں انہیں احادیث مشہورہ کے ذیل میں نہیں رکھا جائے گا کیونکہ تدوین کے مرحلے سے گزر چکنے کے بعد پھر تو تمام حدیثیں مشہور اور مستفیض ہو چکی ہیں۔

ان احادیث مشہورہ کا مرتبہ ظن راجح اور یقین قاطع کے بین بین ہے، یہ صورت حنفیہ کے ہاں ہے کیوں کہ ان کے ہاں احادیث مشہورہ سے تخصیص قرآن ہو سکتی ہے اور احکام میں اس پر زیادتی بھی روا ہے، نیز یہ مطلق کی تقیید بھی کر سکتی ہیں۔

بلکہ بعض حنفیہ کا خیال تو یہ ہے کہ احادیث مشہورہ مفید ظن نہیں بلکہ مفید قطعیت ہیں۔

(۲) ظنی احادیث

حنفیہ کے نزدیک جو حدیثیں مشہور نہیں ہوئیں اور حد شہرت یا استفاضے تک نہیں پہنچیں وہ بالاتفاق ظنی ہیں، ان سے قرآن کے عام کی تخصیص نہیں ہو سکتی نہ ان سے مطلق کی تقیید ہو سکتی ہے۔

اس جگہ ایک امر کی تنبیہ ضروری ہے۔

خبر آحاد مفید علم قطعی ہے

بعض علماء کا خیال ہے کہ خبر آحاد مفید علم قطعی ہے، جب وہ کسی ایسے امر میں وارد ہو جو صرف دلیل قطعی سے ثابت ہوتا ہو، اس قول کی نسبت نظام معتزلی کی طرف کی گئی ہے۔

طوسی نے ان سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے نزدیک:

"خبر واحد مفید علم ہے، مجرد ظن کو مفید نہیں ہے، بشرطیکہ ایسے موقع پر وارد ہوئی ہو کہ جہاں صرف قطعی کو قبول کیا جا سکتا ہو، اور از روئے عقل اس کے قبول میں کوئی مانع نہ ہو۔[1]"

امامیہ کے نزدیک خبر آحاد قابل قبول ہے

یہ تھے جمہور کے آراء جنہیں زیادہ سے زیادہ ایجاز و اختصار کے ساتھ ہم نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ یہ بحث خبر آحاد کے سلسلے میں امامیہ کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے بطور تمہید کے ضروری تھی۔

امامیہ کے نزدیک اگر خبر آحاد کی روایت کسی امام معصوم نے کی ہوتی بالاتفاق قابل قبول ہے کیونکہ وہ حجت ہے اور اس کی حجیت بالاتفاق تسلیم ہے اس لئے کہ قول معصوم بذات خود حجت ہے، اور اگر وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی اور روایت کر رہا ہو تو اور زیادہ اس کی حجیت میں اضافہ ہو جائے گا، اس صورت میں اس کی قطعیت بھی مسلم ہو گی، کیوں کہ اب وہ مفید علم ہے نہ کہ مفید ظن، امام کا بیان ویسا ہی ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان، کیوں کہ یہ بہ ودیعت اسے سونپا گیا ہے اور بہ وصیت اسے حاصل ہوا ہے۔

لیکن اگر اخبار آحاد کی روایت امام معصوم نے نہ کی ہو، بلکہ بہ طریق اس سے روایت کی گئی ہو، یا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہو، تو سوال زیر غور یہ آئے گا کہ کیا اس صورت میں بھی وہ حجت۔

---

[1] العدۃ ص ۲۱۳ للطوسی

واجب العمل ہے یا نہیں؟ اور از روئے استدلال اس وقت کیا ہوگی اگر اسے واجب العمل تسلیم کر لیا گیا؟

اس بارے میں امامیہ کے دو قول ہیں:۔

(۱) اخبار آحاد قبول سے انکار، عام اس سے کہ اس کی روایت بطریق امامیہ ہوئی ہو یا کسی اور طریق سے۔

یہ قول السید الشریف المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

بعض متقدمین علماء امامیہ اس کے قائل ہیں کہ خبر آحاد اس وقت تک قبول نہیں کی جاسکتی جب تک وہ کسی ایسے قرینے سے وارد نہ ہو جو اس کی نسبت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام معصوم کی طرف قطعی بنا دیتا ہو۔

اس سلسلے میں صاحب کتاب معالم الدین کا ارشاد ہے:۔

معالم الدین کا بیان | متقدمین کی ایک جماعت جس میں سید المرتضیٰ اور ابوالمکارم جیسے اصحاب شامل ہیں۔ یہ ابن زہرہ اور ابن براج اور ابن ادریس وغیرہ بھی ان سب کی رائے یہ ہے کہ شرعیات میں اسے قبول نہیں کیا جائے گا، اگر یہ ایسے قرائن سے محروم ہو، جو مفید علم ہوتے ہیں اور اس کے حکم کے بارے میں کہا ہے:۔

"یہ اس کی سزاوار ہے کہ اسے نظرانداز کردیا جائے۔"

طوسی کی رائے | (۲) یہ تو اس جماعت کی رائے تھی جس کے نزدیک احادیث آحاد کی حجیت ناقابل قبول ہے۔

لیکن یہ قول جمہور امامیہ کے مسلک کے خلاف ہے

امر واقعہ یہ ہے کہ جمہور امامیہ کے نزدیک اخبار آحاد کا قبول کرنا جائز ہے۔ عام اس سے کہ وہ ایسے طریق سے مروی ہو یا نہ ہو جو اسے مرتبہ قطعیت پر پہنچا دیتا ہو۔

طوسی کی رائے یہی ہے اور وہ مدعی ہیں اور اس پر امامیہ کا اجماع ہے

چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"قبول اخبار آحاد پر جو چیز دلالت کرتی ہے وہ اجماع ہے، میں نے اخبار آحاد کو مجمع علیہ پایا ہے۔ علماء نے اپنے تصانیف میں انہیں روایت کیا ہے اور اپنی کتب اصول میں انہیں مدون کیا ہے کسی نے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ اگر ان میں سے کوئی

کسی مسئلہ میں فتویٰ دیتا ہے تو اس سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ تم یہ بات کہاں سے کہہ رہے ہو؟ اگر کسی کتاب معروف یا اصل مشہور کا حوالہ دیا جائے اور راوی ثقہ ہو تو اس کی حدیث سے انکار نہیں کیا جائے گا، لوگ خاموش ہو جائیں گے اور اس کی بات تسلیم کریں گے اور اس کے قول کو قبول کریں گے، ان کا یہ طور عہدِ نبویؐ سے اور آپؐ کے بعد عہد ائمہ سے چلا آتا ہے۔

امام جعفر صادق کے زمانے سے علم چلنا شروع ہوا، ان کی حیثیت سے روایات کی کثرت ہوئی، پس اگر اخبار آحاد پر عمل جائز نہ ہوتا تو اس پر اجماع کیسے ہو جاتا؟ اور اس مجمع علیہ میں چونکہ امام معصوم شامل ہے۔ لہٰذا غلطی اور نسیان کی نسبت اس کی طرف جائز اور روا نہ ہوگی۔[1]"

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ خبر آحاد پر عمل درآمد کی تائید میں طوسی اجماع کا حوالہ دیتے ہیں۔ شریف مرتضٰی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ قبول خبر آحاد کے مخالف تھے اور اسے مرتبۂ علم پر نہیں رکھتے تھے۔ لیکن طوسی کے ان تصریحات کی روشنی میں شریف مرتضٰی کی طرف اس قول کی نسبت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

کیا طوسی شریف مرتضٰی کے خلاف ہیں؟

اس نسبت کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ طوسی شریف مرتضٰی کے شاگرد رشید ہیں، اور قبول اخبار آحاد پر اجماع کا ذکر کر رہے ہیں، اگر شریف مرتضٰی قبول خبر آحاد کے مخالف ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اجماع کا حوالہ دیتے؟

کیا یہ جانتے ہوئے کہ ان کے شیخ اور استاذ خبر آحاد کو قبول نہیں کرتے اس کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں پھر بھی اس کی تائید میں اجماع کو پیش کرتے رہتے؟

امامیہ اور اہل سنّت کا اتفاق

اس باب میں امامیہ کے دلائل علماء سنت کے دلائل سے متفق اور ہم آہنگ ہیں، خاص طور پر امام قرشی محمد بن ادریس شافعی رضی اللہ عنہ کے دلائل سے بلکہ شبہ ہوتا ہے کہیں یہ دلائل امام شافعی کے "الرسالہ" سے ماخوذ ہوں، دونوں

---

[1] عدۃ الاصول للطوسی ص ۳۱، ۳۲۔

کی یکسانیت کا یہ حال ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

یعنی: سوا ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے۔ تاکہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں، اور تاکہ یہ لوگ اپنی (اس) قوم کو جبکہ یہ ان کے پاس واپس آئیں ڈرائیں!

صاحب معالم الدین اس دلیل کی توجیہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ خبر واحد پر عمل واجب ہے!

---

(۲) خبر واحد کے اثبات میں جمہور امامیہ ایک یہ دلیل بھی لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یٰۤاَیھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین!"

یعنی! اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو، کبھی کسی ناوانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو، پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے!

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کی لائی ہوئی خبر کو خوب اچھی طرح کھنگال لینا چاہئے۔ لیکن اگر خبر لانے والا فاسق نہ ہو تو اس کا قول قبول کر لیا جائے گا!

پس آیت اپنے منطوق کے اعتبار سے فاسق کی لائی ہوئی خبر کے لئے تحقیق کی طالب ہے اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے خبر غیر فاسق کو قبول کر لینے کی اجازت دیتی ہے۔

قول فاسق میں مقدار صدق کی تلاش | پھر ایک بات اور بھی ہے۔ آیت میں فاسق کی لائی ہوئی خبر کو رد کر دینے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اس کی تحقیق کر لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا تحقیق کے بعد وہ قبول کی جا سکتی ہے۔

یعنی قول فاسق اس لئے رد نہیں کیا جائے گا کہ وہ فاسق ہے یا واحد ہے، بلکہ اس میں مقدار صدق تلاش کی جائے گی، پس آیت اپنے منطوق کے اعتبار سے اس امر پر دال ہے کہ خبر واحد

عادل قبول کرلی جائے گی رد نہیں کی جائے گی، اور وہ دین میں حجت ہوگی![1]"

(۳) امامیہ اس سلسلے میں ایک اور دلیل بھی پیش کرتے ہیں جو ان کے مذہب سے مشتق ہے اور خاص چیز ہے۔

وہ دلیل یہ ہے کہ اگر ائمہ کے معاصرین اتباع کا اتفاق اس کے قبول کرلینے پر ہو تو قبول کرلی جائے گی!

چنانچہ صاحب معالم الدین لکھتے ہیں:-

"قدماء اصحاب کا جو ائمہ علیہم السلام کے معاصر ہوں، خبر آحاد پر اطباق اور تدوین بشرطیکہ ائمہ علیہم السلام سے اس کے خلاف کوئی حدیث مروی نہ ہو درست ہے چنانچہ اصولیوں میں ابوجعفر منصور طوسی وغیرہ نے خبر واحد کے قبول کرنے سے اتفاق کیا ہے! اور مرتضیٰ اور ان کے اشتباہ کے سوا کسی نے انکار نہیں کیا ہے![2]"

خبر آحاد کے قبول پر اجماع | ہم بتا چکے ہیں کہ طوسی خبر آحاد پر اجماع کے قائل ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ سید شریف مرتضیٰ کی طرف عدم قبول خبر آحاد کی نسبت درست نہیں ہے۔

(۴) امامیہ کی چوتھی دلیل قبول خبر آحاد کے لئے یہ ہے کہ فقہ کے دو ادوار ہیں:-

(۱) پہلا دور **علم قطعی کا دور ہے** | یعنی حیات ائمہ رضوان اللہ تبارک وتعالیٰ علیہم کا دور یہ علم ہر اعتبار سے قطعی ہے۔ اس لئے کہ امام کی موجودگی سے تعلق رکھتا ہے۔

(۲) **دور ثانی، بعد از ائمہ** | یہ دور عصر ائمہ کے بعد کا ہے۔ اس دور میں علم قطعی کا دروازہ بند ہوگیا۔ بجز اس علم کے جو امور دین میں بالضرورت معصوم ہو، یا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ سے متواتر طور پر معلوم وماثور ہو۔ اور شروط تواتر پر پورا اترتا ہو۔

اس کے علاوہ جو علم ہے وہ ظنی ہے:

عقل اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ اگر ظن جہالت مختلفہ متعددہ اور متفاوت فی القوۃ

---

[1] معالم الدین ص۱۹۰۔

[2] معالم الدین ص۱۹۰۔

رکھتا ہو تو ری سے ضعیف کی طرف عدول معیوب ہے اور بلاشبہ اکثر اخبار آحاد سے جو ظن حاصل ہوتا ہے وہ دوسری تمام ادلہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا عمل میں اس کی تقدیم واجب ہے[1]۔"

اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ دلالات عقلی جو احکام پر دلالت کرتی ہیں، ظنی ہیں، اور اخبار آحاد کی دلالت بھی ظنی ہے، لہٰذا اخبار آحاد کا اخذ واجب ہے۔ اس لئے کہ وہ نصوص ہیں اور نص کی موجودگی میں عقل کا کوئی کام نہیں اس لئے کہ نص زیادہ قوی ہے اور جب قوی موجود ہو تو ضعیف پر عمل نہیں کیا جا سکے گا۔

امامیہ کی طرف سے خبر واحد کا اثبات

یہ ہیں وہ دلائل جن سے امامیہ خبر واحد کا اثبات کرتے اور اسے حجت تسلیم کرتے ہیں۔

نیز ظنی ہونے کے باوجود وہ واجب العمل ہے۔

لیکن اس سے علم قطعی حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس پر اعتقاد کی بنا بھی نہیں رکھی جا سکتی، یعنی اگر کوئی شخص خبر آحاد کو تسلیم نہ کرے تو اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ توبہ کر، جیسا کہ امام شافعی کا ارشاد ہے۔

امامیہ کے دلائل

حضرات امامیہ اس باب میں اپنے مذہب کی تائید میں دو دلیلیں رکھتے ہیں نہ (۱) یہ کہ مصادر فقہ، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اقوال ائمہ ہیں۔

: سنت طریق ائمہ سے ثابت ہوتی ہے۔

: ائمہ نے جو کچھ کہا ہے وہ از روئے تواتر ثابت ہے۔ اس کے لئے خبر آحاد کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

لیکن یہ دلیل نظری ہے کیوں کہ ائمہ کی طرف جو کچھ منسوب ہے اس میں صحیح بھی ہے اور غیر صحیح بھی۔ اس بات پر خود امامیہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ چنانچہ وہ اسے واجب قرار دیتے ہیں کہ ائمہ کی طرف جو کچھ منسوب ہو اس کی تحقیق کی جائے، اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ جو کچھ ائمہ کی طرف منسوب ہو وہ سب کا سب صحیح ہو، نہ جملہ اخبار ائمہ کو متواتر کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اگر وہ متواتر ہوتے تو بعض ان میں سے رد نہ کئے جاتے۔

(۲) دوسری دلیل:۔

---

[1] معالم الدین ص ۱۹۰

خبر واحد قیاس کی طرح ہے۔ دونوں مفید ظن ہیں اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو ظن سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو ظن سے کام لیتے ہیں اور دین کی معرفت بہ طریق ظن حاصل کرتے ہیں، چنانچہ فرماتا ہے:۔

ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً!

اور عبادت میں ظن کا گزر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی سرزنش کی ہے کہ وہ ظن کی پیروی کرتے ہیں۔ ادلۂ قطعیہ کو ترک کر دیتے ہیں اور ظن کو اختیار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ عقائد میں ظن سے کام لینا روا نہیں بلکہ واجب ہے کہ عقائد کی بنا علم قطعی پر ہو اور یہ لوگ سبیل علم حقیقی کو ترک کر دیتے ہیں اور ادراہوا، کی پیروی کرنے لگتے ہیں جن کا نتیجہ ظن فاسد، بلکہ وہم باطل کے سوا کچھ نہیں نکلتا!

عصر ائمہ معصومین میں امامیہ پیش آمدہ مسائل میں ان سے رجوع کر لیا کرتے تھے، اس زمانے میں علم قطعی بہ تواتر ان کے پاس موجود تھا لیکن ائمہ کے بعد آرا و ائمہ کی معرفت کوئی سبیل نہیں رہ گئی، سوا روایات کے، خواہ یہ روایات متواتر ہوں یا غیر متواتر۔

اور صورت یہ ہے کہ متواتر قلیل ہیں لہٰذا ضروری ہوا کہ غیر متواتر پر زیادہ تر بھروسا کیا جائے، لہٰذا عصر ائمہ کے بعد اشد حاجت کے وقت خبر آحاد کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ ان کے لئے نہیں رہا۔

بہر حال اس مسئلے میں اختلاف کا نچوڑ یہ ہے کہ امامیہ میں سے جو لوگ اخبار آحاد کو قبول نہیں کرتے وہ انہیں ظنی قرار دیتے ہیں اور جب وہ ظنی ٹھہریں تو ان کے صدق پر مرجح کوئی چیز ہونی چاہئے کیونکہ بداہتہ اخبار آحاد صدق و کذب دونوں کی محتمل ہیں۔

اور اس احتمال کی صورت میں ضروری ہے کہ کوئی ایسی دلیل ہو جو کذب یا صدق میں سے کسی ایک کو واضح کر دے، ایک کو رد کر دے اور دوسری کو ثابت کر دے۔

قرینۂ عقلی بھی ضروری ہے

نیز یہ کہ خبر کے ساتھ کوئی قرینۂ عقلی یا بربنائے مصلحت ہونا چاہئے کیونکہ قرینہ اور خبر دونوں موجب علم ہیں۔

پس اس صورت میں موضع اختلاف مانع کذب صدق کے قرینۂ مثبتہ کا اشتراط ہوا۔

لہٰذا جو لوگ اخبار آحاد کو بہ مجرد قبول نہیں کرتے وہ اس اشتراط کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

اور جو لوگ اخبار آحاد کو بہ مجرد قبول کر لیتے ہیں وہ اس اشتراط کو بالکل اہمیت نہیں دیتے۔

امامیہ کی طرف سے تعدد کی شرط یہ ہیں ہر دو فریق نقاط نظر قبول یا عدم قبول خبر آحاد کے سلسلے میں

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اخبارِ آحاد کے قبول کے لئے کوئی شرط ہو یا نہ ہو، آیا امامیہ تعدّد کی شرط رکھتے ہیں یا نہیں؟ آیا وہ خبرِ واحد کو ایک فردِ واحد کی روایت سے قبول کر لیتے ہیں؟

بعض امامیہ تعدّد کی شرط رکھتے ہیں اور اس عمل میں وہ علی رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کرتے ہیں۔

حضرت علی کا مسلک حضرت علی رضی اللہ عنہ خبرِ واحد عقور میں قبول نہیں کرتے تھے بلکہ یہ شرط عائد کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرنے والے کم از کم دو آدمی ہوں بلکہ زیادہ بھی ہوں تو بہتر ہے۔

امام علی کرم اللہ وجہہٗ کی رائے کتبِ سنّت سے بھی اسی طرح ثابت ہے جس طرح کتبِ شیعہ سے ثابت ہے، طوسی نے "عدۃ" میں اس کا ذکر کیا ہے[1]

امامیہ کا ایک دوسرا گروہ شرطِ تعدّد کا قائل نہیں ہے بلکہ خبرِ واحد کی روایت پر اکتفا کرتا ہے اور تعداد کو بالکل اہمیت نہیں دیتا، بشرطیکہ راوی ثقہ اور عادل ہو۔

امامیہ کی طرف سے راوی کے لئے شرط اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امامیہ راوی کے لئے کیا شرط رکھتے ہیں؟

طوسی نے اپنی کتاب عدۃ الاصول میں بیان کیا ہے کہ خبرِ واحد عمل میں حجّت ہے، بشرطیکہ راوی طائفہ محقہ کا ایک فرد ہو۔

اور طوسی اور برادرانِ اثنا عشری کی نظر میں طائفہ محقہ سے مراد راوی کا اثنا عشری ہونا ہے۔ گویا راوی کے لئے شرط یہ قرار پائی کہ اسے اثنا عشری ہونا چاہیئے۔

اس کا مطلب یہ نکلا کہ ہر وہ خبر جو غیر محقہ جماعتوں اور فرقوں کے لوگوں سے روایت کی ہو نامقبول ہے، صرف وہ خبر قبول کی جائے گی جو طائفہ محقّہ کے راوی نے روایت کی ہو۔

چنانچہ طوسی کہتے ہیں:۔

"تحقیقی بات یہ ہے کہ ایسی خبر پر عمل نہیں کیا جائے گا جسے صرف کسی امامی نے روایت کیا ہو بلکہ ضروری ہے کہ وہ کسی امام سے روایت کی گئی ہو"[2]

اس اصول کی بنیاد پر ایک اثنا عشری کی روایت پر دو قیدیں عائد ہوتی ہیں۔

---

[1] العدۃ ص ۲۱ [2] عدۃ الاصول ص ۳۱۔

(۱) راوی امامی ہو۔

(۲) اور امام سے روایت کی گئی ہو۔

اگر امامی نے خبر آحاد کسی امام سے روایت نہیں کی ہے تو وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اس کی سند متصل چلی گئی ہو اور راوی تمام کے تمام امامی ہوں۔

اس سے یہ بات متحقق ہوئی کہ امامیہ صرف روایت آل بیت کو قبول کرتے ہیں۔

اور اس شرط کا منطوق اس امر پر دال ہے کہ امامیہ صرف ان حدیثوں کو قبول کرتے ہیں جو ائمہ آل بیت سے مروی ہوں۔

کیونکہ جملہ آل بیت سے روایت نہیں کی جاسکتی۔

کیونکہ جملہ آل بیت ائمہ نہیں ہیں۔

پس امام حسن کی اولاد سے روایت نہیں قبول کی جائے گی۔

کیونکہ امام حسن کے بعد امامیہ ان کی اولاد میں سے کسی کو امام نہیں مانتے۔

غیر اثنا عشری کی روایت

طوسی کے کلام سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر غیر اثنا عشری شخص کسی امام سے روایت قبول کرے تو اس کی روایت قبول کرلی جائے گی۔

مثلاً اگر امام ابوحنیفہ امام جعفر صادق سے روایت کریں تو اسے قبول کرلیا جائے گا۔

لیکن اکثر امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ غیر امامی کی روایت سوا محدود صورتوں کے قبول نہیں کی جائے گی۔

فقہاء شیعہ میں ایسے لوگ بھی ہیں جو غیر اثنا عشری کی روایت قبول کرلیتے ہیں۔ اگر وہ ثقہ ہو اور امامیہ کا پسندیدہ شخص ہو، چنانچہ رسائل ابوالمعالی میں غیر امامی کی روایت کو صحیح قبول کرلینے کا جواز موجود ہے وہ کہتے ہیں۔

"اگر اہل سنت میں سے کوئی ایسا شخص روایت کرے جو ثقہ ہو اور مادح ہو تو اس کی روایت قبول کرلی جائے گی۔[۱]"

اس عبارت سے دو امور پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) غیر امامی کی روایت اگر وہ امامی سے زیادہ ثقہ ہو یا ممدوح امامیہ ہو، قبول کرلی جائے گی۔

ثقہ اور ممدوح امامیہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ صلاح و فتویٰ میں مشہور و معروف ہو۔

اور آل بیت سے محبت رکھتا ہو تو گو وہ ان کے گروہ میں داخل نہیں ہے اور عصمت ائمہ
اور وصیت نبی ص کا قائل نہیں ہے لیکن فاسق بھی نہیں ہے نہ کافر ہے۔ لہٰذا اس کی روایت
قبول کر لی جائے گی!

(۲) لیکن یہ صحیح نہیں ہوگا کہ پوری کی پوری سند غیر امامی ہو، اگرچہ جمیع رواۃ اہلِ توثیق و مدح کیوں
نہ ہوں۔

: ضروری ہے کہ باقی افراد سند امامی ہوں۔

: اور اس امامی کے لئے کیا یہ ضروری ہوگا کہ ثقہ ہو، صدق و امانت میں معروف ہو۔

اس جگہ ہم برادران امامیہ کے ہاں جو شروط روایت ہیں ان کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

امامیہ کے ہاں شروط روایت یہ ہیں جن سے جملہ رواۃ کے منازل واحوال کی تمیز ہو جاتی ہے۔

: راوی کو راجح صدق ہونا چاہیئے۔ یہ شرط ایسی ہے جو علماء حدیث کے ہاں عام ہے
سب اس سے اتفاق کرتے ہیں۔

: راوی کو بالغ اور عاقل ہونا چاہیئے۔

: راوی کو مسلمان ہونا چاہیئے۔

: راوی کی قوت یادداشت نسیان پر غالب ہونی چاہیئے۔

: راوی اگر وقت سماع نابالغ لیکن صاحب ادراک ہو اور وقت ادائے روایت بالغ ہو چکا ہو تو
اس کی روایت قبول کر لی جائے گی[1]

اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ امامیہ کے ہاں کم سن راوی کی روایت قبول کرنے کی وجہ یہ ہے
کہ وقت اداء روایت معاملات دین میں اس کا کذب معروف نہیں ہے اور کذب کا تیقن صرف
وقت اداء روایت ہی ہو سکتا ہے نہ کہ سماع کے وقت لہٰذا اگر ادا روایت کے وقت وہ بالغ ہے تو اس
کی روایت قبول کی جائے گی، گو وہ روایت سماع پر مبنی ہو البتہ مبنی کو صاحب تمیز ہونا چاہیئے۔

---

[1] التہذیب ص ۹۷

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ مبنی جو کچھ سنتا ہے اس میں وہ دھوکا کھا سکتا ہے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے نہیں سنا ہے اس کے بارے میں باور کر لے کہ سُن چکا ہے، لہٰذا اس کی روایت مشکوک ہوگی اور یہی کیفیت سماع کے وقت بھی تصور کی جائے گی۔ بالغ ہونے کے بعد جب اس روایت کو ادا کرتا ہے تو اپنی وسعت خیال کے مطابق ادا کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا قول اس کا سزاوار نہیں کہ قبول کیا جائے، پس شرط سماع بھی بلوغ ہونی چاہیئے نہ کہ صرف ادا روایت جیسا کہ شہادت میں ہوتا ہے کیونکہ عقل اس چیز کا بھی تخیل کر لیتی ہے جو حقیقتاً واقع نہ ہوئی ہو اور ایسے قول کا خیال کر لیتا ہے جو کسی دوسرے نے کہا ہو، پس صبیان کے ہاں ضبط کی وہ کیفیت نہیں ہے جو کبار کے ہاں ہے۔ لہٰذا امامیہ کے ہاں صاحب تہذیب کا قول متفق علیہ نہیں ہے، بلکہ موضع اختلاف ہے۔

جہت اشتراط اسلام کا تعلق اور جہاں تک جہت اشتراط اسلام کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ہمیں دو مختلف نصیں ملتی ہیں۔

جمال الدین الحلی کے نزدیک شرطِ قبول اسلام ہے۔

اور صاحب معالم الدین کے ہاں شرط قبول ایمان ہے

پس بادی النظر میں اس موضوع پر امامیہ کے ہاں دو رائیں ہیں!

(۱) عدم اشتراط ایمان، اور صرف شرط اسلام پر اکتفا۔

یہ رائے اثنا عشری حضرات کی ایک قلیل جماعت کی ہے۔

(۲) اشتراط ایمان اور عدم اکتفاء شرط اسلام

یہ رائے امامیہ کے بہت بڑے گروہ کی ہے۔

ایک نازک سا فرق ان ہر دو آراء کے مابین ایک نازک سا فرق ہے جو دو طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) امامیہ حضرات فاسقین کو مومنین نہیں خیال کرتے، بلکہ انہیں صرف مسلمان قرار دیتے ہیں اور یہ اصول منہاج معتزلہ سے بہت قریب ہے، جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں۔

(۲) یہ حضرات اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کو مسلمان کہتے ہیں، مومن نہیں کہتے۔ چنانچہ کفایۃ الاحکام میں وارد ہے کہ واقف جس وقت یہ کہے:

"میں نے یہ چشمہ فقراء مومنین کے لئے وقف کیا ہے، تو اس وقف میں صرف فقراء اثنا عشریہ ہی شامل ہوں گے اور اگر وہ فقراء مسلمین کا لفظ استعمال کرے تو وقف جملہ اہل

قبلہ کو شامل ہو گا۔ امامی اور اثنا عشری کے مابین کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا!"

اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صاحب کتاب معالم الدین نے ابتدا راوی کے لئے اہل قبلہ ہونے کی شرط رکھی ہے لیکن جمال الدین الحلی نے یہ شرط نہیں رکھی ہے، اس بارے میں وہ کہتے ہیں،

"مسلمانوں میں سے جو مخالف ہو وہ مبتدع ہے، اگر ہم اسے کافر قرار دیں تو روا ہے اگرچہ اس کی تحریم کذب ثابت ہو، اس لئے کہ وہ اس آیۃ کریمہ کے ذیل میں آتا ہے جس میں کہا گیا ہے۔

ان جآءکم فاسق بنبإ

پس مخالف غیر کافر کی روایت نہیں قبول کی جائے گی، اس لئے کہ اس کا اندراج فاسق کے طور پر ہے[1]"

اس جگہ اگر دونوں رائیں مل جاتی ہیں، کیوں کہ دونوں مخالف کی روایت کو قبول نہیں کرتے۔ اور اگر معالم الدین نے تصریح کی ہے کہ اکثر امامیہ قبول روایت کے لئے ایمان کی شرط رکھتے ہیں لیکن غیر امامی کی روایت کی ترجیح کے معاملے میں اختلاف ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ غیر امامی کی روایت بالاتفاق رد کر دی جائے گی۔

بعض کے نزدیک غیر امامی راوی اگر امین اور غیر متہم ہے، تو اس کی روایت قبول کر لی جائے گی اور اسے ترجیح دی جائے گی۔

ابو المعالی کی رائے بین بین ہے، ان کی رائے میں غیر امامی کی روایت کو ترجیح ہو گی۔ اگر وہ امامی راوی سے زیادہ ثقہ ہو، یا امامیہ کا ممدوح ہو!

ابو المعالی کی رائے

گویا غیر امامی کی روایت قبول کرنے کے سلسلے میں امامیہ کے ہاں دو شرطیں ہیں۔

(۱) یہ کہ غیر امامی ثقہ ہو اور امامیہ کا ممدوح ہو۔

(۲) یہ کہ سند میں متوسط ہو، بایں طور کہ امامی سے روایت کی گئی ہو، اور اس سے امامی نے روایت کی ہو، الغرض اس کی سند منفرد نہ ہو، بلکہ متوسط ہو اور اس سے امامی نے روایت کی ہو۔

---

[1] التہذیب ص ۸۷۔

لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ امامیہ کے ہاں اس کے ممدوح ہونے کی صراحت موجود ہو۔

اس بحث سے جو حقائق نظر کے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) امامیہ اہل سنت کی ایسی روایت قبول نہیں کرتے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متصل ہو۔ ضروری ہے کہ اس میں ائمہ اہل بیت میں سے کسی کا توسط ہو۔

(۲) غیر امامی کی روایت ائمہ سے اس وقت تک قبول نہیں کی جائے گی جب تک اس کے صدق روایت کا قرینہ ترجیحی طور پر موجود نہ ہو۔

اور قرائن میں یہ بات شامل ہو کہ غیر امامی راوی دو راویوں کے بیچ میں ہو اور یہ دونوں راوی امامی ہوں۔

(۳) امامیہ کے ہاں ترجیح اس بات کی ہے کہ بغیر قرینے یا حجت کے غیر امامی کی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔

کیا یہ امام صادق کا منہاج ہے

امامیہ کی کتب اصول سے مذکورہ باتیں ثابت ہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے آیا یہ باتیں اس منہاج سے مستفاد ہیں جو امام جعفر صادق نے مقرر فرمایا ہے؟ یا کسی اور امام سے اس منہاج پر مستفاد ہیں۔

طوسی نے اس کا جواب دیتے ہوئے تہذیب میں لکھا ہے کہ یہ سب باتیں امام جعفر صادق سے ماثور و منقول ہیں۔

تہذیب کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"عمر بن حنظلہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے ابو عبد اللہ سے دو امامی لوگوں کے بارے میں دریافت کیا جو جھگڑ پڑے تھے اور یہ جھگڑا دین یا میراث کے مسائل میں تھا، چنانچہ انہوں نے معاملہ حاکم کے سامنے پیش کیا اور اس کا فیصلہ حاصل کیا، کیا یہ درست ہے؟

میرے سوال کے جواب میں امام جعفر صادق نے فرمایا:

جس کسی نے حاکموں کے پاس فریاد کی خواہ وہ حق سے متعلق ہو یا باطل سے اس نے گویا طاغوت سے داد رسی چاہی اور اس کے حکم کے مطابق اس نے جو کچھ حاصل کیا، وہ حرام حاصل

کیا، اگرچہ وہ حق ثابت ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ اس نے یہ حق ثابت طاغوت کے حکم سے حاصل کیا ہے، حالانکہ اللہ تعالے نے اس سے منع فرمایا ہے، وہ فرماتا ہے:

یریدون ان یتحاکموالی الطاغوت، وقد امروا ان یکفروا بہ

میں نے یہ سنکر عرض کیا۔

"پھران دونوں شخصوں کو کیا کرنا چاہئے تھا؟"

امام صاحب نے جواب میں ارشاد فرمایا:

"انہیں چاہئے تھا کہ ایسے شخص کو تم میں سے تلاش کرتے جو راوی حدیث ہوتا، اور ہمارے حلال وحرام سے واقف ہوتا اور ہمارے احکام جانتا ہوتا پس اس کے حکم کے سامنے سر جھکا دیتے؛ ایسے شخص کو میں نے تم پر حاکم بنایا ہے پس اگر وہ ہمارے حکم کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور ہم میں سے کوئی اس کے فیصلے کو قبول نہیں کرتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا استخفاف کرتا ہے اور شرک کا ارتکاب کرتا ہے!"

میں نے یہ سنکر بارگاہ امام میں عرض کیا:

"اگر ہر شخص ہمارے اصحاب میں سے ایک شخص کو اختیار کرلے جن دو شخصوں کو یہ دونوں اختیار کریں اپنے فیصلے میں مختلف الرائے ہوں اور ہر دو کا یہ اختلاف آپ کی حدیث کے بارے میں ہو تو؟

امام جعفر صادق نے یہ سنکر ارشاد فرمایا:

"فیصلہ اس کا قبول کیا جائے گا جو ان دونوں میں زیادہ عادل ہو، زیادہ فقیہہ ہو، زیادہ اصدق فی الحدیث ہو!"

میں نے اس ارشاد کے جواب میں عرض کیا:

اگر وہ دونوں برابر کے عادل ہوں، دونوں میں سے کسی کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ ہو تو؟

"پھر دیکھا جائے دونوں میں سے کس کا فیصلہ اجماعی اصول پر ہے؟ جس نے اجماع پر فتویٰ دیا ہوگا وہی قابلِ قبول ہوگا اور ہمارے حکم کے بالکل مطابق ہوگا اور وہ فیصلہ ترک کردیا جائے گا جو روایت شاذ پر مبنی ہوگا، کیونکہ مجمع علیہ احادیث پر جو فیصلہ ہوگا وہ ہر طرح

کے شک و شبہ سے ماوراہو گا اور یاد رکھو امور تین ہیں :۔
(۱) وہ امر جو رشد کا بیان کرتا ہو، اس کی پیروی کی جائے گی۔
(۲) وہ امر جو گمراہی کا آئینہ دار ہو، اس سے اجتناب کیا جائے گا!
(۳) وہ امر جو مشکل ہو وہ اللہ اور رسول کی طرف لوٹا یا جائے گا، رسول اللہ نے فرمایا ہے
حلال بیّن ہے، حرام بیّن ہے اور شبہات ان دونوں کے مابین ہیں۔
پس جس نے شبہات کو ترک کر دیا محرمات سے بچ گیا اور جس نے شبہات کو لے لیا
اس نے محرمات کا ارتکاب کیا۔
میں نے عرض کیا :
" اگر دونوں خبریں مشہور ہوں اور ان دونوں ثقات نے آپ سے روایت کی
ہو تب ؟"
ارشاد فرمایا :
" پھر دیکھو کہ ان دونوں میں کون سی خبر حکم کتاب و سنت کے مطابق ہے اس کو قبول
کرلو۔ اگرچہ لوگ اس کے مخالف کیوں نہ ہوں اور جو خبر حکم کتاب و سنت کے خلاف ہو
اسے رد کر دیا۔ اگرچہ عوام اس کی موافقت کیوں نہ کرتے ہوں"!
"میں نے عرض کیا :
"میں آپ پر قربان اگر دو فقیہہ کتاب و سنت سے حکم لائیں اور ان میں سے ایک
وہ ہو جس کے عوام موافق ہوں، اور دوسرا وہ ہو جس کے عام لوگ مخالف ہوں تو
ان دونوں میں سے کون سی خبر قبول کی جائے گی"؟
امام عالی مقام نے ارشاد فرمایا :
" جس کے عام لوگ مخالف ہوں اس میں رشد و ہدایت ہے!"
میں نے پھر عرض کیا :
میری جان آپ پر قربان، اگر دونوں خبروں کے عام لوگ موافق ہوں تو کیا کیا جائے؟
ارشاد فرمایا :
پھر یہ دیکھا جائے گا کہ حکام و قضاۃ ان دونوں میں سے کس خبر کی طرف مائل ہیں؟
جس طرف مائل ہوں وہ ترک کر دی جائے گی۔

میں نے عرض کیا:۔
"اگر دونوں خبروں کی طرف مائل اور ان سے متفق ہوں پھر راہ عمل کیا ہوگی؟
میرے اس معروضے کے جواب میں حضرت امام نے فرمایا:
جب تک امام سے نہ مل لو انتظار کرو، کیونکہ شبہات کے وقت وقوف ہلکات میں پڑ جانے سے بہتر ہے"[1]

طوسی اور کلینی کی رائے کا فرق یہ ہے وہ کلام جو امام صادق کی طرف منسوب ہے اور امامیہ کی ایک کتاب میں جو اصول حدیث میں ہے موجود ہے اس کے راوی کلینی نہیں ہیں بلکہ طوسی ہیں جن کا قول ہے کہ قرآن میں نہ کسی طرح کی تحریف ہوئی ہے نہ کوئی نقص اس میں ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس روایت کو درست ماننے پر ہم اپنے آپ کو مطمئن نہیں کر سکتے۔

بہر حال اس روایت کا پایہ کچھ بھی ہو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مخالفین کی روایت قبول نہیں کی جاسکتی گو وہ بڑی حد تک درست کہتے ہیں۔

اور جب دو حدیثیں کتب امامیہ میں موجود ہوں اور ان میں سے ایک عوام الناس یعنی اہل سنت سے موافقت رکھتی ہو تو اسے ترک کر دیا جائے گا۔

جب یہ صورت ہے تو ظاہر ہے عوام الناس کے محدث کی روایت بھی ناقابل ٹھہرے گی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امامیہ کے ہاں یہ روایت صحیح ہے، کیوں کہ اس پر کسی نے نکتہ چینی نہیں کی ہے بلکہ بعض نے تو اس کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔

عدم قبول روایت کے اسباب لیکن ہم کسی طور پر بھی امام جعفر صادق کی طرف اس روایت کی نسبت درست اور صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔

اور اس کے ہمارے پاس وجوہ بھی ہیں:

(۱) یہ نسبت کیوں غلط ہے اس روایت کی امام جعفر صادق کی طرف عدم قبول نسبت کی ایک وجہ یہ ہے کہ امام صاحب سے مالک، ابو حنیفہ اور سفیان ثوری رضی اللہ علیہم نے روایت کی ہے۔

---

[1] السند ج ۱ ص ۱۹، ۲۰، ۲۱۔

عدالت راوی

جس کے بغیر روایت حدیث نامقبول ہے

عدالت کی تعریف | حضرات امامیہ راوی کے لئے ایک شرط یہ بھی رکھتے ہیں کہ وہ عادل ہو، اگرچہ وہ غیرامامی ہو۔

صاحب معالم الدین نے عدالت کی تعریف یوں کی ہے کہ یہ ایسا خدا داد ملکہ ہے جو آدمی کو ارتکاب کبائر اور اصرار صغائر سے روکتا ہے۔

پس عدالت ایک امر نفسی ہے جو ثمرہ ہے تقویٰ، فضیلت اور خلق کریم کی بنیاد پر ریاضت نفس کا۔ عدالت کے مظاہر حسی ہیں۔ مثلاً مرد عادل کبائر سے دور رہتا ہے۔

اس سے اگر صغائر سرزد ہوتے ہیں تو شوق و اصرار سے نہیں۔ اتفاق سے اور وہ بھی غیرارادی طور پر۔

اور اس طرح یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول سے مطابق ہو جاتی ہے جس میں اس نے اہل جنت کا ذکر فرمایا ہے!

الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم

یعنی: یہ وہ لوگ ہیں جو مجتنب رہتے ہیں کبائر اور فواحش سے بجز اتفاق کے

شرط روایت کا اصول کیا ہے؟ | راوی کی شرط عدالت کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ عدالت قبل از روایت معلوم ہونی چاہئے، یا روا ہے کہ مستور الحال رہے اور اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو اور قیاس کر لیا جائے کہ مومن صاحب صلاح ہوتا ہے پس اصل لوگوں کی یہ قرار پائی کہ وہ فطرت پر ہوتے ہیں۔

کیا عدالت بھی ایک فطری امر ہے؟

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اثنا عشری میں اختلاف ہے، بالکل اسی طرح جیسے یہ مسئلہ جمہور فقہاء کے مابین اختلافی اور نزاعی ہے۔

اور یہ بات کس طرح تسلیم کی جاسکتی ہے کہ جو لوگ دین میں مہتم ہوں ان کی روایت قبول کرلی جائے؟

(۲) امام صادق اور فقہ امصار امام جعفر صادق کی خود یہ کیفیت تھی کہ وہ فقہ امصار اسلامیہ سے واقفیت کے جویار ہتے تھے، جیسا کہ ان سے ابو حنیفہ نے روایت کیا ہے۔

اور ہمارے برادران اثنا عشری ابو حنیفہ جیسے شخص کو امام جعفر صادق سے روایت میں مہتم نہیں قرار دے سکتے اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ان کی روایت ہمارے نزدیک مقام اجلال و تکریم پر فائز ہے۔

۳-ابو حنیفہ کی روایت امام صادق سے ابو حنیفہ نے امام موصوف سے روایت کی ہے اور انہوں نے عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے اور ظاہر ہے اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت امام عبداللہ بن عمر کو صادق اور امین سمجھتے تھے، حالانکہ وہ امامیہ میں سے نہیں تھے، بلکہ شیعہ بھی نہیں تھے۔

۴-تاریخ اور روایت کا تصادم یہ روایت منطق تاریخ کے خلاف ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ امام جعفر صادق قاسم بن عروہ بن ابی بکر کے نواسے ہوتے تھے اور قاسم رواۃ میں اس پائے کے فقیہہ تھے ان سے فقہ مدینہ منقول ہے۔

اور قاسم کی جب وفات ہوئی تو حضرت امام مرد کامل بن چکے تھے، مرتبہ علم پر فائز ہو چکے تھے کیونکہ قاسم کی وفات کے وقت حضرت امام کی عمر ۲۸ سال کی تھی اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم یہ تصور کرلیں کہ انہوں نے اپنے جد عالی مقام سے علم نہیں حاصل کیا، حالانکہ سارا مدینہ ان سے علم ابن عباس اور علم عائشہ حاصل کرنے کے لیے ٹوٹا پڑ رہا تھا۔

لہٰذا ہم پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کلام کی نسبت امام صادق و طاہر ذریت اطہار رواہ ابوالاطہار کو، طاء غیر صحیح ہے۔ اگرچہ یہ روایت طوسی کی تہذیب میں وارد ہوئی ہے اور ان کے معاجم وفضل اور استیعاب مسائل فقہ اسلامی ــ علاوہ فقہ اثنا عشری کے ــ کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔

امامیہ میں ایک جماعت وہ ہے جو مجہول الحال راوی کی روایت قبول نہیں کرتی۔

یہ متقدمین امامیہ ہیں!

لیکن متاخرین کی ایک جماعت مجہول الحال راوی کی روایت قبول کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی۔

متقدمین اور متاخرین کا اختلاف

خاص اشتراط عدالت کے بارے میں بھی بنا نہ متقدمین اور متاخرین کے مابین متفق علیہ نہیں ہے۔

متاخرین کی ایک جماعت ہے جو کہتی ہے کہ عدالت من حیث التدین شرط نہیں ہے یعنی راوی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کیا کرے، مجتنب اور صغائر سے دور اسے سلیم الاعتقاد اور ظاہر الصدق ہونا چاہئے، کیونکہ فسق بالجوارح (جو فسق اعتقادی نہ ہو) عدالت کو مانع نہیں ہے۔

لیکن امامیہ کے اہل انصاف اس آخری بات کو تسلیم نہیں کرتے رد کر دیتے ہیں!

یہ اقوال ثلاثہ کتاب معالم الدین میں مذکور ہیں اس میں وارد ہوا ہے۔

"شیخ (طوسی) سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

راوی کا ثقہ ہونا یعنی روایت میں جھوٹ بولنے سے احتراز کرنا کافی ہے،

اگرچہ وہ بہ جوارح (اعضا) فاسق ہی کیوں نہ ہو![1]"

طوسی کے ایک قول پر گفتگو

عدالت راوی سے متعلق یہ اقوال اور آخری قول کہ راوی کا سچا اور سلیم الاعتقاد ہونا کافی ہے یعنی ائمہ کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہو۔ اگرچہ متدین نہ ہو۔ محرمات کا ارتکاب کرتا ہو، مامورات کو ترک کر دیتا ہو۔

یہ قول طوسی کا ہے جو سید شریف مرتضیٰ کے شاگرد رشید ہیں اور اپنے وقت کے شیخ الطائفہ ہیں، جن کی دونوں کتابیں "التہذیب" اور "الاستبصار" فقہ جعفری کی کتاب اربعہ اولیٰ میں شامل ہیں۔

یہ قول اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت عجیب ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ ہم جب اس کی تنقیح کرنا چاہتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ صاحب معالم الدین نے اس کی تعلیق کرتے ہوئے دبے الفاظ میں اس کی تردید کی ہے۔

مجہول الحال راوی

اب ہم امامیہ کی اس رائے پر گفتگو کریں گے جو مجہول الحال راوی کے بارے میں ہے۔

---

[1] معالم الدین ص ۲۰۹۔

مجہول الحال راوی کی روایت اکثر متقدمین امامیہ کے نزدیک غیر منقول ہے البتہ متاخرین میں کچھ لوگ اسے قبول کرنے پر مائل نظر آتے ہیں، یہی رائے ان دونوں صورتوں میں جمہور علماء سنت اور فقہاء امصار کی بھی نظر آتی ہے۔

مجہول الحال راوی کی روایت قابل قبول ہوسکتی ہے

جمال الدین الحلی نے اپنی کتاب التہذیب میں ہر دو فریق کی حجت درج کی ہے۔ اسی کتاب معالم الدین میں بھی ہر دو فریق کے دلائل کا ذکر موجود ہے۔

سب سے پہلے ہم ان لوگوں کے دلائل کا ذکر کرتے ہیں جو مجہول الحال راوی کی روایت قبول کرتے ہیں، ان کا خلاصہ کلام یہ ہے،

(۱) اللہ تعالٰی نے خبر فاسق کی تحقیق کا حکم دیا ہے اور جو شخص مجہول الحال ہو اس کے فسق پر حکم نہیں لگایا جا سکتا نہ اس کی عدالت کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

(۲) اجتہاد مومنین کی اصل یہ ہے کہ وہ صادق ہیں اس لئے کہ صدق کی اصل اہل عدالت ہونا اور ثقہ ہونا ہے، اس شخص کا قول صادق پایا جائے گا جو عادل اور ثقہ ہو، البتہ اگر اس کے خلاف دلیل موجود ہو تو رد کر دیا جائے گا اور جب اس کے فسق و کذب کی کوئی دلیل نہ ہو تو اس کی حدیث قبول کر لی جائے گی۔

پھر اخبار احادیث میں اصل جو ہے وہ ہے کذب کے برخلاف صدق کا رجحان، اور مجہول الحال کی روایت قبول کر لینے کے لئے اتنا کافی ہے۔

(۳) مسائل حلال و حرام میں مجہول الحال راوی کا قول قبول کر لیا جاتا ہے، مثلاً اگر وہ کسی حیوان کو پاک کہدے تو اس کی بات مان لی جائے گی، اس کے تزکیۂ اخبار کی بنیاد پر ایسے حیوان کا گوشت کھانا مباح ہو گا۔

اسی طرح اگر وہ طہارت آب کی خبر دے تو وہ مان لی جائے گی اس سے وضو جائز ہو گا۔

(۴) حضرات شیعہ ایک دلیل مجہول الحال راوی کی روایت قبول کرنے کے سلسلے میں اور دیتے ہیں، وہ یہ کہ جو شخص سلیم الاعتقاد اور کذب و دروغ سے دور ہو، اگرچہ وہ عملی طور پر (بہ جوارح) فاسق ہو، پھر بھی اس کی روایت قبول کر لی جائے گی، اگر فاسق کی روایت قبول کی جا سکتی ہے تو ایک مجہول الحال کی روایت کا قبول کر لینا تو اور زیادہ اولیٰ ہے کیوں کہ اس کا فسق ثابت نہیں ہے پس وہ اس شخص سے زیادہ ثقہ ہوگا جس کا فسق ثابت ہو۔

سنّی کی روایت
امامیہ کے ہاں کیا قبول کی جا سکتی ہے؟

مخالف کی روایت یہ بات ہمارے علم میں آچکی ہے کہ برادران امامیہ یا بدرجۂ اقل سابقین حضرات مخالف کی روایت نہیں قبول کرتے، اگرچہ وہ اہل سنت میں سے ہو۔
اس سلسلے میں ان کے تین اقوال ہیں:۔
(۱) وہ غیر مقبول الروایت ہے:۔
(۲) وہ مقبول الروایت ہے اگر ثقہ ہو اور نزد امامیہ ممدوح ہو۔
(۳) اگر وہ ثقہ اور ممدوح ہے تو اس کی روایت قبول کر لی جائے گی، لیکن شرط یہ ہے کہ اس نے کسی امامی سے روایت کی ہو اور اس سے کسی امامی نے روایت کی ہو۔

طوسی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو امامی مستقیم العقیدہ ہو اور اپنے صدق میں شہرت رکھتا ہو تو اس کی روایت قبول کر لی جائے گی گو وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو۔

مذکور رہے کہ متقدمین کی ایک جماعت اسی نظریے پر عامل تھی لیکن متاخرین اس میں مناقشہ کرنے لگے اور اس کی روایت بر بنائے فسق قبول کرنے سے انکار کرنے لگے لیکن انہیں زیادہ درخور نہ حاصل ہو سکا۔

✣

ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر امامی کی روایت خواہ وہ مطلقاً قبول کی جائے یا رد کر دی جائے بہر حال معاملہ روایت میں وہ امامی سے فروتر مانا جائے گا، بلکہ فاسق امامی سے بھی اس کا رتبہ کم ہوگا جیسا کہ طوسی نے عدۃ الاصول میں بیان کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر کی بنیاد مذہب یا اصول پر نہیں محض عصبیت پر ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ اسے استمرار حاصل نہیں ہوگا۔

سنّی بھی یہی کرتے ہیں جہاں تک سنّیوں کا تعلق ہے وہ بھی اس باب میں امامیوں سے کم نہیں،

طوسی کے بعد کے علماء امامیہ کی ایک جماعت نے عملی فاسق کی روایت قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔

مجہول الحال راوی کی روایت نہ قبول کرنے کے اسباب

یہ دلائل تو ان لوگوں کے تھے جو مجہول الحال راوی کی روایت قبول کرتے ہیں۔

لیکن جو لوگ مجہول الحال راوی کی روایت قبول نہیں کرتے ان کے دلائل یہ ہیں:۔

(۱) خبر واحد صدق و کذب دونوں پر محتمل ہوتی ہے لیکن اگر کذب کے مقابلے میں صدق کا پہلو مرجح ہو تو ظاہر ہے مرجح پہلو قبول کر لیا جائے گا اور یہ مرجح پہلو عدالت ہے۔
جب تک راوی کی عدالت ثابت نہ ہو، خبر بغیر کسی ترجیح کے اصل احتمال پر قائم رہے گی۔ اور احتمال مکلّف نہیں کرتا۔
البتہ جب عدالت کا پہلو متحقق ہو جائے تو اسے ترجیح حاصل ہو جائے گی اور اس پر عمل واجب ہو گا۔

(۲) قبول اخبار کی جو کم از کم شرط ہو سکتی ہے وہ ہے عدم فسق راوی اور مجہول کے بارے میں نہیں معلوم کہ فاسق ہے یا عادل؛ لہٰذا شرط متحقق نہیں ہو گی پس روایت بھی قبول نہیں کی جائے گی۔

(۳) عدل ایک ایسی کیفیت ہے جو نفس عادل میں موجود ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ صحت خبر کا ثبوت موجود ہو اور مجہول الحال راوی میں یہ ثبوت نہیں ملتا، لہٰذا اس کی روایت عدم قیام عدالت کے باعث قابل قبول نہیں ہو گی۔
انسان یا تو عادل ہو گا یا غیر عادل ہو گا، ان دونوں کے بیچ میں کوئی صورت نہیں۔ پس عادل کی روایت قبول کر لی جائے گی اور غیر عادل کی رد کر دی جائے گی۔

اس سے ثابت ہوا کہ عدالت اور فسق کے بین بین کوئی چیز نہیں ہے اور مجہول الحال راوی یا تو عادل ہو گا یا فاسق ہو گا۔
عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ معلوم ہو، مجہول اور مخفی نہ ہو اور جب قبول روایت کی شرط عدم فسق ٹھہری تو مجہول الحال راوی کی روایت قبول نہیں کی جا سکتی[۱]

---

[۱] یہ دلائل بہ تصرف قلیل تہذیب اور معالم الدین سے ماخوذ ہیں۔

میں بھی کیوں نہ ہو، کیوں کہ فکری اختلاف کسی شخص کو موجب قدح نہیں بنا دیتا، کیونکہ صدق جس سرچشمے سے نکلتا ہے وہ ہے امانت، خلق اور قوت تدین اور رائے قائم ہوتی ہے نظر اور استدلال سے، پس آدمی رائے میں غلطی کر سکتا ہے، لیکن قطعاً ضروری نہیں کہ جو شخص رائے میں غلطی کرے اسے صدق و امانت میں بھی متہم قرار دیا جائے۔

اور جو لوگ اس جادۂ صحیح سے ہٹ کر دوسروں پر صرف اختلاف رائے کے باعث جرح کرتے ہیں وہ انہیں ان فرق مختلفہ کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پھر جو مذہبی عصبیت کے باعث اپنے فرقے اور جماعت کی تائید کے جوش میں کذب علی الرسول سے بھی دریغ نہیں کرتے، یہ لوگ شخص کو اس کی سیرت اور کردار سے نہیں جانچتے اس کے فرقے اور طائفے کے لحاظ سے پرکھتے ہیں۔

زیدیہ کا مسلک

اس باب میں زیدیہ کا مسلک بہت بہتر ہے، وہ تزکیہ رواۃ کے سلسلے میں صرف اشخاص کے کردار اور سیرت کا جائزہ لیتے ہیں اس کے فرقے اور طائفے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔

چنانچہ وہ کتب اہل سنت میں سے احادیث صحاح کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے اپنے مصادر اجتہاد میں سے ایک مصدر قرار دیتے ہیں۔

ہم نے اپنی کتاب "امام زیدؒ" میں لکھا ہے۔

"زیدیہ کے ہاں یہ شرط نہیں ہے کہ رواۃ زیدی ہوں، بلکہ وہ تو آل بیت کی شرط بھی عائد نہیں کرتے۔ ان کے ہاں صرف ایک شرط ہے اور وہ ہے عدالت! زیدیہ جماہیر مسلمین کی تعدیل کرتے ہیں، بجز اس صورت کے کسی کا فسق ثابت ہو جائے۔ اس اصول کی بنا پر وہ تقدیم روایات کے سلسلے میں امامیہ سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ کیونکہ امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ امامی راوی غیر عادل ہو تو بھی غیر امامی راوی پر خواہ وہ عادل ہو اسے ترجیح ہوگی!"

کردار اور سیرت کے بجائے فرقہ کیوں؟

راوی کی شخصیت اور کردار و سیرت کے بجائے اس کے مسلک اور فرقے کو مدار صدق و عدل قرار دینا، سنیوں اور شیعوں دونوں کے ہاں معمول یہ ہے، اور ہم نے اسی سلسلے میں ان دونوں پر نکتہ چینی کی ہے۔

ہیں۔ ان کا مسلک بھی قریب قریب ایسا ہی ہے، انھوں نے اپنے روایات میں بہت سے اس لئے اور اس بنیاد پر رد کرائے کہ ان کے راوی روافض تھے، ان کے روایات کو رد کرنے کی کوئی اور وجہ اس کے سوا نہیں تھی کہ وہ روافض تھے وہ کہتے ہیں کہ اہل بدعت کی روایت قبول نہیں کی جاسکتی، اگرچہ ذاتی طور پر وہ اپنے صدق میں مشہور رہوں۔

ہم اپنی دوسری کتابوں میں لکھ چکے ہیں کہ سنیوں کا یہ نقطہ نظر درست نہیں ہے، راوی کو عادل ہونا چاہئے، اس سے کیا بحث کہ اس کا فرقہ کیا ہے؟ اور وہ کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض محدثین نے حضرت حسن بصری واعظ عراق اور سید علماء بصرہ کی روایت قبول کرنے میں تامل سے کام لیا ہے کیونکہ ان پر قدری ہونے کا الزام تھا، اور سنی اس بات کو اسباب طعن میں شمار کرتے ہیں کہ کوئی شخص بہ حیثیت قدری کے معروف ہو۔

ائمہ کرام کا مسلک کیا تھا؟

لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ائمہ رضوان اللہ تبارک تعالیٰ علیہم کا یہ مسلک نہیں تھا۔

امام ابوحنیفہ نے آل بیت سے اور ان کے ثقات انصار سے روایت کی ہے۔

امام شافعی نے ابراہیم بن ابی یحییٰ سے روایت کی ہے جو قدری تھے۔

ابن حجر نے ابراہیم بن یحییٰ کے بارے میں اپنی کتاب "التلخیص" میں لکھا ہے!

"اکثر اہل حدیث ابن ابی یحییٰ کی تضعیف کرتے ہیں، لیکن کہتے ہیں گو وہ مبتدع تھے لیکن صدوق تھے!"

اور ان کا ابتداع یہ تھا کہ وہ قدری تھے۔

الربیع جو مصر میں ثقہ شافعی کے راوی ہیں ابن ابی یحییٰ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میں نے شافعی کو کہتے ہوئے سنا کہ ابراہیم بن ابی یحییٰ قدری تھے، ربیع سے پوچھا گیا۔

"پھر کیا بات تھی کہ شافعی ان سے روایت کرتے تھے؟"

جواب دیا "وہ کہا کرتے تھے، اگر ابراہیم کی جان بھی لے لی جائے تو وہ جھوٹ نہیں بول سکتے!"

یہ تھا ائمہ کا اصل منہاج!

یہ ایسا منہاج تھا جو راوی کی اچھی طرح چھان بین کرتا تھا، محدث صرف راوی کی سیرت اور کردار کا جائزہ لیتا تھا، اس کے فکر و عقیدے کی جانچ نہیں کرتا تھا، اگرچہ محدث کی نظر میں اس کی رائے

ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ یہ طریق اس منہاج کے بالکل خلاف ہے جو فقہاء امصار کا رہا ہے ہم اس واقعے پر بھی روشنی ڈال چکے ہیں کہ امام شافعی نے مناہج تفسیر جابر الجعفی سے لئے ہیں جو شیعی تھے۔

اور گو ہم نے سنیوں اور شیعوں پر اس باب میں نکتہ چینی سے گریز نہیں کیا، لیکن زیدیہ کا استحسان کئے بغیر بھی نہ رہ سکے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کبار زیدیہ کتب اہل سنت کو اپنے اجتہاد کی اساس قرار دیتے ہیں، وہ قیاس کی طرف پھر رجوع نہیں کرتے اگر کتب اہل سنت میں انہیں کوئی نص مل جاتی ہے۔

الضبط

خبرآحاد کی شرط قبول کا امامیہ و اہل سنّت کے ہاں اشتراک

انشراح قلب اور اطمینان کی صورت خبرآحاد کی روایت کے لیے شرط قبول اور اس پر عمل درآمد جائز ہونے کی صورت میں یہ ہے کہ راوی ضابط ہو۔

یہ ایسی شرط ہے جو امامیہ اور جمہور علمار سنت کے ہاں مشترک ہے اس میں نہ ایک دوسرے سے کسی طرح کا اختلاف ہے، نہ باہمی اختلاف ہے کیونکہ قبول روایت آحاد کی اساس کذب کے بر خلاف صدق کی طرف رجحان قوی کا ہونا ہے اور یہ نسبت اس شخص پر صادق نہیں آسکتی جو بھول چوک کا عادی ہو اور جس کی یاد داشت پر نسیان کا غلبہ ہو۔

کیونکہ جس کی یاد داشت کمزور ہوگی وہ حدیث میں سہو کا ارتکاب بھی کرگزرے گا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بھول چوک کے باعث ہی حدیث میں کچھ بڑھا دے، اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ مقدم لفظ کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کردے، اس طرح معنیٰ مضطرب ہو جائیں گے اور مفہوم بدل جائے گا۔

ایسا شخص امام معصوم سے جو روایت کرے گا، اس پر بھی اس کے سوا اور حافظے کی کمزوری کے باعث انشراح قلب اور اطمینان نہیں ہوسکے گا۔

ایسا شخص جو کمزور حافظے والا ہو، سند متصل کے ساتھ اگر امام سے روایت کرے لیکن بعض اجزائے سند فراموش کردے تو حقیقتاً یہ سند متصل نہیں بلکہ منقطع ہوگی، حالانکہ روایت سند متصل سے کر رہا ہے۔

اس طرح اس کی روایت حدیث قابل قبول نہیں تسلیم کی جاسکتی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ شرط ایسی ہے جس پر فقہا کا اجماع ہے، کیونکہ کوئی ایسی حدیث تسلیم نہیں کی جاسکتی جس کے صدق میں شک ہو، خواہ شک کا سبب کوئی بھی ہو۔

راوی فسق سے متہم ہو تو اور ضعف حافظ کا مریض ہو تو دونوں صورتوں میں بات ایک ہی ہے، لہٰذا

دونوں صورتیں مساوی تسلیم کی جائیں گی، کیونکہ ہر دو صورتوں میں راوی دانستہ یا نادانستہ طور پر کذب سے محترز نہیں رہ سکتا۔

اگر راوی بھول چوک کا عادی ہے تو بھی اس کی روایت پر اعتماد، کذب سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کی حدیث اگر نقل کی جائے تو بھی غلطی سے بری نہیں ہو سکتی اور یہ بھی ایک صورت کذب ہی کی ہے۔

کذب بہرحال کذب ہے، جو کذب ارادے پر مبنی ہو، یا جو نسیان کے باعث ہو یا غلطی اور شبہ کے سبب ہو، کذب ہی کہلائے گا۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جو کذب ضعف اعصاب کا یعنی نسیان کا نتیجہ ہو، یا جو کذب قصد و ارادے کا ہے ایک ہے، الہٰذا نتیجہ واحد ہوگا۔

لیکن ایک بات اور بھی ہے!

ہر سہو و نسیان قبول روایت کا مانع نہیں ہوتا، اصل مانع روایت کے قبول کرنے میں یہ ہوتا ہے کہ سہو و نسیان میں راوی پر غلبہ کس چیز کا ہے؟

اگر راوی مستقل طور پر اس مرض کا شکار ہے تو بات دوسری ہوگی اور اگر سہو و نسیان کا کبھی کبھی شاذ و نادر طور پر شکار ہو جاتا ہے تو بات کچھ اور ہوگی۔ آخری صورت میں اس کی روایت پر قدح نہیں کی جائے گی۔

اگر زوال سہو من کل الوجوہ شرط قبول حدیث قرار دیا جائے تو صرف وہی حدیث قابل قبول ہوگی جو ایسے شخص سے مروی ہو جو سہو سے معصوم ہو اور یہ صورت باجماع علماء غیر مطلوب ہے۔

امامیہ کے ہاں ضبط کی تعریف

حضرات امامیہ کے ہاں "ضبط" کی تعریف یہ ہے کہ راوی سے نقل روایت میں سہو اگر ہوتا ہو تو شاذ و نادر۔

حنفیہ کے ہاں فخر الاسلام نے ضبط کی بڑی اچھی تعریف کی ہے، جسے ہم یہاں ذکر کرتے ہیں اور یہ ایسی تعریف ہے جسے علماء بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

"ضبط" کی تعریف فخر الاسلام کے الفاظ میں یہ ہے:

"ضبط نام ہے سماع کلام کا، اس طرح کہ حق سماع ادا ہو جائے، پھر وہ عبارت سے اس فہم سے جو مقصود و مطلوب ہو، پھر وہ ایسا حفظ ہے، جس میں پوری پوری کوشش کی گئی ہو، پھر اس یادداشت کو جتا کرے، مراقبے اور دور کی صورت میں قائم رکھنے کی پوری پوری

کوشش کی گئی ہو۔

ضبط کی دو قسمیں ہیں، ایک متن کا یاد رکھنا دوسرے فقہی اور شرعی اعتبار سے معنیٰ کو یاد رکھنا، یہ ضبط کی کامل صورت ہے[1]!"

اس صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنفیہ کے ہاں ضبط کو دو قسموں میں منقسم کرتے ہیں:

(۱) ضبط حفظ و معنیٰ۔

(۲) فقہی اور شرعی اعتبار سے مفہوم حدیث کا ضبط۔

اس کا اقتضا یہ ہے کہ راوی کو فقیہہ ہونا چاہئے تاکہ وہ فقہ حدیث کا عرفان حاصل کر سکے اور اپنی حدیث کا دوسری حدیث سے موازنہ کر سکے

حنفیہ کے ہاں فقیہہ راوی کی حدیث غیر فقیہہ راوی کے مقابلہ میں قبول کر لی جائے گی اور غیر فقیہہ کی روایت رد کر دی جائے گی۔

---

[1] اصول فخر الاصول البزوری ج ۲ ص ۲۱۷۔

تعدیل رواۃ

تعدیل رواۃ شرط واجب ولابدی ہے

عدالت اور ضبط کی معرفت | جو لوگ عدالت کو شرط قبول روایت قرار دیتے ہیں وہ تعدیل رواۃ کو بھی واجب گردانتے ہیں۔

تعدیل سے مراد ہے راوی کی عدالت اور ضبط کی معرفت۔

علماء امامیہ کا قول ہے کہ راوی کی عدالت اور ضبط کا اندازہ ایک عرصے تک اس کے ساتھ نشست و برخاست رکھتے ملتے جلتے اور روابط رکھنے سے ہوتا ہے، پھر ایک حد تک اس کے تمام حالات نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔

اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو اس کی معرفت عدالت وضبط کے لئے علماء اور اہل حدیث کے مابین اس کی شہرت عدل وضبط پر اعتماد کرنا پڑتا ہے اور شہادت قرائن کثیرہ سے کام لینا پڑتا ہے۔

اور اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی ممکن نہ ہو تو کسی عالم کا تزکیہ فیصلہ کن مانا جائے گا۔[1]

یعنی تزکیہ اس وقت ضروری ہوگا جب ایسے قرائن موجود نہ ہوں جو راوی کی عدالت ثابت کرسکیں!

اور تزکیے کی صورت یہ ہے کہ اس بات کی صحیح اطلاع بہم پہنچائی جائے کہ راوی ضابط اور عادل ہے۔ معالم الدین کے حاشیے پر اس سلسلے میں یہ عبارت ملتی ہے:

راوی کی عدالت اور ضبط کا علم حاصل کرنے کے لئے علماء چند امور پر بھروسہ کرتے ہیں ان امور میں راوی کے ساتھ ملنے جلنے، اٹھنے بیٹھنے اور تعلق وربط کے ذریعے جو ایک عرصۂ دراز تک جاری رہا ہو۔ راوی کا امتحان ـــ کیا جاتا ہے، تاکہ اچھی طرح اس

---

[1] معالم الدین ص ۲۰۴۔

احوال منکشف ہوجائیں اور اس کی تمام اندرونی باتیں ظاہر ہوجائیں اور اس کے صدق اقوال کا اندازہ ہوجائے تاکہ جن خصوصیات سے وہ خالی ہے ان پر اس کا اعتماد نہ کیا جائے۔

یا پھر اسے علماء اور اہل حدیث کے مابین عدالت اور ضبط کے اعتبار سے مشہور ہونا چاہئے، خواہ اس کی یہ باتیں شائع و ذائع ہوں یا نہ ہوں۔

علاوہ ازیں شہادت قرائن کثیرہ سے بھی راوی کی عدالت اور ضبط کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

ایک صورت راوی کے ضبط و عدل کا فیصلہ کرنے کی یہ بھی ہے کہ کوئی عادل عالم اس کا تزکیہ کر کے اسے ضابط و عادل ثابت کر دے[1]۔"

تین اہم سوال اس تعریف کی روشنی میں تین سوال پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) کیا راوی کا تزکیہ کئی آدمیوں (علماء) کو کرنا چاہئے، یا ایک ہی کا تزکیہ کافی مان لیا جائے گا؟

(۲) کیا غیر امامی کا تزکیہ بھی تسلیم کر لیا جائے گا یا ضروری ہے کہ مزکّی امامی ہو؟

(۳) طرق تزکیہ۔

(۱) صاحب معالم الدین کا ارشاد امر اوّل یعنی تعداد کے بارے میں صاحب معالم الدین نے لکھا ہے کہ تعدیل ایک طرح کی شہادت ہے، نہ کہ روایت اور شہادت کے لئے تعداد ضروری ہے، اور یہ بات اجماعی ہے۔

پس شہادت احوال میں ہمیشہ دو آدمیوں کی یا ایک آدمی اور دو عورتوں کی قبول کی جائیں گی۔

جمال الدین الحلی نے اپنی کتاب "التہذیب" میں لکھا ہے کہ تزکیے کے لئے ایک عادل آدمی کافی ہے۔ اس لئے کہ خبر آحاد کا راوی ایک ہی ہوتا ہے، جب وہ قبول کر لی جاتی ہے تو ایک آدمی کا تزکیہ کیوں نہیں قبول کیا جائے گا؟

(۲) امر دوم، یعنی کیا مزکی کو امامی ہونا چاہئے؟ امامیہ کے ہاں راجح یہی ہے کہ اسے امامی ہونا چاہئے، کیونکہ روایت میں ایمان شرط ہے اور امامیہ کے اہل قبلہ مخالفین اسی لئے مسلم کئے جاتے ہیں، مومن نہیں کہے جاتے۔

صاحب حاشیہ معالم الدین کی تحریر سے مستفاد ہوتا ہے کہ غیر امامی کا تزکیہ قبول کیا جا سکتا ہے

---

[1] حاشیہ معالم الدین ص ۲۰۴، ۲۰۵

شہادت عدالت سے جرح زیادہ اہم ہے امامیہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ راوی کی شہادت عدالت اتنی اہم نہیں ہے جتنی جرح جس کی یہ صورتیں ہیں :

(۱) **نفی علم، عدم وجوہ کی مقتضی نہیں ہے** اور راوی کا تزکیہ کرنے والے یہ کہیں کہ ہم نے اس میں کوئی فسق نہیں پایا اور جرح کرنے والے یہ کہیں کہ ہم اس میں فسق پاتے ہیں تو ان دونوں شہادتوں میں تنافی نہیں ہے کیونکہ نفی علم۔ عدم وجود کی مقتضی نہیں ہے۔

اس صورت میں جرح پر عمل کیا جائے گا، یعنی وہ قبول کرلی جائے گی کیونکہ اعمال، اہمال سے ادنیٰ ہیں اور جرح اعمال پر مبنی ہے۔

(۲) **جرح و تعدیل میں اختلاف** اگر تزکیے اور جرح میں جمع ممکن نہ ہو، بایں صورت کہ تزکیہ کرنے والے راوی کو عدالت ثابت کرتے ہوں اور جرح کرنے والے اسے فاسق ثابت کرتے ہوں اور اس تناقض کے باعث جمع ممکن نہ ہو تو ہر دو فریق کے اسباب پر غور کیا جائے گا جس کا سبب قوی اور ارجح ہوگا اسے مقدم رکھا جائے گا، یعنی اگر اسباب عدالت ارجح ہوں گے تو راوی کی روایت قبول کرلی جائے گی اور وہ عادل مان لیا جائے گا اور اگر اسباب جرح زیادہ قوی ہوں گے تو راوی کی روایت رد کردی جائے گی۔

اور اگر ترجیح کی کوئی صورت نہ ہو تو قبول روایت میں توقف سے کام لیا جائے گا۔ یہاں تک کہ راوی کے احوال واضح اور جلی طور پر معلوم ہو جائیں، اور ہر دو احتمالات میں سے کسی ایک کو ترجیح دی جا سکے۔

مذکورہ رائے جمال الدین الحلی کی تھی لیکن معالم الدین میں اس مسئلے سے متعلق دو قول ملتے ہیں، جب کہ تعدیل و جرح ساتھ ساتھ ہوں اور ان میں تعارض پیدا ہو جائے۔

(۱) پہلی صورت تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہو چکی ہے۔

(۲) دونوں شہادتوں پر غور کیا جائے گا، تدبر و تفحص کے بعد ترجیحی پہلو اختیار کر لیا جائے گا اور اگر ترجیحی پہلو نہ ہو تو پھر توقف کیا جائے گا تا آنکہ امر راوی واضح ہو جائے!

جس طرح اس کی جرح قبول کرلی جاتی ہے
لیکن یہ قول مشہور نہیں ہے، مشہور قول یہ ہے کہ تزکیہ اور جرح دونوں غیر امامی کی قبول نہیں کی جائیں گی، اکثریت کا مسلک امامیہ کے ہاں یہی ہے۔
اس سلسلے میں ایک تیسرا قول بھی ہے۔
یہ کہ جرح میں غیر امامی کی شہادت قبول کرلی جائے گی لیکن تعدیل میں صرف امامی کا قول مانا جائے گا
لیکن یہ قول بھی ضعیف ہے اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔
(۳) تیسرا امر ہے طریق تزکیہ | جمال الدین الحلی نے لکھا ہے کہ مزکی کو چاہئے کہ وہ راوی کی عدالت بیان کرے۔
اگر مزکی نے تزکیہ راوی کے وقت اپنے علم کا ذریعہ نہ بتایا ہو تو اس سلسلے میں اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا۔ بشرطیکہ مزکی اسباب جرح یا تعدیل سے واقف ہو
لیکن اگر مزکی تعدیل یا جرح کا سبب بیان کرے تو پھر اس سے مزید استفسار جائز ہے کیوں کہ سبب کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دوسروں کو تعرف اسباب جرح و تعدیل میں شریک کرنا چاہتا ہے

حاشیہ معالم الدین میں تزکیے کے چند مراتب مذکور ہیں۔
(۱) کوئی عادل امامی اس بات کا حکم شہادت کاملہ کے ساتھ لگائے کہ راوی نقل حدیث کا اہل ہے۔
اس کا شمار ثقات میں ہوتا ہے۔
پس یہ صرف تزکیہ نہ ہوگا بلکہ تزکیے کے ساتھ ساتھ راوی کی عدالت کا فیصلہ بھی متصور ہوگا۔
(۲) مزکی راوی کو عادل قرار دے اور اپنی اس رائے کا سبب بھی بیان کرے تاکہ راوی کا حال اچھی طرح سے معلوم ہو جائے اگر وہ قبول کیا جائے تو دلیل کے ساتھ، اور اگر رد کیا جائے تو بھی دلیل کے ساتھ۔
(۳) مزکی عادل جو امامی ہوگا یہ کہے کہ راوی نقل روایت کا اہل ہے۔
(۴) مزکی عادل کو جو امامی ہوگا تزکیے کا اہل ہونا چاہئے، اور اسے اس راوی سے جس کا وہ تزکیہ کر رہا ہے روایت کرنی چاہئے۔
ظاہر ہے مزکی اس سے روایت کرے گا جو ثقہ اور ذی عدالت ہو۔
پس اس کی یہ روایت اس کے تزکیے کو عملی طور پر ثابت کردے گی۔

سے نقل حدیث بامعنیٰ کی اجازت دیتے ہیں، اور اس اجازت کی سند امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے لاتے ہیں، چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ:

ایک شخص نے امام صادق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا، میں آپ سے حدیث سنتا ہوں، لیکن اس میں کمی زیادتی (الفاظ میں) کر دیتا ہوں!

امام صادق نے جواب دیا:

اگر تو حدیث کے معنیٰ بیان کرتا ہے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں!

مسئلہ زیر بحث پر دو اہم آراء

لیکن اس بحث پر دو رائیں اور ہیں:

(۱) یہ کہ روایت حدیث بالمعنیٰ جائز نہیں ہے۔

جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"خدا اس شخص پر رحم کرے جو میری باتیں سنتا ہے اور انہیں اس طرح دہرا دیتا ہے جس طرح سنتا تھا۔ کیوں کہ کبھی حامل فقہ، غیر فقیہہ ہوتا ہے؟ اور کبھی حامل فقہ یہ حدیث اس تک پہنچا دیتا ہے) جو اس سے زیادہ فقیہہ ہوتا ہے"!

فقیہہ کا اپنے سے زیادہ فقیہہ تک سنی ہوئی حدیث جوں کی توں پہنچا دینا، اس امر کا متحمل ہے کہ زیادہ فقیہہ ایک عام فقیہہ سے زیادہ تک تہہ رس ہوتا ہے، اور فقیہہ وہ بات پالیتا ہے جہاں تک غیر فقیہہ کی رسائی نہیں ہوتی، اور کبھی فقیہہ اور افقہ اس چیز کا ادراک کر لیتے ہیں جس کا ادراک سامع نہیں کر پایا۔

پس ضروری ہے کہ روایت باللفظ ہو، تاکہ فقیہہ یا افقہ کو صحیح الفاظ کے ذریعے معانی فقیہہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

اور ان باتوں سے بڑھ کر تطاول ازمنہ اور کثرت روایات کے باعث روایت بالمعنیٰ مشکوک ہو جاتی ہے اور اس کا تطابق اصل معنیٰ پر دشوار ہو جاتا ہے۔

پس معاملات دین میں احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ نص کو اس کے اصل الفاظ میں روایت کیا جائے۔

(۲) دوسری رائے امامیہ کی ہے اور حنفیہ ان کی رائے سے ہم آہنگ ہیں وہ یہ ہے کہ

قبولِ روایت میں شرطِ تعدّد

طوسی کے نزدیک شرطِ تعدّد لازمی ہے

صحابہ کرام کا مسلک حضرت امامیہ خبرِ واحد کے قبول میں تعدد کی شرط نہیں رکھتے بلکہ خبر واحد مفرد کو قبول کر لیتے ہیں، لیکن طوسی کا بیان ہے کہ بعض حضرات امامیہ تعدد کی شرط رکھتے ہیں، کیوں کہ امام علی کرم اللہ وجہہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی حدیث قبول نہیں فرماتے تھے جب تک کم از کم دو راوی نہ ہوں، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، بعض صحابہ کرام کا بھی یہی مسلک تھا، لیکن جمہور فقہا اور جمہور امامیہ قبول روایت میں شرط تعدد کے قائل نہیں ہیں۔

حضرات امامیہ راوی کا فقیہہ ہونا بھی ضروری نہیں سمجھتے، نہ اصل قبول میں، نہ معارضے کی صورت میں، وہ فقیہہ راوی کی روایت کو غیر فقیہہ راوی کی روایت پر ترجیح نہیں دیتے، جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے، بلکہ تعارض کے وقت صرف روایت کی توثیق اور قوت سند پر نگاہ رکھتے ہیں، اس لئے کہ اصل حجت تو قول رسولؐ یا قول امام معصوم ہے نہ کہ فہم راوی۔

روایت حدیث بالمعنیٰ جائز ہے یہ بات مقررات امامیہ میں سے ہے کہ نقل حدیث بالمعنیٰ جائز ہے کیونکہ راوی عربی زبان سے بہت اچھی طرح واقف ہوگا تو فہم معنیٰ میں تصور نہیں کرے گا نہ ایسا لفظ اختیار کرتے ہیں جو کہ گا جو مفہوم کو اچھی طرح واضح کرتا ہو، اگرچہ وہ بلاغت رسول تک نہ پہنچ سکے، کیونکہ آپؐ کو تو جوامع الکلم کا کمال عطا کیا گیا تھا، پس اگر راوی کمی زیادتی نہ کرے اور اس کی عبارت واضح اور جلی ہو اور اصل معنی کو حاوی ہو تو اس کی روایت قبول کر لی جائے گی، کیونکہ صحابہ رضوان اللہ تبارک وتعالیٰ علیہم جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ نہیں لکھتے تھے تو بالمعنیٰ روایت کیا کرتے تھے۔

اس لئے جمہور کی نقل حدیث بالمعنیٰ جائز قرار پائی جب کہ راوی صفات بالا کا حامل ہو۔ حضرات امامیہ کا بھی اس باب میں یہی مسلک ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ائمہ معصومین

اخبار آحاد اور قرآن وقیاس

علّت منصوص علیہ پر جو قیاس مبنی ہو وہ قابلِ تسلیم ہے

اصول فقہ کا استیفاء اگرچہ امامیہ کا مسلک نفی قیاس ہے لیکن خبر آحاد کے ساتھ معارضہ قیاس پر وہ بحث و گفتگو کرتے نظر آتے ہیں تاکہ ابواب علم اصول فقہ کا استیفا ممکن ہو سکے۔

بعض امامیہ اس قیاس کو مانتے ہیں جو کسی علت منصوص علیہ پر مبنی ہو۔

کیونکہ علت اگر منصوص علیہ ہے یا اجماع کی طرح بہ طریق قطعی معروف ہے تو قیاس کے نص کی تطبیق یا تو امر قطعیہ سے مطابقت ہے، لہٰذا اسے استنباط بالقیاس کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

اگر خبر آحاد قیاس سے معارض ہو تو اس کی علت نص سے یا امر قاطع سے ثابت ہوتی ہے۔ پس جو بات امر قطعی سے ہم آہنگ ہوگی مان لی جائے گی۔

اور اگر نص پر علت ظنی ہو تو اسے مقدم رکھا جائے گا جس کی سند زیادہ قوی ہو یا جو مذہب امامی سے زیادہ مطابق ہو، اور اگر توفیق ممکن ہو تو دونوں میں سے ایک کو دوسرے کا مخصص مان لیا جائے گا۔

جب حدیث قرآن سے متعارض ہو حدیث قرآن سے معارض ہونے کی صورت بھی زیر بحث آئی ہے۔

قبل اس کے کہ اس باب میں ہم مسلک امامیہ پر گفتگو کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "الکافی" نے جو کچھ امام صادق سے نقل کیا ہے اسے پیش کردیں۔

کافی میں وارد ہے کہ:

"ابو عبداللہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے، ہر صواب پر ایک نور ہوتا ہے، پس جو کتاب اللہ کے موافق ہو اسے لے لو اور جو کتاب اللہ کے مخالف ہو اسے چھوڑ دو"۔

اگر راوی فقیہہ ہو تو وہ نقلِ حدیث بامعنیٰ کر سکتا ہے۔ کیوں کہ فقیہہ مرامی و غایات حدیث کو بہت اچھی طرح فقہی و شرعی اعتبار سے سمجھ سکتا ہے۔
لیکن غیر فقیہہ راوی سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ معنیٰ کو غیر صحیح طور پر نقل کر دے۔
اس صورت میں التزام نص لابدی ہے، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول میں کمی زیادتی نہ ہونے پائے۔

ابان بن ابی یعفور سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا:

میں نے ابو عبداللہ سے اختلاف حدیث کے بارے میں سوال کیا۔

فرمایا اگر تمہارے پاس کوئی حدیث ہو اور اللہ کی کتاب سے اس کی شہادت مل جائے یا قول رسولؐ اس سے شاہد پایا جائے تو اسے لے لو۔

ایوب بن راشد ابوعبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

جو حدیث کتاب اللہ سے موافق نہ ہو وہ از قبیل مزخرفات سے ہے۔[1]

مذکورہ عبارت سے جو حضرت امام جعفر صادق سے منسوب ہے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کتاب اللہ کی مخالف نہیں ہوتی۔ اس روشنی میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن اور خبرِ آحاد میں تعارض ہو اور ان دونوں میں توفیق ممکن نہ ہو تو خبرِ آحاد ان نصوص کی روشنی میں جو ہم پیش کر چکے ہیں رد کردی جائے گی۔

اور جو علماء قرآن کے عام کی خبرِ آحاد سے تخصیص کرتے ہیں تو یہ تخصیص درحقیقت ایک طرح کی توفیق ہے۔ پس اگر خبرِ آحاد قرآن کے عام سے معارض ہو اور خبر خاص ہو تو وہ عموم نصِ قرآنی کی مخصص مانی جائے گی، یہ درحقیقت توفیق ہے۔

بہت سے امامیہ جن میں سرفہرست طوسی ہیں اس خیال کے حامل ہیں کہ خبرِ آحاد قرآن کے عام کی تخصیص نہیں کرسکتی، کیونکہ قرآن کے عام کی دلالت قطعی ہے لہٰذا اس کی تخصیص ظنی سے نہیں ہو سکتی اور جب قطعی اور ظنی میں تعارض ہو تو ظنی کا عمل ترک کردیا جائے گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر حدیث معصومین سے متواتر ہو تو وہ قرآن کے عام کی تخصیص کرسکتی ہے کیونکہ ائمہ کو قرآن کے عام کی تخصیص کرنے کا حق ہے، اگرچہ یہ تخصیص عام پر عمل درآمد کے میسیوں سال بعد کیوں نہ کی گئی ہو۔

عدم نص کی صورت میں حکم عقل واجب ہے

امامیہ کے اصولی حضرات کے نزدیک اگر نص نہ ہو تو عقل کا حکم واجب النفاذ ہے۔

ان کا یہ خیال بھی ہے کہ عقل ہی اشیاء کے حسن و قبح کا حکم لگا سکتی ہے، نیز یہ کہ اشیاء میں جو

---

[1] المستدرک ص ۲۲، ۲۳ طبع بیروت۔

حسن و قبح ہوتا ہے وہ ذاتی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ خبرِ آحاد اور عقل کے مابین تعارض فرض کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اگر خبرِ آحاد حکمِ عقل سے متعارض ہو تو دونوں کے مابین توفیق کسی طور پر بھی ممکن نہ ہو تو خبرِ آحاد باطل ہے، اسے رسولؐ اور ائمہؑ پر دروغ قرار دیا جائے گا کیونکہ حکم نبیؐ، حکم خدا اور حکم ائمہ ایسا ہی ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر روایت حکم عقل سے مخالف ہو تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ قبیح کا حکم دیتا اور حسن سے روکتا ہے اور یہ مستحیل ہے، لہٰذا خبر رد کر دی جائے گی اور اسے دروغ مانا جائے گا۔

اور اگر دونوں میں جمع ممکن ہو یا تاویل و تقیید کا امکان ہو یا بعض کا اخذ قابلِ عمل ہو تو اس دائرے کے اندر وہ واجب العمل ہے۔[1]

---

[1] التہذیب ص ۸۔

حدیث متصل اور حدیث منقطع

روایت حدیث کی سند نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہونی چاہیئے

سند امام کے بارے میں امامیہ کا مسلک

امامیہ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ روایت حدیث کی سند نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا معصوم یعنی امام سے متصل ہونی چاہیے۔

لیکن وہ شرط نہیں عائد کرتے کہ سند امام بھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متصل ہونی چاہیے کیوں کہ قول امام بجائے خود حجت ہے اور سنّت ہے، لہٰذا اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے یہ روایت کہاں سے حاصل کی ہے؟

اپنے اس مسلک کی تائید میں وہ امام جعفر صادق کی روایت کا سہارا لیتے ہیں۔ الکافی میں نصر الخثعمی سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا:

"میں نے ابو عبداللہ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص اس کی معرفت رکھتا ہے کہ ہم حق کے سوا کچھ نہیں کہتے اسے چاہئے کہ جو کچھ ہم سے معلوم کرے اس پر اکتفا کرے!"

اب ہم اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں کہ اس موضوع سے مسلک امامیہ کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں اگر کوئی شخص امام معصوم سے مباشرہ اور روایت کرتا ہے اس پر طاعت واجب ہے اس لئے کہ اس کے سامنے دلیل قطعی سے امر شرعیت واضح ہو گیا ہے اور اب اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں رہ گیا۔

لیکن جو معصوم امام سے صرف روایت کرتا ہے، یا امام سے کم کی شخصیت سے روایت کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ جس سے روایت کر رہا ہو اس سے اس کا لقا ثابت ہو۔

لقا کے دو مرتبے ہیں

(۱) مرتبہ اولیٰ سب سے زیادہ اعلیٰ و برتر ہے وہ یہ ہے کہ راوی نے اپنی روایت کو بلفظ سنا ہو، خواہ قرأت مجردہ سے یا بذریعہ املا۔

(۲) مرتبۂ ثانیہ امر تبہ اولیٰ سے فروتر ہے، اس کی رُو سے اجازت روایت تحریری طور پر حاصل ہوتی ہے۔

خلاصۂ قول یہ کہ اجازت راوی اگر تحریری ہو تو اکثر کے نزدیک ایسی روایت جائز ہے لیکن اس کی تصریح ہونی چاہیئے کہ روایت اس طرح سے (تحریری طور پر) نقل کی گئی ہے، یعنی بہ طریق اجازت نہ کہ بہ طریق قرأت۔

لیکن اگر راوی اجازت تحریری کی تصریح نہ کرے، اور یہ نہ بتائے کہ بہ طریق اجازت نقل روایت کر رہا ہے تو اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، اس لئے کہ وہ ادعائے قرآت میں کاذب ہے، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قاری نہیں ہے۔

اجازے کی مختلف صورتیں

رسائل ابوالمعالی میں وارد ہے کہ اجازے کی مختلف صورتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ استاذ شاگرد کو اجازۂ تحریری عطا کرتا ہے۔ بایں صورت کہ یا تو کوئی شخص کسی کے سامنے احادیث کتاب کی قرأت کرتا ہے تو وہ استاذ کی تصدیق کا طالب ہوتا ہے، وہ تصدیق کر دیتا ہے تو اپنے شیخ کے سامنے قرأت کی وہ روایت کرنے لگتا ہے اور یا یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے تحریری اجازے کی درخواست کرتا ہے، وہ اسے دے دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے۔

"یہ فلاں شخص کی تحریر ہے"[1]

اجازے کی صورتوں میں سے ایک صورت جسے ابوالمعالی نے ذکر کیا ہے یہ بھی ہے کہ شیخ ایسے شخص کو بھی تحریری اجازت دے دیتا ہے جو ابھی سن تمیز کو نہ پہنچا ہو۔

ہمارے علماء اور رواۃ اخبار و احادیث استجازے اور اجازے کے جویا رہا کرتے ہیں۔

چنانچہ احمد بن محمد بن عیسیٰ اگرچہ قمیوں کے شیخ اور فقیہ تھے، اور اپنے فن میں یکتا تھے، مگر وہ قم سے کوفہ پہنچے اور حسن بن علی بن بنت الیاس کے پاس عثمان بن ابان کی دونوں کتابوں کا اجازہ حاصل کرنے کے لئے پہنچے۔

اسی طرح السید المرتضیٰ سے مروی ہے کہ ابو غالب رازی نے اپنے نواسے کے لئے اجازہ کہہ دیا حالانکہ ابھی وہ گہوارے میں تھے، اسی طرح شیخ طائفہ نے اپنی جمیع مصنفات کا اجازہ اپنی دونوں لڑکیوں کو دے دیا تھا۔[2]

اس عبارت میں شیخ الطائفہ سے مراد ابو جعفر طوسی صاحب "التہذیب" اور "الاستبصار" ہیں۔

---

[1] الرسالۃ الناصرعن لا یحضرہ الفقیہ ص ۵ [2] الرسالۃ المذکور ص ۷۔

امامیہ کا یہ خیال بھی ہے کہ اجازہ از قبیل سند متصل ہے

ابو المعالی کا قول ہے کہ اجازہ از قبیل اتصال تو ہے لیکن عمومی اعتبار سے نہ کہ خاص معنیٰ میں۔

اتصال سند وانقطاع سند | اور معصوم امام سے سند متصل خواہ وہ بہ طریق تحمل ہو یا بہ طریق اجازہ بلا اجازت مقبول ہے گو طرق روایت میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔

بلاشبہ تحمل، اجازے سے قوی ہے اور مراتب رجال میں بہ حیثیت قوت کے نقد ہے اور حدیث وجود معارض، یا معارض سے اختلاف سلامتی کے اعتبار سے قوی وضعیف ہوتی ہے، لیکن جب تک سند متصل ثابت ہے اصل قبول ثابت ہے اگرچہ احادیث متصلہ مختلفہ میں قوت کا اختلاف کیوں نہ ہو امام سے متصل ہر حدیث اور جز متصل مانی جائے گی، کیونکہ جو کچھ وہ نقل کرتا ہے وہ نبی ہی سے ہے جیسا کہ کافی نے امام صادق سے روایت کیا ہے۔

اور اگر معصوم کی سند غیر متصل ہو، خواہ معصوم نے اسے نبیؐ تک پہنچایا ہو یا نہ پہنچایا ہو۔ اس کے قبول میں اختلاف ہے

سند غیر متصل اس وقت مانی جائے گی جب راوی ایک شخص سے روایت کرے جس سے اس کا لقا نہ ہوا ہو، یا سند مجہول غیر معروف ہو، جس سے شبہ یہ ہو کہ راوی امام سے یا اس کے بعض اصحاب سے روایت کر رہا ہے۔

سند غیر متصل کے بارے میں امامیہ کے ہاں چار اقوال ہیں:۔

(۱) اسے مطلق طور پر قبول کر لیا جائے گا، اگر روایت متصل ہو۔

(۲) اسے مطلق طور پر قبول کر لیا جائے گا، اس لئے کہ اساس روایت سند کے جملہ رواۃ میں ان کا ثقہ ہونا ہے، پس واجب ہے کہ وہ سب معروف ہو اور ان کے ثقہ ہونے کی مقدار معلوم ہو، آخری راوی کا قول اس وقت قابل قبول ہوگا جب کہ وہ معروف ومشہور ہو اور جو مجہول ہو اور جس کا ذکر ہی نہ کیا گیا ہو وہ کس طرح مزکی قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۳) اگر راوی بذات خود ثقہ ہو تو سند غیر متصل کی روایت قبول کر لی جائے گی، اس ثقہ راوی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے بارے میں یہ شہرت ہو کہ وہ ثقہ کے سوا کسی سے روایت نہیں کرتا اور ارسال روایت کرتا ہے، بجز اس صورت کے کہ جن لوگوں سے روایت

کر رہا ہے وہ اس کی نظر میں عدول ہوں۔
بعض علماء نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اس سے کہ راوی ثقہ اس وقت تک ارسال نہیں کر سکتا جب تک وہ ثقہ اور عدول سے روایت نہ کر رہا ہو، اس صورت میں اس کی روایت لے لی جائے گی۔
(۴) مرسل روایت اس صورت میں قبول کر لی جائے گی کہ راوی کا عدل بہ حد شہرت پہنچ چکا ہو اور اس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ ثقہ کے سوا کسی سے روایت نہیں کرتا مگر مرسل روایت کی شرط قبول یہ ہے کہ وہ سند متصل رکھنے والی روایت سے معارض نہ ہو۔

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ تیسرے اور چوتھے قول کے مطابق مرسل روایت قبول کی جا سکتی ہے اور اگر مرسل روایتوں میں اختلاف ہو تو پھر موازنے سے کام لیا جائے گا۔
صاحب معالم الدین نے آخری قول کو ترجیح دی ہے اور اس پر گروہ امامیہ کو عامل بتایا ہے ان کا کہنا ہے۔
"ہماری جماعت مراسیل پر عمل کرتی ہے بشرطیکہ وہ معارض سے سلامت ہوں[1]"
اور یہ قول بلاریب مغز و مفہوم کے اعتبار سے قول اول سے متفق ہے، جس کی رُو سے احادیث مرسلہ مطلق طور پر قبول کی جا سکتی ہیں، بشرطیکہ ان کا راوی ثقہ ہو، البتہ یہ ضرور ہے کہ سند متصل والی حدیث کے مقابلے میں مرسل ضعیف تصور کی جائے گی!
قبول مرسل کے بارے میں جمہور فقہاء کا اصول جمہور فقہاء نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبول مرسل کے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔
امام مالک، ابوحنیفہ ابراہیم نخعی اور حماد بن ابی سلیمان وغیرہ کبار فقہاء اور بعض تبع تابعین مرسل

---

[1] معالم الدین ص ۲۱۴۔

روایات قبول کرلیا کرتے تھے اور انہیں حجت تسلیم کرتے تھے اور استدلال میں حجیت مسند کے برابر مانتے تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک اعتبار اس راوی کا تھا جس نے ارسال کیا ہے اور اگر وہ معتبر ہے تو اس کی بنیاد یہی ہو سکتی ہے کہ وہ صرف اسی صورت میں ارسال کرے گا جب وہ اس پر پورا بھروسا کرتا ہو جس سے اس نے ارسال کیا ہے اور چونکہ وہ ثقہ ہے لہٰذا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ رسول اکرمؐ یا صحابی، یا تابعی پر جھوٹ بولے گا اور یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کاذب سے روایت کرے۔

بعض تابعین خاص طور پر صرف اس صورت میں ارسال کرتے تھے جب وہ لوگ تعداد میں کافی ہوں جو ان سے روایت کرتے ہیں:۔

روایت ہے کہ ابراہیم نخعی فرمایا کرتے تھے!

"جب میں تم سے کہوں "عن فلاں عبد اللہ" تو جس نے مجھ سے حدیث بیان کی ہے وہ فلاں (یعنی مجہول) ہے، لیکن جب ساتھ ہی ساتھ میں عبد اللہ کا نام بھی لیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے ایسے کئی لوگوں سے سنا ہے جنہوں نے عبد اللہ سے سماعت کی ہے اور یہ عبد اللہ کوئی اور نہیں بلکہ) عبد اللہ بن مسعودؓ ہیں، لہٰذا اس معنی میں اکثر محدثین کا یہ خیال ہے کہ اس اعتبار سے مرسل، مسند سے زیادہ قوی ہے!"

لیکن شافعی مرسل کو چند قیدوں کے ساتھ قبول کرتے ہیں:

(۱) وہ اس مرسل کو قبول کرتے ہیں جو تابعی ثقہ کا ہو۔

(۲) اور جسے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عدد کبیر سے شرف لقا حاصل ہو،

(۳) یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مرسل مسند سے موافق ہو۔

(۴) یا اس کی تائید کسی ایسے مرسل سے ہوتی ہو جسے اہلِ علم قبول کر چکے ہوں۔

عہد شافعی کے بعد کے بعض علماء نے مرسل کی تضعیف کی ہے۔

ان علماء میں امام احمد بن حنبل بھی شامل ہیں، لیکن وہ قیاس کے مقابلے میں اس پر عمل کو مقدم رکھتے ہیں، اس لئے کہ قیاس سے صرف بہ وقت ضرورت کام لیا جا سکتا ہے۔

۲ دو اہم حقیقتیں

مراد بالا سے دو حقیقتیں ہماری نظر کے سامنے آتی ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ حدیث مرسل کے قبول میں امامیہ اور جمہور فقہاء اہل سنت میں

بڑی حد تک اتفاق ہے، سوا اس کے کہ معنی ارسال میں اختلاف ہے،
امامیہ کے ہاں ارسال انقطاع سند سے ثابت ہوتا ہے خواہ یہ انقطاع کسی طبقے میں کیوں نہ ہو۔
اور اہل سنت کے ہاں ارسال صرف تابعی کرسکتا ہے کہ اپنی روایت میں صحابی کا نام نہ لے۔
لیکن علماء و فقہاء اہل سنت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ارسال کی تعریف میں حضرات امامیہ سے بالکل متفق ہیں۔

(۲) ہم دیکھتے ہیں جمہور کے ہاں مراسیل ان احادیث کو قرار دیا جاتا ہے، جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف صحابی سے انقطاع سند کے ساتھ ہو۔
اور اتصال سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتصال سند ہو۔
لیکن امامیہ کے ہاں اس مفہوم میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ان کے ہاں خواہ اتصال ہو یا ارسال ہو الگ الگ کیفیتیں ہیں۔

اتصال کے لئے ضروری ہے کہ وہ امام معصوم سے ہو اور اگر ارسال ہو تو وہ بھی اس سے ہو، کیونکہ اگر معصوم کا توسط حاصل ہو جائے تو پھر روایت متصل سے بھی مافوق ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس نے اس میں کسی کا ذکر نہ کیا ہو کیونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ناقل ہے، بلکہ الکافی نے حضرت امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے صادق الحکایت ہے اور اس کی عصمت شک و شبہ سے بالا ہے۔

احادیث کا ردّ و قبول

احادیثِ نبوی اور ایمان حدیث کے مراتب کا تعیّن

امامیہ کے علماء اخبار و اصول کے تصریحات

مراتب اخبار نزد امامیہ

راویوں کی روایت کب اور کس طرح قبول کی جاسکتی ہے؟

حدیث کے اقسام اربعہ | حضرات امامیہ کے ہاں حدیث کی چار قسمیں ہیں:
(۱) حسن (۲) صحیح (۳) موثق (۴) اور ضعیف۔

یہ جس بنیاد پر قائم ہے وہ ہے راوی میں عدالت کا توافر اور عدم توافر، اگر توافر کامل موجود ہے تو پھر اس کی روایت صحیح ہے اور اگر مرتبہ کمال پر نہیں ہے تو اس میں نقص ہے۔

کتاب معالم الدین مؤلفہ شیخ حسن زین العابدین میں صحیح تعریف یہ ہے کہ جمیع طبقات رواۃ میں نقل و بیان عادل وضابط راوی کے ذریعہ اس کی سند امام معصوم تک متصل ہو[۱]!"

اس تعریف سے مستفاد ہوتا ہے کہ توافر صحت کے لئے شروط ثلثہ کا وجود لازمی ہے!

(۱) امام معصوم تک ایسی سند متصل، جو منقطع نہ ہو۔

(۲) جمیع طبقات میں راوی یکساں طور پر عادل ہوں۔

(۳) راویوں کو ضابط ہونا چاہیئے۔

اگر یہ شروط کسی حدیث میں پائے جائیں تو وہ صحیح ہوگی۔ اور پھر اس میں کسی طرح کے طعن کی گنجائش نہیں ہوگی۔

علماء امامیہ کا بیان ہے کہ صحیح کی یہ تعریف اصطلاحی ہے یا اسے صحیح بہ اطلاق کہہ سکتے ہیں۔ لیکن کبھی اس لفظ کا معنیٰ نسبی کی طرف، نہ کہ معنی مطلق کی طرف بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ لفظ کسی راوی کی طرف مضاف ہوتا ہے، اس صورت میں کہا جاتا ہے کہ "صحیح فلاں" یعنی فلاں شخص کی صحیح حدیث، پس یہ صحت معنی نسبی کے اعتبار سے ہے جو راوی کی طرف مضاف ہو جاتی ہے[۲]۔

---

[۱] معالم الدین ص ۲۱۶

[۲] معالم الدین ص ۲۱۷

اس سے دو امر مستفاد ہوتے ہیں:

(۱) کلمہ صحیح کا اطلاق غیر متصل سند کی طرف بھی ہوتا ہے یعنی ثقہ راوی کے لئے بولا جاتا ہے:۔
"حدیث صحیح فلاں شخص کی جانب سے"!

لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ راوی، رجال اسناد متصلہ میں سے ہو۔ اگرچہ اس نے سند متصل کا ذکر نہ کیا ہو، اس اعتبار سے کہ باقی رواۃ ضرور فن حدیث کے اہل جرح میں سے ہوں گے، کیونکہ اس راوی کے رجال ضابط اور عادل ہونے کے لحاظ سے معروف ہوتے ہیں اور جب کبھی راوی نے جن سے روایت کی ہے ان کی تعداد کثیر ہو تو اختصار کے پیش نظر ان کا نام حذف کر دیا جاتا ہے۔

(۲) یہ حدیث امامیہ کے ہاں مرسل نہیں شمار ہوتی، نہ اسے سند منقطع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ محذوفین کی تعداد کافی ہے اور اہل خبران سے واقف ہیں، ورنہ اسے کسی طرح بھی صحیح نہ مانا جاتا، کیونکہ امامیہ کے ہاں قول راجح یہ ہے کہ حدیث مرسل قبول نہیں کی جا سکتی، اور قبول کی جائے گی تو اسے صحیح اور قوی نہیں مانا جائے گا

یہ تعریف اس تعریف سے بڑی حد تک ملتی ہوئی ہے، جو ابراہیم نخعی نے عبداللہ بن مسعود سے اپنی ایک روایت کے سلسلے میں کی ہے اور جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہم کر چکے ہیں۔

شیخ حسن زین الدین کا بیان

حدیث حسن کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ حسن زین الدین نے اپنی کتاب معالم الدین میں لکھا ہے:۔

"حدیث صحیح امام معصوم تک وہ متصل السند حدیث ہے جو ایک ایسے امامی نے روایت کی ہو، جو بغیر معارضہ ذم مقبول کے ممدوح ہو، لیکن!۔ جمیع مراتب میں عدالت کا ثبوت نہ ہو۔[۱]"

حدیث حسن کی اس تعریف سے مستفاد ہوتا ہے کہ حدیث حسن میں امور ثلثۃ کا تحقق ضروری ہے۔

(۱) سند امام معصوم تک متصل ہو، اگر سند منقطع ہو گی تو اسے حدیث حسن نہیں مانا جائے گا۔

(۲) جمیع سند کے رواۃ کو بغیر معارضہ ذم مطلق یا ذم مقبول کے ممدوح ہونا چاہئے۔

(۳) رواۃ غیر ثابت العدالت ہوں، بشرطیکہ ان کا فسق ثابت نہ ہو، اگر وہ عدول ہیں تو ان کی

---

[۱] معالم الدین ص ۲۱۷۔

اس تعریف سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ حدیث موثق کی سند متصل ہونی چاہئے اور راوی عادل ضابط اور بہ جمیع شرائط روایت کا حامل ہونا چاہئے کیونکہ غیر امامی کی روایت قبول کرنے کی شرط یہ ہے کہ اس میں کسی جہت سے کوئی ضعف نہ ہو۔

ضعیف حدیث کی تعریف

ضعیف حدیث وہ ہے جو مروی تو ہو، لیکن اس میں شروط انواع سہ گانہ مذکورہ میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے۔

یعنی اس حدیث کو ایسے راوی نے روایت کیا ہو جو مجروح اور مطعون ہو، غیر ممدوح ہو یا اس نے فاسد المذہب اور غیر موثق اصحاب سے روایت کی ہو۔

یا اس سے موثق لیکن فاسد الاعتقاد شخص نے روایت کی ہو۔

یا وہ حدیث صحیح کی مخالف ہو، یا مقررات مذہب اس حدیث کے مخالف ہوں ۔۔ وغیرہ ذالک۔

اس طریق پر جو روایت ہوگی وہ ضعیف غیر موثق قرار پائے گی۔

اقسام اربعہ ضابطہ

روایت مقبولہ یا غیر مقبولہ کے لئے یہ ہیں اقسام اربعہ ضابطہ، ان اقسام کو اقسام رئیسہ کہا جاتا ہے، کیونکہ ہماری جملہ تقسیمات انہی اقسام اربعہ کی طرف راجع ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان اربعہ کو اصول حدیث کہا جاتا ہے۔

احادیث کی اور بھی کئی قسمیں ہیں۔ متفرق الفاظ میں جن کی تعریف کی گئی ہے، لیکن سب کی سب بالآخر انہی اقسام اربعہ کی طرف راجع ہوتی ہیں، لیکن یہ موقع تفصیل کا نہیں ہے، ہم نے ان اربعہ کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ زبان فقہاء پر بہ کثرت یہی جاری ہیں![1]

---

[1] معالم الدین ص ۲۱۹۔

روایت بلا اندیشہ صحیح ہوگی۔

اس تعریف سے ایک مزید تعریف پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ کہ اشتراط ثبوت عدالت خبر صحیح میں ہے جو انتہائی درجات قوت پر پائی جاتی ہے، لیکن جو مراتب حدیث صحیح کے مرتبے سے کم ہیں ان میں ثبوت عدالت کی شرط نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ راوی علماء خبر کے ہاں ممدوح مانا جاتا ہو، اپنے صدق کے اعتبار سے اور اس کی طرف کسی ذم کی نسبت نہ ہو۔

احادیث کی ان دونوں قسموں میں ضروری ہے کہ رواۃ امامی ہوں حدیث حسن اور صحیح کے لئے یہ بہا ضروری ہے کہ ان کی سند میں جو راوی آئیں وہ امامی ہوں، ان دونوں اقسام حدیث میں کوئی غیر امامی شریک روایت نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ فقر و تقویٰ کے اعتبار سے کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو۔

حدیث مؤثق کی تعریف

تیسری قسم حدیث مؤثق کی ہے۔ اس کی تعریف معالم الدین میں یوں آئی ہے۔

"وہ حدیث جس کے طریق میں غیر امامی ہو، لیکن اصحاب امامیہ کی توثیق پر منصوص ہو اور باقی طریق میں کسی اعتبار سے کوئی ضعف نہ ہو، اسے حدیث موثق قوی کہتے ہیں!"

اس تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ اس حدیث کا سلسلہ سند امام معصوم تک پہنچنے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ حدیث موثق کی امام معصوم کی طرف اگر نسبت ہو، جیسے امام ابوحنیفہ کی روایت امام صادق اور ان کی آل سے، یا امام باقر سے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن اس قول کے علاوہ ایک اور قول بھی ہے جس کی رُو سے غیر امامی کی روایت حدیث موثق یا غیر موثق کسی میں قبول نہیں کی جا سکتی۔

ایک اور قول بھی اس سلسلے میں ہے وہ یہ کہ غیر امامی کی روایت اس صورت میں قبول کر لی جائے گی کہ وہ دو امامیوں کے بیچ میں ہو۔

بہر حال ان اقوال میں سے کوئی قول بھی درست اور صحیح مانا جائے حدیث موثق اگر قبول کی جائے گی تو بہر حال اس کا رتبہ حدیث حسن اور حدیث صحیح سے کم ہوگا، وہ ان دونوں کے بین بین مانی جائے گی، مرتبہ عالیہ کی شرط یہی ہے کہ پوری سند کے رجال امامی ہوں۔

میں نے عرض کیا "پھر کیا بات ہے کہ وہ اختلاف کرتے نظر آتے ہیں"!
فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک سوال کیا، آپ نے اس کا جواب دے دیا، اس کے بعد آپ سے ایسا سوال کیا گیا جس کا جواب پہلے جواب کا ناسخ تھا پس (یاد رکھنا چاہئے) احادیث ایک دوسرے کی ناسخ ہوا کرتی ہیں[1]!"

زرارہ کی روایت امام باقر سے

نیز "الکافی" میں زرارہ ابوجعفر سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق سے ایک سوال کیا آپ نے اس کا جواب دے دیا۔ پھر ایک دوسرا آدمی آیا، اس نے ایک سوال کیا، اب آپ نے جو جواب مرحمت فرمایا وہ میرے جواب سے مختلف تھا، پھر ایک اور آدمی سوال کرنے آیا اسے آپ نے جو جواب دیا وہ اس سے مختلف تھا، جب دونوں آدمی وہاں سے چلے گئے تو میں نے عرض کیا۔

"اے ابن رسول اللہ آپ کے دو عراقی شیعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے آپ سے سوال کیا۔ آپ نے ان دونوں کو الگ الگ جواب دیا جو ایک دوسرے سے مختلف تھا"!
آپ نے ارشاد فرمایا:
"اے زرارہ یہ ہمارے لئے بہتر ہے، ہمارے اور تمہارے لئے، باقی رہنے والا ہے"!
یہ اخبار امام جعفر صادق سے منقول ہیں ان اخبار کے تعداد صدق و ثقہ پر ہم بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن ان عبارات سے جو مستنبط ہوتا ہے اس پر گفتگو کریں گے۔

امور مستفادہ

اخبار مرویہ امام صادق سے متعدد امور مستفاد ہوتے ہیں:
امام اگر زندہ ہو تو تعارض احادیث کی صورت میں اس سے رجوع کیا جائے گا جب تک وہ زندہ ہے تعارض کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جیسا کہ امام صادق نے معلیٰ بن خنیس سے ان کے سوال پر ایک مرتبہ فرمایا تھا، کیونکہ جب تک امام زندہ ہے، اس کے پاس حاضر ہو کر شک اور تعارض رفع کر لیا جا سکتا ہے اور اگر وہ غائب ہو اور اس کی رائے کا معلوم کرنا ممکن نہ ہو تو موازنے اور ترجیح سے کام لیا جائے گا۔ جیسا کہ الکافی میں امام جعفر صادق سے مروی ہے۔

---

[1] المسند طبع بیروت ج ۱ ص ۱۱

تعارضِ حدیث

احادیث میں تعارض کتب اخبار سے ثابت ہے

"الکافی" کی تصریحات | امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اور آل کرام سے ایسے اخبار مروی ہیں جو تعارض احادیث مرویہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ہیں۔
اسی طرح ائمہ آل بیت سے بھی، چنانچہ "الکافی" میں وارد ہے:

خزاز محمد سے اور وہ ابوعبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:
کیا بات ہے لوگ فلاں اور فلاں سے روایت کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور کذب سے متہم نہیں کئے جاتے:

آپ نے فرمایا:۔
حدیث بھی اسی طرح منسوخ ہوتی ہے جس طرح قرآن میں نسخ ہے۔
منصور بن حازم سے روایت ہے کہ:
میں نے ابوعبداللہ سے کہا:
"کیا بات ہے میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں، اور آپ اس کا ایک جواب مرحمت فرماتے ہیں۔ پھر میرے علاوہ دوسرا شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ آپ اسے بھی جواب دیتے ہیں لیکن وہ جواب پہلے جواب سے جو آپ نے مجھے دیا تھا مختلف ہوتا ہے۔
آپ نے فرمایا
ہم لوگوں کو جو بھی جواب دیتے ہیں اس میں (حسبِ ضرورت) زیادتی بھی ہوتی ہے۔ اور کمی بھی!
میں نے عرض کیا:
"اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صادق ہیں یا برعکس"؟
آپ نے فرمایا "وہ صادق ہیں"!

اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ ائمہ معصوم ہیں، وہ نبیؐ سے بلکہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔

اگر خبرِ آحاد کسی اور مجمع علیہ یعنی اجماعی سے متعارض ہو تو امامیہ کے ہاں وہ رد کر دی جائے گی، کیونکہ روایت مجمع علیہ شک و ریب سے ماوراء ہوتی ہے۔

امام صادق سے مروی ہے کہ مشہور احادیث غیر مشہور احادیث کو رد کر دیتی ہیں کیوں کہ نہ شاذ کی طرف التفات کیا جاتا ہے نہ اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

: اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو حدیثیں مروی ہوں اور سند کے اعتبار سے وہ مساوی قوت کی نہ ہوں تو اس حدیث کو مقدم رکھا جائے گا جو از روئے سند قوی ہو۔

: اگر بعض احادیث میں زیادتی ہو، جو بعض دوسری حدیثوں میں نہیں ہے تو نص سابق پر عمل کیا جائے گا، جیسا کہ امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ اگر مجالس کا تعدد ثابت ہو تو روایت قبول کر لی جائے گی، اس لئے کہ اس کا امکان ہے کہ آپؐ نے ایک مرتبہ کوئی بات فرمائی ہو اور بعد میں اُسے ترک کر دیا ہو اور ہر راوی نے وہی روایت کیا جو اس نے سُنا۔

تعدّدِ مجلس نہ ہو تو...

لیکن اگر مجلس میں تعدّد نہ ہو اور دونوں روایتیں با اعتبار قوت کے مساوی ہوں تو دونوں قبول کر لی جائیں گی۔ کیونکہ ہوسکتا ہے راوی تارک زیادتی نے اُسے فراموش کر دیا ہو اور جس نے یاد رکھا اس کا قول اس پر حجّت ہے جو یاد نہیں رکھ سکا۔

نیز ثقہ کی زیادتی مقبول ہے اگر اس سے زیادہ ثقہ راوی کی روایت اس سے معارض نہ ہو۔

: اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو اور یہ ثابت ہو کہ دونوں ایک ہی مجلس سے متعلق ہیں تو ان دونوں میں توفیق دینے کی کوشش کی جائے گی، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ جس سوال کا جواب آپؐ نے دیا ہے دو میں سے ایک روایت میں با اعتبار سوال وہ کسی وصف سے مقید ہو اور دوسرے جواب میں آپ نے مطلق جواب با اعتبار سوال کے دیا ہو اور دونوں جوابوں کی روایت سوال کی تبیین کے بغیر کر دی گئی ہو اور قاری نے تعارض پہ محمول کیا ہو!"

کیونکہ اس نوع کے تعارض میں امام صادق یا امام باقر کے جوابات جو مجلس واحد میں دو مختلف آدمیوں کو دئے گئے ہوں وہ اُن کے سوال کی نوعیت کے اعتبار سے ہوں، جو سوال تقیید کا طالب ہو اس کا جواب مقید ہو اور جو سوال مطلق ہو اس کا جواب بھی مطلق دیا گیا ہو گا۔

اوراس صورت میں بہ ظاہر جوابات متعارض معلوم ہوتے ہوں، لیکن اگر قیود اور احوال سائلین کو پیش رکھا جائے تو جوابات غیر متعارض بلکہ ہم آہنگ نظر آئیں گے

امام شافعی کاارشاد

بالکل ایسی ہی بات امام شافعی نے بھی اپنے "الرسالہ" میں کہی ہے: امام صادق کے مرویات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام لاحق کے اقوال اگر امام سابق سے مختلف ہوں تو امام لاحق کا قول لے لیا جائے گا.

اس سے متبادر ہوتا ہے کہ اقوال ائمہ میں بھی نسخ کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کیونکہ امام متاخر امام متقدم کا قول منسوخ کرسکتا ہے.

یہ اس لئے کہ متاخر اخبار و احادیث متقدم احادیث واخبار کی ناسخ ہوسکتی ہیں بشرطیکہ دونوں کے مابین توفیق دینے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکے اور دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح بھی نہ دی جا سکے. لہٰذا متاخر کو متقدم کا ناسخ مان لیا جائے گا.

توفیق کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ایک کو عام دوسری کو خاص مان لیا جائے.

شیخ الطائفہ طوسی کی رائے

اب ہم شیخ الطائفہ طوسی کی رائے پیش کرکے اس باب کو ختم کرتے ہیں، انہوں نے اپنی کتاب "الاستبصار" کے مقدمے میں لکھا ہے:

متواتر حدیث کی دو قسمیں ہوتی ہیں:۔

ایک قسم وہ ہے جو موجبِ علم ہوتی ہے، موجب علم ہر وہ خبر ہوتی ہے جو ایسے قرینے سے مقترن ہو جو موجبِ علم ہوسکتی ہے، اس خبر پر عمل واجب ہوتا ہے.

قرائن میں یہ چیز شامل ہے کہ:

وہ ادلۂ عقل کے مطابق ہوں:

ظاہر قرآن کے موافق ہوں.

اس صورت میں خبر، خبرِ آحاد نہیں رہتی باب معلوم میں داخل ہوجاتی ہے.

نیز یہ کہ خبر کو مطابق سنت مقطوع بہا ہونا چاہئے، خواہ صریحی طور پر یا از روئے دلیل یا فحوی کے اعتبار سے یا عموم کے لحاظ سے.

نیز یہ کہ اسے اجماع مسلمین کے مطابق ہونا چاہئے.

اور اس پر فرقہ محقہ (شیعہ) کا بھی اجماع ہونا چاہئے.

امامیہ کے استنباط معمول بہا

یہ طوسی کا قول تھا جو ہم نے نقل کیا، اور یہ مرویات کتب منسوبۂ امام جعفر صادق سے مستنبط ہے اور یہ استنباطات امامیہ کے ہاں معمول بہا ہیں، جن سے کئی امور واضح ہوتے ہیں، جن کی تفصیل آئندہ آئے گی[1]

---

[1] استاذ ابوزہرہ نے اس میں کوئی شبہ نہیں بڑی ژرف نگاہی کے ساتھ اصل ماخذوں کا سراغ لگایا ان کا مطالعہ کیا اور ان سے ضروری مواد حاصل کیا، یہ ان کا بہت بڑا اور وقیع علمی کارنامہ ہے جس پر بجا طور سے وہ علمی حلقے کی طرف سے سزاوارِ تحسین و آفرین ہیں۔

لیکن صورتِ احوال اور زیادہ اجاگر ہو جاتی، اگر انہوں نے اس مسئلے پر ذرا بسط اور تفصیل سے گفتگو کی ہوتی کہ یہاں ایجاز کی نہیں اطناب کی ضرورت تھی۔

(رئیس احمد جعفری)

یہ جمیع قرائن، خبر کو آحاد کی منزل سے نکال کر باب معلوم میں داخل کر دیتے ہیں اور اس پر عمل واجب ہوتا ہے!

دوسری قسم میں ہر وہ حدیث و خبر داخل ہے جو متواتر نہ ہو اور مذکورہ قرائن میں سے کسی ایک قرینے سے خالی ہو۔

یہ خبر، خبر آحاد ہوگی اور چند شروط کے ساتھ اس پر عمل جائز ہوگا

اور اگر کوئی خبر اس کی معارض نہ ہو تو یہ واجب العمل ہوگی، کیوں کہ پھر یہ اس باب میں شمار ہوگی جس پر اجماع ہے، البتہ اگر اس کے خلاف فتویٰ موجود ہو تو واجب العمل نہیں رہے گی۔

اور اگر تعارض ہو تو ہر دو طریق میں سے زیادہ عادل راوی کی روایت پر عمل درآمد ہوگا۔

اور اگر دونوں عدالت میں مساوی ہوں تو جس روایت کے راوی زیادہ ہوں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔

اگر عدالت اور عدد میں دونوں مساوی ہوں تو تاویل کی کوشش کی جائے گی۔

اور اگر دونوں میں سے کسی پر تضاد اور بُعد تاویل کے باعث عمل ممکن نہ ہو تو اجازت ہے کہ دونوں میں سے کسی پر عمل کر لیا جائے۔ کیوں کہ ائمہ علیہم السلام سے مروی ہے کہ اگر تمہارے پاس دو حدیثیں ہوں اور تم دونوں میں سے ترجیح نہ دے سکو تو تمہیں دونوں میں سے کسی ایک پر عمل کی اجازت ہے۔

کیوں کہ اگر دو متضاد احادیث وارد ہوں اور دونوں میں سے کسی ایک کی صحت پر اجماع طائفہ ہو، نہ دوسری کے ابطال پر اجماع ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دونوں کی صحت پر اجماع ہے۔

اور جب صورت یہ ہو کہ دونوں کی صحت پر اجماع ہو تو دونوں پر عمل جائز ہوگا۔

اور اگر تم اس پہلو پر غور کرو تو جملہ اخبار و احادیث کو ان اقسام میں سے کسی ایک سے خالی نہ پاؤ گے!"

حدیث اور اصول حدیث کی تدوین

السیّد حسن الصدر کی تصریحات

تدوین سب سے پہلے شیعوں نے کی

علماء امامیہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے پہلے شیعوں نے حدیث کی تدوین کی۔ وہ امام علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تدوین حدیث کا کارنامہ سرانجام دیا اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مرتب کیا۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے السیّد حسن الصدر، ندا قر الصیرفی سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھوں نے کہا:

"میں حکم بن عُیینہ کے ساتھ ابو جعفر محمد بن علی الباقر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکم نے کچھ سوال کیا تو ابو جعفر نے فرمایا!

"اے بیٹے اٹھ اور کتاب علی لے آ"!

چنانچہ ایک ضخیم کتاب آپ کے سامنے لائی گئی جسے آپ دیکھتے جاتے تھے اور مسائل نکالتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے یہ علی کی کتاب ہے جسے انھوں نے لکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے املا کرایا، پھر آپ حکم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا!

اے ابو محمد تم اور سلمہ اور مقداد یمین و شمال جہاں چاہو جاؤ، خدا کی قسم اس قوم سے زیادہ اوثق علم کہیں نہیں پاؤ گے جس کے ہاں جبرئیل نازل ہوا کرتے تھے!"

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ السید حسن الصدر کے نزدیک حضرت علیؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حدیث مدّون کی۔

• اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تدوین حدیث عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں

انجام پا چکی تھی۔

جمہور مسلمین کا نقطہ نظر

لیکن جماعت جمہور مسلمین کا نقطہ نظر اور ہے، ان کا خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دنیا ترک کی تو قرآن کے سوا کوئی چیز مدون نہیں تھی اور سنت کا جہاں تک تعلق ہے یہ تو آخر عہد بنو امیہ میں تدوین کے ابتدائی مرحلے سے گزری، تکمیل اس کے بھی ایک عرصے کے بعد کہیں جا کر ہوئی۔ جب عصر عباسی میں علوم مختلفہ کی تالیف و تصنیف کا دور شروع ہوا۔

السید الصدر نے یہ بھی فرمایا کہ کتاب علی آل بیت کے ہاں مصدر روایات کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"کتاب علی سے محمد ابن الحسن الصفار نے کتاب مصائر الدرجات میں بہت سے مسائل حل کئے ہیں، محمد عصر بخاری کے ایک عالم حدیث تھے۔
علی علیہ السلام نے ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام صحیفہ رکھا تھا، اس میں دیات کے مسائل تھے، یہ ان کی تلوار سے لٹکی رہتی تھی، میرے پاس اس کا نسخہ ہے۔
بخاری نے ان محمد سے اپنی صحیح میں "باب کتاب العلم" کے ماتحت ان کی روایت شامل کی ہے![1]"

امام علی کرم اللہ وجہہ کا صحیفہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام علیؓ کا صحیفہ دیات ایک حقیقت ہے۔ یہ خبر متفق علیہ ہے۔

لیکن روایت کا یہ حصہ کہ صحیفہ علی کے مسائل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے املا کرائے ہوئے تھے، موضوع نظر ہے۔ اس باب میں امامیہ اور سنیوں کے مابین اختلاف ہے۔

اور یہ روایت حیات علی و نبیؐ سے موافقت بھی نہیں رکھتی، اس لئے کہ علی بطل اسلام تھے ان کی زندگی جہاد کے لئے وقف تھی، وہ ہمہ وقت حرکت میں رہتے تھے اس لئے کتابت احادیث کا کام انجام دینا ان کے لئے آسان نہ تھا، گو امر واقعہ یہ ہے کہ علم رسالت سے انہیں بہرہ وافر ملا تھا۔

عہد صحابہ میں اہل تشیع کی کثرت روایت

ہمارے برادران اثنا عشری کا دعویٰ ہے کہ عہد صحابہ میں شیعوں نے کثرت کے ساتھ روایات کیں اور جو

---

[1] تاسیس الشیعہ ص ۲۷۹، طبع عراق۔

لوگ علم آل رسول کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے ان میں وہ صحابہ شامل ہیں جو علی کے ساتھ تھے، مثلاً سلمان فارسی وغیرہ۔

اسی طرح تابعین میں بھی جو لوگ آل بیت علی کے عقیدت کیش تھے، یہ کام حضرت علی کی شہادت کے بعد کرتے رہے۔ ان میں آل بیت کے لوگ بھی شامل تھے، مثلاً علی زین العابدین رضی اللہ عنہ، پھر ان کے صاحبزادے امام باقر جو روایت و درایت میں حجت تھے، جن کا کبار علماء وائمہ سے زیادہ ادب واحترام کرتے تھے مثلاً ابو حنیفہ وغیرہ امام باقر کے بعد ان کے صاحبزادے امام جعفر صادق نے یہ ذمے داری سنبھالی۔

حضرات شیعہ کہتے ہیں کہ امام صادق کے روایات کا شمار ممکن نہیں، اور ان سے جن لوگوں نے روایت کی ہے وہ بھی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔

چنانچہ طوسی نے اپنی کتاب "اعلام الوریٰ" میں لکھا ہے۔

جن مشہور اہل علم نے ابو عبداللہ جعفر الصادق سے روایت کی ہے ان کی تعداد چار ہزار کے لگ بھگ ہے!

اب ہم شیعوں کی کتاب اصول اور روایت پر فرداً فرداً اختصار کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

الکافی

امامیہ کی کتب اصول میں سب سے پہلی کتاب

السید حسن الصدر کی رائے السید حسن الصدر اپنی کتاب تاسیس الشیعہ میں لکھتے ہیں:۔
"کافی میں ۱۶۰۹۹ حدیثیں ہیں جن کی سند طریق آل بیت سے ہے، یہ تعداد اہل سنت کی کتاب صحاح ستہ سے زیادہ ہے اور ان میں جو زیادہ تعداد نظر آتی ہے وہ متن واحد کے طرق متعددہ کے باعث ہے[1]۔"

اس کلام سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ کافی میں احادیث کی یہ تعداد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان روایات کا بڑا حصہ ائمہ معصومین پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ کافی میں احادیث کی سند متصل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پائی جاتی ہے اور ایسا دعویٰ بھی کیا نہیں جا سکتا تھا، کیونکہ امامیہ کے ہاں اقوال ائمہ بھی اقوال رسولؐ ہی مانے جاتے ہیں۔

کافی کے اکثر مرویات امام جعفر صادق تک منتہی ہوتے ہیں، بہت کم روایتیں ایسی ہیں جو امام باقرؑ تک پہنچتی ہیں اور ان سے کم وہ ہیں جو امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ تک جاتی ہیں اور ایسی روایتیں تو نادر ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتی ہیں۔

السید الصدر نے مرویات کلینی وکتب صحاح ستہ اہل سنت کی تعداد کا موازنہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ روایات کافی کتب صحاح ستہ اہل سنت سے تعداد میں زیادہ ہیں، کیونکہ کتب

---

[1] تاسیس الشیعہ ص ۲۸۸۔

صحاح کی زیادتی روایات تکرار سند ور روایات پر مبنی ہے۔

ہم تعدد سند کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کافی اس سے خالی ہے اس میں بھی متعدد عبارات کے ساتھ ایک ہی معنی کی روایت کی گئی ہے۔

لیکن اصل سوال تعداد کا نہیں قوت سند اور سند متصل کا ہے۔ اس اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو معاملہ الٹ جائے گا۔

الکافی پر ایک موضوعی نظر

کافی پر ہم ایک موضوعی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں صحیح روایات بھی ہیں لیکن ایسی روایتیں بھی ہیں جو محتاج نظر ہیں۔

یہ خیال کہ کافی کو شیعوں میں وہی منزلت حاصل ہے جو سنیوں میں صحیح بخاری کو ہے خود شیعہ افاضل کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔

"اصولاً اور فروعاً کافی کو شیعوں میں وہ مقام حاصل نہیں ہے جو سنیوں میں صحیح بخاری کو ہے۔ سنی اسے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ مانتے ہیں اور ابن خلدون نے دعویٰ کیا ہے کہ بخاری کی صحت کے معمول بہ ہونے پر اجماع ہے، لیکن کافی کو شیعوں میں یہ رتبہ حاصل نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے نزدیک صحاح اخبار کی کتب اربعہ میں سے ایک ہے اس کی ہر حدیث صحیح نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ شیعوں کے ہاں اس کے واجب العمل ہونے پر اجماع نہیں ہے۔"[1]

بخاری کے روایات کی تحقیق

بخاری کے بارے میں ہم کہہ دینا چاہتے ہیں کہ علماء اہل سنت نے اس کے رواۃ کو بغیر تحقیق کے نہیں چھوڑا ہے اور نہ نقد و تمحیص سے گریز کیا ہے۔

اور بخاری کو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ضرور کہا جاتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ کتاب قریب قریب ہم پایۂ قرآن ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کے اور قرآن کریم کے مابین مسافت بہت طویل ہے، اتنی ہی طویل جتنی حدیث قطعی و متواتر اور حدیث ظنی الثبوت میں ہے کہ اول الذکر کا منکر کافر ہے اور ظنی الثبوت کا نہیں اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ بخاری میں ایسی حدیثیں بہت کم ہیں

---

[1] الدعوۃ الاسلامیہ الی وحدۃ اہل السنت والامامیہ ج ا ص ۵، للامام ابوالحسن الخنیزی۔

جو متواتر باللفظ ہوں، اگرچہ متواتر بالمعنیٰ کافی ہیں۔ پہلی قسم نادر ہے اور دوسری قلیل۔

"الکافی" میں ائمہ تک سند متصل ہے

ہمارے برادران امامیہ کا دعویٰ ہے کہ کافی میں ائمہ معصومین تک سند متصل ہے، اس میں کوئی انقطاع نہیں، لیکن ابوالمعالی نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس سے تین امور مستفاد ہوتے ہیں۔[1]

(۱) اثبات سند کا التزام

کلینی نے کافی میں اثبات سند کا التزام رکھا ہے، اور جب کبھی وہ سند ترک کرتے ہیں تو سند سابق کے احالے کے ساتھ اور احالے میں ان کی عبارت سند سابق سے مختلف ہوتی ہے، کبھی وہ تصریح کر دیتے ہیں کہ روایت سند سابق سے متعلق ہے اور کبھی روایت خبر کے بعد "قال" کہہ کر ضمیر کو اول سند کی طرف راجع کر دیتے ہیں، کبھی اس شخص کی طرف جس نے امام سے روایت کی ہو اور کبھی ضمیر اس امام کی طرف عائد ہوتی ہے جس سے وہ خود روایت کرتے ہیں۔

(۲) امامیہ مرسل حدیث کو رد کرتے ہیں

کبھی وہ ارسال سے کام لیتے ہیں حالانکہ اکثر امامیہ مرسل حدیث کو رد کرتے ہیں لیکن علی الاطلاق اسے قبول کر لیتے ہیں۔ یعنی اس صورت میں قبول کرتے ہیں کہ راوی ثقہ ہو اور چونکہ کلینی ان کے نزدیک ثقہ ہیں اس لئے ان کا ارسال قبول کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ سند متصل سے معارض نہیں ہوتا۔

بہر حال یہ ثابت ہے کہ جمہور امامیہ کلینی کے جملہ مرویات کو حجت نہیں مانتے، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں ضعیف روایتیں بھی ہیں۔

(۳) توثیق روایت

کبھی وہ روایت کی توثیق کلمے کا اعادہ کر کے کر دیتے ہیں۔

الکافی میں بغیر کسی خلل کے سند موجود ہے

بہر حال یہ ہیں علماء کے افکار و آراء "الکافی" کے بارے میں، وہ اس پر سختی کے ساتھ قائم ہیں کہ کافی میں بغیر کسی خلل کے سند موجود ہے اور وہ ائمہ میں سے کسی ایک امام تک پہنچتی ہے اور کافی کے اکثر اسناد امام جعفر صادق تک جاتے ہیں اور اسناد کا بڑا حصہ متصل ہے، بعض روایات مرسل بھی ہیں اور اس اساس پر کتاب کا کچھ حصہ علماء کی نظر میں موضع نظر ہے اور موضع نظر

---

[1] رسائل ابوالمعالی رسالۃ من لا یحضرہ الفقیہ ص ۲۔

روایات کا موازنہ دوسرے روایات سے کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ ارجح ہوں تو انہیں قبول کیا جا سکتا ہے۔

بعض علماء امامیہ کا قول ہے کہ کافی میں جو کچھ ہے سب مقبول ہے اور واجب العمل ہے، خواہ سند کی نوعیت کچھ ہی ہو، یہ قول فاضل قزوینی کی طرف منسوب ہے "الریاض" میں ان سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"الکافی کی روایتیں زیادہ تر امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہیں اور بلا واسطہ مروی ہیں اس کی تمام حدیثیں برحق ہیں اور واجب العمل ہیں، اس میں تقیہ سے متعلق ایک حدیث بھی نہیں ہے۔"

لیکن یہ رائے جمہور علماء شیعہ کے نزدیک مقبول نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ کافی کے بعض روایات رد بھی کئے جا سکتے ہیں اور اس میں جو کچھ ہے سب کا سب واجب الاخذ نہیں ہے۔

"المسند" کتب اربعہ کی جامع ہے

نجف کے برادران امامیہ نے کتب اربعہ کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے اور اس کا نام "المسند" رکھا ہے اس کے متعدد اجزاء دار الفکر بیروت سے شائع ہو چکے ہیں، اس میں ہم نے روایات کافی پر ایک نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اکثر روایات متصل السند نہیں ہیں، ہو سکتا ہے کہ مسند میں پورا سلسلہ سند اختصار کے پیش نظر درج نہ کیا گیا ہو، لیکن اچھا ہوتا اگر پوری سند درج کر دی جاتی تاکہ پڑھنے والا رواۃ کے بارے میں خود بھی کوئی رائے قائم کر سکتا۔

اس جگہ ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔

کلینی نے ایسے اشخاص سے بھی روایت کیا ہے جو عہد امام جعفر صادق میں وفات پا چکے تھے، جیسے معلی بن خنیس، کلینی نے امام جعفر صادق سے ان کی کئی روایتیں درج کی ہیں۔ لیکن معلی اور کلینی کے مابین کوئی واسطہ نہیں ملتا، حالانکہ یہ بات ثابت ہے کہ عہد امام صادق میں معلی کو داؤد بن علی نے قتل کر دیا تھا جو خلیفہ منصور عباسی کی طرف سے مدینے کا والی تھا، وہ امام صادق کو بھی قتل کرنا چاہتا تھا لیکن اللہ نے اُسے ہلاک کر دیا۔

ایک تحقیقی نظر

بہر حال کافی کے بارے میں ہماری معلومات اور خیالات جو تھے وہ ہم نے پیش کردئے، مقصد تشکیک یا تجریح نہیں ہے بلکہ صرف ایک تحقیقی نظر ڈالنا ہے[1]

---

[1] "الکافی" کے بارے میں علامہ ابوزہرہ نے جو تحقیق کی ہے وہ ہر آئینہ اہم، قابل غور اور اس کے نتائج کی حامل ہے انھوں نے یہ اچھا کیا کہ اس سلسلے میں بعض اکابر و اعیان شیعہ کے تاثرات اور خیالات بھی ضروری حوالوں کے ساتھ درج کردئے، جس سے دوسرے تحقیق کرنے والوں کے لئے سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ اور وہ بہ آسانی ان مصادر کا مطالعہ کر کے رائے قائم کرسکتے ہیں۔

(رئیس احمد جعفری)

"من لایحضرہ الفقیہ"

کتب اصول امامیہ کی دوسری اہم کتاب

ابوجعفر محمد بن موسیٰ قمیؒ

یہ کتاب قدامت کے اعتبار سے برادران امامیہ کے ہاں دوسرے نمبر پر ہے، یعنی کلینی کے بعد!

اس کتاب کے راوی ابوجعفر محمد بن موسیٰ قمی نزیل "رے" ہیں، سال وفات ۳۸۱ھ

قمیؒ صدق روایت میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں، ان کی اس کتاب میں ۹۰۴۴ احادیث ہیں جو احکام پر مشتمل ہیں اور طریق آل بیت سے مروی ہیں۔

السید حسن الصدر کی نظر میں شیخ قمیؒ کے مراسیل صحت کے لحاظ سے مسانید کے برابر مانے جاتے ہیں[1]۔

مؤلف کتاب کا مرتبہ

اس کتاب کے مؤلف کی حیثیت امامیہ کے ہاں بہت دقیع ہے اس لئے انہیں "الصدوق" کا لقب دیا گیا۔

لیکن ان کی کتاب کا درجہ "کافی" سے کم ہے، اس لئے کہ وہ کافی سے تقریباً پچاس سال متاخر ہے، بایں ہمہ وہ ارسال سے کام لیتے ہیں اور اسناد کا ذکر نہیں کرتے۔

ابوالمعالی نے اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے:

"الصدوقؒ نے اپنی کتاب من لایحضرہ الفقیہ کے آغاز میں لکھا ہے۔

میں نے یہ کتاب بایں طور مرتب کی ہے کہ اسناد حذف کر دئیے ہیں تاکہ کثرت طرق کی ضرورت نہ پیش آئے[2]۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ الصدوق نے اسانید کا ذکر نہیں کیا ہے تاکہ کثرت اسناد سے بچا جا سکے!"

---

[1] تاسیس الشیعہ للسید الصدر رحمۃ اللہ ص ۲۸۸

[2] رسائل ابی المعالی رسالۃ لزوم نقد من لایحضرہ الفقیہ ص ۲۵۔

اس کتاب کے بارے میں پھر مزید کہا ہے :

"اس کتاب میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب ایسی کتب مشہورہ سے متخرج ہے جو مرجع اور مصدر مانی جاتی ہیں، کیونکہ ان کے رجال طریق مشائخ اجازہ میں سے ہیں[1]"

قوت اجازہ سے متعلق اختلاف | قوت اجازہ کے بارے میں علماء کے اندر اختلاف ہے اکثر نے اسے قبول کیا ہے۔

لیکن شرط یہ رکھی ہے کہ اجازہ سماع اور قرأت پر مبنی ہو یا سماع قرأت غیر پر اس کی اساس ہو۔

اور یہ بھی ضروری ہے کہ مجیز صاحب عدل ہو، یا اس کی کتاب مشہور، متواتر اور معروف ہو، اور اس پر اعتماد کیا جاتا ہو اور متصل رواۃ کے باعث اس سے اخذ کیا جاتا رہا ہو اور علماء نے اسے بغیر نکیر و اعتراض کے قبول کر لیا ہو[2]

اور اگر اجازہ ان شرائط کو پورا نہ کرتا ہو تو وہ موضع نظر ہے، لیکن اس باب میں کوئی شبہ نہیں کہ الصدوق کے ثقہ ہونے پر اعتماد کا نتیجہ یہ ہے کہ احتمال غالب یہ ہے کہ انھوں نے اسی اجازے کو قبول کیا ہے جو کتاب مشہور و متواتر اور مرد ثقہ پر مبنی ہو۔

مراسیل کی تضعیف | الصدوق نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں مراسیل بھی درج کئے ہیں۔

ائمہ نے فی الجملہ مراسیل کو ضعیف گردانا ہے، اور اس کی تضعیف کو ترجیح دی ہے، چنانچہ اُن کی بڑی تعداد مراسیل کو قبول نہیں کرتی، لیکن کتب مشہورہ میں جو مراسیل ملتے ہیں ان کی صورت دوسری ہے۔ یہاں وہ مراسیل اس لئے قبول کر لئے جاتے ہیں کہ راوی کے ثقہ ہونے پر اعتماد ہے چنانچہ کلینی نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور "الصدوق" (ابن بابویہ) نے بھی اس اصول کو پیش نظر رکھا ہے جس کے باعث مراسیل کو قبول کیا گیا ہے، اگرچہ ان میں شروط اتصال سند نہیں پائے جاتے، جو لوگ روایت، رواۃ اور اخبار کو علی الاطلاق قبول کر لیتے ہیں وہ اخباری کہے جاتے ہیں اور

---

[1] رسائل ابوالمعالی۔ [2] رسائل ابوالمعالی۔

اجتہاد سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا، ان تک بہ طرائق مختلفہ امام معصوم سے جو کچھ پہنچتا ہے اس پر اکتفا کرتے ہیں اور اسے بے چون وچرا قبول کر لیتے ہیں، جیسے بعض سُنّی فقہاء کا دستور ہے کہ صرف ضرورت سے مجبور ہو کر اجتہاد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ورنہ انہیں ان احادیث ضعیفہ کے قبول کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا، جن کا کذب "ثابت نہ ہو" اور ان ضعیف حدیثوں کو اجتہاد بالرائے پر مقدم رکھتے ہیں۔

یہی حال اکثر حنابلہ کا ہے جو اجتہاد بالرائے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے ہاں صرف اسی صورت میں اجتہاد روا ہے جب اس کی سخت و شدید ضرورت لاحق ہو۔

لیکن جن لوگوں نے شروط روایت وضع کئے ہیں اور ان کے اصول ضبط کئے ہیں، یہ اصولی کہلاتے ہیں، ان اصولیوں نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور اگر نص نہ ہو تو زیادہ دور تک بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اور یہ ہم بتا چکے ہیں کہ امامیہ حضرات دو ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ اخباریوں کا ہے اور دوسرا اصولیوں کا۔

ایک دوسری کتاب "التوحید"

من لا یحضرہ الفقیہہ کے علاوہ الصدوق کی ایک کتاب اور بھی ہے جس کا نام "التوحید" ہے۔

اس کتاب میں عقائد سے متعلق امام جعفر صادق کے ارشادات مروی ہیں۔

جس طرح "الصدوق" نے من لا یحضرہ الفقیہہ میں اپنا طریق ارسال کا رکھا ہے، وہی اسلوب اس دوسری کتاب میں بھی قائم ہے، جس طرح من لا یحضرہ الفقیہہ میں انھوں نے اپنی معتمد کتابوں سے اخذ کیا ہے، اس طرح اس دوسری کتاب میں بھی اپنی وضع قائم رکھی ہے۔

چند اہم مباحث

ذیل میں ہم اس کتاب کے چند مباحث پیش کرتے ہیں تاکہ روایت میں "الصدوق" کے منہاج کا اندازہ ہو جائے۔

(۱) ہشام بن حکم سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا۔

میں نے ابو عبداللہ سے عرض کیا۔

"اللہ کے ایک ہونے کی دلیل کیا ہے"؟

آپ نے فرمایا اتصال، تدبیر کمال صنعت جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لو كان فيهما آلهة الا الله لفسدتا (اگر خدا کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو فساد برپا ہو جاتا

ان میں)۔

(۲) ایک جماعت نے امام جعفر سے عرض کیا۔

"ہم دعوت دیتے ہیں مگر وہ پذیرا نہیں ہوتی!"

آپ نے فرمایا "اس لئے کہ عرفان کے بغیر تم اجازت دیتے ہو۔"[1]

مذکورہ مثالوں میں الصدوق نے اس راوی کا ذکر نہیں کیا ہے جس نے امام صاحب سے روایت کی ہو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ مواد کسی کتاب سے حاصل کیا ہے، نہ کہ سند مرسل یا متصل سے۔

مقصد تشکیک نہیں

یہ تھے ہمارے افکار و خیالات "من لایحضرہ الفقیہ" اور کتاب "التوحید" کے بارے میں۔

یہ دونوں کتابیں ابن بابویہ القمی کی ہیں۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ اپنے جائزے میں موصوف کے منہاج و روایت پر روشنی ڈالیں مقصد صرف توضیح اور بیان تھا نہ کہ تشکیک۔

---

[1] المسند ج ۱ ص ۳۵۔

"التہذیب" اور "الاستبصار"

کتب اصول امامیہ کی آخری دو کتابیں

شیخ طوسی کی شخصیت یہ دونوں کتابیں شیخ ابو جعفر محمد بن علی طوسی کی تصنیف ہیں۔ جنہوں نے ۴۶۰ھ میں وفات پائی۔

السید حسن الصدر کا بیان ہے کہ ان دونوں کتابوں میں تقریباً ۱۳ ہزار حدیثیں ہیں اور یہ جملہ ابواب علم امامی پر مشتمل ہیں۔

لیکن خود شیخ طوسی نے اپنی کتاب عدۃ الاصول میں تصریح کی ہے کہ "تہذیب" کے اخبار و احادیث کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہے۔ گویا چھ ہزار سے کم! تو کیا جو زائد حدیثیں ہیں وہ عصور مختلفہ کا اضافہ ہیں؟

الاستبصار کے بارے میں السید حسن الصدر فرماتے ہیں اس کی مجموعہ احادیث تقریباً پانچ ہزار ہیں اس کتاب کی حدیثیں احکام و مسائل پر مشتمل ہیں۔ مؤلف نے اپنی کتاب الاستبصار میں لکھا ہے۔

"میں نے اس کتاب کو تین اجزا میں تقسیم کیا ہے۔

جزء اول اور جزء ثانی عبادات سے متعلق احادیث پر مشتمل ہیں۔ اور تیسرا جزء معاملات وغیرہ ابواب فقہ سے متعلق ہے۔

پہلا جزء ۳۰۰ ابواب پر مشتمل ہے جس میں ۱۸۷۹ حدیثیں ہیں اور دوسرا جزء ۲۲۷ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں ۱۱۷۷ حدیثیں ہیں۔

کتاب کے جملہ ابواب ۹۲۵ ہیں، جن میں ۵۵۱۱ حدیثیں ہیں[1]

فقہ متعارف پر طوسی کا عبور غرض یہ ہے التہذیب اور الاستبصار کی کیفیت جن کی روایت طوسی نے کی ہے اور طوسی اپنے عہد میں بلا نزاع و اختلاف شیخ الطائفہ مانے جاتے

---

[1] رسالہ من لایحضرہ الفقیہ والتہذیب ہیں۔

تھے۔ ان کا شمار پانچویں صدی ہجری کے اعیان میں ہوتا ہے۔ ان کی کتابیں موسوعات فقہیہ وعلمیہ اور درس فقہ متعارف کی آئینہ دار ہیں، کیوں کہ ان کے دراسات صرف علوم و فقہ امامیہ تک محدود و مقتصر نہیں تھے۔

طوسی کی روایات | طوسی کا اگرچہ پانچویں صدی ہجری میں انتقال ہوا۔ لیکن انہوں نے ائمہ معصومین سے اخبار و احادیث کی روایت کی ہے ان کے جملہ اسناد متصل نہیں بلکہ زیادہ تر مرسل ہیں، وہ الکافی پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں اور اس سے زیادہ تر اخذ کرتے ہیں۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بہ طریق اجازہ ان لوگوں سے روایت کرتے ہیں جنہوں نے کلینی سے روایت کی ہے۔

طوسی اپنی کتاب "التہذیب" میں اسناد مرسلہ کا کبھی ذکر کرتے ہیں اور کبھی نہیں کرتے کبھی صرف اس راوی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں جس نے امام معصوم سے روایت کی ہے۔

لیکن الاستبصار میں کہیں انھوں نے ان اسناد مرسلہ کا ذکر کیا ہے اور کہیں کوئی سند نہیں ذکر کی ہے الاستبصار کے آخر میں وہ فرماتے ہیں۔

> "الاستبصار کے جزء اول اور ثانی میں اسناد کا سلسلہ قائم ہے، لیکن جزو ثالث میں محذوف ہے[1]!"

اپنی اکثر کتب میں حذف کے ساتھ ارسال پر طوسی کا اعتماد اس بات کا طالب ہے کہ اس اصول کی طرف رجوع کیا جائے جو ان کے پیش نظر رہا ہے وہ جامع الاصول کی حیثیت سے حجت ہیں، نہ کہ بذاتہ اپنی روایت کے اعتبار سے اس لئے کہ ان میں اور امام جعفر صادق میں زمانی بُعد بدرجہ اتم موجود ہے اور روایات کا بیشتر حصہ۔ چند نادرات کے سوا۔ امام جعفر صادق پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔

ایک بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ طوسی نے اپنے روایات میں ایسے رجال پر زیادہ بھروسا کیا ہے جو اسناد رجال میں نہیں شمار ہوتے لہٰذا معاملات دین و مذہب میں ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں نے ان رُواۃ کے بارے میں نکتہ چینی کی ہے تقی مجلسی رجال طوسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "جاننا چاہئے کہ شیخ طوسی سے جس سہو و غفلت کا صدور ہوا ہے اس کی بنیاد کثرت تصانیف اور مشاغل عظیمہ ہیں، ان کا شمار فضلائے زمانہ میں ہوتا تھا۔ ہم نے اپنے مشائخ سے سنا ہے کہ ان کے فضلاء تلامذہ جو پایۂ اجتہاد رکھتے تھے ان کی تعداد تین سو سے

---

[1] رسالۃ التہذیبین ص ۳۔

کہتے ہیں کہ وہ ثقہ ہے، دوسرے موقع پر اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں!

طوسی پر ایک اعتراض یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طوسی نے اپنی کتابوں "التہذیب اور الاستبصار" میں ان اصولوں کو ملحوظ نہیں رکھا ہے جو خود انھوں نے وضع کئے ہیں۔

رسائل ابی المعالی میں وارد ہے:

"طوسی قبول روایت میں ایمان و عدالت کی شرط لگاتے ہیں، اس کا اقتضاء یہ ہے کہ اخبار موثقہ پر عمل نہ ہو، لیکن کبھی وہ خبر ضعیف کو مطلق طور پر واجب العمل قرار دے دیتے ہیں، چنانچہ اس سے اخبار کثیرہ صحیحہ کی تخصیص تک کر گزرتے ہیں، کبھی ضعف کے باعث حدیث کو صراحت کے ساتھ رد کر دیتے ہیں اور کبھی خبر صحیح کو اس تعلیل سے رد کر دیتے ہیں کہ وہ خبر واحد ہے جو واجب العمل نہیں!"

موضوعی طور پر استفادہ ہم نے اوپر جو عبارتیں درج کی ہیں وہ مذہب امامی کی کتب ثقہ سے منقول ہیں۔ ہمیں انہیں رد کرنے یا ترک کر دینے کا اختیار نہیں، ہم نے ان سے موضوعی طور پر استفادہ کیا ہے۔

علماء امامیہ نے طوسی اور ان کی دونوں کتابوں "التہذیب" اور "الاستبصار" پر جو تنقید کی ہے وہ چار وجوہ پر مبنی ہے!

(۱) ارسال۔ یعنی امام معصوم کی طرف سند غیر متصل، خواہ سند ذکر کی جائے یا نہ کی جائے اور بُعد زمانہ کے باعث ارسال حدیث کو (مزید) ضعیف کر دیتا ہے۔ اور ویسے ارسال بجائے خود اکثر امامیہ کے ہاں نامقبول ہے۔

نیز انھوں نے ان کتب معتبرہ سے بھی نقل کیا ہے جو اجازے کی حامل ہیں۔ اجازہ اتصال سند کے طرق میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ صاحب معالم الدین نے بتایا ہے کہ اجازہ یا تو صاحب کتاب سے کیا گیا ہوگا اور نعلاً اس کی اجازت پر یا خلفاً عن سلف، اجازات مثلاً حقہ پر مبنی ہوگا، یہ بھی جائز ہے۔

(۲) طوسی کو تمیز رجال پر پوری قدرت نہیں تھی۔

(۳) بعض متون کا نقص۔

(۴) طوسی پر ایک اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں اصولاً عدالت و ایمان کی شرط کی ہے لیکن ان کے مرویات میں اس شرط کا پورا پورا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، وہ غیر امامی افراد جمہور مسلمین سے بھی روایات قبول کر لیتے ہیں، بعض ضعفاء کی بھی روایت قبول کر لیتے ہیں اور بعض صحاح کی روایت رد کر دیتے ہیں۔

زیادہ ہے اور عام تلامذہ کی تعداد تو حد شمار سے خارج ہے۔ شیخ طوسی کو خلفا اپنے دربار میں کرسی پیش کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ وحید عصر تھے۔ ان کی اکثر تصانیف عہد عباسی کی ہیں، کیونکہ عباسی خلفا عام وخاص علماء فضلا کی تعظیم میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا کرتے تھے۔ شیخ طوسی کے زمانے میں تقیے کا زیادہ چلن نہیں تھا، بلکہ اصول و فروع کے موضوعات پر عام مباحثے بڑی بڑی مجلسوں اور اجتماعات میں ہوا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مثلاً امامت تک پر بحث ہوا کرتی تھی۔"[1]

اس عبارت سے یہ بات بہ وضوح سامنے آجاتی ہے کہ طوسی نے کثرت مشاغل علمی و دینی کے باعث حکام کی نظر میں اجلال و احترام حاصل کرلیا تھا اور کثرت تصانیف کے باعث سہو و غفلت میں کبھی کبھی مبتلا ہو جایا کرتے تھے

یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کثرت مشاغل کے باعث شیخ طوسی اغلاط رجال اور متن اخبار دونوں میں سہو کر جاتے تھے۔

چنانچہ السید ہاشم بحرانی اپنی ایک کتاب "اللؤلؤۃ" میں کتاب "تنبیہ الادیب فی رجال التہذیب" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اسانید اخبار کتاب مذکور میں شیخ (طوسی) سے کافی غلطیاں ہوگئی ہیں چنانچہ کتاب مذکور میں بہت کم ایسے اخبار ہیں جن کا متن اور سند سہو و تحریف سے خالی ہے۔

روایات میں شیخ طوسی کی شرح حال کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب "اللؤلؤہ" میں لکھتے ہیں:۔

"التہذیب میں خاص طور پر طوسی سے سند اور متن میں زیادہ غلطیاں ہوئی ہیں۔ شاید ہی کوئی خبر اس طرح کی غلطیوں سے خالی ہو۔"[2]

رسائل ابی المعالی میں اس سلسلہ بحث میں وارد ہوا ہے:

"رجال سے متعلق اقوال شیخ پر زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیے، ان کے اخبار نہ مفید ظن ہیں نہ مفید شک کیونکہ ان کا کلام محل اضطراب ہے۔ ایک موقع پر ایک راوی کے متعلق

---

[1] رسالہ "التہذیبین" لابی المعالی۔ [2] رسالہ لزوم نقد رجال التہذیبین۔

نے کلینی سے علم حاصل کیا ہے اس سے اجازہ حاصل کیا ہے۔

امام صادق کے اس ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا علم الہامی اور بہ وصیت نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو علم کی اپنی ذات سے نفی نہ کرتے بلکہ علم و حکم کی اپنی جانب نسبت مؤکد طور پر فرماتے۔

الاستبصار کے بعض مباحث

الاستبصار میں وارد ہے۔
احمد بن محمد اپنے والد سے وہ سعد بن عبداللہ سے، وہ احمد بن محمد عیسٰی سے وہ حسین بن سعید سے اور ان کے والد محمد بن عیسٰی سے وہ محمد بن ابی عمیر سے وہ عمرو بن اذینہ سے وہ زرارہ و بکیر اعین کے بیٹوں سے وہ ابو جعفر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ مسح کرتے ہوئے نعلین پر مسح کر لو۔ تسمے کے نیچے ہاتھ مت لے جاؤ، اور اگر تم نے اپنے سر کے کچھ حصے کا اور پاؤں کے کچھ حصے کا مسح کر لیا تو یہ کافی ہے[1]!

یہ خبر سند متصل کے ساتھ امام ابو جعفر محمد الباقر تک جاتی ہے!

کیا یہ دونوں کتابیں ایک ہیں؟

ہمارا خیال یہ ہے کہ التہذیب اور الاستبصار در حقیقت ایک ہی کتاب سے عبارت ہیں اس لئے نہیں کہ ان کا مؤلف ایک ہے، بلکہ اس لئے کہ ان کتابوں میں سے ہر ایک دوسرے کے اندر دخیل ہے۔ گویا ایک دوسرے کا جزء ہے، کیونکہ الاستبصار میں وہی چیزیں ہیں جو التہذیب میں ہیں، اس لئے کہ التہذیب جملہ ابواب علم امامی پر مشتمل ہے اس میں جملہ اصول دینیہ و فروع فقہیہ موجود ہیں اور الاستبصار صرف فروع فقہیہ پر مشتمل ہے در حقیقت الاستبصار ان فروع میں التہذیب کا اختصار ہے اس لئے طوسی نے اپنے مقدمے میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے "الکتاب الکبیر" سے اخذ کیا ہے اور ان احکام فقہیہ کو لیا ہے جو ان اخبار سے مستمد ہیں جو ان کے مذہب کے مقتضی ہیں، اور جن اخبار کے ظواہر میں تعارض ہے ان کا موازنہ بھی کیا ہے اور جہاں توفیق ممکن ہوئی ہے توفیق سے کام لیا ہے اور اگر توفیق ممکن نہیں رہی تو من حیث السند موازنہ کیا ہے۔

---

[1] الاستبصار ج ۱ ص ۱۶ طبع دار الکتب الاسلامیہ نجف۔

اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ تھی کہ وہ علماء جمہور سے ربط و ضبط رکھتے تھے، وہ ایک ایسے بلند علمی منصب پر فائز تھے کہ طلاب مسلمین ان کی طرف جوق در جوق آتے تھے، وہ طائفی اور فرقہ وارانہ عصبیت سے دور تھے۔

اور اگر ہماری یہ تخریج صحیح ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ طوسی پہلے شخص ہیں جنہوں نے طائفہ اثناعشریہ اور جمہور مسلمین میں فکری و ذہنی توافق اور اتحاد پیدا کرنے کی سعی کی اور ان کے اس کارنامہ عظیم و جلیل پر ہم ان کی تحسین و سپاس سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتے۔

طوسی کے رجال پر بحث

جن لوگوں نے طوسی کی دونوں کتابوں پر تنقید کی ہے، انھوں نے تفصیل کے ساتھ ان رجال پر بحث کی ہے جو ان کی نظر میں ثقہ نہیں ہیں اسی طرح طوسی کے روایت کردہ اخبار پر بھی نقد کیا ہے اور اپنے نقطہ نظر سے ان کی کوتاہیاں بیان کی ہیں۔ ہم نقد اور ناقدین کو زیر بحث نہیں لاتے، البتہ تہذیب اور استبصار کی بعض روایات کو زیر نظر لائیں گے۔

(۱) التہذیب میں حنان بن سدیر کی روایت ہے کہ انہوں نے کہا:
مجھ کو ابو عبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:
ابن شبرمہ نے مجھ سے سوال کیا قسامت دم کے سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟
میں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل بتا دیا
ابن شبرمہ نے کہا:
"اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہ کیا ہوتا تو آپ کا ارشاد کیا ہوتا؟
میں نے ابن شبرمہ کو جواب دیا۔
نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کی میں نے تمہیں خبر دے دی، لیکن جو کچھ آپ نے نہیں کیا اس کا مجھے علم نہیں۔[۱]"

اس روایت میں طوسی نے سند کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف آخری راوی اور امام صادق کا ذکر کیا ہے شاید اسے بطور اجازہ انھوں نے کلینی سے لیا ہے۔ انھوں نے کلینی سے بہت زیادہ اخذ کیا ہے، اور کلینی سے جو اخذ کیا ہے وہ اس اعتبار سے کہ ان کے عہد میں اسے شہرت تھی، یا جس راوی

---

[۱] المستدرج ۱ ص ۱۴۔

الفہرست

ایک نہایت اہم اور معرکۃ الآراء کتاب

طوسی کے گراں بہا خدمات

ہم پر یہ واجب ہے کہ اس امر کا اعتراف کریں کہ شیخ طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے مذہب جعفری کے گراں مایہ اور بے بہا خدمات انجام دئے ہیں صرف اپنے بلند پایہ مطبوعات کے واسطے سے نہیں بلکہ ان رجال کا ذکر کر کے جن کے روایات پر معاملات دین و مذہب میں اعتماد کیا جاتا ہے، انھوں نے صرف ذکر رواۃ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جمیع رواۃ مذہب کا تذکرہ کیا ہے کیونکہ یہ رواۃ مذہب ان کے مشائخ میں داخل ہیں۔

انھوں نے سب سے پہلے اپنے مشائخ کا ذکر کیا ہے، ان کے بعد مشائخ مذہب کو زیر بحث لاتے ہیں۔ رجال کافی کا تذکرہ کیا ہے اور سابق العہد راویوں کا تذکرہ بھی کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان رجال کا ذکر بھی کیا ہے جنہوں نے انہیں اجازہ دیا ہے، نیز ان رجال کا جن پر ان کتابوں کی بنیاد ہے جن سے انھوں نے اخذ کیا ہے۔

یہ ساری چیزیں انھوں نے اپنی کتاب "الفہرست" میں مدون کر دی ہیں، ہمارے برادران امامیہ کے ہاں علم رجال پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے جس پر علماء و فقہاء امامیہ پورا پورا اعتماد کرتے ہیں، کیونکہ یہ کتاب لکھ کر انہوں نے ایک بہت بڑی ضرورت پوری کر دی ہے۔

اس کتاب کی بعض علماء نے شرح لکھی ہے، بہت سے بزرگوں نے اس کے ذیول قلمبند کئے ہیں اور ایک آدمی کے لئے اس سے بڑھ کر سرمایۂ شرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے ایک نیا راستہ کھول دے۔

طوسی کے محامد و کمالات

قبل اس کے کہ ہم طوسی کی کتابوں پر اظہار خیال کا سلسلہ بند کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم عظیم کے علمی پائے کا کھلے دل سے اعتراف کریں اور یہ اعتراف طائفیت اور مذہبیت سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر ہونا چاہئے۔ کیونکہ انسان کی قدر و منزلت، اس کے علمی کمال سے ہوتی ہے، نہ کہ اس کے افکار و آراء اور فرقے سے اور اس

بات کا خدا شاہد ہے کہ ہم نے مذہبی یا طائفی اختلافات کو اکابر رجال کے فضل و کمال میں مانع نہیں بننے دیا ہے گو ان کے بعض افکار و آراء سے اختلاف ہی کیوں نہ کیا ہو۔

شیخ طوسی نے اپنے دراسات متعارفہ سے مذہب جعفری کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے ان کی کتاب النہایہ اس مذہب کی فقہ کا گنجینہ ہے، نیز ان کی کتاب "العدۃ" ان کے منہاج استنباط کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے اور ان کی کتب "التہذیب" اور "الاستبصار" مذہب امامیہ کی اصلی کبیر ہیں۔

بنا بریں ہم صدق دل سے ان کے فضل و کمال کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

رسائل ابی المعالی کی ایک عبارت

رسائل ابی المعالی میں وارد ہے۔

کتب اصول اربعہ محدثین کے نزدیک اظہر من الشمس ہیں۔ ہم ان کتب اصول اربعہ کی سند بیان کرنے کے حاجت مند نہیں ہیں اگر ہم سند کا ذکر کسی جگہ کرتے ہیں تو ضرورۃً نہیں بلکہ تیمن اور تبرک کے لئے اور اقتدا و سنت سلف کے جذبے کے ماتحت![1]"

صفحات بالا میں ہم نے جو بحث و گفتگو کی ہے اس کا مدعا اور مقصد ان کتب اربعہ کے بارے میں کوئی ایسی رائے ظاہر کرنا نہیں ہے جو ان کی تنقیص کا سبب ہو، اسی طرح ہم ان کے بارے میں بھی یہی خیال رکھتے ہیں کہ کتب اہل سنت کے خلاف انھوں نے اگر کچھ کہا یا لکھا ہے تو ان کا مقصد و مدعا تنقیص نہیں ہے بلکہ علمی طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ہم نے اسناد رجال پر جو گفتگو کی ہے اس کا مقصد صرف بحث و گفتگو کا استیفاء ہے، ورنہ جہاں تک مسلک کا تعلق ہے، ہمارے برادران امامیہ اپنی رائے، منہاج اور کتب پر قائم ہیں اور ہم بھی اس طرح اسے اپنا حق سمجھتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ ہے جو دلوں کو جوڑتا ہے اور انہیں مودت، رحمت اور اخوت پر مجتمع کر دیتا ہے۔

---

[1] رسالہ لزوم نقد رجال "من لا یحضرہ الفقیہ"۔

الاجماع

ایک مختلف فیہ فقہی مسئلہ

اجماع کی حیثیت الکافی نے امام جعفر صادق سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا" اگر دو عادل راویوں کی روایت میں اختلاف ہو تو کون سی رائے اختیار کی جائے گی؟"

امام صادق نے جواب دیا۔

"یہ دیکھا جائے گا کہ ان دونوں روایتوں میں جو انھوں نے ہم سے روایت کی ہیں کونسی روایت تمہارے اصحاب کے نزدیک مجمع علیہ (اجماعی) ہے، بس اسی کو ہمارا حکم قرار دیا جائے گا! اور شاذ روایت جو تمہارے اصحاب میں مشہور نہ ہو ترک کر دی جائے گی، کیونکہ مجمع علیہ روایت میں شک نہیں ہوتا!"[1]

یہ نص امر مجمع علیہ کو اتنی قوت دیتی ہے کہ مخالف خبر کو رد کر دیتی ہے اور موافق خبر کو قبول کر لیتی ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امام صادق کی نگاہ میں اجماع استدلال میں ایک خاص مقام رکھتا ہے!

امام صادق کی نظر میں امور مجمع علیہا اصل اسلام ہیں کیونکہ اسی ذریعہ (اجماع) سے شرع میں امور متواترہ کا اثبات ہوتا ہے، نماز مفروضہ، اعداد رکعات، ہیئت، صلوٰۃ، ارکان نماز، حج، اور مناسک حج، زکوٰۃ اور اس کے انواع، یہ سب اجماعی امور ہیں۔ کعبہ اور اس کا مکان، قبلہ اور اس کا اشتراط روزہ اور اس کا وقت و زمانہ، شکل اور ارکان زکوٰۃ اور اس کے انواع و مقادیر، یہ سب اجماع مسلمین ہی سے ثابت ہیں، اجماع مسلمات ضروریہ میں سے ہے اس کا منکر کافر ہے جو اس میں شک کرے وہ دین سے خارج ہو جاتا ہے۔

---

[1] المسند ج ا ص ۲۰۔

اس صورت میں اجماع کو ثابت الاصل ماننے بغیر چارہ نہیں، اس کے وقوع سے انکار نہیں کیا جاسکتا!

امام شافعی اور اجماع

امام شافعی نے اجماع کو صرف اس صورت میں مانا ہے کہ وہ اصول فرائض مقررہ و ثابتہ نصوص قرآنیہ اور احادیث متواترہ سے متعلق ہو، چنانچہ ان مسائل میں بعض مذاہب کا اصول اجماع کو مقدم رکھنا ہے۔

کتب اثنا عشریہ میں بھی اجماع تقریباً اسی منہاج پر چلتا ہے وہ بھی نصوص میں کلام پر اجماع کو مقدم رکھتے ہیں، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اجماع عمل نصوص کو ختم کر دیتا ہے، جیسا بعض ناواقف دراسات اسلامیہ سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے معنی ہیں کہ ارکان اسلام کے یہ مسلمات و مقدرات ہر دلیل سے مسلح ہیں اور اب یہ کسی خاص دلیل کے محتاج نہیں ہیں، چنانچہ امام شافعی علوم اسلام کی دو قسمیں کرتے ہیں۔

(۱) علم عامہ

(۲) علم خاصہ

یعنی ایک علم (عامہ) تو وہ ہے جس کا جہل کسی مسلمان کے لئے روا نہیں، اور دوسرا (خاص) وہ علم جو استنباط و استدلال سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلام کے مسلمات اور مقررات علم عامہ کے تحت آتے ہیں ایک مسلمان کے لئے ان کا جہل جائز نہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مسلمان، مسلمان نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اجماع پر اس کا ایمان اور اس کے حکم پر اس کا اذعان نہ ہو، بہ صورت دیگر وہ کافر ہے۔

کیا اجماع دین میں حجت ہے؟

اجماع پر یہ ایک عام نظر تھی، یہ مقررات اسلامیہ میں سے ہے اب ہم دین میں اس کے حجت ہونے پر گفتگو کریں گے۔

مسلمانوں میں تین فرقے ہیں، جنہوں نے اجماع پر بحث و گفتگو کی ہے اور اسے اصلی دین مانا ہے البتہ ان کے مفہومات ضرور ایک دوسرے سے مختلف اور مغائر ہیں۔

(۱) اہل السنّت کا مسلک

پہلا فرقہ جمہور مسلمین کا ہے جو اہل السنت والجماعت کے نام سے موسوم و معروف ہے۔

اہل السنت والجماعت کے ہاں اجماع، حکم شرعی کے امور عملیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی مسئلے میں بھی مجتہدین ملت اسلامیہ کے اتفاق کا نام ہے۔

جمہور مسلمین کے ہاں فکری اجماع جس بنیاد پر قائم ہے وہ صحابہ کا عمل ہے جو مسائل میں اجتہاد کیا کرتے تھے جس پر نفاذ امر کے بعد سب لوگ اتفاق کر لیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ زیدیہ کے ہاں۔

: اجماع صرف احکام عملیہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں احکام اعتقادی بھی شامل ہیں۔

: امر اعتقادی پر اجماع امت یا اجماع عترت زیدیہ کے ہاں حجت ہے، چنانچہ "اللولویہ" میں وارد ہے۔

عملیات میں اجماع اسی طرح حجت قطعی ہے جس طرح نص معلوم"۔

یعنی جس اجماع کی سند متواتر ہو، اور اس کا وقوع قطعی طور پر ثابت ہو، وہ مفید علم یقینی ہے اس سے اعتقاد اس طرح ثابت ہو جاتا ہے جس طرح عملی حکم شرعی ثابت ہو جاتا ہے۔

کیا امامیہ کے ہاں اجماع حجت ہے؟ امامیہ میں اکثر لوگ اجماع کو حجت مانتے ہیں، ایسے لوگ شاذ و نادر ہیں جو کہتے ہیں کہ اجماع حجت نہیں ہے۔

امامیہ کے ہاں اجماع نام ہے "اتفاق جماعت کا اور یہ اتفاق جماعت امام معصوم کی رائے سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں ؛

(۱) اجماع اس جماعت کے اتفاق کا نام ہے جو امام معصوم کے وجود پر ایمان رکھتی ہو، اور امام معصوم کے وجود سے کوئی زمانہ بھی خالی نہیں ہے، خواہ ظاہر اور مشہور ہو یا مخفی اور مستور ہو، جیسا کہ علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے۔

(۲) اجماع صرف امامیہ تک مقصور اور محدود ہے، اگر غیر امامیہ کا اتفاق کسی مسئلے پر ہو جائے تو اسے اجماع نہیں کہا جائے گا۔

امامیہ کے ہاں اجماع صرف غیبت امام میں ہو سکتا ہے، اس کے حضور کی صورت میں وہ خود تنہا اپنے قول و عمل سے فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔

یہ بات کہ اجماع خاص ہے یا عام اور جو رائے امام کا مظہر ہو، اس کے ثبوت کے تین طریقے ہیں۔

(۱) "جب علماء امت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی قول پر مجتمع ہو جائیں تو وہ امام معصوم اور قائم کا قول ہوگا، کیونکہ وہی سردار امت ہے، پس جب کسی مسئلے پر اجماع امت ثابت ہو جائے تو رائے امام کی موافقت بھی ثابت ہو جائے گی۔

اس کے بعد عصر اجتہاد فقہی آیا، ہر امام کوشش کرتا تھا کہ ان اقوال سے روگردانی اختیار نہ کرے جو اس کے فقہاء اہل بلد کے ہاں رائج تھے چنانچہ مالک اجماع اہل مدینہ کو حجت مانتے تھے اور ابوحنیفہ اہل کوفہ کے ان آراء فقہی سے باہر نکلنا نہیں چاہتے تھے جن پر ان کا اجماع چلا آرہا تھا۔ فقہاء مجتہدین اس بات کی بھی کوشش کرتے تھے کہ جن مسائل پر صحابہ کا اجماع ہے ان سے باہر نہ جائیں۔

اس نقطہ نظر کے ماتحت آراء میں منع شدوذ کے لئے ان مسائل استنباطیہ میں اجماع حجت مانا جاتا تھا جو معاملات دین میں ضرورۃً معلوم اور ثابت تھے۔

زیدیہ کے ہاں اجماع کا مقام

(۲) زیدیہ کے ہاں اجماع وہ ہے جس پر کسی زمانے میں بھی علماء مجتہدین کا اتفاق ہو البتہ یہ خوارج کو اہل قبلہ میں سے نہیں مانتے لہٰذا انہیں اجتہاد کا حق بھی نہیں دیتے۔

زیدیہ کے ہاں اجماع دو طرح کا ہوتا ہے ایک اجماع عام، ایک اجماع خاص۔

اجماع عام فقہا اور مجتہدین کا ہوتا ہے اور اجماع خاص سے مراد اجماع عترت رسولؐ ہے۔ یعنی کسی مسئلے پر ان مجتہدین کا اتفاق جو عترت یعنی آل نبیؐ سے ہوں۔

"زیدیہ کے ہاں اجماع کی ایک تیسری صورت بھی ہے اور یہ تیسری صورت پہلی دونوں صورتوں سے اعلیٰ وارفع ہے اور یہ اجماع ہے جمیع امت کا اور یہ جملہ انواع استدلال پر مقدم ہے۔

زیدیہ کے ہاں اجماع عترت سے مراد اجماع اربعہ معصومین، پھر ارمعیت آباء اول دحسنین کا اجماع ہے۔

اربعہ معصومین سے مراد یہ ہیں:-

(۱) علی کرم اللہ وجہہ۔ (۲) فاطمۃ الزہرا سیدۃ النساء العالمین۔

(۳)(۴) جوانان جنت کے سردار حسن اور حسین!

زیدیہ کے ہاں یہ چاروں "اربعہ معصومین" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ کیا تو ارشاد خداوندی کے مطابق (فمن حآجك فيه من بعد ما جآءك من العلم فقل تعالوا ندع ابنآءنا وابنآءكم ونسآءنا ونسآءكم وانفسنا وانفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكاذبين) ان اربعہ کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔

کا معارض نہ ہو اور اگر معارض ہو گا تو پھر حق اس کے بیان ہی سے ظاہر ہو گا اور اجماع معتبر نہیں ہو گا۔

امامیہ نے یہ بات بھی فرض کر لی ہے کہ خواص اصحاب امام کی جماعت اگر کسی مسئلے پر متفق ہو جائے تو وہ امام کی رائے مانی جائے گی، کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنا وجود تفکیر امام میں گم کر دیا ہے اس کی منطق کو اپنا لیا ہے اس کے منہاج پر ان کی عقل استوار ہو گئی ہے، گویا امام کی روح ان کے اندر سرایت کر گئی ہے پس جب یہ کسی فکر پر مجتمع ہو جائیں گے تو یہ دراصل امام کی فکر ہو گی۔

ارکان اجماع

علماء مسلمین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اجماع اگر منعقد ہو جائے وہ حجت ہے لیکن اس کے امکان وقوع میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف ان امور میں ہے۔ جو مسلّمات و مقررات شریعت میں نہیں ہیں، ورنہ مسلّمات شریعت اسلامیہ میں اجماع کا تحقق بالاتفاق درست اور روا ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اتفاق مجتہدین کسی زمانے میں بھی کسی مسئلے پر غیر ممکن ہے کیونکہ مجتہدین مقامات دور دراز میں بکھرے ہوئے ہیں اور کسی ایک جگہ ان کی ملاقات ممکن نہیں بجز اس کے کہ کسی قطعی الدلالت نص پر اجماع مان لیا جائے جس کا ثبوت تواتر تک پہنچا ہوا ہو مثلاً پانچ وقت کی فرض نماز اور نماز پڑھنے کا طریقہ، استقبال قبلہ، حج، روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ امور ثابتہ لیکن یہ امور مقررات اسلام میں سے ہیں، اور اجتہاد و مجتہدین سے ماوراء کیونکہ یہ اسلام کے ایسے ستون ہیں جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے

پھر سوال یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہوں گے جن سے اجماع منعقد ہو گا؟ کیا وہ سب اہل عصر ہوں گے؟ یا ان اہل عصر میں سے صرف مجتہدین؟ اور مجتہدین کی معرفت کے حدود مرسومہ جملہ بلادِ اسلامیہ میں کیا ہیں؟

امام شافعی کی داستان مناظرہ

اس مبحث پر گفتگو کرتے ہوئے امام شافعی نے اپنے ایک حریف مقابل سے دوران مناظرہ میں جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔

: صحابہ کا اجماع فرائض میں بے شک واقع ہو گیا، جن سے کوئی بھی ناواقف نہیں ہے اس اجماع کا ہر شخص معترف ہے کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

: لیکن صحابہ کے بعد یہ بات بعید از تصور ہے کہ کامل طور پر اجماع منعقد ہو سکے۔

(۲) دوسرا طریقہ وہ ہے جسے طوسی نے اپنی کتاب "عدۃ الاصول" میں اختیار کیا ہے یعنی وہ بہ طریق تواتر ثابت ہو۔

(۳) یہ تیسرا طریقہ بعض متاخرین نے اختیار کیا ہے یعنی اجماع کو رائے امام کا بہر حال کاشف ہونا چاہئے اور اس کی صورت یہ ہے کہ رائے امام کا علم خواص جماعت کے فتوے سے بایں طور ممکن ہو کہ کوئی اس کا مخالف نہ ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ فرض کیجئے کسی فقیہ کے ثقہ اور عدول شاگرد ہیں اور یہ اپنے استاد کی رائے سے منحرف نہیں ہوتے، یہ کسی فتوے پر استاد کی طرف نسبت دئے بغیر متفق ہو جاتے ہیں اور اس اتفاق سے اختلاف کرنے والا کوئی نہیں تو علم غالب یہ ہوگا کہ یہ رائے ان شاگردوں کی نہیں ان کے استاد کی ہے!

"کسی فتوے پر جمیع اصحاب امام صادق مثلاً زرارہ بن اعین، محمد بن مسلم لیث المرادی یزید بن معاویہ العجلی اور فضیل بن یسار وغیرہ فضلا، ثقات و عدول متفق ہو جاتے ہیں اور ان کی مخالفت میں کوئی صدا، اصحاب صادق کی طرف سے بلند نہیں ہوتی، تو یہ فتویٰ امام کا فتویٰ مانا جائے گا جو اس کے اعتقاد کا مظہر ہوگا، یہ طریقہ وجدان پر مبنی ہے[1] اور معروف ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

امام فہم قرآن میں قطب کی حیثیت رکھتا ہے

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ جس محور پر امامیہ کے ہاں اسلامیات کا علم گردش کرتا ہے وہ امام کی ذات ہے امام فہم قرآن میں قطب (محور) کی حیثیت رکھتا ہے وہ سنت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل میں اصل ہے اس کا کلام بجائے خود سنت ہے اور اجماع اس لئے حجت ہے کہ وہ کشف رائے امام کا ایک ذریعہ ہے، اس لئے کہ یہ زمین کبھی بھی وجود امام سے خالی نہیں رہ سکتی اور جب صورت یہ ہے تو ناممکن ہے کہ امت اس کی رائے کے خلاف کسی رائے پر متفق ہو جائے کیونکہ امت اسلامیہ گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی اور کاشف گمراہی امام ہے اور اس پر واجب ہے کہ بہ وقت ضرورت صورت مسئلہ کی وضاحت اور تبلیغ کرے اور بیان کے موقع پر سکوت بیان کا قائم مقام ہے لہٰذا اگر امت کسی قول پر متفق ہو جائے تو وہ امام کا قول ہوگا، بشرطیکہ کوئی اس

---

[1] القوانین المحکمہ، طبع ایران۔

امام احمد بن حنبل بھی اجماع صحابہ کے قائل اور معترف ہیں، لیکن غیر صحابہ کے اجماع کو وہ بھی تسلیم نہیں کرتے، چنانچہ اگر کوئی شخص کسی مسئلہ معینہ میں اجماع کا دعویٰ کرتا تھا، تو وہ فرمایا کرتے تھے۔

"یوں کہو کہ مجھے اس میں کسی اختلاف کا علم نہیں!"

ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام احمد بن حنبل اجماع تسلیم کرتے تھے لیکن اجماع ناقص۔

زیدیہ کے نزدیک از روئے عقل صحابہ اور غیر صحابہ سب کا اجماع ممکن ہے۔

لیکن اس کا وقوع یعنی یہ بات کہ غیر صحابہ کا اجماع کبھی منعقد بھی ہوا، مسلمات مقررہ میں سے نہیں ہے، چنانچہ بعض حنابلہ نے اسے ماننے سے یکسر انکار کر دیا ہے، غرض بعض صرف اجماع صحابہ کے قائل ہیں۔ بعض صحابہ اور غیر صحابہ دونوں کا اجماع اصولی طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

امامیہ کا حجیّت اجماع پر اتفاق

لیکن شیعۂ امامیہ حجیت اجماع پر متفق ہیں اور اس کے امکانِ وقوع پر بھی متفق ہیں اور اس کے وقوع بالفعل کے بھی قائل ہیں، چنانچہ صاحب "القوانین المحکمہ" کا ارشاد ہے،

"ہمارے اصحاب اجماع کی حجیت اور اس کے وقوع پر متفق ہیں!"

فی الواقع اجماع خاصہ امام تو ایک امر ممکن ہے اور اس کے وقوع کا تصور کیا جا سکتا ہے اور امامیہ اس پر زیادہ تر اعتماد کرتے ہیں اور احکام مختلفہ کی بنیاد قائم کرتے ہیں۔

لیکن گروہی اور طائفی اجماع عملی طور پر قریب قریب ناممکن ہی ہے، جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا ہے۔

طائفہ کسی ایک جگہ نہیں بستا، اس کے افراد دور دراز مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں ایک بڑی جماعت ہندوستان میں ہے ایک اور بہت بڑی جماعت ایران میں ہے، عراق میں تو سمجھنا چاہیئے بہت زیادہ تعداد میں وہ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سوریا، لبنان وغیرہ دیگر بلاد اسلامی میں بھی پھیلے ہوئے ہیں یہ سب کس طرح ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں؟

لیکن امامیہ کے نزدیک قول فقیہہ پر بھی منعقد ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا مخالف کوئی قول نہ ہو، اس اعتبار سے ان کے ہاں اجماع کا وقوع متصوّر ہے۔

اقسام اجماع

فقہاء نے اجماع کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے، جو دراصل اس کے تین مراتب ہیں اور یہ ایسے مراتب یا اقسام ہیں جن سے متعلق کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔

۱/۱ اجماع صریح

یہ اجماع اگر واقعی واقع ہو جائے تو حجت قطعی ہے اس میں جملہ طوائف اسلامیہ کا اتفاق ہے اور اگر اختلاف ہے بھی تو یوں ہی سا۔

۲۔ **اجماع سکوتی** | یعنی کوئی عالم اور فقیہہ یا مجتہدین امت کی ایک جماعت ایک رائے کسی مسئلے میں قائم کرتی ہے اور یہ رائے ان کے عصر میں مشہور بھی ہو جاتی ہے اور اسے ایک مدت گزر جاتی ہے۔ مگر اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی اسے اجماع سکوتی کہیں گے۔

شافعی اجماع کی اس نوع کو حجت نہیں مانتے اس لئے کہ ساکت کا کوئی قول تو موجود نہیں ہے پس ہو سکتا ہے کہ یہ سکوت موافقت پر مبنی ہو یا عدم مصادفت پر۔

علماء اہلسنت کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ سکوتی اجماع بھی اجماع ہے۔ اس لئے کہ ضرورت بیان کے وقت سکوت بیان کا قائم مقام تصور کیا جائے گا۔ کیونکہ جملہ اہل فتویٰ کا نطق متعذر ہے۔ اور کسی مجتہد کے لئے یہ بات فرض نہیں کی جا سکتی کہ وہ ضرورت کے وقت اپنی رائے ظاہر نہ کرے اور خاموش رہ کر ایک فعل حرام کا ارتکاب کرے گا، کیونکہ عندالحاجت مجتہد کا مخالف رائے رکھتے ہوئے خاموش رہنا حرام ہے، لہٰذا اس کا سکوت مخالفت پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

ایک اور فریق ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہم اسے حجت مان لیں گے لیکن اجماع تسلیم نہیں کریں گے اس لئے کہ ارکانِ اجماع کا تحقق ثابت نہیں ہے، لیکن عدم وجود مخالفت کے باعث حجت تسلیم کریں گے۔

زیدیہ کے نزدیک — اجماع سکوتی اجماع ہے ان کے ہاں:

"سکوتی اجماع نص معلوم کی طرح عملیات میں حجت قطعی ہے اور قول، فعل یا سکوت مع الرضائے منعقد ہو جائے گا۔"[۱]

۳۔ **اجماع کی تیسری قسم** | یہ ہے کہ مثلاً کسی زمانے میں فقہاء کسی مسئلے پر چند راؤں میں منقسم ہو جائیں تو ان آراء کے علاوہ کسی رائے کے بطلان پر اجماع تصور کر لیا جائے گا مثلاً بھائیوں کی موجودگی میں میراثِ جد پر صحابہ کا اختلاف، بعض نے اسے تیسرے اور بعض نے چھٹے حصے کا وارث ٹھہرایا ہے اور بعض نے جد کو وارث ٹھہرایا ہے۔ بھائیوں اور بہنوں کو محروم کر دیا ہے۔ اس طرح جملہ فقہا توریث جد پر متفق ہو گئے ہیں۔ اب کوئی مجتہد یہ نہیں کہہ سکتا کہ جد وارث نہیں ہے کیونکہ اس کی وراثت پر اجماع منعقد ہو رہا ہے۔

بعض علماء نے اس نوع اجماع کو اجماع سکوتی ٹھہرایا ہے۔ یا کم از کم اس کے مرتبے میں لیکن بہرحال اسے اجماع صریح نہیں کہا جا سکتا۔

زیدیہ کے ہاں یہ اجماع ہے لیکن اجماع صریح سے کم رتبہ، چنانچہ "الفصول اللؤلؤیہ" میں وارد ہے۔

• اگر امت دو قولوں پر منقسم اور مختلف ہو جائے تو پھر تیسرا قول پیدا کرنا جائز نہیں ہے۔

اجماع کی ہر سہ انواع معتبر ہیں

اثنا عشریہ اجماع کی ان تینوں انواع کو معتبر مانتے ہیں، کیونکہ ان تینوں سے رائے امام منکشف ہوتی ہے

پہلی سے بایں طور کہ وہ صریح ہے کیونکہ اس کی بنیاد یہ ہے کہ اگر امت یا طائفہ قول واحد پر مجتمع ہو جائیں، تو ان کا یہ اجماع ضلالت اور گمراہی سے نہیں ہو سکتا، بصورت دیگر امام پر خواہ وہ ظاہر ہو یا باطن واجب ہے کہ وہ مسئلے کی وضاحت اور تبیین کرے، کیونکہ وہ ہدایت وارشاد کے لئے موجود ہے۔

دوسرے سے بایں طور کہ اگر کوئی قول مشہور ہو گیا اور اس کے خلاف کوئی قول سامنے نہیں آیا تو وہ معمول بہ بن جائے گا اور اسے مبنی بر ضلالت نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ مبنی بر ضلالت ہونے کی صورت میں امام خاموش نہیں رہ سکتا تھا، کیونکہ باطل کے نمودار ہوتے کی صورت میں حق کا بیان کرنے والا وہی ہے۔

اور جب طائفہ یا امت دو آراؤں میں منقسم ہو جائیں تو یہ ناممکن ہے کہ دونوں موجب ضلالت ہوں، ورنہ امام پر واجب ہے کہ وہ تبیین کرتا، لہٰذا ان دونوں میں سے ایک بہر حال صواب ہے اور ان دونوں کے مقابلے میں تیسرا قول گمراہی ہے، لہٰذا اسے بے تامل رد کر دیا جائے گا۔

اجماع کے ان انواع ثلٰثہ کے اخذ سے متعلق نصوص موجود ہیں۔

جہاں تک پہلی نوع کا تعلق ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔

دوسری نوع کے متعلق "القوانین المحکمہ" میں "عدۃ الاصول" سے نقل کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ "اگر طائفے میں کوئی قول ظہور پذیر ہوا اور اس کا مخالف کوئی قول نہ ہو اور ہمیں نہ صحت کا علم ہو نہ فساد کا، تو پہلا قول قطعی طور پر صحیح مانا جائے گا اور اسے امام معصوم کے موافق تسلیم کر لیا جائے گا کیونکہ امام معصوم کا قول مخالفت میں ہوتا تو ظاہر ہو گیا ہوتا۔

بلاشبہ یہ رائے اجماع سکوتی کے متعلق ہے۔

اجماع سکوتی کے قبول کی دو شرطیں ہیں:

(۱) صحت قول کی کوئی دلیل نہ ہو، کیونکہ اگر قرآن، سنت یا قول امام معصوم سے کوئی دلیل ہوتی تو حجت وہ دلیل قرار پاتی اور اجماع کو اس میں حجت نہ تسلیم کیا جاتا، کیونکہ قول امام معصوم مکشوف اور بین

ہے پھر اجماع کی حاجت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ اس قول کے فساد پر کوئی دلیل نہ ہو، کیونکہ اگر فساد پر کوئی دلیل موجود ہوتی تو اسے رائے امام کا کسی طرح بھی کاشف نہیں مانا جا سکتا تھا، کیونکہ امام معصوم باطل کی تائید نہیں کر سکتا۔

ایک سے زیادہ اقوال پر اجماع

اب رہی اجماع کی تیسری صورت، یعنی کسی ایک مسئلے پر کسی زمانے میں دو یا زیادہ اقوال پر اجماع اس کے بارے میں صاحبؒ "القوانین المحکمہ" فرماتے ہیں۔

"اگر امامیہ دو اقوال میں کسی مسئلے سے متعلق منقسم ہو جائیں تو اس میں تخییر کا اصول وجوب یا حرمت کے بارے میں جاری نہیں ہوگا، کیونکہ ان دونوں میں ایک قول بہر حال امام کا ہے ورنہ دونوں کو باطل ماننا پڑے گا اور اس صورت میں ظہور امام واجب ہوگا!"

بعض علماء امامیہ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ بیان حق کے لئے علماء عصر کافی ہیں ظہور امام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

امامیہ اس نوع اجماع کو "اجماع مرکب" اور پہلی دونوں انواع کو "اجماع بسیط" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

امامیہ اجماع کے لئے عصر واحد کی شرط نہیں عائد کرتے ان کے نزدیک ایک کے بجائے دو زمانے بھی ہو سکتے ہیں اس صورت میں اہل عصر زمانہ گم سابق سے منضم ہو جائیں گے۔

اجماع اور علم یقینی

اجماع علم یقینی کو مفید ہے، مفید ظن نہیں ہے اس لئے کہ اس کی بنیاد کشف قول امام مستور پر ہے اور وہ حجت قطعی ہے حجت ظنی نہیں ہے، البتہ اجماع سکوتی کو وہ ظنی مانتے ہیں، اسی طرح اجماع مرکب بھی ظنی ہے کسی ایسی دلیل کے اعتبار سے قطعی نہیں ہے جس سے ہر دو اقوال میں سے کسی ایک قول کا غلط ہونا ثابت ہو، اور اس احتمال کے ساتھ قطع و یقین کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی، پس اجماع قطعی صرف اجماع صریح ہے۔

سند اجماع

جمہور فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ اجماع کے لئے سند ضروری ہے اس لئے کہ اہل اجماع انشائے احکام نہیں کرتے، وہ استنباط کرتے اور وجوہ استنباط میں سے کسی پر متفق ہو جاتے ہیں، کیونکہ انشاء احکام شرع اللہ تعالیٰ کا کام ہے، اس کے سوا کوئی بھی اس کا مجاز نہیں ہے صحابہ کرام جن مسائل میں اجماع کرتے تھے تو سند کی جستجو ضرور کرتے تھے کہ اس پر اعتماد کر سکیں، چنانچہ میراث جدہ پر ان کا اعتماد مغیرہ بن شعبہ کی خبر پر تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ورثہ دلایا ہے اور مغیرہ کی تائید میں شاہد بھی مل گیا

جس نے وہی کہا جو مغیرہ نے کہا تھا۔

غرض جمہور فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ اجماع کے لئے سند واجب ہے زیدیہ کا مسلک بھی یہی ہے، چنانچہ الفصول اللولویہ میں وارد ہے۔

ہمارے ائمہ اور جمہور اس پر متفق ہیں کہ اجماع کی سند ضروری ہونی چاہئے، اور یہ سند متواتر اور قطعی ہونی چاہئے۔

زیدیہ اور جمہور کا اتفاق

زیدیہ اور جمہور اس امر پر بھی متفق ہیں کہ اجماع کو کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ سے مستند ہونا چاہئے۔

علاوہ ازیں زیدیہ اور جمہور اس بات پر بھی متفق ہیں کہ ثبوت اجماع کے لئے خبر آحاد کافی ہے فقہ زیدی کی کتاب "الاصول" میں اسے معلوم ومعروف کہا گیا ہے

جمہور فقہاء کا اس باب میں اختلاف ہے کہ قیاس اجماع کے لئے سند بن سکتا ہے۔ بعض فقہا اور علماء قیاس کو اجماع کی سند ماننے سے بالکل انکار کرتے ہیں، بعض بہ شرائط اسے سند مان بھی لیتے ہیں کیونکہ اگر کسی حکم پر اتفاق واقع ہو جائے، خواہ وہ قیاس پر مبنی کیوں نہ ہو تو یہ حجیت اجماع کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

فقہاء جمہور کا خیال ہے کہ اگر قیاس کی علت غیر منصوص علیہ یا ظاہر ہو اور مخفی نہ ہو بایں طور کہ اوصاف مختلفہ کے مابین اس کی معرفت تردید و تحری کی محتاج نہ ہو تو اسے مستند مان لیا جائے گا۔

امامیہ کے ہاں اجماع کے لئے سند ضروری ہے

اب اگر ہم امامیہ کے مسلک کی ٹوہ لگائیں تو معلوم ہو گا کہ ان کے ہاں اجماع کے لئے سند ایک ضروری اور لازمی چیز ہے۔ کیونکہ جو لوگ اجماع پر تکیہ کرتے ہیں خواہ وہ مرکب ہو یا غیر مرکب اجتہاد کرتے ہیں اور مجتہدین سے ثابت تسلیم کرتے ہیں، جب وہ کسی دلیل سے مشتق ہو۔

مجتہد اور غیر مجتہد کے مابین فرق یہ ہے کہ مجتہد صرف کسی اصل کی بنیاد پر بحث وگفتگو کرتا ہے لیکن اس کے فتوے اس اصل فقہی پر مبنی ہوتے ہیں جو اس کی نظر میں معتمد ہے، لیکن اگر کسی حکم پر اجماع کا استقرار ہو جائے تو وہ حجت بیّنہ اور برہان مستقیم ہے، کیونکہ وہ رائے امام کو منکشف کرتا ہے۔

چنانچہ صاحب قوانین نے اس مسئلے پر کئی مثالیں پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

اگر تم یہ کہو کہ مجتہدین کا جب اجماع کسی حکم پر ہو جاتا ہے تو بے دلیل ہوتا ہے تو یہ

تمہاری زیادتی ہوگی اگر تم یہ کہتے ہو کہ ان کی دلیل اجماع تو نہیں آیت یا عقل وغیرہ ہے تو اگر سچے ہو تو اپنا قول ثابت کرو، ورنہ تسلیم کر لو کہ دلیل اجماع ہی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جمیع مصار میں علماء کا مدار اس پر اجماع رہا ہے بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ مسائل اجماع میں سے کوئی بھی مسئلہ کتاب و سنت سے بغیر انضمام اجماع ثابت نہیں ہو سکتا خواہ وہ اجماع بسیط ہو یا مرکب[1]۔

اس سے دو امر ثابت ہوتے ہیں:

(۱) اجماع کے لئے کتاب یا سنت میں سے کسی کی سند ضروری ہے۔

(۲) اجماع بذاتہ حجت ہے، بغیر اس کی اصل کو ٹٹولے ہوئے جمہور فقہاء کا مسلک یہی ہے۔

صاحب "القوانین" کا ارشاد | اس مسئلے پر بحث و گفتگو کرتے ہوئے صاحب "القوانین المحکمہ" کہتے ہیں۔

"بعض علماء اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ قرین انصاف یہ ہے کہ مان لیا جائے کہ عہد صحابہ کے سوا کسی اور زمانے میں معرفت حصول اجماع کا کوئی طریقہ نہیں ہے ایسے مومنین بہت کم ہیں جو اس کے سرّ معرفت سے تفصیلی طور پر واقف ہوں!"

آگے چل کر موصوف نے جو مزید تصریحات کی ہیں، ان سے چند امور مستفاد اور واضح ہوتے ہیں جو یہ ہیں!

۱۔ سند اجماع عقل بھی ہو سکتی ہے | اگر اجماع حسن ذاتی یا قبح ذاتی پر مبنی ہو یا تخریج یا استنباط کے ماتحت ہو یا ایسی تفریع واضح المأخذ پر اس کی بنا ہو جس پر جماہیر علما کا اتفاق مسافت دور دراز کے باوجود ہو، تو ایسے اجماع کی سند عقلی بھی مانی جا سکتی ہے۔

۲۔ تفریع و استنباط اور تخریج جائز ہے | اگر وہ نصوص پر مبنی ہو اور اگر اس تخریج پر اتفاق کامل ہو تو اجماع متصور ہو گا۔

---

[1] اجماع بسیط سے مراد، اجماع صریح اور اجماع سکوتی ہے اور اجماع مرکب سے مراد وہ اجماع ہے کہ اگر فقہاء دو قول پر تقسیم ہو کر رہ جائیں تو ان دونوں اقوال سے خروج نہ کیا جائے۔ (رئیس احمد جعفری)

• القوانین المحکمہ میں خبرِ آحاد سے ثابت ہونے والے اجماع کی حجیّت تسلیم کی گئی ہے اور اسے صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

"جو اجماع خبرِ واحد سے منقول ہو اس کی حجیت تسلیم کی جاتی ہے، کیوں کہ خبرِ واحد حجیّت ہے، کیوں کہ خبرِ عادل پر علماء کا اجماع ہے کہ وہ التزام پر دلالت کرتا ہے۔ اگر وہ امام معصوم کے قول سے نقل اور تقریر پر منقول ہو، جن سے اس کے اعتقاد کا کشف ہوتا ہے!"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اجماع اخبارِ آحاد کے علم کا ایک طریقہ ہے اور مذہب جعفری کے مقتضا کے مطابق مفید ظن ہے، جیسا کہ مذاہب اسلامیہ عامہ میں ہے، اس کی مخالفت ظاہریہ کے سوا کسی نے نہیں کی ہے۔

اجماع مشاہدے اور تواتر سے ثابت ہوتا ہے

اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اجماع شاہدے اور تواتر سے ثابت ہوتا ہے۔

نیز خبرِ آحاد اور کتب سے ثابت ہو جاتا ہے۔

اور ان طرائق میں سے ہر طریقہ مرتبۂ قوت و اثبات پر فائز ہے۔

زیدیہ کے ہاں بھی اجماع کے طرق ثبوت کئی مراتب کے حامل ہیں، جو مذکورہ مراتب سے قریب قریب ہیں، یا موافق ہیں۔

زیدیہ کے مراتب قبول:

۱۔ مرتبہ اولیٰ یہ ہے کہ اجماع مشاہدے سے ثابت ہو، اور یہ ان امور میں متحقق ہوتا ہے جن پر سلف اور خلف کا اجماع ہے۔

یہ اجماع دین میں بالضرورت مانا جاتا ہے، اس اجماع کے موضوع سے حقائق اسلامیہ کی تمیز ہوتی ہے۔

۲۔ مرتبۂ ثانیہ یعنی جو اجماع ساری امت سے قولی یا فعلی طور پر منقول ہو، بایں طور کہ جمیع مسلمین خبرِ اجماع کے تواتر پر متفق ہوں۔

یہ مرتبے میں پہلے کی طرح ہے، اس کا تواتر اس طرح ہے جیسے کوئی چیز مشاہدے اور

۳۔ اجماع سکوتی منعقد ہو جاتا ہے | اور اس کے خلاف کوئی روایت نہ ہو اور مسئلہ مجمع علیہ قبل از اجماع بار بار تکرار کے ساتھ زیر بحث آ چکا ہو۔

۴۔ اجماعات سابقین کی معرفت | ان کتابوں سے بھی حاصل ہو جاتی ہے جو مدون ہو چکی ہیں، اس کی توضیح علماء اثنا عشریہ کر چکے ہیں۔ یعنی علماء انہیں پشت ہا پشت سے پڑھتے اور قبول کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی شہرت دلیل ہے ان کی صحت نقل کی اور جب تک وہ صحیح النقل ہیں ان سے اجماع بسیطہ یا مرکب کی معرفت ممکن ہے۔ لیکن اگر علماء کا قول دو یا تین اقوال میں مختلف اور منقسم ہو کر رہ گیا ہو تو اب مزید چوتھا قول نہیں پیدا کیا جا سکتا۔

اور اجماع بسیط خواہ وہ اجماع سکوتی ہو یا صریح بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اسے امام معصوم کا اتفاق حاصل ہے۔

اور اجماع مرکب اس بات کی دلیل ہے کہ رائے امام اُن امور مترددہ کے مابین محصور ہے۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک سے متفق نہ ہوتا اور کوئی دوسرا قول اس کے اتفاق و تائید کا حامل ہوتا تو اس پر واجب تھا کہ اس کی وضاحت اور تبیین کرتا اور پردۂ غیب سے ظاہر ہو جاتا، تاکہ ہدایت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دے۔

اجماع سابقین کا اثبات کس طرح ہوتا ہے؟ | اس کلام سے واضح ہوتا ہے کہ اجماع سابقین کے اثبات کے تین طریقے ہیں:-

(۱) جماہیر مسلمین و اثنا عشریہ کے مابین خواص اور عوام کا اجماع پر تواتر۔
اس صورت میں مدلول اجماع قطعی مانا جائے گا اور اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) اجماع علماء کے مابین تواتر سے ثابت ہو۔
یہ اجماع بھی قطعی ہے اور اس میں کسی طرح کے شک و ریب کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ تکذیب تواتر قطعاً ناممکن ہے، جس کا علم ضروری ہوتا ہے اور اگر نظری ہو تو بھی وہ باب قطعیۂ علمیہ میں سے ہے اور عامہ کے نزدیک متواتر سے کم نہیں ہے۔

(۳) ظنی قطعی سے مناظر ہوتا ہے اور وہ بہ طریق قرائن کتب کی طرح بغیر تواتر کے مروی نہیں ہوتا خواہ اخبار آحاد کے قرائن کے ساتھ مصحوب ہوں یا نہ ہوں۔

معاینے سے ثابت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ علماء کہتے ہیں کہ یہ تواتر علم ضروری کو مفید ہے جیسے محسوسات کا علم، چنانچہ اپنے موضوع کے اثبات میں محتاج نظر واستدلال نہیں ہے۔

۳- تواتر کے ساتھ نقل | امت کا ایک حصہ تواتر کے ساتھ اسے نقل کرے، باقی لوگ خاموش رہیں، لیکن تعارض نہ کریں!

یہ مرتبہ پہلے دونوں مرتبوں سے کم ہے اگرچہ وجود تواتر کے باعث مفید علم قطعی ہے۔

۴- جس حکم پر اجماع ہو اس کا اعلان ہو چکا ہو اور ورود اجماع کا انکار کسی نے نہ کیا ہو۔

۵- یہ کہ اجماع خبراً حاد سے ثابت ہو لیکن مشہور نہ ہو اور اس کا اعلان نہ ہوا ہو۔

العقل

فقہ امامیہ کی ایک نادر اور یگانہ خصوصیت

نسبت استنباط کا حکم

نسبت استنباط حکم کا جہاں تک تعلق ہے۔ امامیہ کے دو فریق ہیں :-

ایک فریق وہ ہے جو نصوص مرویہ از ائمہ پر توقف کرتا ہے اور اس حد سے باہر قدم نہیں نکالتا، یہ لوگ "واقفیہ" کہلاتے ہیں، کیونکہ مرویات از ائمہ سے ماورا نہیں جاتے۔

دوسرا فریق اصولیوں کا ہے جو اجتہاد اور استنباط سے کام لیتے ہیں، یہ نزد اخبار توقف نہیں کرتے بلکہ اس پر بنیاد قائم کرتے ہیں اور جہاں نص نہ ہو اجتہاد سے کام لیتے ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ اصل اصول کتاب و سنت ہے، ان کے نزدیک سنت میں ائمہ معصومین کے اقوال، افعال اور تقریرات اسی طرح داخل ہیں جس طرح سنت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات معتبر ہیں

اصولیوں کے ہاں سنت کے بعد اجماع کا درجہ ہے جو ان مسائل میں منعقد ہوتا ہے جو فرائض میں سے نہ ہوں کیونکہ وہ پہلے ہی سے متفق علیہ ہیں اور جن کا دین میں علم ضروری حاصل ہے استنباط فقہی میں عقل کا آخری درجہ ہے۔

برادران امامیہ کے ہاں حکم عقل کو مقام خاص حاصل ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ یہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا مذہب ہے، جہاں کتاب و سنت اور اجماع سے دلیل نہ ہو وہاں عقل دلیل کا کام دیتی ہے۔

عقل کے دو مرتبے

احکام شرعیہ کی نسبت سے عقل کے دو مرتبے ہیں۔

(۱) مرتبہ اولیٰ

قضایا میں عقل کا حکم قطعی ہے، مثلاً معرفت اللہ تعالیٰ اور معجزے سے نبوت کا اثبات اور صدق معجزہ اور رسالت پر دلالت۔

حکم قطعی کا یہ مرتبہ خطاب اسلامی کی اساس ہے کیونکہ یہی اللہ اور رسول ؐ پر ایمان کی اساس

کی طلب کی جائے اور قبیح کو ترک کر دیا جائے!

(۲) کتاب و سنت اور اجماع کے لائے ہوئے پر تخریج، اس میں بعض قیاسات بھی داخل ہیں جو ان کی علّت ثابت کرتے اور ان کے طریق کو مستقیم کرتے ہیں۔

عقل ہی حسن و قبیح کا حکم رکھتی ہے

امر اول کے بارے میں امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ عقل ہی اشیاء کے حسن و قبیح کا حکم لگاتی ہے اور صاحب "القوانین المحکمہ" نے تصریح کی ہے کہ عقلاء اس بات پر متفق ہیں کہ اشیاء کا حسن بھی ذاتی ہوتا ہے اور قبیح بھی ذاتی ہوتا ہے لہٰذا عقل ہی مستحسن کا حکم دیتی اور قبیح سے باز رکھتی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

"جن معاملات میں عقل مستقل اور منفرد ہے، وہ فرض ادا کرنے کا وجوب، امانت کی واپسی، ظلم کی حرمت استحباب احسان وغیرہ ہیں، ان معاملات میں عقل حکم شرع کی دلیل ہے اور اکثر عقلاء مذاہب مختلفہ، حکماء، براہمہ، ملاحدہ، ادلہ قاطعہ اور براہین ساطعہ کی روشنی میں ان سے متفق ہیں، بلکہ یہ اتفاق مبنی ہے، ضرورت وجدانیہ پر جس کا معارضہ شبہہ و ریب نہیں کر سکتے، کیونکہ عقل مستحسن اور قبیح کا ادراک بایں طور کرتی ہے کہ بعض افعال کا کرنے والا فاعل ہونے کی حیثیت سے مستحق مدح ہے اور بعض افعال کا کرنے والا فاعل کی حیثیت سے مستحق ذم ہے[1]!"

اشیاء کی تقسیم سہ گانہ

اس کے بعد فاضل موصوف نے حسن و قبیح کی نسبت سے اشیاء کی تقسیم تین قسموں پر کی ہے۔

(۱) وہ اشیاء جو بذاتہٖ حسن ہیں، جن کے ترک کا شرع حکم نہیں دے سکتی، یہ حسن ذاتی کہلاتا ہے۔

(۲) وہ اشیا جو بذاتہٖ قبیح ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ شارع ان کے ارتکاب کا حکم دے اور کوئی عاقل ان کے ارتکاب کو مقدم نہیں رکھ سکتا، کیونکہ یہ تمام لوگوں کے نزدیک موضع ذم ہیں۔

(۳) وہ اشیاء جن میں حسن و قبح نسبتی ہے۔

مثلاً قتال۔ قتال مستحسن ہے اگر اعداء کے مقابلے میں ہو اور قبیح ہے اگر امت اسلامیہ میں خانہ جنگی کی صورت اختیار کرے۔

یا بعض مباح چیزوں کا استعمال کہ اگر ان کے استعمال سے ضرر پہنچتا ہے تو ان کا استعمال قبیح ہے

---

[1] القوانین المحکمہ

ہے(۱) اگر حقائق اشیا اور بدیہیات میں قضا یائے عقلی نہ ہوتے تو تسلیم رسالت اور اذعان احکام کی صورت بھی نہ ہوتی، نہ کفر پر اور تبلیغ کے بعد سرکشی پر اور قیام برہان و استقامت استدلال کے بعد کسی طرح کا مواخذہ روا ہوتا۔

۲- مرتبہ ثانیہ

اس کی تکوین ثبوت رسالت اور تصدیق و اذعان اور تعرف احکام کے بعد ہوتی ہے، یہ مرتبہ کتاب و سنت اور اجماع سے کم ہے، کیونکہ عقل صرف وہیں احکام عملیہ سے متعلق تکلیف شرعی کی دلیل فقہی ہے جب اس کے سوا کوئی دلیل نہ ہو۔

اور یہ مرتب یعنی تکلیفات شرعیہ عملیہ میں عقل کا حکم اس وقت وجود میں آتا ہے جب خطاب شرعی وجود پذیر ہو چکا ہو، یہی وجہ ہے کہ معرفت احکام پر سبق رسالت لابدی اور ضروری ہے۔

چنانچہ الشیخ المفید اپنی کتاب "اوائل المقالات" میں تحریر فرماتے ہیں،

امامیہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ عقل اپنے علم و نتائج میں سمع کی محتاج ہے اس باب میں اصحاب حدیث بھی امامیہ سے متفق ہیں۔ البتہ معتزلہ، خوارج اور زیدیہ کا اجماع اس کے خلاف ہے، ان کا خیال ہے کہ سمع و توقیف کے ساتھ عقول کا کام شروع ہو جاتا ہے، سوا بغداد کے معتزلہ کے جو رسالت کو اوّل تکلیف میں واجب گردانتے ہیں[1]!"

اس کلام سے مستفاد ہوتا ہے کہ بغیر تنبیہ شرعی کے عقل حکم تکلیفی کا ادراک نہیں کر سکتی؛ معتزلہ اس رائے کے مخالف ہیں کیونکہ ان کا — سوا اہل بغداد کے — اس باب میں مسلک یہ ہے کہ وہ عقل ہی ہے جو تکلیف شرعی کا ادراک کرتی ہے اور مطلوب و غیر مطلوب کا بیان کرتی ہے اور اگر شرع تنبیہ سابق نہ کرتی ہو تو عقل ہی تبیین کرتی اور زیادہ محکم و اقوم راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

طریق عقل کے دو منہاج

تعرف احکام میں معتزلہ طریق عقل کے دو منہاج قرار دیتے ہیں:-
(۱) شرع کے بعد منہاج عقل مجرد، جو بتاتا ہے کہ اچھا کیا ہے؟ اور برا کیا ہے؟ جو مستحسن ہوتا ہے، شرع اس کی طلب کا حکم دیتی ہے کیونکہ اوامر شرع صریح ہیں، یعنی مستحسن

---

[1] اوائل المقالات فی المذاہب المختار ص ۴۴-

اور اگر ان کا استعمال (کسی وجہ سے) ضروری اور لابدی ہے تو پھر یہ استعمال مستحسن ہے

اور جن امور میں نہ قبیح ذاتی ہے نہ حسن ذاتی ہے تو ان کا حسن و قبح امر شارع کا پابند ہوگا،
جس چیز کا شارع حکم دے گا وہ مستحسن ہے، جس سے منع کرے گا وہ قبیح ہے

اوامر عقلی ہی مطلوب ہیں

جیساکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا امامیہ اوامر عقلی کو مطلوب قرار دیتے ہیں اور منہیاتِ عقلی کو ممنوع اور متروک قرار دیتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک عقل بذاتہ آمر (حکم دینے والی) اور ناہی (روکنے والی) نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کی کاشف ہے، اور اسکے بعد رائے امام کی کاشف ہے جس کا مقام خدا و رسول کے امر و نہی کے بعد ہے۔

کسی امر میں جب عقل کاشف حکم شرع ہو تو اس پر اعتماد کے تین وجوہ ہیں۔

۱۔ شرع میں سب کچھ ہے

کوئی امر بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں شرع کے اندر حکم موجود نہ ہو، پس اوامر شارع عام ہیں جو اشیاء افعال اور اشخاص کو عام ہیں، ہر معاملے میں حکم خدا ہی کا ہے، پس اگر نصوص کتاب و سنت یا ماثورات و منقولات از امام معصوم موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ کا حکم واضح ہوگیا۔

اور اگر موجود نہ ہوں تو شارع نے ہمیں عقل کی صورت میں ہادی اور مرشد عطا فرمایا ہے، جو اللہ کے امر و نہی کو منکشف کرتی ہے اور شرع کی تنبیہ یہ ہے کہ مکلف مستحسن کا طالب ہو اور قبیح سے باز رہے،
پس جس چیز کا ادراک وہ عقل سے کرتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کا کشف کرتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے علم کا حکم دیا ہے

اور جہل سے روکا ہے، اور علم اس کے سوا کیا ہے کہ حقائق واوضاع اشیاء کے حسن و قبح کا عرفان ہو جائے اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے اس کی معرفت حاصل ہو جائے جس کا کشف عقل نے کیا ہو اور یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسئلے کا حکم نص یا اجماع سے معروف نہ ہو، پس اللہ تعالیٰ امر و نہی کے سلسلے میں اس چیز کی طرف رہنمائی فرما دیتا ہے جو اس نے عقل و ادراک کی صورت میں عطا کر رکھی ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نصوص میں عدل و احسان کا حکم دیا ہے

اور ہر اس چیز کا حکم دیا ہے جو ذاتی اعتبار سے مستحسن ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فحشاء اور منکر سے روکا ہے اور ہر اُس چیز سے روکا ہے جو ذاتی اعتبار سے قبیح ہو، جیساکہ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعرابی سے سوال کیا گیا۔

"تم محمدؐ پر ایمان کیوں لائے؟"

میں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ محمدؐ نے کہا ہو "یہ کر" اور عقل نے کہا ہو "یہ نہ کر" میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ محمدؐ نے کہا ہو کہ "یہ نہ کر" اور عقل نے کہا ہو "یہ کر"!

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء کا حسن و قبح ذاتی ہوتا ہے۔ اور مکلف مامور ہے کہ مستحسن کو اختیار کرے اور فعل قبیح سے رکا رہے، کیونکہ جب کوئی نص موجود نہ ہو تو عقل کا حکم منصوص کے حکم میں ہوگا کیونکہ وہ کاشف ہے، حکم شرع کا یا امام معصوم کا!

امامیہ کا منہاج

یہ ہے وہ منہاج جسے امامیہ نے اختیار کیا ہے اور جس کی نسبت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف کی ہے۔

یہ منہاج معتدل زیدیہ کے منہاج سے بالکل ہم آہنگ ہے، کیونکہ زیدیہ امور تکلیف میں عقل کو خاص منزلت دیتے ہیں۔ ان کے ہاں اعتبار اس کا ہے کہ اشیاء بذاتہٖ قبیح یا حسن ہوتی اور نصوص سے کوئی دلیل نہ ہو تو عقل حکم شرع کی کاشف ہوتی ہے، اور عقل جلب مصلحت یا دفع مضرت کے لئے جو حکم لگاتی ہے، اس کی بنیاد امر و نہی پر ہوتی ہے، جہاں کہیں بھی مصلحت ہوگی عقل اُسے طلب کرنے اور اجتہاد کرنے کا حکم دے گی اور جہاں مضرت ہوگی عقل اس سے روکے گی۔

چنانچہ کتاب "الکاشف" میں وارد ہے:-

"جب کتاب، سنت، قیاس سے کوئی شرعی دلیل نہ ہو تو دلیل عقل کی مانی جائے گی۔

جب یہ ادلہ موجود نہ ہوں تو دلیل عقلی نافذ ہوگی یعنی از روئے حسن و قبح، جو کچھ بھی مستحسن یا قبیح ہو، غرض عقل پر عمل کی شرط عدم دلیل شرعی ہے![1]"

غرض حکم عقل پر عمل اس وقت ہوتا ہے جب نص سے کوئی دلیل نہ ہو، نہ نص پر عمل کرنے کا کوئی امکان خطر اور اباحت کی حیثیت سے ہو، چنانچہ وہ اشیاء میں اباحت اور خطر کو اصل نہیں مانتے بلکہ اباحت اور خطر کو مقدار مضرت و مصلحت کے مطابق مانتے ہیں، جو مصلحت ہے وہ مباح ہے جو مضر ہے وہ ممنوع ہے۔

چنانچہ "الفصول اللولویہ" میں وارد ہے:

"جاننا چاہیئے کہ اشیاء کی اصل میں اختلاف اس بات پر ہے کہ آیا وہ مباح ہیں؟

---

[1] الکاشف (قلمی نسخہ)

اکثر فقہا اور متکلمین کے نزدیک مختار پہلو یہ ہے کہ ہر وہ چیز، جو ضرر عاجل سے خالی ہو، اس کا حکم اباحت یعنی اذن (اور اذن کا مطلب ہے طلب) کا ہے، اس میں عقلاً کوئی قباحت نہیں ہے، یعنی مقتضائے عقل بھی ہے، مثلاً درخت کا قطع کرنا اور اس سے منتفع ہونا، چٹانوں کو کاٹنا تاکہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ استخراج معادن (کانوں کا کھودنا) اور اسی طرح کے دوسرے کام از روئے عقل مباح ہیں، ان میں کوئی ضرر نہیں ہے، نہ عاجل، نہ آجل![1]"

مذہب اثنا عشری میں عقل اشیاء کے حسن و قبح کا فیصلہ کرتی ہے، لہٰذا وہ اس مصلحت پر بھی نظر رکھتی ہے جو ان میں پوشیدہ ہے اور مضرت کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتی، جو ان سے وابستہ ہے، اگر اس کے نزدیک مضرت کو ترجیح دی ہے تو اس سے روک دیتی ہے اور مصلحت کو ترجیح تو حکم لگاتی ہے کہ یہی مطلوب ہے کیونکہ یہ بات ناممکن ہے کہ عقل مضرت کی طلب کرے اور منفعت سے روک دے، نہ عقل ایسی مصلحت کو تسلیم کر سکتی ہے جو امر شارع کی جنس سے باہر ہو یا نہی شارع میں داخل ہو۔

اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مذہب جعفری ایسی مصلحت پر عامل ہے جس کی تکوین اس جنس مصالح سے ہوتی ہے جس کا شارع اسلام نے حکم دیا ہے۔

مذہب جعفری اس باب میں مالکی مذہب سے بہت قریب ہے!

ان تصریحات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب جعفری اس فقہی رائے پر عامل ہے جو مدینہ کی تھی، کیونکہ اہل مدینہ کے نزدیک رائے مصلحت مجانسہ پر قائم ہے، بشرطیکہ وہ مرضی شارع سے مطابق ہو۔

لیکن عراق کی صورت اس کے برعکس تھی۔

عراق میں "رائے" کا مفہوم مدینے سے مختلف تھا۔ یہاں رائے سے قیاس مراد لیا جاتا تھا۔

اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے اور ان کے آباو کرام سے جو چیز ثابت ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اور ان کے اتباع نے منہاج مدینہ کا التزام کر رکھا

---

[1] الفصول اللولویہ (قلمی نسخہ)

تھا، جن کے نزدیک رائے کا مبنی بر مصلحت ہونا ضروری تھا (نہ کہ مبنی بر قیاس) اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ امام جعفر صادق کا شمار فقہا حجاز میں تھا نہ کہ فقہاء عراق میں۔

یہ دوسری بات ہے کہ حضرت امام عراق اور مدینے کی فقہ کے جامع تھے اور ان کے ادلہ اور اصولوں سے واقف تھے۔

مذاہب سہ گانہ

گزشتہ صفحات میں جن مذاہب کا ذکر ہوا ہے، ان کے مقابل میں تین مذاہب اور ہیں، جن کا مختصر سا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ مذہب معتزلہ

معتزلہ کے ہاں عقل ہی اشیاء کے حسن و قبح کا فیصلہ کر سکتی، اور ان پر حکم لگا سکتی ہے، وہی حلال و حرام کے بارے میں آخری اور قطعی بات کہہ سکتی ہے، اور اس کے حکم پر آخرت کا عقاب و ثواب بھی مرتب ہو سکتا ہے۔

اگر آں حضرتؐ مبعوث نہ ہوئے ہوتے اور آپؐ نے امور شرع کی وضاحت اور تبیین نہ فرمائی ہوتی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپؐ پر حلال و حرام کے مسائل و احکام نازل نہ کئے ہوتے تو بھی اصحاب فکر و دانش بمقتضائے حکم عقل مکلف ہوتے، نیکی پر اجر پاتے اور شر پر سزا سے دوچار ہوتے۔

اس طرح جو شخص ایسے دور دراز جزیرے میں ہوتا کہ لوگوں سے بالکل کٹا ہوا ہوتا، اسے شرع کا کوئی علم نہ ہوتا، نہ اس پر دین و مذہب کی تبلیغ کی گئی ہوتی تو بھی بمقتضائے حکم عقل وہ مکلف قرار دیا جاتا۔

یہ قول زیدیہ اور امامیہ کی طرف بھی منسوب ہے لیکن یہ انتساب غلط ہے۔

زیدیہ اور امامیہ کے مذہب کی حقیقت ان صفحات میں زیر بحث لائی جا چکی ہے جو انہی کی کتابوں سے ماخوذ تھی اور انہی کے موارد اور مصادر کو پیش نظر رکھ کر زیر بحث لائی گئی تھی، ان چیزوں کی روشنی میں یہ بات نا سزا ہے کہ امام زید اور ان کے ابن اخی جعفر صادق رضی اللہ عنہما وعن آبائہما الکرام کی طرف اس قول کو نسبت دی جائے۔

۲۔ دوسری رائے ماتریدی کی

یہ ابو منصور ماتریدی کی رائے ہے، جو فقہا حنفیہ کی رائے بھی ہے۔

اس رائے کے مطابق عقل اشیاء کے حسن و قبح کا حکم لگاتی ہے اور مستحسن مطلوب اور ماذون فیہ ہے اور قبیح ممنوع اور منہی عنہا اور غیر ماذون ہے۔

لیکن شرع ہی کو اصل حق طلب و نہی کا حکم دینے کا ہے بشرطیکہ اس سے دلیل پائی جاتی ہو۔

اور اگر صورت اس کے برعکس ہو یعنی طلب سے متعلق ادراک دریہ مستحیل ہے کہ اللہ بندوں کو بیل ہی

چھوڑ دے، کوئی دلیل نہ ہو تب عقل آگے بڑھے گی اور اپنا فیصلہ صادر کرے گی۔
مگر اس صورت میں عقاب کا سوال نہیں پیدا ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا، (ہم عذاب نہیں نازل کرتے جب تک رسول کو مبعوث نہ کرلیں)
ماتریدی شاید ثواب کے تو قائل ہیں لیکن عقاب کو تسلیم نہیں کرتے۔

۳۔ تیسری رائے اشاعرہ اور محدثین کی ہے | اس رائے کے مطابق اشیاء بذاتہٖ نہ حسن ہیں نہ قبیح، بلکہ حسن وقبح کا عرفان امر شارع سے ہوتا ہے
شرع نے جس چیز کا حکم دیا، وہ حسن ہے، اور جس چیز سے منع کیا وہ قبیح ہے۔
کیونکہ جس نے یہ ساری کائنات پیدا کی ہے۔ وہی اور صرف وہی اس کے خیر و شر کا راز داں ہوسکتا ہے۔ وہی اور صرف وہی اس کے نفع و ضرر کا عالم ہوسکتا ہے۔ صرف وہی ہے جو منفعت کا انکشاف اپنے امر سے اور مضرت کا اپنی نہی سے فرماتا ہے۔

تلخیص آراء | نظر عقلی کی نسبت سے تکلیف بالفعل کی تلخیص آراء کے بعد ہمیں دو مذاہب نظر آتے ہیں۔
(۱) یہ کہ عقل ہی اشیاء کے حسن و قبح کا حکم لگاتی ہے۔
نیز یہ کہ اشیاء میں نہ ذاتی حسن ہے نہ ذاتی قبح، بلکہ یہ حسن و قبح ایک نسبتی چیز ہے
(۲) اشیاء کے حسن و قبح کا عرفان عقل نہیں کرسکتی، جب تک من جانب شارع دلیل کاشف موجود نہ ہو جس کے تحت وہ حکم دے اور منع کرے

وجوہ اربعہ | اس رائے کی دلیل جس کے مطابق اشیاء میں عقل ہی حسن و قبح کی کاشف ہے چار وجوہ ہیں۔
(۱) بعض اعمال و اقوال ایسے ہیں کہ ایک عقلمند شخص انہیں کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے سوا اس کے لئے کوئی چارہ ہی نہیں، اور یہ فاعل سزاوار حمد بھی ہے۔ مثلاً صدق و عدل۔
اب تک کوئی شرع بھی ایسی نہیں آئی جس نے صدق و عدل کی مخالفت کی ہو۔
پس یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اشیاء (صدق وعدل) ذاتی طور پر مستحسن ہیں!

اسی طرح ایسے اقوال و افعال بھی ہیں جن کا ارتکاب کوئی عاقل نہیں کرسکتا، مثلاً کذب اور ظلم۔

جس شخص سے بھی کذب اور ظلم کا صدور ہوتا ہے، اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ شرائع بھی کذب و ظلم کے باعث عقاب پر متفق ہیں۔

پس یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اشیاء ذاتی اعتبار سے قبیح ہیں، اور ان حقائق ثابتہ سے انکار مکابرہ ہے، کیوں کہ علماء اور جہلاء دونوں ان حقائق کے مقر ہیں۔

(۲) یہ کہ اشیاء کے حسن و قبح کا علم ضروری ہے جو فطرت انسانی کے ساتھ پیوست ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مستقیم الجسم والعقل پیدا کیا ہے۔ لہٰذا امور حسنہ اور امور قبیحہ کا ادراک انسانی فطرت خود کر لیتی ہے، اس میں دین دار اور غیر دین دار کی کوئی تفریق نہیں بلکہ اس کے ادراک میں سب برابر ہیں، بھلا کون ایسا ہے جو کسی آدمی کو کسی دوسرے شخص کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہوئے دیکھے اور اس کے اس فعل کو مستحسن قرار دے؟ یا کوئی آدمی کسی کو چوری کرتے دیکھے اور اس کی تعریف کرنے لگے؟ یا انسان ظلم کرے اور ظلم کو مستحسن قرار دے؟

اگر عقل حسن و قبح کا ادراک نہ کر سکتی ہوتی تو تعطل پیدا ہو جاتا، اور انسان بے عمل ہو کر رہ جاتا۔ قرآن کریم نے اپنی محکم آیتوں میں مخلوقات اور ان کی عظمت اور فوائد پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

کیا اس کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ عقل اشیاء کے حسن و قبح کا ادراک نہیں کر سکتی؟

(۳) اگر یہ کہا جائے کہ وہ تو شارع ہے جو حسن و قبح کا فیصلہ کرتا ہے تو جائز ہوتا کہ اللہ تعالیٰ انہی چیزوں کا حکم دیتا جو مطابق عقل ہوتیں اور انہی چیزوں سے روکتا اور باز رکھتا جن سے اجتناب عقل کے مطابق ہوتا۔

لیکن یہ بات ذاتِ خداوندی کے لائق نہ تھی، کیونکہ قبیح فساد اور لغویت ہے، اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا، حسن نفع و مصلحت ہے اور خدائے رحمان و رحیم کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ اپنے بندوں کو ایسے کام سے روک دیتا جو نافع ہوتے

(۴) اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے احکام تکلیفیہ کی مضرت کے اسباب و علل بھی بیان فرمائے ہیں مثلاً: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

انما الخمر والمیسر والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون

(شراب، جوا اور پانسے شیطانی کام ہیں، ان سے اجتناب کرو تاکہ فلاح پاؤ)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرما دیا کہ وہ فحشاء کا حکم نہیں دے سکتا۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ !"

اللہ تعالیٰ فحشا (بے حیائی کے کام) کا حکم نہیں دیتا۔

: نیز اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے :

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ

(اے محمدؐ) کہہ دیجئے میرے رب نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے۔

اسی طرح اور بھی بہت سی دلیلیں ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عقل اشیاء کے حسن و قبح کا ادراک کر سکتی ہے !

امام شوکانی نے اپنی کتاب "ارشاد الفحول" میں جو رائے اس مسئلے پر ظاہر فرمائی ہے وہ بتمامہ ماتریدیہ اور حنفیہ کی رائے سے متفق اور ہم آہنگ ہے، جو کہتے ہیں کہ اشیاء کا حسن و قبح ذاتی اعتبار سے ہے اور عقل ان کے حسن و قبح کا فیصلہ کرتی ہے، وہ مستحسن کام کرنے والے کی تعریف کرتی ہے اور فعل قبیح کا ارتکاب کرنے والے کی مذمت کرتی ہے۔

لیکن آخرت میں ثواب و عقاب صرف رسالت اور تکلیف شرعی پر مبنی ہے، عقلی دلیل اور رسائی پر نہیں۔

دلائل کی تنقیح یہ ہیں دلائل ان لوگوں کے جو کہتے ہیں کہ بعض اشیاء کا حسن و قبح ذاتی ہے اور بعض کا حسن و قبح نسبتی ہے۔

پہلے کا حکم اللہ نے دیا ہے، اس پر ثواب مرتب ہوگا اور اس کا فاعل سزاوار تحسین ہوگا۔

دوسرے کا مرتکب اس لئے کہ وہ مذموم ہے، اس کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے اور قیامت کے دن اس کا کرنے والا سزا پائے گا۔

تیسرا حسن و قبح کے بین بین ہے

اگر ان میں حسن ہے تو وہ امر شارع سے ثابت ہے اور اگر قبح ہے تو بھی نہی شارع سے ثابت ہے

ہمارے خیال میں جو لوگ حکم شرعی نہ ہونے کی صورت میں معاملات تکلیفی میں حکم عقل کو آخری قرار دیتے ہیں بلا ریب وہ "خیالی" لوگ ہیں انہوں نے غلو سے کام لیا ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے۔

کوئی امت ایسی نہیں جس میں خدا نے کسی ڈرانے والے کو نہ بھیجا ہو۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو اجماع ونصوص کے بعد عقل کی سلطانی اور کارفرمائی کے قائل ہیں۔
وہ بھی ہیں جو جملہ ادلۂ شرعیہ میں اسے کارفرما سمجھتے ہیں۔
اور وہ بھی ہیں۔ اور یہ حنفیہ ہیں۔ جن کی رائے یہ ہے کہ عقل حسن وقبح کا حکم تو لگاتی ہے لیکن امور تکلیف کا حکم نہیں لگاتی جس پر ثواب وعقاب مرتب ہوتا ہے۔

شافعیہ اور جمہور فقہا کی رائے یہ ہے کہ اشیاء کا حسن وقبح ذاتی نہیں ہے، بلکہ اللہ کے امر ونہی کا پابہ ہے اور عقل کا کسی معاملے کا استحسان یا عدم استحسان ممکن نہیں صرف حکم عقل کا تابع ہو اگر عقل امور تکلیفی کے لئے کافی ہوتی تو خدا کی کیا ضرورت تھی کہ انبیاء اور رسل بھیجتا؟ پھر زمین پر آسمان کی طرف سے رسالت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ اشیاء میں جو ذاتی حسن نظر آتا ہے وہ واجب العمل ہے۔ اور جو ذاتی قبح نظر آتا ہے اس سے باز رہنا ضروری ہے تو یہ اللہ کی شان کا استخفاف ہے کیوں کہ وہ فعال لما یرید ہے جو چاہے کرے۔ "لا یسئل عما یفعل" جو کچھ بھی وہ کرے اس سے بازپرس نہیں کی جاسکتی۔

ان تمام تصریحات وبیانات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان مذاہب (از زیدیہ و امامیہ) میں اعتدال وتوسط کا مذہب حنفی مذہب ہے۔

حکم عقل رائے امام کا کاشف ہے

اس سے قبل ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ اگر نص نہ ہو تو حکم عقلی بعض کے نزدیک رائے امام کا کاشف ہے جس طرح اجماع اپنے مراتب میں رائے امام کا کشف کرتا ہے۔

اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے صاحب "القوانین المحکمہ" نے لکھا ہے۔
"عقل وشرع باہم مطابق ہیں جس چیز کا شرع حکم دیتی ہے اس کا عقل بھی حکم دیتی ہے اس طرح جس چیز سے شرع روکتی ہے عقل بھی روکتی ہے۔
کسی چیز میں تعیین حکم خاص پر مشتمل اگر شرع نے کوئی حکم دیا ہے اور عقل اس کی وجہ پر مطلع ہو جائے تو اس کی موافقت کرتی ہے، اس لئے کہ حکم عادل (خدا) نہ کسی فعل قبیح کا مرتکب ہوسکتا ہے نہ اس سے قبیح کا صدور ممکن ہے۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ، خمر اور خنزیر کے لئے تعیین تحریم، یہ چیزیں از جہت حسن وقبح ذاتی ہیں، یا یہ حسب زمان و

مکان" اور یہ جہت علّت تامہ ہے، اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اگر اطلاع عقول
اس علت کے لئے فرض کر لی جائے تو پھر ہمارا حکم بھی وہی ہے جو شارع پر واجب ہے۔
اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ جو حکم دیتا ہے وہ بندے کے امتحان کے لئے دیتا ہے
تو یہ بات بھی ہمارے مذکورہ بیان کے منافی نہیں ہے، کیونکہ نفس ابتلا بجائے خود
مصلحت ہے لہذا امر سے مراد محض بندے کا امتحان ہے جیسا کہ حکایت ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم
سے ثابت ہے۔ کیونکہ مصلحت امتحان تھی نہ کہ ذبح۔ بہرحال عقل اِفادۂ شارع کی تابع ہے یا اگر وہ طلب عقل پر من حیث عقل
مطلع ہو جائے تو اس کے حسن طلب کا حکم دیتی ہے اور من حیث الامتحان اس کی
طلب پر مطلع ہو جائے تو من حیث امتحان اس کے حسن طلب کا حکم لگاتی ہے۔ اس
طرح برعکس صورت میں یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ جب بھی عقل کوئی حکم لگاتی ہے تو حکم
شرع بھی اس کے موافق ہی ہوتا ہے۔"

"اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

: ایک تو یہ کہ حسن و قبح کا عقل جو حکم لگاتی ہے یا یہ لزوم عقل، اور عدم رضا کی صورت
میں ترک کا جو یا بہ صورت بالعکس عقل جو حکم لگاتی ہے، وہ شرع کا بھی فیصلہ ہوتا
ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شارع کے مطلوب و مراد پر دال ہے اور ہم اسے
کرنے پر مکلف (مجبور) ہیں یا نہ کرنے پر مکلف (مجبور) ہیں، اس صورت میں پہلی
صورت میں ہمیں ثواب ملے گا، اور دوسری صورت میں مستوجب عقاب ہوں گے۔

(۲) عقل کا جو حکم ہے، وہ خدا کی مراد اور اس کا مطلوب ہے، وہ چاہتا ہے کہ ہم
اسے کریں اور اس کا ترک ایک جرم ہے، کیونکہ وہ اللہ کے صادر کئے ہوئے احکام
سے موافق ہے۔

یہ بات اس اعتقاد پر مبنی ہے کہ ہر چیز کا حکم اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ
وسلم پر نازل ہو چکا ہے اور اس کا اکثر حصہ آپ سے ہم تک پہنچا چکے ہیں، باقی حصہ اہل
کے پاس مصلحت کی بنا پر مخزون ہے۔

پس یہ حکم عقلی اس حکم کا کشف کرنے والا ہے جو اہل کے پاس مخزون ہے جس
کا ادراک عقل نے کر لیا ہے۔

لیکن تقریر اول ہی زیادہ واضح اور اظہر ہے۔"[1]

---

[1] القوانین المحکمہ فی المقصد الرابع فی الادلۃ العقلیہ۔

اس سے یہ بات واضح اور مترشح ہوتی ہے کہ عقل اس امر میں قاضی ہے کہ کسی چیز کے حسن و قبح ذاتی کا فیصلہ کرے، جو شرع کے امر و نہی سے متفق ہو۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ عقل سلیم کسی حالت میں احکام شرعی کی مخالفت کر ہی نہیں سکتی؟ اور جب نص اور اجماع موجود نہ ہوں تو کیا عقل کا فیصلہ بالکل درست اور آخری ہوگا؟ کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ امر شرع کی مخالفت کرے اور اللہ تعالیٰ نے عقل کا حکم اس صورت میں تسلیم کرلیا ہے جب اس کے سوا کوئی دلیل نہ ہو ــ یہ معنی ہیں تقریر اول کے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس اعتبار سے عقل کو دلیل شرعی ماننا پڑے گا جو شارع کے احکام اور مرتبے کی تبیین کرنے والی ہے، اس صورت میں عقل نص اور اجماع کے بعد دلیل شرعی ہوگی جس سے شارع کے احکام اور ان کے مراتب کی وضاحت ہوتی ہے۔

اور تقریر ثانی کا مواد یہ ہے کہ عقل رائے امام کی کاشف ہے، بایں طور کہ شرع بعض ان چیزوں کو بیان کرتی ہے جو لسان نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جاری ہوئیں اور بعض ان چیزوں کی تبیین کرتی ہے جو ائمہ کے ہاں مخزون ہیں اور اس صورت میں عقل کا حکم اس مخزون کا کشف کرنے والا ہوگا، اس صورت میں عقل کی مثال وہی ہوگی جو اجماع کی ہے۔

بہر حال نتیجہ دونوں باتوں کا ایک ہی ہے، یعنی یہ کہ اگر نص نہ ہو اور اجماع بھی نہ ہو تو عقل کا حکم گویا شرعی ہے، یا تو اس لئے کہ عقل تقریر اول کے مطابق کسی امر مخالف شرع کا حکم دے ہی نہیں سکتی یا پھر وہ قول امام اور اس کے مخزون علم کی کاشف ہوگی، جیسا کہ تقریر ثانی سے واضح ہوتا ہے۔

صاحب "القوانین المحکمۃ" نے تقریر اول کو ترجیح دی ہے، کیونکہ فقہاء اثنا عشریہ کا مسلک یہ ہے کہ نصوص اور اجماع کے بعد عقل دلیل کی حیثیت رکھتی ہے

احکام کی تین قسمیں جو احکام عقل سے ثابت ہوتے ہیں امامیہ نے انہیں تین قسموں میں منقسم کیا ہے:-

(۱) ادراک حسن و قبح کے سلسلے میں عقل کو پایۂ مستقل حاصل ہے۔

(۲) دوسری قسم ـ اگر اللہ تعالیٰ کا مقصود ہو تو عقل حسن و قبح کا ادراک نہیں کرسکتی۔

(۳) تیسری قسم:- حسن و قبح کا تعلق ذاتی اعتبار سے نہیں ہوتا، یعنی نہ مستحسن بذاتہٖ کوئی چیز ہے

کیونکہ اس صورت میں بادی النظر میں وجہ مصلحت معلوم نہیں ہوتی، البتہ لابدی ہوتا ہے کہ صدق میں اصل نفع اور ضرر طاری کا موازنہ کیا جائے کہ ان دونوں میں زیادہ دوررس اثرات کس کے مترتب ہو سکتے ہیں؟

یہ ادراک صرف مقدار نفع اور مقدار ضرر کے مابین ترجیح و موازنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ادراک عقل کی تقسیم

تصریحات بالا کی روشنی میں ادراک عقل کو چار اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ایک قسم تو وہ ہے جسے واجب قرار دیا جا سکتا ہے۔
۲۔ دوسری قسم وہ ہے جو مندوب (مستحسن) ہے۔
۳۔ تیسری قسم وہ ہے جسے حرام قرار دیا گیا ہے۔
۴۔ اور چوتھی قسم وہ ہے جو مکروہ ہے۔

اب ان کی وضاحت ہم الگ الگ کرتے ہیں۔

قسم واجب کی تصریح

واجب وہ ہے جس کی منفعت از روئے عقل مؤکد ہو اور وہ اتنی واضح ہو کہ پھر اس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہ رہ جائے کیونکہ اگر اس میں مضرت کا ذرا سا شائبہ بھی رہ گیا تو پھر وہ واجب کی مصداق نہیں ہو سکتی۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء پیدا کی ہیں اور ان میں نفع کو ضرر کے ساتھ پیوست کر دیا ہے ان میں جو نفع ذاتی ہے وہ ضرر سے خالی نہیں ہے۔

چنانچہ اللہ تبارک تعالیٰ نے شراب اور جوئے کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس

یعنی، اے نبیؐ لوگ آپؐ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپؐ کہہ دیجیئے ان دونوں میں بہت زیادہ گناہ ہے اور (کچھ) منافع بھی لوگوں کے لئے ہیں۔

پس اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے جو سچوں کا سچا ہے ان دونوں چیزوں سے جو حد درجہ موجب معصیت ہیں نفع کی نفی نہیں کی، حالانکہ عقل و شرع دونوں اس پر متفق ہیں کہ شراب بذاتہ قبیح ہے۔

مندوب قسم کیا ہے؟

مندوب قسم وہ ہے جس میں وجہ مصلحت از روئے استدلال و نظر بیان کی گئی ہے، لیکن اتنی واضح نہیں کہ وہ وجوب کے لئے کافی ہو۔

یا قبیح اس کا تعلق زمان، مکان یا شخص سے ہوتا ہے، کیونکہ عقل کی اساس مصلحت ہے اور مصلحت ہر اعتبار سے واضح اور جلی ہوتی ہے پس اس کا حسن ذاتی ہے اور مضرت بھی واضح ہوتی ہے اور وہ ہر حالت میں ضرر رساں سی ہوتی ہے، مثلاً کسی ایسے آدمی کو قتل کر دینا جس کا قتل، اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے لیکن اس صورت کے برعکس مصلحت اختلاف اشخاص یا اختلاف ازمان سے مختلف ہو جاتی ہے۔

اس صورت میں حکم عقلی اختلاف وجہ مصلحت کا تابع ہوگا۔

اور وہ قسم جس میں عقل اپنے ادراک کے لحاظ سے مستقل ہے۔ ذاتی اعتبار سے بہت زیادہ مستحسن پہلو اپنے اندر رکھتی ہے۔ اسی طرح وہ قسم جس میں قبح اشیاء کی حیثیت ذاتی ہے۔ بہت سے قبیح پہلو اپنے اندر رکھتی ہے۔

اس طرح عقل کی دو قسمیں ہوئیں۔

عقل کی ایک قسم جو بغیر غور و فکر کے بداہتہً ادراک کر لیتی ہے مثلاً قرض کا ادا کرنا، امانت کا واپس کرنا، عدل کرنا، سچ بولنا، ظلم سے دور رہنا، کذب سے بچنا، خیانت کا ارتکاب نہ کرنا، فساد سے گریز کرنا اور اس طرح کی دوسری چیزیں۔

ان سب چیزوں میں عقل بدیہی طور پر جازم ہوتی ہے اور حسن ذاتی یا قبیح ذاتی کی ٹوہ نہیں لگاتی کیوں کہ ان سب باتوں میں مصلحت اجتماعیہ واضح ہے کیوں کہ عدل شریعت کا لب لباب اور انسانی سوسائٹی کا ستون ہے، صدق وہ چیز ہے جس پر قانون ثقہ کی بنا ہے، اس طرح امانت تعامل باہمی کا قانون مستقیم ہے۔

ایک قسم اور ہے!

اور اس قسم کا ادراک عقل صرف استدلال و نظر سے کر سکتی ہے:۔

یہ قسم وجوہ مصلحت کے مابین ترجیح پر مشتمل ہے!

مثلاً

: کذب کبھی نفع کا پہلو اپنے اندر رکھتا ہے:

: صدق میں کبھی مضرت کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

مثلاً قرض کا ادا کرنا، جب اسے ادا کرنے کی قدرت و استطاعت ہو۔ بشرطیکہ وہ موجل ہو یا امانت کا واپس کر دینا جب اس کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو، یا ظن غالب یہ ہو کہ اس کی محافظت نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں امانت کے واپس کرنے میں جلدی کرنا مندوب (مستحسن) ہے۔

وہ قسم جو حرام ہے

حرام میں وجہ ضرر اسی طرح واضح ہے جیسے شراب، زنا اور ظلم میں یا سؤر کا گوشت اور مردار اور خون جاری کے کھانے میں ہے۔ ان چیزوں کا عقل کو ادراک ہے کہ بلاشبہ یہ حرام ہیں:۔

اسی طرح بھنگ کہ عقل اس کی مضرت کو بداہتہً محسوس کر لیتی ہے (اس کے نشے کے باعث) کیونکہ یہ بھی شراب کی طرح ہے۔

لیکن تحریم قیاس سے ثابت نہیں ہو سکتی۔ صرف عقل ہی سے ثابت ہو سکتی ہے جو اشیاء میں مصلحت اور مضرت کا ادراک کر لیتی ہے، کیونکہ قبح ذاتی نظر و استدلال کے ذریعے محتاج معرفت نہیں ہوتا کیونکہ اس کے آثار محسوس اور واضح ہوتے ہیں۔

مکروہ قسم کا بیان

مکروہ وہ چیز ہے جس میں مضرت ہو۔ لیکن وہ مضرت پورے طور پر واضح نہ ہو۔

مثلاً ایسی چیزوں کا استعمال جن کے نفع میں تو شک ہے، لیکن ضرر نمایاں ہے، پس ایسی اشیاء کا استعمال مکروہ ہے، مگر شرط یہ ہے کہ یہ ضرر ان اشیاء کی طرح نہ ہو جن کا قبح ذاتی اعتبار سے ہے۔

اس تقسیم سے معلوم ہوا کہ واجبات مقدار کثرت نفع پر مبنی ہیں، جن چیزوں میں جتنا زیادہ نفع ہو گا اتنا ہی ان کے اندر وجوب کا پہلو بھی شدید ہو گا۔

اسی طرح مندوبات متفاوتہ کا حال ہے۔

حرام بھی متفاوت ہے۔

اگر ایک مومن بھوک سے قریب بہ مرگ ہو تو مردار کا کھا لینا اس پر واجب ہے، کیوں کہ اس کا ترک کر دینا ضرر شدید ہے۔

یہی کیفیت مکروہ کی ہے اس کے بھی مراتب متفاوت ہیں۔ اس کا اعلیٰ حرام سے قریب اور ادنیٰ حرام سے دور ہے۔

مقتضیات عقل اس سے ثابت ہوا کہ امامیہ کے ہاں، یہ احکام اربعہ یعنی وجوب، ندب، کراہت

اور تحریم عقل کے مقتضیات حکم میں سے ہیں۔

امامیہ حکم مباح کی عقل سے نفی کرتے ہیں کیونکہ اس میں نفع و ضرر کے پہلو مساوی ہوتے ہیں چنانچہ "القوانین المحکمۃ" میں وارد ہے!

"احکام اربعہ امامیہ کے ہاں متفق علیہ ہیں لیکن مباح عقلی متفق علیہ نہیں ہے۔ کیونکہ اباحت عقلیہ کا حکم اس بات پر مبنی ہے کہ مصلحت اور مفسدے کے اعتبار سے فعل و ترک مساوی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا!"

اس کلام مستقیم الفکر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں نفع و ضرر مساوی ہوں، یا نہ نفع ہو، نہ ضرر۔

کیونکہ محققین نے اشیاء کو حسن و قبح یا دوسرے الفاظ میں نفع و ضرر کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے، وہ کہتے ہیں اشیاء میں اگر ضرر غالب ہو گا تو وہ ممتنع ہیں اور یہ منع مقدار ضرر پر مبنی ہو گا۔

یا نفع غالب ہو گا، اس صورت میں اس کا طلب ضروری ہے اور طلب مقدار نفع پر مبنی ہو گا لیکن دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایسی نافع ہو کہ نفع محض کی حامل ہو، نہ ایسی کوئی چیز ہے جس میں نفع و ضرر یکساں ہوں!

لیکن طوفی نے اپنے رسالے "مصلحت" میں لکھا ہے کہ اشیاء کو چھ قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے،

۱۔ وہ چیزیں جن میں صرف نفع ہی نفع ہے، ۔ وہ واجب الفعل ہیں۔

۲۔ وہ چیزیں جن میں ضرر ہی ضرر ہے۔ ان کا ترک کر دینا واجب ہے۔

۳۔ وہ چیزیں جن میں نفع کا پہلو غالب ہے، یہ مندوب ہیں۔

۴۔ وہ چیزیں جن میں طلب مستحسن ہے۔

۵۔ یا وہ چیزیں جو مطلوب ہیں مگر علی وجہ الیقین نہیں۔

۶۔ وہ چیزیں جن میں نفع و ضرر مساوی ہیں۔ وہ مباح ہیں۔

طوفی کے یہ مفروضات گو منطقی ہیں لیکن ازروئے تطبیق غیر عملی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ ہم محسوس کرتے ہیں کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی ہے جو اپنے وجود میں خیر محض ہو

نہ ایسی کوئی پیدا کی ہے جو اپنے وجود میں شر محض ہو۔
خیر محض قیامت کے دن نعیم جنت میں مل سکتا ہے اور ضرر محض قیامت کے دن دوزخ میں لیکن جو وجود ہمارے سامنے ہیں ان میں نفع و ضرر ساتھ ساتھ پیوست ہیں، ان میں خیر و شر کا اختلاط ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزما سکے جیسا کہ فرماتا ہے
لیبلوکم ایکم احسن عملاً (تاکہ خدا تمہیں آزمائے کہ تم میں از روئے عمل کون بہتر ہے)

اس اساس پر وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز اس طرح پیدا کی ہے کہ وہ حسن و قبح سے مرتبط ہے، پس احکام شرعی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے مباح کہا جا سکے کیونکہ اباحت کی بنیاد مساوات نفع و ضرر پر ہے اور دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو مساوات نفع و ضرر کی حامل ہو۔
اگر اساس اعمال نیت ہے،
اور اعمال انسان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو نیت سے خالی ہو۔
یہ نیت یا تو تقرب الی اللہ کی ہو گی یا شیطان کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی پہلی چیز پر اجر ملے گا دوسری پر قیامت کے دن عذاب ہو گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
"اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق صلہ ملے گا، جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو گی تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لئے مانی جائے گی۔ جس کی ہجرت اس لئے ہو گی کہ کسی عورت سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اس کے لئے ہو گی جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہے۔"
اس سے ثابت ہوا کہ مباح کوئی چیز نہیں ہے!

اصول استنباط اور مصلحت اشیاء کے حسن و قبح کی اساس و بنیاد اور ان میں مصلحت و مضرت کے پہلوؤں پر گفتگو کر چکنے کے بعد ہم اس موضوع پر آتے ہیں کہ اصول استنباط میں فقہ جعفری کی اصل اخذ مصلحت ہے۔
جب کسی مسئلے میں قرآن، سنت اور اجماع سے کوئی چیز نہ ملے تو فقہا، علما، امامیہ اجتہاد سے کام لیں گے۔
اور یہ صورت بڑی حد تک فقہ مدنی کے اصول سے ہم آہنگ اور مطابق ہے۔ اگرچہ اسے وہ حکم عقل قرار دیتے ہیں۔

تخریج عقلی کی دو انواع فقہ امامی میں اس حکم کی جو عقل پر مبنی ہو تخریج عقلی کی دو انواع ہیں۔

(۱) ایک کی اساس اس پر ہے کہ عقل اشیاء کے حسن و قبح کے لحاظ سے حکم لگاتی ہے۔

(۲) اقوالِ ائمہ پر تخریجات

اب ہم امامیہ کے اسالیب تخریج پر گفتگو کریں گے اور دو امور کو خاص طور پر زیر بحث لائیں گے

(۱) استصحاب

(۲) قیاس ۔ وہ قیاس جسے امامیہ قبول کرتے یا رد کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہم طرق تخریج پر بحث و گفتگو کریں گے[1]!

---

[1] کتاب و سنت اور اجماع کے بعد عقل کو دلیل شرعی تسلیم کر لینا اگرچہ مبنی بر حقیقت طرز کار ہے لیکن کوئی شبہہ نہیں یہ بہت جرأت مندانہ اقدام ہے اور فقہ اثنا عشری کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے اور کوئی شبہہ نہیں اس خصوصیت میں وہ قطعاً منفرد اور یکتا ہے

حکم عقل کے مدارج اور مراحل کے سلسلے میں اختلاف ہو سکتا ہے، اور ہے بھی لیکن اس اختلاف کے باوجود مجموعی طور پر فیصلہ یہی ہے کہ عقل بھی ادلہ شرعیہ میں سے ایک ہے،

درحقیقت دوسرے مذاہب میں اور اسلام میں بنیادی اور اساسی فرق یہی ہے!

دوسرے مذاہب عقل کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، عقل سے کام لینا ان کے ہاں جرم ہے اور اتنا شدید جرم ہے جسے کسی اور حالت میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اسلام نے عقل کے ایوان میں ضروری حدود و شرائط کے ساتھ ہر شخص کو داخل ہونے کی اجازت دے دی ہے، اسی لئے قرآن میں بار بار تعقل اور تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔

(رئیس احمد جعفری)

شوکانی کا قول ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ماضی میں جو کچھ ثابت تھا اس کی اصل زمانہ حاضر اور مستقبل میں بھی باقی ہے جو ماخوذ ہے مصاحبت سے جس کا مطلب ہے ایسے امر کی بقا جس میں تغیر پیدا کرنے والا کوئی سبب موجود نہ ہو[1]۔"

غیر منصوص اولہ پر اعتماد اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادلہ مستنبط غیر منصوص پر اعتماد جتنا کم ہوگا استصحاب پر عمل اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

چنانچہ ظاہریہ جو استدلال کے قائل نہیں اور نصوص تک مقصور رہتے ہیں اور تعلیل احکام کی نفی کرتے ہیں۔ استصحاب پر زیادہ سے زیادہ عمل پیرا ہیں۔

اور شافعی گو قیاس کے قائل ہیں مگر استحسان و مصالح مرسلہ کی نفی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اخذ استصحاب کی فراوانی ہے۔

امامیہ اثنا عشریہ نے قیاس کا دروازہ بند کر دیا ہے وہ مصلحت کا اخذ اس اساس پر کرتے ہیں کہ تحسین عقلی اور تقبیح عقلی دفع ضرر اور جلب مصلحت پر مبنی ہیں مگر استصحاب کے اخذ میں پیش پیش ہیں۔

استصحاب کا وجود ائمہ سے ایسے اخبار بھی وارد ہوئے ہیں جو اخذ بالا ستصحاب کے وجوب کو اصل شرعی کی طرح مفید ہیں۔

ذیل میں اس طرح کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

: زرارہ امام باقر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز عرض کیا۔ وضو کی حالت میں آدمی سوجاتا ہے تو کیا نیند کے دو ایک جھونکے وضو کو ختم کر دیں گے؟

آپ نے فرمایا: اے زرارہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آنکھ سو جاتی ہے مگر دل اور کان نہیں سوتے لیکن جب آنکھ اور کان اور دل سو جائیں تو وضو واجب ہو جائے گا۔

میں نے عرض کیا

اگر اس کے پہلو پر کوئی چیز حرکت کرے اور وہ اس سے لاعلم رہے؟

فرمایا اس سے کچھ نہیں ہوتا جب تک سونے کا یقین نہ ہو جائے اور اس بارے میں امر بین ظاہر نہ ہو جائے، بصورت دیگر اس کا وضو قائم رہے گا، کیونکہ شک سے یقین کبھی نہیں ٹوٹتا!"

---

[1] ارشاد الفحول ص ۲۰۸

استصحاب

فقہ امامیہ کا ایک مہتم بالشان مسئلہ

استمرار بقاء حکم فقہاء امامیہ کے ہاں استصحاب عبارت ہے، استمرار بقاء حکم سے یا اس وصف یقینی سے جو ماضی میں ثابت ہوا اور حال تک مستمر ہو۔

اگر اس کے بقاء میں شک وارد ہو جائے تو شک کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔

مثلاً ماضی میں طہارت کا حکم ثابت تھا لہٰذا باقی تھا، اب شک پیدا ہو گیا کہ کوئی ایسی چیز واقع ہوئی ہے جو اسے ختم کر دینے والی ہے تو شک کی پرواہ نہیں کی جائے گی۔ ماضی کا حکم علیٰ حالہ قائم رہے گا اگرچہ اس کے **نقض** کے بارے میں شک پیدا ہو چکا ہو۔

یا مثلاً کوئی شخص غائب ہو گیا، یہ نہیں معلوم کہ زندہ ہے یا مر گیا؟ اس صورت میں وصف حیات مستمر اور قائم رہے گا، جب تک زوال حیات کی دلیل نہ مل جائے، چنانچہ احکام اسی بنیاد پر قائم کئے جائیں گے، یعنی یہ کہ وہ زندہ ہے درگور نہیں ہے۔

یہ تعریف جمہور کی تعریف سے مشابہ ہے، وہ کہتے ہیں۔

"استصحاب اس چیز کے بقاء جو ماضی میں ثابت ہو استدامت کا اور جو ماضی میں منتفی ہو نفی کا نام ہے جب تک اس کے برعکس دلیل قائم نہ ہو جائے۔

یعنی خواہ منفی صورت میں یا مثبت صورت میں سابقہ حکم اس وقت تک قائم رہے گا جب تک تغیر حالت سے متعلق دلیل واضح نہ دستیاب ہو جائے۔

اور استدامت حکم مشتمل ہے، حکم شرعی اور اس وصف کی استدامت کو جو مقتضائے حکم ہے — مثلاً حیات مفقود (گم شدہ شخص) یہ خواہ وصف حال حکم کو مقتضی ہے، یعنی استحقاق میراث اور بقائے ملکیت کا حکم:

صاحبؒ "القوانین المحکمہ" نے اس پر تعلیق کرتے ہوئے فرمایا ہے۔
"اس حدیث میں یقین اور شک عمومؒ پر محمول ہیں!
یعنی وہ یقین ہی نہیں ہے جو شک سے زائل ہو جائے۔
شیخ طوسی، صفار سے، وہ علی بن قاشانی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر کو لکھ کر دریافت کیا کہ اگر کسی دن کے بارے میں شک پڑ جائے کہ یہ رمضان کا دن ہے یا نہیں تو روزہ واجب ہوگا یا نہیں؟
جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:
"بارگاہِ یقین میں شک نہیں داخل ہو سکتا، رویت کی بنا پر روزہ رکھو اور رویت کی بنا پر افطار کرو!"
علامہ مجلسی نے اپنی کتاب بحار الانوار میں افعال وضو سے متعلق شک اور نسیان کا باب باندھتے ہوئے روایت کی ہے:۔
سعد بن عبداللہ محمد بن عیسیٰ یقطینی سے وہ قیم بن یحییٰ سے وہ اپنے جد حسن سے، وہ راشد سے وہ ابوبصیر سے وہ ابوعبداللہ سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:
امیرالمومنین نے فرمایا جسے یقین وضو تھا مگر شک پیدا ہو گیا، اسے چاہیئے کہ یقین پر قائم رہے کیونکہ شک یقین کو نہیں توڑ سکتا۔
بحار الانوار ہی کی یہ روایت بھی ہے کہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ وکرم اللہ وجہہ نے فرمایا
جو شخص یقین پر ہو مگر شک میں مبتلا ہو جائے تو جاننا چاہیئے کہ یقین شک سے دور نہیں سکتا!"
اس خبر سے متعلق "القوانین المحکمہ" میں وارد ہے۔
"اس خبر کی اصل غایت وثوق واعتبار ہے طرق قدما پر، اگرچہ بزعم متاخرین یہ صحیح نہیں ہے!"

لہ القوانین المحکمہ باب قانون الاستصحاب
نیز اس سلسلے میں وسائل ابی المعالی کا باب الاستصحاب ملاحظہ ہو۔

استصحاب کی چار قسمیں امامیہ اور زیدیہ نے استصحاب کی چار قسمیں کی ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) استصحاب برات اصلیہ

(۲) استصحاب الملک۔

(۳) استصحاب حکم اور استصحاب حال جسے استصحاب وصف بھی کہتے ہیں۔

(۴) استصحاب موضوع

اور ایک پانچویں قسم بھی ہے! استصحاب اجماع!

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ بیان کریں گے۔

استصحاب براۃ

تعریف وبیان

اس کے معنیٰ ہیں واجب سے ذمے کا غیر مشغول ہونا یا عباد میں سے کسی کے حق ہیں سے بری ہونا یہ برات اس وقت تک مستمر رہے گی جب تک کوئی دلیل اس سے متعلق وجوب حق پر قائم نہ ہوجائے۔ یہ مشتمل ہے تکلیفات شرعیہ اور حقوق عباد پر۔ بعض علما نے اس کا نام "استصحاب نفی" بھی رکھا ہے۔ اس لئے کہ اس میں نفی ثابت ہوتی ہے اور اسے استمرار حاصل ہوتا ہے اور یہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک دلیل ایجاب نہ پائی جائے۔

پس اس استصحاب کے جملہ احکام ثابت ہوتے ہیں، اثبات نہیں!

اس بنیاد پر صغیر اس وقت تک غیر مکلف ہے جب تک اس کا بلوغ اپنے امارات وقرائن ظاہر نہ کرے۔

"جو شخص مجنوں ہو، تو وہ اس وقت تک غیر مکلف رہے گا جب تک اس کی دیوانگی زائل نہ ہو جائے۔

مکلف ہو جانے یعنی بالغ ہو جانے کے بعد جو دیوانگی میں مبتلا ہو جائے اس سے تکلیف ساقط ہو جائے گی، یعنی وہ مکلف نہیں رہے گا اور تکلیف سے اس کی براۃ ذمہ استمراری طور پر قائم رہے گی یہاں تک کہ اس کے اثبات عقل کی دلیل واضح نہ ہو جائے۔

اس نوع استصحاب میں ذمہ اس وقت تک قرض عائد نہیں کرے گا جب تک وہ ثابت نہ ہو جائے، نہ مہر اس وقت تک ثابت ہوگا جب تک وجود نکاح پر دلیل موجود نہ ہو۔

اس طرح وجود نکاح پر قیام دلیل کے بغیر نفقہ بھی واجب نہیں ہوگا۔

دلیل تحریم ضروری ہے

ان تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اصل یعنی براۃ استصحاب پر کوئی چیز اس وقت تک حرام نہیں ہوگی جب تک دلیل تحریم موجود نہ ہو۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اشیاء میں اصل جو ہے وہ اباحت ہے، یا خطر ہے جب یہ پہلو واضح ہوجاتا ہے تو پھر تحسین عقلی اور تقبیح عقلی کی حیثیت سے غور کیا جاتا ہے، کیونکہ اشیاء حسن و قبح کے اعتبار سے ایک حالت پر نہیں رہتیں اور جب تک یہ صورت رہے گی اس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تحریم یا وجوب کی اصل براۃ ذمہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض کا قول ہے کہ جن اشیاء میں ذاتی اعتبار سے حسن و قبح نہیں ہوتا، تحریم اور وجوب میں ان کی اصل براۃ ذمہ ہے، تا آنکہ شرعی دلیل قائم ہوجائے، کیونکہ منفعت اور مضرت کا تعرف صرف شارع کی طرف سے ہو سکتا ہے وہ شارع ہے جو مکلف کو حکم دیتا ہے کہ یہ چیز حرام ہے یا مباح ہے لیکن جس چیز کے قبح پر قطعیت کے ساتھ عقل فیصلہ کر سکتی ہے وہ بہر حال حرام ہے، مثلاً ظلم کذب چغل خوری، خیانت، دھوکا وغیرہ جن کے قبح پر عقل کا توافق حاصل ہے۔

اسی طرح جن چیزوں کے مستحسن ہونے پر عقل کا توافق ہے وہ مطلوب ہیں ان کا ترک جائز نہیں۔

جو چیزیں قطعیت کے ساتھ مستحسن یا قبیح ہیں ان کے بارے میں اتفاق ہے کہ وہ کسی حکم سے خالی نہیں ہو سکتیں اور اس بنیاد پر نزول شرع اسلامی کے بعد وہ برأۃ اصلیہ سے بھی خالی نہیں ہو سکتیں اس مسئلے پر امامیہ کا اتفاق ہے۔

البتہ نزول شرع محمدی سے پہلے کے بارے میں امامیہ اور معتزلہ کے مابین اختلاف ہے معتزلہ تحسین عقل پر وجوب احکام کے قائل ہیں فعل حسن پر استحقاق ثواب کو مانتے ہیں اور فعل قبیح پر عقاب اخروی پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

لیکن امامیہ اس صورت میں نہ ثواب کے قائل ہیں نہ عقاب کے کیونکہ ثواب و عقاب کی شرط یہ ہے کہ بشیر و نذیر آ چکا ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا۔

اس بارے میں چار اقوال ہیں:

اقوال اربعہ (۱) اکثر امامیہ کا یہ قول ہے کہ اشیاء میں اصل چیز جو ہے وہ اباحت ہے کیونکہ اباحت اصلیہ اللہ تعالیٰ کے قول سے ثابت ہے۔

خلق لکم ما فی الارض جمیعا۔

پس زمین میں جو کچھ ہے وہ مباح ہے جب تک کسی چیز کی تحریم پر دلیل موجود نہ ہو، اور قبح ذاتی کی صورت میں تحریم ادلّہ عقل سے ثابت ہوتی ہے۔

(۲) اشیاء میں اصل چیز جو ہے وہ حظر (تحریم) ہے۔ یہ معتزلہ کا قول ہے، بعض امامیہ بھی اس کے قائل ہیں۔

اس قول کی بنیاد تقاضائے احتیاط ہے، اس کی مثال ویسی ہے جیسے ادلّہ متعارض ہوں اور وجہ ترجیح کوئی نہ ہو، لہٰذا تقاضائے احتیاط حظر ہے۔

(۳) قول ثالث عبارت ہے توقف سے۔

کیونکہ ناممکن ہے کہ کوئی امر بھی حکم سے خالی ہو، اور توقف انسان کو دلیل کی تلاش پر مجبور کر دیتا ہے، یہ گویا حکم دلیل کے سامنے اذعان ہے اور جب یہ غیر معروف ہو تو اس کی جستجو لازمی ہو جاتی ہے اور اس کا عرفان ہم ائمہ کے اقوال ماثورہ سے مواضع اجماع وغیرہ ادلہ کے دیگر سرچشموں سے کرتے ہیں۔ یہ رائے جمہور فقہاء میں سے بعض کی ہے۔ نیز بعض امامیہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے جن میں علامہ المفید صاحب "اوائل المقالات" بھی شامل ہیں۔

(۴) اشیاء میں اصل نہ اباحت ہے نہ تحریم۔ سرے سے کوئی حکم ہی نہیں ہے۔ توقف اور احتیاط کا تقاضا ہے، یہ امام صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اس سلسلے میں جو روایات مروی ہیں ان میں سے چند ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

: امام جعفر صادق سے "الکافی" میں مروی ہے :-

"اگر تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو صاحبِ علم ہیں، ان کی بات مان لو۔ اور اگر وہ لوگ آئیں جو صاحب علم نہیں ہیں تو دیکھو۔ دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ منہ کا بند رکھنا واجب ہے اور خاموش رہنا اولیٰ!

: حسن ہشام بن سالم سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میں نے ابوعبداللہ سے عرض کیا:

"اللہ کا حق مخلوق پر کیا ہے؟

فرمایا، "یہ کہ وہ کہیں جو جانتے ہیں اور اسے زبان پر نہ لائیں جسے نہیں جانتے۔ اگر لوگ ایسا کرنے لگیں تو انہوں نے اللہ کا حق ادا کر دیا!"

: حمزہ بن طیار سے روایت ہے کہ انہوں نے ابوعبداللہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ان کے والد ماجد کے بعض خطبات پیش کئے یہاں تک کہ وہ مقام آیا جہاں آپ نے فرمایا تھا۔

باز آجاؤ اور خاموش رہو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل فرمایا ہے اس کے بارے میں تمہیں وسعت دی ہے کہ اگر نہیں جانتے تو تب کشائی نہ کرو۔ لیکن اس پر قائم رہو اور معاملہ ائمہ ہدیٰ کے سامنے پیش کردو، یہاں تک کہ وہ تمہیں منزل متصور تک پہنچا دیں اور تم میں نور چشم ہیں انہیں بینا بنادیں اور تمہیں حق کی جھلک دکھادیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ء فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر (ائمہ) سے دریافت کرلو:

: عمر بن حنظلہ روایت کرتے ہیں کہ امام جعفر صادق نے فرمایا

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، حلال واضح ہے، حرام واضح ہے اور شبہات واضح ہیں پس جس نے شبہات کو ترک کردیا نجات پائی، اور جس نے شبہات کو لیا اس نے محرمات کا ارتکاب کیا پس وہ لاعلمی کے باعث ہلاک ہوگیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ مواطن احتیاط میں اقتیاط کو موجب خطر گردانتے تھے لیکن جو لوگ اباحت کے قائل ہیں ان کے نزدیک اگر تعارض ادلہ اور اشتباہ نہ ہو تو حلت شرع سے نہ کہ حکم عقل سے ثابت ہوتی ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو انسان کے لئے مسخر کردیا ہے اور اس تسخیر فطری کا مقتضا یہ ہے کہ جب اشتباہ نہ ہو تو اباحت کو تسلیم کیا جائے۔

فی الجملہ بعض علماء اشیاء کی اصل حلت یعنی حلال ہونے کو مانتے ہیں بعض کے نزدیک اشیاء کی اصل حلت نہیں خطر (تحریم) ہے بایں طور کہ کوئی دلیل مخالف موجود نہ ہو۔

اس جگہ ایک اور تنبیہ ضروری ہے۔

بعض فتاویٰ میں ایک عجیب سی رائے نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ حلال وحرام کے سا تھ جب مخلوط اور مشتبہ بہ سبب تعارض ادلہ کے یا عدم وجود دلیل کے باعث پایا جائے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اس کا فتویٰ ابوالحسن الثالث نے دیا تھا۔ ؎۱

؎۱ استصحاب کا مسئلہ، فقہ اہل السنت اور فقہ شیعہ کا ایک نہایت اہم بالشان مسئلہ ہے بلکہ جملہ فرقوں میں اس کے ردو قبول پر کافی مذاکرات موجود ملتے ہیں۔

لیکن فقہ اثنا عشری میں مسئلہ استصحاب کو جتنے مرتب اور مدون طریقے سے پیش کیا گیا ہے اس کی نظیر دوسرے مذاہب فقہیہ میں نہیں ملتی لہٰذا ماننا پڑے گا فقہ اثنا عشری کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے۔

(رئیس احمد جعفری)

استصحاب ملک

بقاءملکیت یہ استصحاب عبارت ہے، بقاءملکیت سے جب کہ وہ ثابت ہو یا اس کے آثار و امارات موجود ہوں جب تک اس ملکیت کا انتقال دوسرے مالک کے حق میں بصورت معاہدہ ثابت نہ ہو جائے۔

زمین کا بنجر ہو جانا بھی استصحاب ملک کی ایک صورت ہے جب کہ سبب ملکیت اس کی سرسبزی اور شادابی ہو۔

ملکیت کے ساتھ حق احترام بھی ثابت ہوتا ہے جب تک اس سبب احترام کا زوال نہ ثابت ہو جائے۔

مثلاً کوئی شخص ایک حوض کا مالک ہے تو ملکیت محترم ہے اور اس کا احترام مستمر ہے۔

لیکن اگر یہ حوض شراب کا حوض بن جائے گا یا کسی دوسری صورت میں تبدیل کر دیا جائے تو یہ مال محترم سے مال غیر محترم میں تبدیل ہو جائے گا، اس کی حرمت زائل ہو جائے گی اور اس کے تلف کرنے والے پر کوئی جرمانہ عائد نہیں ہوگا۔

یا کسی شخص نے شکار کیا اور شکار کو ذبح کئے بغیر رکھا اور چلا گیا تو یہ شکار اب مال مباح ہو جائیگا

ایسی نوع استصحاب کی مثالیں کتب اثناعشریہ میں کافی ملتی ہیں، ہم ذیل میں چند درج کرتے ہیں۔

: قبضہ ملکیت کی دلیل ہے، بشرطیکہ یہ قبضہ نیابت کی صورت میں۔ جیسے مستاجر۔ — نہ ہو، نہ یہ وکیل کا فیصلہ ہو، نہ مستعیر (عاریت پر لینے والا) کا قبضہ ہو، کیوں کہ یہ تمام صورتیں ملکیت کے قبضے کی نہیں ہیں۔

ملکیت کے لئے ضروری ہے کہ مالک کو اپنی ملکیت پر تصرف کا پورا پورا حق ہو کیونکہ یہ ملکیت کی دلیل ہے۔

اور ملکیت اس وقت تک زائل نہیں ہوتی جب تک اسے زائل کرنے والی کوئی دلیل موجود نہ ہو یہی وجہ ہے کہ متنازعہ ملکیت کی صورت میں بار ثبوت اس پر ہے جس کا قبضہ نہیں ہے اور قسم اس سے لی جائے گی جس کا قبضہ ہے۔

: مسلمان کا خون حرام ہے اور یہ اس کا حق ہے جو شخص اس حق پر چھاپہ مارتا ہے اور مسلمان کو قتل کر دیتا ہے قدوہ ماخوذ ہوگا اور اگر یہ قتل غلطی سے ہوا ہے تو دیت واجب ہے۔

: اگر کوئی شخص مرتد ہو گیا تو اس نے اپنی حرمت دم زائل کر لی۔

: کسی مسلمان نے کسی مسلمان کو زخمی کر دیا اور یہ زخمی مرتد ہو گیا، تو اب اس ایذاء کے سبب وہ جزا سے محروم ہو گیا کیونکہ حق اس وقت واجب ہوتا ہے جب وہ قصاص کے وقت ثابت ہو جائے اور قبل از قصاص وہ کسی سبب سے زائل ہو جائے تو اب اس حق کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔

اگر مرتد ہونے کے بعد اس زخم کی تاب نہ لا کر مر گیا لیکن بغیر توبہ کئے ہوئے تو پھر اس کا کوئی قصاص نہیں ہے، کیونکہ قصاص کا مطالبہ کرنے کا حق کھو بیٹھا کیونکہ مرتد ہونے کے باعث اس کی حرمت زائل ہو گئی۔

لیکن اگر قبل از مرگ تائب ہو گیا اور پھر جراحت کی تاب نہ لا کر مر گیا تو اس سلسلے میں نقاط نظر مختلف ہیں۔

بعض کے نزدیک مجروح کا خون معاف ہے، کیونکہ مرتد ہونے کے باعث اس کی حرمت دم ختم ہو گئی تھی اور اب توبہ کے بعد وہ واپس نہیں آ سکتی

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر حال عارض کے سبب حق حرمت دم زائل ہو گیا تو اس حال عارض کے ساقط ہونے کے بعد وہ واپس آ جائے گا، یہ بات ثابت ہے کہ جس جراحت سے موت واقع ہوئی وقت جراحت ایسے شخص کا خون حرام تھا، لہٰذا قتل کے احکام زخمی کرنے والے پر مترتب ہوں گے۔

اسی طرح مسئلہ فدک ہے جس پر حضرت قاسم اور حضرت علی کا قبضہ تھا۔

اس مسئلے پر حضرت ابوبکر سے گفتگو کرتے ہوئے حضرت علی نے فرمایا:

اے ابوبکر تم نے ہمارے اس مسئلے میں حکم خدا کے خلاف فیصلہ دیا ہے، ابوبکر نے کہا نہیں ایسا تو نہیں ہے، علی نے کہا۔

اگر مسلمانوں کے قبضے میں کوئی چیز ہو اور میں اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر دوں

تو بار ثبوت کس پر ہوگا؟"

ابوبکر نے کہا بار ثبوت تم پر ہوگا کہ تم مسلمانوں کے خلاف مدعی بن کر آئے ہو۔

علی نے کہا اگر میرے قبضے میں کوئی چیز ہے اور مسلمان اس کے مدعی بنتے ہیں۔ کیا پھر تم مجھ سے دلیل ملکیت طلب کرنے کا حق رکھتے ہو؟ حالانکہ میرا قبضہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی رہا، اور بعد کو بھی، لیکن تم مسلمانوں سے ثبوت نہیں طلب کرتے ہو!

"ابوبکر نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش ہو گئے![1]"

گویا فدک کی اس جدل میں قبضے کے باعث بات ختم استصحاب ملکیت پر ہوئی

---

[1] رسائل ابو المعالی فی رسالۃ استصحاب الملکیۃ ص ۱۰

استصحاب حکم

حکم کا استمرار استصحاب حکم سے مراد اسباب شرعیۂ ثابتہ میں سے کسی سبب کے ماتحت اس حکم کا استمرار ہے جو اس کے مثل میں قائم ہو، یہ استمرار اس وقت تک قائم رہے گا جب تک اسے زائل کرنے والی کوئی چیز موجود نہ ہو استصحاب کی یہ نوع فقہ جعفری میں ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔

جس شے کی نجاست ثابت ہو چکی ہے وہ اس وقت تک نجس رہے گی جب تک کوئی ایسا سبب نہ پایا جائے جو اس کی نجاست میں تغیر کردے، اس کی ایک صورت تحول بھی ہے مثلاً پاخانہ اگر مٹی میں تبدیل ہو جائے تو پاک ہوگیا، کھال وباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایک نجس اور ناپاک چیز اس وقت تک نجس اور ناپاک رہتی ہے جب تک اس میں تغیر کرنے والی کوئی چیز نہ پیدا ہو جائے۔

ضروری مثالیں استصحاب حکم کی مثالوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ:۔ جس کا وضو ثابت ہو وہ شک سے نہیں ٹوٹ سکتا۔

اس کی تصریح کتب اثنا عشریہ میں موجود ہے جسے اپنے وضو کے ٹوٹ جانے کا شک پیدا ہو گیا ہو اسے چاہیے کہ اس شک کے باوجود نماز پڑھ لے کیونکہ جو چیز یقین سے ثابت ہو وہ اس وقت تک زائل نہیں ہو سکتی جب تک اسی قوت کا یقین، اسے زائل نہ کر دے جیسا کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جمہور فقہا کا مسلک بھی استصحاب حکم کے بارے میں یہی ہے امام مالک کے سوا کوئی بھی اس کا مخالف نہیں ہے۔

امام مالک کے نزدیک شک پیدا ہو جانے کی صورت میں سابقہ وضو سے نماز پڑھنا درست نہیں ہے، کیونکہ استصحاب حکم بقاء احکام مقررہ ثابتہ کا موجب ہے وہ نئے احکام کا جواز

نہیں پیدا کرتا اور نماز چونکہ وضو یقینی کی طالب ہے، لہٰذا وضو مشکوک سے جائز نہیں ہوگی، اور شک پیدا ہو جانے کے باعث وضو غیر یقینی ہوگیا، لہٰذا شرط صلوٰۃ (جو وضو ہے) کا تحقق نہیں ہوا۔

• اسی طرح زواج کا مسئلہ ہے، زواج حلال ہے لہٰذا اس کی یہ حلت مستمر ہے۔ اب اگر کسی شخص کو شک پیدا ہوگیا کہ اس نے طلاق دے دی ہے۔ تو اس شک سے حکم زواج کی حلت زائل نہیں ہوگی۔

• اگر پانی طاہر ہے اور یہ بات ثابت ہے تو وہ اس وقت تک نجس نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ایسا امر نہ پایا جائے جو حال طہارۃ سے حال نجاست میں منتقل کردے۔

غرض اصول یہ ہے کہ حکم اس وقت تک قائم ہے جب تک کوئی ایسی تغیر کرنے والی چیز نہ پیدا ہو جائے جو اصل غایت کے لئے حکم کو مقید کردے۔

اور تحقق غایت میں اختلاف ہو تو حکم مستمر رہے گا کیونکہ غایت ثابت نہیں ہوتی۔

• مثلاً کسی شخص نے ہلال نہیں دیکھا لیکن رویت ہلال کے سلسلے میں مبتلائے شک ہو گیا تو اس پر روزہ واجب نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ یہ شک ہلال رمضان کے بارے میں ہو، لیکن اگر ہلال رمضان کے بجائے ہلال شوال کے بارے میں شک پیدا ہو جائے تو افطار جائز نہیں ہوگا، کیونکہ وجوب صریح یقین سے زائل ہو سکتا ہے شک سے نہیں۔

• کسی شخص نے روزے کی نیت کرلی اور دن میں کسی وقت بیمار پڑ گیا اور نہیں جانتا کہ روزہ توڑے یا نہ توڑے، افطار جائز ہوگا یا ناجائز؟ تو اس کے لئے افطار جائز نہیں ہوگا، کیونکہ حکم صیام یقین سے ثابت ہے، اب وہ اسی جیسے کسی یقین سے زائل ہو سکتا ہے!

فقہاء کا مسلک: بعض فقہاء کا قول ہے کہ استصحاب حال بقائے حکم کا متقاضی ہوتا ہے، تاکہ سلب وایجاب کو یعنی دفع واثبات کو باقی رکھے۔

ابن قیم نے دفع واثبات کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس کے معنی یہ ہیں کہ جو تغیر احوال کا مدعی ہو وہ اسے دفع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، تاکہ صورت احوال جوں کی توں قائم رہے، کیونکہ اس کی بقاء کا استناد موجب حکم کی طرف ہے نہ کہ اس کے عدم کی طرف، اگر ہمارے پاس کوئی دلیل نافی یا مثبت نہیں ہے تو ہم حکم و نفی میں سے کسی کو ثابت نہیں کریں گے بلکہ استصحاب سے کام لے کر اس کا دعویٰ دفع کریں گے جو اس کا اثبات کر رہا ہے کیونکہ استصحاب سے تمسک کرنے والے کا حال بھی ویسا ہی ہے جیسا معترض کا کیونکہ وہ دلالت کو جب تک کہ ثابت نہ ہو جائے تسلیم نہیں کرتا نہ نفی ادعا پر کوئی دلیل قائم کرتا ہے۔ اور یہ صورت حال معارض کے برعکس ہے، معترض دلالت دلیل کا مانع ہے اور معارض اس کی دلیل کو تسلیم کر لیتا ہے۔[1]

ابن قیم کی اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ استصحاب ایسی دلیل معارض اور راجح نہیں ہے، جو احکام جدیدہ کو ثابت کر سکے، لیکن جو اسے اخذ کرتا ہے اس کے لئے تغیر کی مانع ضرور ہے اور جب دلیل مثبت نہیں ہوگی، وجوب حقوق بھی نہیں ہوگا۔

ثمرہ اختلاف: جس مسئلے میں سب سے زیادہ ثمرہ اختلاف واضح ہے، وہ مسئلہ مفقود ہے، کیونکہ اس کی زندگی استصحاب سے ثابت ہے، لیکن یہ ثبوت اس کے حقوق قائمہ کی محافظت کے لئے ہے، اس سے اس کے حقوق جدید قائم نہیں ہوتے، نہ اس سے جدید ایجابی حقوق ثابت ہوتے ہیں تاکہ اس کے احوال اس کی ملکیت پر قائم رہیں۔ ان میں اس وقت تک ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا، نہ وراثت نافذ کی جا سکتی ہے جب تک موت ثابت نہ ہو جائے۔

: اسی طرح شوہر اور بیوی کے مابین صرف شوہر کی گمشدگی کے باعث تفریق نہیں کرائی جائے گی۔

---

[1] اعلام الموقعین ص ۳۹۶

استصحاب حال

استصحاب وصف یا موضوع

اسے استصحاب وصف یا استصحاب موضوع بھی کہتے ہیں۔

اقسام سابقہ میں یہ بات واضح ہوچکی ہے استصحاب مانع تغیر ہوتا ہے، امر غیر قائم کے لئے مثبت نہیں ہوتا۔ چنانچہ پچھلے ابواب میں جو مثالیں پیش کی گئیں ان میں استصحاب کی حیثیت مانع کی تھی، یعنی وہ حکم جدید کا واقع تھا اور کسی ایسے حکم کا مثبت نہیں تھا جو حکم سابق پر مبنی ہو، چنانچہ فقہا ان انواع سابقہ پر متفق تھے، اگرچہ تطبیق میں باہمی اختلاف بھی تھا

لیکن، استصحاب حال یا استصحاب وصف قائم یا استصحاب موضوع جو نفی اور اثبات دونوں کو متضمن ہوتا ہے وہ تغیر کا مانع ہوتا ہے لیکن حکم جدید کو بھی ثابت کرتا ہے۔

فقہاء کا اختلاف

استصحاب حال کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ آیا اس وصف کا اعتبار کیا جائے گا جس کی بقا استصحاب حال سے ثابت ہے تاکہ احکام تغیر کا مترتب ہوسکے یا یہ حقوق جدیدہ کا مثبت بھی ہوگا جن کی بنیاد بقاء وصف پر قائم ہے؟ یہ ایک اختلافی اور نزاعی مسئلہ ہے۔

فقہاء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ حکم استصحاب کے مطابق جو بقاء وصف ہوتا ہے اس پر نفی تغیر مترتب ہوتی ہے اور جو احکام تغیر پر مترتب ہوتے ہیں ان کی نفی بھی ہوتی ہے۔ یہ ایسا امر ہے جس سے ایسے احکام جدیدہ ثابت نہیں ہوتے کیونکہ یہ احکام سبب ثابت کے قیام کے طالب ہوتے ہیں اور جہاں استصحاب سے بقاء حال ثابت ہو، وہاں شک کا گزر نہیں ہوتا۔

جو شخص اثناء گمشدگی میں وفات پائے گا میراث میں اس کی ملکیت ثابت نہیں ہوگی۔ صرف زندہ ہونے کی صورت میں وہ مستحق میراث ہو سکتا تھا۔

اسی طرح جو وصیت گمشدہ شخص کے لئے کی گئی ہو اس پر اس کی ملکیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کی زندگی کا فرض کر لینا بقاء حقوق ثابتہ کے لئے ہے اور یہ فرض کر لینا نفی تعرض کے لئے ہے نہ کہ اثبات کے لئے۔

شافعیہ اور حنابلہ کی رائے: یہ حنفیہ اور مالکیہ کی رائے تھی جو ذکر ہوئی، لیکن شافعیہ، حنابلہ اور زید یہ کہتے ہیں کہ مفقود حقوق جدیدہ حاصل کر سکتا ہے اور اس کے حقوق ثابتہ باقی رہیں گے۔ وہ گمشدگی کی حالت میں مرنے والے کا وارث ہو سکتا ہے کیونکہ اگر وہ اپنے اموال ثابتہ کی نسبت سے زندہ فرض کیا جا سکتا ہے تو اپنے اموال جدیدہ کی نسبت سے بھی زندہ فرض کیا جا سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک بات کے لئے زندہ فرض کر لیا جائے اور دوسری کے لئے مردہ مان لیا جائے اور یہ مرگ و زیست ایک ہی وقت میں ہوں۔

فقہ اثناء عشری کے ہاں اس باب میں دو رائیں ہیں۔

فقہاء اثناء عشریہ: بعض فقہاء اثناء عشریہ کا فیصلہ یہ ہے کہ گمشدہ شخص اس مرنے والے کے مال میں حصہ نہیں پا سکتا جو اس کے اثناء غیبت میں مرا ہے۔

صاحب "مفتاح الکرامۃ" کا ارشاد ہے کہ یہی رائے مختار ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"مختار مسلک یہ ہے کہ گمشدہ شخص کا حصہ میراث میں اس وقت تک موقوف رہے گا جب تک ثبوت اور دلیل سے اس کی موت کا حال نہ معلوم ہو جائے۔ یا اتنی مدت گزر جائے جو حیات طبعی کی مدت سے متجاوز ہو، باقی ترکہ تقسیم کر دیا جائے گا۔ مفقود اگر زندہ ہے تو اپنا حصہ پالے گا اور اگر مرگ مورث کے بعد اس کی موت کا علم ہوا تو اس کا حصہ اس کے ورثاء کو دے دیا جائے گا اور اگر اس کی موت وفات مورث سے پہلے ہو گئی، لیکن اس کا پتہ نہ لگ سکا تو حیات طبعی کی مدت بھر انتظار کرنے کے بعد مورث کے جملہ ورثاء میں شخص مفقود کا حصہ تقسیم کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ مقتضائے اصل ہے[1]

---

1. مفتاح الکرامت ج ۸ ص ۹۷

اثنا عشریہ کی دوسری رائے اس مسئلے میں یہ ہے کہ مفقود اپنے اثنا گم شدگی میں مرنے والے کا وارث ہو سکتا ہے، بشرطیکہ پہلے سے اس کی وفات کا علم نہ ہو۔

ایران میں بھی یہی قانون رائج ہے۔ مجموعۂ قوانین میں جس کی دفعہ کا نمبر ۸۷۹ ہے۔[1]

---

[1] مسئلہ مفقود الخبر ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ مالکی، فقہ حنبلی اور دوسرے مذاہب فقہ میں اس مسئلہ سے متعلق مختلف اور متنوع احکام موجود ہیں لیکن ایسے بہت کم ہیں جو عسر کے بجائے یسر کے حامل ہوں حالانکہ اسلام دین یسیر ہے۔ (الاسلام یسیر)

اس سلسلے میں فقہا اثنا عشری کا جو مسلک ہے، وہ متعدد اعتبارات سے زیادہ توجہ طلب ہے جس پر اہل علم اور اصحاب خبر کو غور کرنا چاہئے۔

(رئیس احمد جعفری)

ہو گیا اس طرح احوال متغیر ہو گئے، لہٰذا اس دوسرے حکم کے سامنے جھکنا پڑے گا۔
یہ ہیں استصحاب کے اقسام

ظاہریہ کا اسراف اور زیادتی ہم دیکھتے ہیں کہ استصحاب اجماع میں ظاہریہ۔ نے جتنی زیادتی اور اسراف سے کام لیا ہے اس کا شائبہ بھی امامیہ کے ہاں نہیں ملتا، حالانکہ دونوں فریق قیاس کی نفی کرتے ہیں اور اس سے اخذ نہیں کرتے۔

فرق یہ ہے کہ ظاہریہ قیاس کے ساتھ حکم عقل کی بھی نفی کرتے ہیں اور افتا بالرائے کی بھی نفی کرتے ہیں، اس کمی کو وہ کثرت کے ساتھ استصحاب قبول کر کے پورا کرنا چاہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑی بڑی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ خنزیر کے پیشاب کی اصل از روئے استصحاب اباحت ہے لیکن آدمی کے پیشاب کی اصل نجاست ہے کیونکہ وارد نص سے یہی ثابت ہے

لیکن امامیہ نے، جہاں نص نہ ہو وہاں احکام عقلیہ کا باب کھول دیا ہے، چنانچہ وہ از روئے عقل حسن و قبح اور ضرر و نفع کا موازنہ کرتے ہیں، لہٰذا زیادتی اور اسراف و غلو سے بچے رہتے ہیں۔ نہ ایسی غلطیاں کرتے ہیں جیسی ظاہریہ سے سرزد ہوتی ہیں، حالانکہ احکام شرعیہ میں دونوں نفی قیاس کے قائل ہیں۔

استصحاب اجماع

حکم مستمر کب ہوگا؟

استصحاب اجماع وہ استصحاب ہے جس کا حکم اجماع سے ثابت ہو، اس صورت میں اس کا حکم مستمر رہے گا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو پانی دستیاب نہیں ہوتا تو اس پر اجماع ہے کہ اس کے لئے تیمم جائز ہے اور اس تیمم سے نماز جائز ہے۔

اور اگر نماز پانی کی رویت سے پہلے تمام ہوگئی تو بالاجماع صحیح ہوگی۔

اور اگر ختم نماز سے پہلے پانی اس نے دیکھ لیا تو وضو بالاجماع اس پر واجب ہوگیا۔

اور اگر اس نے اثنائے نماز میں پانی دیکھا تو ایک قول یہ ہے کہ اس کی نماز حکم اجماع کے استصحاب کے باعث باطل نہیں ہوگی۔

ایک قول یہ ہے کہ باطل ہو جائے گی، کیونکہ اس کے سامنے وہ چیز آگئی جو تیمم کو توڑ دیتی ہے اور جب تیمم ٹوٹ جائے تو وضو واجب ہو جاتا ہے لہٰذا بغیر وضو کے نماز صحیح نہیں ہوگی۔

علماء جمہور کے مابین وجہ نزاع

یہ نوع استصحاب علماء جمہور کے مابین وجہ اختلاف و نزاع ہے اور امامیہ کے ہاں بھی یہ مختلف فیہ ہے۔

جو لوگ اسے جائز مانتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ موضع اتفاق کا مستمر ہونا ثابت ہے. جب تک اسے متغیر کرنے والی کوئی چیز سامنے نہ آجائے.

لیکن اگر متغیر کرنے والی دلیل غیر قطعی ہو بلکہ اس میں شک یا احتمال ہو تو حکم اجماع مستمر رہے گا اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حکم اجماع مستمر نہیں ہے کیوں کہ جس اجماع کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ صفت معین کے لئے تھا اور اگر یہ صفت زائل ہوگئی تو اجماع بغیر موضوع کے رہ گیا اور جو اجماع جواز تیمم پر منعقد ہوا ہے اس کی بنیاد پانی کا نہ ہونا ہے تو گویا یہ عدم دستیابی آب سے مقید ہے اور جب یہ قید زائل ہوگئی یعنی پانی مل گیا تو موضوع اجماع (یعنی نایابی آب بھی زائل

القیاس

فقہ امامیہ میں قیاس کی تعریف

کتب امامیہ کی رو سے قیاس کی تعریف یہ ہے کہ وہ فرع میں حکم اصل کے اجزاء سے عبارت ہے، اور دونوں کے مابین جو چیز جامع ہے وہ ثبوت حکم کی علت ہے۔

ثبوت حکم کی علت

قیاس کے ارکان چار ہیں:

(۱) حکم

(۲) علت

(۳) اصل۔ اصل وہ نص ہے جو بیان حکم پر مشتمل ہو۔

(۴) فرع۔ فرع وہ ہے جس کا حکم نص سے ثابت نہ ہو اور جس کا اثبات قیاس سے کیا جائے

قیاس کی امامیہ دو قسمیں کرتے ہیں:

(۱) قیاس علت ر۔ جس کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

(۲) قیاس علت، ۔ جس کے مسائل نص سے ثابت ہوتے ہیں۔

امامیہ اول کو بالاتفاق رد کرتے ہیں، استرداد کے اسباب یہ ہیں:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"یہ امت کچھ عرصے تک کتاب وسنت پر عمل پیرا رہے گی کچھ مدت تک سنت پر عمل کرے گی اور کچھ زمانے تک قیاس پر — اور جب لوگ یہ کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے!"

امامیہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث کتب سنت میں موجود ہے اور اس کی صحت اگر فرض کر لی جائے تو اس کا مورد یہ ہے کہ لوگ سنت اور کتاب کو ترک کر دیں گے اور اپنے ایسے آراء پر عمل کریں گے جو نصوص سے معارض ہوں گے۔ ان کے موافق نہیں ہوں گے۔

اور یہ صورت بدم مصادر اسلام کی ہے جو گمراہی ہے اس سے مراد قیاس صحیح بھی نہیں ہے کیوں کہ قیاس صحیح صرف اس صورت میں بروئے کار آتا ہے جب نص موجود نہ ہو۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"عنقریب میری امت ستر سے زیادہ فرقوں میں بٹ جائے گی جو قیامت سے بھی بڑا فتنہ ہوگا، لوگ اپنی رائے سے کام لینے لگیں گے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کریں گے!"

یہ حدیث اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ نص نہ ہونے کی صورت میں قیاس عموم قیاس میں داخل ہو جاتا ہے جس پر فتنہ مترتب ہونے لگتا ہے کیونکہ جس قیاس پر فتنہ مترتب ہوتا ہے وہ حرام کو حلال کر لیتا ہے، حالانکہ اس کی تحریم پر دلیل موجود ہے اور حلال کو حرام کر لیتا ہے حالانکہ اس کی حلت ثابت ہے، لیکن یہ موضع قیاس ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو اسے استنباط کا منہاج قرار دیتے ہیں کیوں کہ یہ قیاس کو صرف اس وقت عمل میں لاتے ہیں جب کہ موضوع سے متعلق کوئی نص نہ ہو، جو حلت یا حرمت کی تصریح کرتی ہو۔ اس صورت میں یہ ایسی نص تلاش کرتے ہیں جو موضوع مسئلہ سے ملتی جلتی ہو جس سے یہ حکم کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں۔

(۳) امام ابو حنیفہ اور امام صادق یا بہ اختلاف روایت امام باقر کے مابین قیاس کے مسئلے پر بحث و گفتگو اور حضرت امام کا قیاس سے انکار!

قیاس سے متعلق اقوال کتب سنت سے منقول ہیں

امامیہ کا قول یہ ہے کہ قیاس سے متعلق امام جعفر صادق سے جو اخبار مروی ہیں وہ کتب سنت سے منقول ہیں۔ چنانچہ صاحب القوانین المحکمہ فرماتے ہیں۔

"جمیع اعصار و امصار میں ہم اپنے علماء کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے کتب اصولیہ اور فقہیہ میں بہ بانگ دہل حرمت قیاس کا اعلان کیا ہے اور اس تحریم کی سند ائمہ سے لاتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے مبنی بر قیاس عمل کی حرمت اجماع اور ضرورت متواترہ سے ثابت کرتے ہیں!"

اس کے بعد موصوف نے رد قیاس اور مبنی بر قیاس عمل کی ممانعت پر بہت سے وجوہ

پیش کئے ہیں۔

• امامیہ قیاسیوں کی اس دلیل کو رد کرتے ہیں کہ شارع نے اشیاء کو مباح یا حرام قرار دیا ہے اور اباحت وتحریم کے علل از خود اوصاف ثابت ہیں۔

امامیہ کی دلیل کا ردّ

امامیہ اس دلیل کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی احکام کی تعلیل ایسے اوصاف سے بھی کی ہے جو ان میں ذاتی طور پر نہیں ہیں مثلاً ظلم یہود کے باعث اللہ نے ان پر ناخن والے جانور حرام کر دئے۔

لیکن یہ تحریم ان امور کی بنا پر تھی جو ان اشیاء میں ذاتی طور پر نہیں تھے، لہٰذا اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ قیاس میں جو بنیادی کام کرتی ہے وہ اشیاء متساویہ کے مابین مساواتِ احکام ان ذاتی معانی کے باعث ہوتی ہے جنہوں نے ان احکام کو واجب کیا ہے۔

قیاسیوں سے اختلاف رکھنے والے دو گروہ

لیکن جو لوگ قیاسیوں کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں وہ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

• فریق اول وہ ہے جو اجتہاد بالرائے سے منع کرتا ہے، اور وسعت استصحاب میں زیادہ سے زیادہ غلو کرتا ہے۔

• دوسری جماعت اجتہاد بالرائے سے کام لیتی ہے لیکن طریق قیاس پر رہروی نہیں کرتی پہلا طبقہ ظاہریہ کا ہے اور دوسرا امامیہ کا۔

امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر نص نہ ہو تو عقل مجرد سے اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نزدیک اس مسلک کے مطابق جو چیز بذاتہ مستحسن ہے اس میں شارع کی طرف سے مصلحت متحقق ہے جس کا تقاضا طلب ہے اور جس چیز میں ضرر ہے وہ قبیح بذاتہ ہے اور ممنوع ہے۔ اس کا اعتبار موضع نہی میں کیا جائے گا۔

پس اس منہاج میں اور ان لوگوں کے مابین میں جو نص کی عدم موجودگی میں باب قیاس وا کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ:

• اول الذکر حکم عقل اور احکام نصوص کے مابین عقل کو مجانست سے مقید کرتے ہیں۔

• اور دوسرا فریق نصوص معینہ میں اس مجانست کی قید نہیں لگاتا، بلکہ مجانست عامہ کا اعتبار

کرتا ہے۔

اور یہ مجانس عامہ کیا ہیں؟

مجانس عامہ وہ مصالح ہیں جو عموم تحسین وتقبیح میں عقلی طور پر داخل ہیں[1]

---

[1] قیاس کا مسئلہ بھی فقہ اسلامی کا اہم ترین مسئلہ ہے۔

بعض فقہی مذاہب میں قیاس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے بعض اس سے کام لیتے ہیں لیکن احتیاط کے ساتھ اور بعض بالکل اس کی نفی کرتے ہیں اور اسے استنباط واستخراج مسائل میں کوئی شرعی حیثیت دینے کو تیار نہیں ہیں فقہائے اثنا عشری کا مسلک یہی ہے۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو لوگ قیاس کو نہیں مانتے انہوں نے اس کا قائم مقام پیدا کر لیا ہے غرض یہ وہ چیز ہے جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔

(رئیس احمد جعفری)

حجیتِ قیاس

علّت مذکورہ بیان کے اعتبار سے مستقل ہوتی ہے

امامیہ کا ظاہر کلام اس قیاس کے بارے میں جس کی علّت منصوص ہو امامیہ کا ظاہر کلام یہ ہے کہ اگر علت مذکور ہو تو وہ بیان کے اعتبار سے مستقل ہوتی ہے، یا پھر علت حکم موضع اجماع میں مانی جائے گی، لہٰذا یہ قیاس سے خارج ہوجائے گی اور حکم کی تعدّی تطبیق سے ہوگی نہ کہ قیاس سے، لہٰذا یہ قیاس منہی عنہ (ممنوع) میں داخل نہیں ہوگا۔

مثلاً نص مستقل یہ ہے کہ ہر نشے والی چیز حرام ہے اور ہر شراب حرام ہے، پس یہ نص جملہ انواع مسکرات پر حاوی ہوگی، اسے قیاس سے تعبیر نہیں کیا جاتا رہا ہے، کیونکہ یہ عموم نص کی تطبیق ہے اور کسی ایسی علت پر عمل نہیں ہے جس کا استخراج طرق استنباط کے کسی طریق سے کیا گیا ہو۔

حلال جانور کے پیشاب کی نجاست پر اجماع ہے تو اس کپڑے سے نماز نہیں ہوگی جس میں یہ موجود ہو، نہ اس فرش پر نماز جائز ہوگی جہاں یہ پایا جائے تو یہ قیاس نہیں بلکہ ایک ایسے امر کی تطبیق ہے جس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

تطبیق کی صورت اور کسی علت پر بہ شکل نص نص مبنی نہ ہو بلکہ متعدد عام نصوص موجود ہوں تو ان احوال سے تطبیق دی جائے گی جن میں وہ ثابت ہیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال جب قحط وگرانی کے باعث لوگ بے گھر اور بے رزق ہو کر مدینے میں پناہ گزین ہوئے تھے، قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے سے منع فرما دیا تھا، لیکن جب ہنگامی صورت ختم ہوگئی تو دوسرے سال گوشت ذخیرہ کرنے کی پابندی ہٹالی۔

کسی حکم کی علت مقترنہ کے بارے میں جو غیر مستقل ہو امامیہ کے تین قول ہیں:

(۱) السید المرتضیٰ کا قول۔ یہ کہ قیاس ممنوع ہے۔ کیونکہ منع قیاس پر امامیہ کا اجماع ہے۔

روایات امام صادق امام صادق رضی اللہ عنہ سے بکثرت روایات ہیں جن سے تحریم قیاس ثابت ہے

اور یہ روایات حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں پس ہر وہ عمل جو مبنی بر قیاس ہو امام صادق کے ارشاد کی مخالفت پر مبنی ہوگا حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ جو کچھ امام جعفر صادق سے ثابت ہے وہ ائمہ سابقین سے بھی ثابت ہے۔ درحقیقت وہ امر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حکم خدائے عز وجل ہے اور اللہ کے حکم کا ترک کر دینا عصیاں ہے۔

علاوہ ازیں بہ صورت اس عمل میں شمار ہوگی جو مبنی بر ظن ہوتا ہے اور جس پر عمل روا نہیں بلکہ وہ ظن منہی عنہ (ممنوع) ہے جس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اگر علت مذکور ہو اور اس پر دلیل قائم ہو تو تعدی علت جائز ہوگی اور حکم اس کے مقتضا کے مطابق ہوگا، کیونکہ جب نص مذکورہ کے ساتھ کثرت قرائن ہو جن میں علت کا ذکر ہے تو یہ تعدی، نص پر عمل در آمد کے لئے ہوگی، اسے مقتضائے قیاس کے مطابق استنباط نہیں قرار دیا جائے گا۔

مثلاً شراب کی حرمت اس کے سکر (نشے) کے باعث ہے اور قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا رنگ سیلان اور مادہ تحریم میں مؤثر نہیں ہے، پس وصف حکم قرار پایا، بالکل اسی طرح جیسے نص حکم عام کے لئے مفید ہوتی ہے

(۳) یہ اکثر محققین امامیہ کی رائے ہے۔ یہی سب سے زیادہ ظاہر، مشہور اور واضح ہے یعنی اگر علت پر نص ہو تو اس کا تعدیہ تطبیق نص سے ہوگا، نہ کہ قیاس منہی عنہ (ممنوع) سے چنانچہ "القوانین المحکمۃ" میں اس رائے کی توجیہہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے

"یہ صورت قیاس کی نہیں ہے بلکہ مدلول کلام شارع ہے۔ یہ درحقیقت قضیۂ کلمہ ہے جو شرع سے مستفاد ہے، حاصل کلام یہ کہ اس قسم قیاس میں اجماع اور ضرورۃ سے حرمت عمل نہیں ثابت ہوتی اگر اسے قیاس مان لیا جائے تو بھی۔

اور نہی قیاس سے متعلق اخبار وارده کا جہاں تک تعلق ہے ان کی دلالت حقیقت شرعیہ کے ثبوت پر موقوف ہے اور یہاں وہ ثابت نہیں یہ ایک خود ساختہ بدعت ہے جو عقول قاصرہ کے باعث وجود میں آئی ہے کیونکہ مصالح احکام حقیقیہ کا بلوغ قصر عقول کے باعث ممکن نہیں[1]!"

---

[1] القوانین المحکمہ فی قانون القیاس۔

اس کلام سے ان لوگوں کے اندازِ فکر پر روشنی پڑتی ہے جو کہتے ہیں کہ علت کا خواہ ذکر کیا جائے یا یہ ذکر مستقل ہو، یا اجماع سے ثابت ہو وہ باب قیاس منہی عنہ میں داخل ہوگی کیونکہ اس پر اعتماد کی بنیاد صرف قول شارع ہے۔[1]

---

[1] اس باب میں حجیت قیاس پر جو بحث و گفتگو کی گئی ہے اس کے فکر آفریں ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہونے کے باوجود اتنا ہمہ گیر پہلو ہے کہ نہ اس سے اعراض کیا جا سکتا ہے، نہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، مسائل کا حل کرتے وقت کسی نہ کسی پہلو سے اسے موضوع فکر و نظر بنانا ہی پڑتا ہے

(رئیس احمد جعفری)

قیاس اولیٰ

دلالت الفاظ | اس نوع قیاس کا باب قیاس میں ادخال موضع نظر ہے، اس لئے فقہاء نے اسے باب قیاس کے بجائے دلالت الالفاظ میں ذکر کیا ہے۔

لیکن امام شافعی اسے باب قیاس میں ذکر کرتے ہیں جس سے ایک طالب علم کے لئے اس کا استدراک آسان اور سہل ہو جاتا ہے۔

اور اس کی صورت یہ ہے کہ جس معنی قیاس میں اصل سے فرع کی زیادتی ہو، یہ دلالت اولیٰ ہے بایں طور کہ امر غیر منصوص میں تحقیق علّت اس کے حکم پر ہوتی ہے اور منصوص علیہ سے زیادہ واضح ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

ولا تقل لهما اف ولا تنهرهما!

(یعنی ماں باپ سے اف تک نہ کرو، نہ انہیں جھڑکو)

اف کرنے اور جھڑکنے کی نہی اس امر کی مقتضی ہے کہ والدین کو مارا پیٹا بھی نہ جائے، امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"بعض اہل علم اسے قیاس ماننے سے انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس معنی میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حلال کیا اور حرام کیا جس کی تعریف کی اور مذمت کی اسے جملے میں داخل کر دیا، پس وہ بعینہٖ ہے، نہ اس کے غیر پر قیاس۔

قیاس تو صرف اس وقت کیا جائے گا جب اس امر کا احتمال ہو کہ دو مختلف معنوں سے تشابہ ہو۔

دوسرے اہل علم کا قول یہ ہے کہ کتاب و سنت کے نصوص کے سوا جو چیز ان کے معنی میں ہو وہ قیاس ہے[1]!

---

[1] الرسالہ ص ۵۱۶۔

یہ نوع دلالت اکثر کے نزدیک دلالات الفاظ میں سے ہے اور اس کا شمار قیاس میں نہیں ہوتا لیکن امامیہ بالاتفاق اسے اختیار کرتے ہیں، کیونکہ دلالات الفاظ کا شمار قیاس میں نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا یہ اُس قیاس کے مضمون نہی میں داخل نہیں ہے جس کی نہی امام جعفر صادق سے مروی ہے، اکثر کا خیال ہے کہ موافقت کے مفہوم میں اس سے اس اعتبار پر کہ یہ قیاس نہیں ہے۔ اخذ جائز ہے یا پھر یہ قیاس جلی ہے، جو ایسے امور کے اخذ پر جنہیں شارع اسلام نے از قبیل مصالح شمار نہیں کیا ہے، موذی نہیں ہوتا، بلکہ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ یہ اخذ مفہوم لفظ کے بجائے منطوق لفظ سے ہے

امامیہ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو کہتی ہے کہ دلالت اولیٰ سے اخذ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ امام جعفر صادق نے اس سے منع کیا ہے۔

قیاس جلی لیکن بہر حال امر واقعہ یہ ہے کہ اکثر امامیہ اس مفہوم سے اخذ اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ اس کا شمار قیاس میں نہیں اور اگر قیاس ہے تو پھر قیاس جلی ہے، جیسے وہ قیاس جس کی علت منصوص ہو اور ظاہر ہے اسے بے تامل قبول کر لیا جائے گا۔

"القوانین المحکمۃ" میں وارد ہوا ہے کہ امامیہ میں جو لوگ قیاس منصوص علیہ سے اخذ کرتے ہیں وہ درحقیقت دلالت اولیٰ سے اخذ کرتے ہیں اور جو اس سے منع کرتے ہیں وہ دلالت اولیٰ سے منع کرتے ہیں۔

بہر حال امامیہ کی ایک جماعت ہر اس چیز کی مانع ہے جس کا قیاس سے ذرا بھی تعلق ہو حتیٰ کہ قیاس جلی اور دلالت اولیٰ تک سے منع کرتی ہے۔

الاستحسان والمصالح

ابواب فقہی میں ایک اہم اور بنیادی مسئلہ

استحسان کی تعریف | بعض فقہا کے نزدیک استحسان ابواب اجتہادِ فقہی میں سے ہے چنانچہ ابوحنیفہ، مالک، احمد اور زیدیہ اسے قبول کرتے ہیں اگرچہ ان فقہا کی تعریفات مختلف ہیں۔

حنفیہ اور زیدیہ کی تعریف یکساں ہے، ابوالحسن شرقی کی مانند ان کا قول ہے:

"استحسان کی تعریف یہ ہے کہ مجتہد کسی مسئلے میں نظائر سے عدول کرے اور ان کے خلاف فتویٰ دے دے!"

کتب زیدیہ میں جو تعریف استحسان کی پائی جاتی ہے وہ احناف کی اس تعریف سے متقارب ہے، اس کی بنیاد بھی مقتضائے قیاس ظاہر سے زیادہ شدید التاثیر قیاس کی طرف عدول ہے اگرچہ وہ مخفی ہی کیوں نہ ہو یہ پھر اس کا عدول نص یا اجماع، یا ضرورت کی طرف ہو۔

یہ جملہ ادلہ قائم بذاتہا ہیں لہٰذا ہم انہیں ادلہ ثابتہ کہہ سکتے ہیں، چنانچہ امامیہ ان سے اخذ کرتے ہیں۔ قیاس کے بارے میں ان کا جو موقف ہے اسے ہم بیان کر چکے ہیں وہ قیاس کی نفی کرتے ہیں، البتہ قیاس جلی یا قیاس اولیٰ کو قبول کر لیتے ہیں جس کی علت منصوص ہوتی ہے اکثر امامیہ اس مسلک پر قائم ہیں۔

اس اصول کی بنا پر امامیہ کے ہاں اس استحسان کی جو حنفیہ کے ہاں ہے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مالکیہ کے ہاں استحسان سے مراد قیاس کے مقابلے میں مرسل سے استدلال ہے۔ بشرطیکہ مصلحت کا تقاضا موجب قیاس سے عدول کا ہو، کیونکہ وہ مقاصد شارع کی روح کو محفوظ رکھتی ہے۔

ضروری مثالیں | اس کی انہوں نے کئی مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً خیار شرط ان کے ہاں موروثی ہو

سکتی ہے اگر ورثہ قبول کرلیں تو اسے نافذ کیا جا سکتا ہے، لیکن بعض اسے رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مقتضائے قیاس یہ ہے کہ اسے بائع قبول کرے، ورنہ بیع ختم کردے، لیکن یہ مقتضائے مصلحت اس کی اجازت دی گئی ہے کہ اگر وارث رضامند ہوں کہ نفاذ بیع کردیا جائے تو بیع کا اخذ درست ہوگا اور بائع کو اس وضع کے قبول کر لینے پر مجبور کیا جائے گا کیونکہ اس کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔

لیکن امامیہ استحسان مالکی کو قبول نہیں کرتے کیونکہ یہ قیاس پر قائم ہے جو قابل قبول نہیں۔

مصلحت مرسلہ

اور مصلحت مرسلہ وہ مصلحت ہے جس کے الغاء کی کوئی دلیل ہو نہ اثبات کی بشرطیکہ اس کے سوا کوئی دلیل نہ ہو، مالکیہ اسے قبول کرتے ہیں اور ہر مصلحت کو حکم منصوص علیہ میں داخل سمجھتے ہیں اگر نص موجود نہ ہو، لیکن اس کے اخذ کی شرط یہ رکھتے ہیں کہ مقاصد شارع سے ہم آہنگ ہو اور اصل موضوع پر کوئی نص موجود نہ ہو گویا اس کی روح ہے دفع حرج اور طلب سہولت، اور یہ نصوص قرآن سے بالکل مطابق ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔

(اللہ تمہارے ساتھ آسانی پسند کرتا ہے دشواری نہیں)

یا رسول اللہ صلی اللہ کا ارشاد گرامی۔

"آسانی پیدا کرو، دشواری نہ پیدا کرو!"

مصلحت اور امامیہ

مصلحت کے بارے میں امامیہ کا خیال ہے کہ اگر مصلحت شارع کے اوامر اور ادلہ سے ہم آہنگ ہے اور اس کی تائید میں عقلی دلیل موجود ہے۔ یعنی از روئے عقل اسے اختیار کر لینے میں اور اس پر عمل کر لینے میں حفظ دین، نسل، عقل اور مال کا کوئی مفسدہ نہیں ہے تو اقتضائے حکم عقل کے مطابق اسے قبول کر لیا جائے گا۔

اور اگر اس کے اثبات پر کوئی عقلی دلیل موجود نہ ہو اور اس کے ترک پر دلیل موجود ہو تو پھر اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ یہ امور دین میں ایک طرح کا مفسدہ ہے اور شارع کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے امر کا حکم دے جس میں کسی طرح کی مضرت ہو۔

اور اگر کوئی ایسی دلیل موجود نہ ہو جو مصلحت مرسلہ کے الغاء یا اعتبار پر دلالت کرتی ہو تو امامیہ اسے قبول نہیں کرتے۔

"القوانین المحکمہ" میں اس سے متعلق وارد ہوا ہے:۔

"مصلحت مرسلہ یعنی جسے شارع نے نہ معتبر قرار دیا ہو نہ اس کے ترک کا کوئی حکم ہو، اور وہ مفسدے سے خالی ہو تو اس کی حجیت بعض عامہ نے تسلیم کی ہے۔ لیکن ہمارے اصحاب اور اکثر عامہ نے اس کی نفی کی ہے اور یہی مسلک حق ہے کیونکہ اس کی حجیت پر کوئی دلیل نہیں ہے[1]!"

مصلحت مرسلہ پر عمل کی نفی

اس تصریح سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امامیہ مصلحت مرسلہ پر عمل کی نفی کرتے ہیں اور جو لوگ اس پر عمل کے قائل ہیں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔

لیکن بخصوص مذہب اثنا عشری کے سلسلے میں ہم نے جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ امامیہ مصلحت مرسلہ پر عمل کرتے ہیں، کیونکہ اسے وہ دلیل عقل میں شمار کرتے ہیں، کیونکہ امام مالک نے مصلحت مرسلہ کے لئے جو شروط رکھے ہیں یعنی دفع حرج اور جلب سہولت، اور مقصد شارع سے ہم آہنگی ان کی مخالفت عقل نہیں کر سکتی، لہٰذا وہ داخل حدود عقل متصور ہوگی، اور وہ ہمیشہ عقل کو حاکم تصور کرتے رہے ہیں، بشرطیکہ نص موجود نہ ہو، عدم موجودگی نص کی صورت میں عقل اس کی شاہد بن جاتی ہے اور وہ کسی ایسے امر کا انکار نہیں کر سکتی جس میں مصلحت ہو اور مفسدہ نہ ہو!

---

[1] القوانین المحکمہ، قانون مما یستدل بہ العامۃ الاستحسان۔

مذہب جعفری میں ——
اجتہاد، اور اس کی نشوونما کے مراحل

ہمہ پہلو حیثیت | اپنی وسعت اور کشادگی کے اعتبار سے مذہب جعفری ہمہ پہلو حیثیت رکھتا ہے اور اس کا سبب یہی ہے، گیارہ ائمہ کے ثمرات فکر اسے حاصل ہیں جن میں سرفہرست امام ہدیٰ علی بن ابی طالب ہیں، ان ائمہ کا سلسلہ مین وسعادت سوا دو سو سال تک جاری رہا، اگر کہیں خوبی بخت سے ایسا ہوسکتا کہ ان جملہ ائمہ کرام کے اقوال مدون ہوجاتے اور انہیں خوبی کے ساتھ مرتب کرلیا جاتا تو بلاشبہ وہ گراں بہا ثروت ہوتی اس لئے کہ یہ مسلم حقیقت ہے کہ ان ائمہ کرام نے فقہ کو بہت کچھ دیا، اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ مذہب اثنا عشری نے وسعت حاصل کرلی اور جیسا کہ ہمارے برادران اثنا عشریہ کا خیال ہے یہ ائمہ کرام حامل الہام بھی تھے۔ لہٰذا اس مذہب کے توسع میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ کیوں کہ یہ ائمہ کرام اس مدت مدیدہ طویلہ میں برابر تبیین احکام شرعیہ فقہیہ کرتے رہے۔

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب اثنا عشری برادران امامیہ کے نقطۂ نظر سے اور خود ہمارے نقطۂ نظر سے بھی ایک بھاری بھرکم مذہب ہے، مختصر الفاظ میں وہ ایک مذہب کبیر ہے لیکن متحد نہیں ہے جیسا کہ اثنا عشری اخباریوں کا مسلک ہے، اخباریوں کا مسلک یہ ہے کہ گیارہ اماموں سے جو اخبار مروی ہیں وہ ان پر آ کر ٹک جاتے ہیں، تجاوز نہیں کرتے اس لئے کہ ائمہ معصومین نے جو فقہی ترکہ چھوڑا ہے، وہ ہر اعتبار سے کافی ہے۔ اعتقاد اور ایمان ہر جہت سے کافی ہے اس لئے کہ ائمہ کا مقصد زندگی صرف یہ تھا کہ ہدایت کریں اور جو احکام مختلف عصور میں پائے جائیں ان کی تبیین کریں اللہ کو ضرورت نہ تھی کہ ان میں سے ایک کو پردۂ غیب میں چھپا لیتا، لیکن خود مصلحت عباد غیبت کی متقاضی تھی اور جب بھی وہ ان کے ظہور کے محتاج ہوں گے وہ ظاہر ہوجائے گا اور بیان احکام کرے گا اور ہدایت وارشاد کی طرف انہیں دعوت دے گا۔ —— یہ اخباریوں کا مسلک ہے لیکن ان کی اکثریت نہیں ہے۔

اخباریین کا جو منہاج ہے اس کے مطابق مذہب متجدد نہیں ہو سکتا۔

منہاج اصولیئین لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اصولیین کے منہاج پر عامل ہیں اور وہ یہ ہے کہ اثناء غیبت امام میں اجتہاد سے کام لیا جا سکتا ہے اس لئے کہ حوادث اپنے وقوع میں متجدد ہیں، اور ہر زمانے میں جو حوادث وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں ان میں ہر حادثے کے لئے شریعت کا حکم موجود ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ائمہ معصومین کے اقوال ماثورہ ان تمام کو شامل ہوں، کیونکہ اقوال ائمہ سے حوادث کا **استخراج** احکام بحث و استقصاء اور اجتہاد کا طالب ہے اخبار مرویہ میں کچھ متواتر ہیں، کچھ آحاد ہیں، آحاد میں کچھ ایسے ہیں جو محتاج قرائن ہیں کہ درجہ یقین حاصل ہو جائے۔ اور کچھ ایسے ہیں جو قرائن نہیں رکھتے تو اگرچہ انہیں لے لیا جائے گا، لیکن ہوں گے وہ حکم ظن میں کچھ قوی ہیں، کچھ حسن ہیں، کچھ موثق ہیں، کچھ ضعیف ہیں۔

پھر ایک مرحلہ اور ہے!

یہ مرحلہ ہے تعارض روایات کا۔ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک مقیاس ضابطہ کی ضرورت ہے تاکہ ان کے مابین کسی کو ترجیح دی جا سکے، یا ممکن ہو تو توفیق سے کام لیا جائے اور سعی توفیق کے باوجود اگر تعارض مستمر رہے تو یہ کوشش کی جائے گی کہ معلوم کیا جائے کہ ان میں سے کون ایسا ہے جس پر عمل کیا جائے؟ — پس اجتہاد لازمی ہے۔

اس بنیاد پر اجتہاد لازمی اور لابدی ہے:

اور اجتہاد صرف ترتیب اخبار تک یا قوی ترین خبر کے اخذ تک محدود نہیں ہے، نہ مراتب ظن و یقین تک مقصود ہے بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور توجیہہ معصومین و ہدایت ائمہ کی روشنی میں ہر عصر اور ہر عہد امامت میں وقائع جدیدہ کے احکام مرتب کرتا ہے جس کا ثمرہ وہ بیش بہا ترکہ علمی و فقہی ہے جو امامیہ کے پاس موجود ہے۔

اخبار مرویہ سے جب احکام حوادث کا استخراج ممکن نہیں رہتا تو عقل سامنے آتی ہے، اور اس کا حکم مشکل کو آسان بنا دیتا ہے، کیونکہ تحکیم عقل اذن امام کے باعث ہے، عقل جو فیصلہ کرتی ہے وہ امام کے محل رضا میں ہوتا ہے اور اگر عقل کا فیصلہ رضائے امام کے خلاف ہو تو وہ ظاہر ہو کر حق کا اعلان کر دے گا، کیوں کہ اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ امت محمد کو ضلال اور گمراہی میں چھوڑ دے۔

باب اجتہاد مفتوح ہے

امامیہ نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے اسے بند نہیں کیا ہے بلکہ زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دروازہ کسی اور نے نہیں خود ائمہ کرام نے کھولا ہے اور اسے بند کرنے سے روکا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے ائمہ سے نہی تقلید کی بکثرت روایت کی ہے اور جب تک تقلید کی نہی ثابت ہے۔ اب اجتہاد کا بند کرنا ممنوع ہے۔

اور نہی تقلید حضرت امام جعفر صادق سے مروی ہے چنانچہ "الکافی" میں وارد ہے:

"ابو بصیر ابو عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت امام سے عرض کیا:

"انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو خدا کے علاوہ اپنا رب بنا لیا ہے۔"

حضرت امام نے فرمایا

خدا کی قسم ان احبار اور رہبان نے لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی اگر وہ ایسا کرتے تو کوئی ان کی بات نہ مانتا۔ البتہ انہوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا اور اس طرح غیر شعوری طور پر لوگ ان کی عبادت میں لگ گئے۔"

ابو بصیر ہی سے ایک اور روایت اللہ تعالیٰ کے اس قول

اتخذوا احبارهم ورهبانهم من دون الله۔

کے سلسلے میں امام صادق سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

"خدا کی قسم لوگوں نے ان احبار اور رہبان کے لئے نہ روزے رکھے، نہ ان کے لئے نماز پڑھی البتہ ان احبار و رہبان نے لوگوں کے لئے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا اور وہ ان کی پیروی کرنے لگے"!

نہی تقلید کا اقتضاء

مذکورہ دونوں خبروں سے اور اس طرح کی دوسری بہت سی خبروں سے ثابت ہے کہ جملہ اصولیین کے ہاں باب اجتہاد مفتوح ہے، کیونکہ نہی تقلید کا اقتضاء یہ ہے کہ آدمی زیادہ قوی دلیل کا جویاں رہے اور ایسے ماخذ کی تلاش میں رہے جس سے حکم مل سکے اور دیکھے کہ آیا یہ اللہ کی کتاب کریم میں ہے یا نبی امین کی سنت میں، یا قول معصوم میں، یا قول عقل میں ہے؟ اور اس تلاش و جستجو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مستفتی موضع نہی میں واقع ہونے سے بچا رہتا ہے اور وہ کسی ایسی ہستی کے سامنے سر نہیں جھکاتا جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے۔

مواضع استدلال کی معرفت لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ہر انسان کی طاقت میں ہے کہ مواضع استدلال کی معرفت حاصل کرلے اور انہیں پہچان لے؟ منابع احکام سے واقف ہو جائے؟ اور ایسا منہاج پالے جس سے استخراج مسائل کر سکے؟ اور صحیح و مستقیم استدلال میں مقائسہ کر سکے؟ تاکہ بغیر دلیل اور بینہ کے پیروی سے بچا رہے؟ یا زیادہ واضح الفاظ میں، کیا تمام انسانوں کے لئے ممکن ہے کہ ہر زمانے میں وہ تقلید سے کنارہ کش رہیں؟ ہر زمانے میں انسان دو قسموں میں منقسم رہتے ہیں۔

(۱) ایک قسم مشتمل ہوتی ہے ان علماء پر جو فقہ اسلام میں تخصیص رکھتے ہیں اور قرآن و سنت سے توفت احکام کر سکتے ہیں۔

(۲) دوسری قسم اور اکثریت اسی قسم میں داخل ہے، ان لوگوں کی ہے جو عقلی اور علمی اعتبار سے یہ پایہ نہیں رکھتے کہ اصل سرچشموں سے توفت احکام کر سکیں، یا قوت دلیل کا اندازہ کر سکیں۔ بلاشبہ یہ لوگ دوسروں کی تقلید پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنے مفتی کی پیروی کرنے لگتے ہیں، یہ اس نہی میں نہیں گرتے جس کی روایت کلینی نے امام صادق سے کی ہے۔

اور یہ مفتی کیا کرتے ہیں؟

یہ مفتی اپنی طرف سے اور اپنی مرضی سے فتوی نہیں دیتے کہ جو چاہیں حلال کر دیں اور جسے مرضی ہو حرام کر دیں۔ بے دھڑک اللہ تعالیٰ پر افترا پردازی کر گزریں — یہ ایسا اس لئے نہیں کر سکتے کہ آزاد اور خود مختار نہیں ہیں۔

یہ لوگ پابند ہیں — یہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہؐ اور اقوال ائمہ معصومین کے حدود سے باہر قدم نہیں نکال سکتے۔

یہ اس اجماع سے بھی باہر نہیں جا سکتے جو ان سے پہلے منعقد ہو چکا ہے۔

پس معاملہ ان مفتیوں کے ہاتھ میں اس طرح نہیں ہے کہ یہ بالکل آزاد ہوں، ہر ضابطے اصول اور نظام سے بے نیاز ہوں، یہ ان سب کے پابند ہیں اور اس قید سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتے!

امامیہ کے ہاں تقلید کب جائز ہے؟ لہٰذا امامیہ کے ہاں ان لوگوں کے لئے تقلید جائز ہے جو فقہ اسلامی میں درک و مہارت

نہیں رکھتے اور یا یہ اختصاص پر فائز نہیں ہیں۔

لیکن جہاں تک میت کی تقلید کا تعلق ہے، یہ ایک اختلافی اور نزاعی مسئلہ ہے۔

ایک جماعت تقلید میت سے منع کرتی ہے، کیونکہ اس کے نزدیک استفسار صرف ہستی زندہ ہی سے کیا جا سکتا ہے، کیونکہ زندہ مجتہد ہی فقہ فتوی کا صحیح اندازہ لگا سکتا، اور اس کے مضمرات سے آشنا ہو سکتا ہے اور فقہ فتوی کا اقتضا یہ ہے مستفتی کے حالات سے بھی واقفیت ہو اور اس واقعے سے بھی جس میں استفتا جاری ہوا ہے نیز یہ بھی کہ فتوے کا نتیجہ کیا ہو گا؟ — کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مستفتی حیلہ جوئی سے کام لے کر شر پسندی کا ثبوت دے رہا ہو؟

مفتی اور طبیب

ان حالات میں مفتی ایک طبیب کی طرح ان مشکلات کا ازالہ کرے گا جو واقعی ہیں اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ مفتی واقعے سے اس کے باعث سے اسباب و محرکات سے، طرق علاج سے، علاج شرعی سے اور نتائج فتوی سے واقف ہو، — اسے اصطلاح میں فقہ واقعہ کہتے ہیں۔

اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مفتی اصل واقعے کی رخ کو بہت اچھی طرح سے سمجھ جاتا ہے اور یہ فہم اسے کذب، یا سنت، یا اقوال ائمہ یا مواطن اجماع، اختلافات فقہ امامیہ، اشباہ اور امور میں حکم عقل سے علاج کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

ان تمام باتوں کا اقتضا یہ ہے کہ مفتی زندہ ہو، موضع ابتلاء کے فہم وا فہام سے عاری نہ ہو۔

اور چونکہ میت سے یہ فوائد نہیں حاصل ہو سکتے، لہٰذا تقلید میت سے یہ لوگ منع کرتے ہیں، بجز اس صورت کے کہ میت نے فتوی دیا ہو، پھر اس کی موت واقع ہو گئی ہو، اس صورت میں یہ فتوی مستمر رہے گا اور جدید استفتاء کی ضرورت لاحق نہیں ہو گی۔

درحقیقت اس طرح کے فتوے کا شمار، نوع استصحاب فتوی میں ہوتا ہے، جب کوئی نیا راستہ واقع ہو گا اس سے پیدا شدہ حالات کے لئے نیا استفتا درکار ہو گا۔

علماء امامیہ کے ایک گروہ کی یہ رائے تھی جو ہم نے سطور بالا میں پیش کی، اس رائے کی روشنی میں مفتی کے لئے ضروری ہے کہ!

• صاحب اجتہاد ہو
• خود اپنی ذاتی رائے رکھتا ہو
• دوسرے کی رائے سے کام نہ چلاتا ہو۔

تقلیدِ میّت کا مسئلہ ایک دوسرا گروہ ہے جو تقلید میت کو روا رکھتا ہے۔ اس گروہ کے نزدیک ایک عامی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنے مفتی سے دوسرے مجتہد کی رائے طلب کرے۔

مثلاً ایک عامی شخص اگر اپنے مفتی سے سوال کرتا ہے کہ اس نے رمضان میں بہ حالت روزہ غلطی سے کچھ کھا پی لیا تو اب وہ کیا کرے؟ — افطار کرے یا افطار نہ کرے؟
مفتی کے لئے جائز ہے کہ کہہ دے۔
"افطار کر لے کیونکہ فلاں امامی عالم نے اس کی اجازت دی ہے۔

تقلید صرف فروع میں جائز ہے لیکن امامیہ کے ہاں تقلید صرف فروع میں جائز ہے لیکن جہاں تک اصول کا تعلق ہے۔ اس کا تعلق اعتقاد سے ہے، پس امامیہ کے ہاں قول مشہور یہ ہے کہ اصول میں تقلید جائز نہیں ہے۔

امامیہ کے ہاں اصول کا تعلق ہے، وحدانیت، رسالت اور امامت سے۔
جن اسباب کی بنا پر امامیہ اصول میں تقلید کی ممانعت کرتے ہیں وہ یہ ہیں:
(۱) بتوں کی پرستش کے سلسلے میں تقلید آباء پر مشرکین کو عار دلانے والی آیات وارد ہ۔ اور وہ آیتیں جو یقین و علم کی دعوت دیتی ہیں ظن سے منع کرتی ہیں، کیونکہ علم کا حصول صرف ادلہ سے ممکن ہے یہ مجرد اتباع سے نہیں آتا۔
چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!
لا تقف ما لیس لک به علم
(جس چیز کا تمہیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے مت پڑو۔)
مطلب یہ کہ جس بات کا تمہیں یقین قاطع حاصل نہیں ہے اس کے پیچھے مت پڑو۔
یا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
وما لهم به علم ان یتبعون الا الظن۔
(ان کے پاس علم نہیں وہ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں)

یا خدائے بزرگ و برتر کا یہ ارشاد۔
ومن الناس من یجادل فی اللّٰہ بغیر علم۔
(ایسے لوگ بھی ہیں جو اللّٰہ کے بارے میں بے جانے بوجھے جھگڑتے ہیں)
ان تمام آیتوں سے اس بات کی صراحت ملتی ہے کہ واجب ہے ایمان دلیل پر مبنی ہو، نہ کہ تقلید پر پس اگر تقلید کا دروازہ کھول دیا گیا تو مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا جو مشرکین کا ہوا، یعنی بغیر جانے بوجھے اندھا دھند پیروی کرنے لگیں گے۔
(۲) وحدانیت کے بارے میں کلام کرتے ہوں، اللّٰہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ حصول علم کا حکم دیا ہے اور ظاہر ہے کہ علم قطعی اور لازمی دلیل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔
(۳) اصول دین میں وجوب یقین پر مسلمانوں کا اجماع ہے اس میں ظن کام نہیں دے سکتا۔ اور ایمان اسلام کا لب لباب ہے اور کوئی شخص مسلمان نہیں مانا جا سکتا جب تک عقائد اسلامیہ پر اسے یقین جازم نہ ہو۔
(۴) ابو عبداللّٰہ جعفر الصادق سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آپ سے ایمان کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا۔
"ایمان نام ہے وحدانیت کا اور جو کچھ اللّٰہ کے پاس سے آیا ہے اس کے اقرار کا اور دل سے اس کی تصدیق کا۔"
اور کھلی ہوئی بات ہے جب تک علم قطعی حاصل نہ ہو کوئی بات دل میں کیونکر بیٹھ سکتی ہے؟ اور علم اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک دلیل قطعی اس کی تائید میں موجود نہ ہو۔

وجوب تقلید کی دلیلیں | یہ تمام دلیلیں اصول اعتقاد میں منع تقلید کی ہیں:۔ لیکن جو لوگ اصول اعتقاد میں وجوب تقلید کے قائل ہیں۔ ان کے ادلہ یہ ہیں:۔
(۱) بغیر کوئی دلیل مانگے ہوئے قبول اسلام کے بارے میں اخبار موجود ہیں۔ چنانچہ مروی ہے کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی حاضر ہوا۔ اس نے بغیر کسی سوال یا طلب دلیل کے اسلام قبول کرلیا چنانچہ اخبار میں وارد ہے کہ آپؐ نے فرمایا
علیکم بدین العجائز (یعنی تمہیں چاہیئے کہ بوڑھی عورتوں کا سا دین رکھو)

کیونکہ (اپنے اعتقاد میں) وہ کسی دلیل سے واقف نہیں ہوتیں۔
(۲) امام صادق نے قضا و قدر پر غور و خوض کرنے سے منع کیا ہے اور ان سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی نہی فرمائی تھی اور قضا و قدر پر ایمان رکھنے کا حکم دیا تھا جو جزو ایمان ہے۔
(۳) سلف صالح سے ثابت ہے کہ جدل فی العقائد جسے وہ علم کلام سے موسوم کرتے ہیں غیر مستحسن ہے
(۴) اصول ایک دلیل ہے لیکن بہت گہری اور عمیق جس کا ادراک ایک عامی نہیں کر سکتا، لہٰذا فروع میں تو اجتہاد کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ رائے حق ہے۔ لیکن اصول (اعتقاد) میں تقلید ہی اولیٰ ہے۔
(۵) یہ بات ثابت ہے کہ قول نبیؐ، قول امام اور اہل عادل وثقہ سے یقین پیدا ہوتا ہے دلیل و برہان نہیں طلب کی جاتی۔ بلکہ بسا اوقات دلائل سے شک اور بڑھ جاتا ہے اور نافذ البصیرت ثقہ اور مامون شخص کے قول سے اس طرح کا شک و ریب دور ہو جاتا ہے
(۶) اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے۔
فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون (اہل ذکر سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے)
آنس رضا کریم کو لوگوں نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔
(۱) اہل ذکر سے دریافت کرنے کا مطلب ہے دلائل کے ساتھ طلب حقائق
(۲) اس سے اہل ذکر کی تقلید ثابت ہوتی ہے (یعنی جو وہ کہیں مان لو)

جواز تقلید پر علماء امامیہ کا اختلاف یہ ہے اصول میں جواز تقلید پر علماء امامیہ کا اختلاف اور یہ نقطہ نظر اس مسلک کے خلاف ہے جو جماہیر علماء کے مابین جاری ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ استدلال کرتے ہوئے ان کے دلائل ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔

صرف دلیل سبیل ایمان نہیں ہے ہم ان تمام مباحث کی روشنی میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں یہ ہے کہ صرف دلیل ہی سبیل ایمان نہیں ہے۔ نہ صرف نظر حصول اذعان و یقین کے لئے کافی ہے اور نصوص عقائد محکمہ سے جہل روا نہیں، علم عامہ میں سے ہے جس سے کوئی مومن لاعلم نہیں ہو سکتا! اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عقائد میں تقلید جائز نہیں، نہ ادلۂ عقلیہ حاصل ہو سکتے ہیں، یہ تو صرف نقول شرعیہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور وہی کافی بھی ہے۔
یہ بات اصل عقیدے کے بارے میں ہے رہے تفریعات مثلاً صفات عین ذات ہیں یا

مجتہد کی حیثیت

مذہب امامیہ اثنا عشریہ یہ ہیں

مجتہد کی چار قسمیں فقہاء نے مجتہد کو چار اقسام رتبیہ میں تقسیم کیا ہے، ان میں سے ہر قسم مرتبہ اجتہاد پر فائز ہے، وہ ہر چہار اقسام یہ ہیں:

(۱) مرتبۂ اجتہاد مطلق وہ مجتہد جو مرتبہ اجتہاد مطلق یا اجتہاد مستقل پر فائز ہوتا ہے۔ مجتہد مطلق یا مستقل اپنے اجتہاد سے استخراج مسائل کرتا ہے یہ اپنے منہاج میں مستقل ہوتا ہے، اسی منہاج پر استخراج احکام کرتا ہے۔

اس قسم مجتہد کو علماء اصول و فروع دونوں کا مجتہد مانتے ہیں۔

(۲) مجتہد فی الفروع یہ اجتہاد کا دوسرا مرتبہ ہے، اس مجتہد کو مجتہد فروع کہتے ہیں۔ یہ مجتہد اصول میں امام کی پیروی کرتا ہے اور فروع میں خود اجتہاد سے کام لیتا ہے۔ نتائج فروع تک پہنچنے کے لیے امام نے جو اصول مقرر کئے ہیں، ان میں تطبیق دیتا ہے۔

اس مجتہد کو مجتہد منتسب کہتے ہیں۔

اصحاب شافعی میں فلاں کی مجتہد منتسب تھے۔ اصحاب مالک میں عبدالرحمٰن بن قاسم ابن وہب، ابن عبدالحکم وغیرہ مجتہد منتسب تھے۔

بعض احناف کہتے ہیں کہ اصحاب ابو حنیفہ میں یہی پایہ ابو یوسف محمد اور زفر کا تھا۔ لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ مذکورہ ہر سہ فقہاء مجتہد مستقل تھے، مجتہد منتسب نہیں تھے، گو اپنے شیخ ۔ ابو حنیفہ ۔ کے علم کو زندہ رکھنے کے بڑے حریص تھے، کیونکہ یہ حضرات اپنے شیخ ابو حنیفہ سے اکثر اصولوں میں متفق تھے، صرف بعض میں اختلاف کرتے تھے اور درحقیقت اسی اختلاف نے انہیں مرتبہ انتساب سے، مرتبہ استقلال پر فائز کر دیا ہے۔

(۳) تیسری قسم اجتہاد یہ مجتہدین مخرجین کہلاتے ہیں، یہ علل احکام کا استخراج کرتے ہیں۔

خارج از ذات تو یہ ایسے امور ہیں جن کی طرف سرے سے متوجہ ہونے ہی کی ضرورت نہیں ان سے متعلق ادلہ کی تلاش تو اور زیادہ بے سود ہے۔

مومنین اولین میں بہت سے ایسے تھے جو آپؐ کی امانت کے باعث صدق رسالت پر ایمان لے آئے۔

روایت ہے کہ ایک اعرابی آپؐ سے ملا اس نے کہا۔

''کیا قریش آپ ہی کو کذاب کہتے ہیں؟''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا ہاں!

اعرابی نے کہا، غلط کہتے ہیں "یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہو سکتا!"

تو کیا اسے غیر مومن اس لئے کہہ دیا جائے گا کہ اس نے کوئی دلیل قبول اسلام کے لئے نہیں طلب کی تھی؟

شروطِ اجتہاد پر ایک نظر ڈال لیں۔

یہ شرائط قبولِ اقوالِ ائمہ سے متعلق نہیں ہیں کیوں کہ ان کا علم الہامی ہوتا ہے اور جب یہ صورت ہے تو ان سے اجتہاد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

امامیہ مجتہد کے لئے حسبِ ذیل شرطیں رکھتے ہیں:

۱۔ عربی زبان پر عبور | مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان پر غیر معمولی دسترس اور کمال رکھتا ہو تاکہ بغیر کسی وقت اور دشواری کے زبانِ عربی کے مقررات و اسالیب اور تصریف کلمات کے فہم پر قادر ہو سکے۔

۲۔ علم کلام سے واقفیت | مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ علم کلام سے واقف ہو یعنی حدوثِ عالم کی ادلہ مثبتہ سے واقف ہو، وحدانیت خالق سے آشنا ہو، صفاتِ الٰہی سے باخبر ہو۔

اور اس علم کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں کیا خوبیاں رکھی ہیں، اپنی شرع میں اصول عدل کو کس طرح ملحوظ رکھا ہے، بندوں کے ساتھ اس کے وعدۂ وعید کی کیا کیفیت ہے، اسے اس کی معرفت بھی ہونی چاہئے کہ خدا اپنے بندوں پر ظلم روا نہیں رکھتا نہ اس سے کسی فعل قبیح کا صدور ہو سکتا ہے نہ وہ کسی فعل مستحسن سے منع کر سکتا ہے۔

۳۔ کتاب اللہ کا علم | مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری اور بسا ضروری ہے کہ کتاب اللہ کا پورا پورا علم رکھتا ہو۔

- اس کے ناسخ اور منسوخ سے واقف ہو۔
- اس کے عام و خاص پر اس کی نظر ہو۔
- طریق ائمہ سے سنت مرویہ کو بخوبی جانتا ہو۔
- اور خود ائمہ سے جو مرویات ہیں ان پر پوری نظر رکھتا ہو، کیونکہ ائمہ کرام درحقیقت علم کے سرچشمے ہیں اور پانی اس وقت تک نہیں حاصل کیا جا سکتا جب تک چشمے کا سراغ نہ لگ جائے۔

جو شخص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے پورے طور پر واقف نہیں ہے وہ اجتہاد کا اہل نہیں ہے۔

اوران اقیسہ کا جن پر علل کی بنیاد قائم ہے، ان ادلہ سے کام لیتے ہیں جو مذہب میں مدّون ہو چکی ہیں۔

یہ مرتبۂ اجتہاد اگرچہ مذکورہ بالا دونوں قسموں سے کم ہے لیکن یہی مجتہدین ہیں جو بناء مذہب کو محکم کرتے ہیں، اس کے قواعد وضع کرتے ہیں اور اشباہ و نظائر سے کام لیتے ہیں۔

(۴) چوتھی قسم اجتہاد | مخرجین مذہب قسم اول و دوم سے کم ہیں یہ لوگ قواعد کا انطباق ان وقائع پر کرتے ہیں جو نئے نئے پیدا ہوتے ہیں، فکر و نظر میں یہ ایک دوسرے سے اختلاف بھی کرتے ہیں، لیکن یہی اختلاف مذہب کے نمو کا سبب بنتا ہے جس سے اس کے آفاق میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور وہ ہمہ پہلو بن جاتا ہے۔

جب تک اختلاف کی بنیاد اجتہاد فقہی پر قائم ہے، خواہ اس کی صورت کچھ بھی ہو، اس میں خیر کا پہلو بہت زیادہ ہے اور ضرر کے مقابلے میں نفع کی کوئی انتہا نہیں۔

ان اقسام چہارگانہ کے بعد جو لوگ آتے ہیں یہ مقلد کہلاتے ہیں اب اگر ہم اقسام اجتہاد کی زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں:

- **جو اپنے اجتہاد میں کسی کے مقلد نہیں ہوتے** ۔ یہ مجتہد مستقل کہلاتے ہیں
- وہ مجتہد جو اصول و فروع دونوں میں تقلید کرتے ہیں، لیکن اگر نص مذہب میں موجود نہ ہو تو اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔
- مجتہدین کی چوتھی قسم بھی اس تیسری نوعیت کے ذیل میں آتی ہے۔
- مجتہدین کے بعد جو لوگ آتے ہیں یہ مقلد کہلاتے ہیں، ان کا سرمایہ صرف تقلید ہوتا ہے لیکن یہ بھی صاحب مراتب ہوتے ہیں۔
- ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو اصحاب ترجیح کہلاتے ہیں۔ یعنی دو قولوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

امامیہ کے شروط اجتہاد | مذہب جعفری میں ان مجتہدین میں کون سی قسم پائی جاتی ہے؟ آیا مجتہدین امامیہ مجتہد مستقل ہیں یا مجتہد منتسب یا اصحاب تخریج؟ دوسرے الفاظ میں سوال یہ ہے کہ آیا امامی مذہب میں مجتہدین مستقلین ہوتے ہیں؟ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سوال کو زیر بحث لائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امامیہ کے

ہم کہتے ہیں کہ اس مسئلے کے سلسلے میں دو نقطہ نظر ہیں، جن پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔
ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ امامیہ کے ہاں مجتہد کسی دوسرے مجتہد کا تابع نہیں ہوتا، نہ اصول میں نہ فروع میں، وہ صرف امام معصوم کا تابع ہوتا ہے۔

پس ہم بے تامل یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ جو مجتہد کتاب و سنت کے علم و فن سے بہرہ ور ہو۔ اور اقوال ائمہ سے پورے طور پر واقف ہو، وہ مجتہد مطلق ہوتا ہے، اسے مجتہد منتسب نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اگر وہ منہاج امام کی پیروی کرتا ہے تو مصادر اسلام کے مصدر اول کی پیروی کرتا ہے۔ کیونکہ امام نے استنباط فقہی کے لئے جو منہاج وضع کیا ہے وہ وحیٔ آسمانی کا تابع ہے کسی ایک شخص کا استنباط نہیں ہے، لیکن کبھی اجمالی ضرور ہوتا ہے اس لئے اجتہاد کی ضرورت دائمی ہوتی ہے۔

(۳) مجتہد کے لئے ایسے مناہج وضع کرئے گئے ہیں، جن کی وجہ سے وہ احکام فروع اور احکام عموم سے واقف ہو جاتا ہے، نیز طرق استنباط بھی اس کے علم میں آ جاتا ہے اسے یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ از خود کوئی طریقہ وضع کرے، بلکہ اپنے اجتہاد میں وہ ایسے راستے پر گامزن ہوتا ہے جو پہلے سے موجود ہے۔ اسے کوئی کھکھیڑ نہیں اٹھانی پڑتی، ایک بندھا ہوا راستہ ہے جس پر چلنا پڑتا ہے اس راستے سے نہ وہ تجاوز کر سکتا ہے نہ اس سے دوری اختیار کر سکتا ہے، نہ دائیں بائیں کسی طرف جنبش کر سکتا ہے۔

اس نقطہ نظر سے وہ درجہ مجتہد منتسب پر فائز ہوتا ہے، نہ کہ مجتہد مطلق کے مرتبے پر۔

اس طرح جو شخص اخبار ائمہ سے ناواقف ہے، وہ بھی اجتہاد کی قوت سے بے بہرہ ہے۔

۴۔ طرق استنباط کا درک

مجتہد کو طرق استنباط سے بھی بہت اچھی طرح واقف ہونا چاہیئے۔ مناہج استدلال بھی اس کے علم میں ہونے چاہئیں اور اخبار مختلفہ میں طرق توفیق کا علم بھی اسے ہونا چاہیئے اور ان کے مراتب کا رمز آشنا بھی اسے ہونا چاہیئے۔

۵۔ مسائل اجماعی کا علم

مجتہد کے لئے یہ شرط بھی ہے کہ وہ مذہب کے مجمع علیہ یعنی اجماعی مسائل سے اچھی طرح واقف ہو اور اپنے اجتہاد میں اجماعی مسائل سے اختلاف نہ کرتا ہو کیونکہ اجماع امام غائب کی رائے کا کشف کرنے والا ہے اور امام کی رائے ہر حالت میں واجب الاتباع ہے، لہٰذا لازمی ہے کہ وہ اس سے واقف ہو۔

۶۔ ذہانت اور فطانت ضروری ہے

مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ذہین اور فطین ہو، ذکی اور مدرک حقائق اشیاء ہو تاکہ مواضع حسن و قبح کی معرفت اس کے لئے دشوار نہ ہو کیونکہ حسن و قبح کا ادراک صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اشیاء اور اشخاص اور اعمال کے طبائع سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں۔

۷۔ مواضع اختلاف سے واقفیت

مذہب امامی کے مواضع اختلاف سے بھی مجتہد کو بخوبی واقف ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ بغیر کسی زحمت اور دشواری کے اجتہاد کر سکے۔ کیونکہ معرفت اختلاف کے بغیر کسی مسئلے میں وہ اجماع مرکب کی معرفت نہیں حاصل کر سکتا، اس لئے کہ اجماع مرکب میں قول دو دائروں کے اندر دائر رہنا چاہیئے اور تیسرے قول کا احداث نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مذکورہ دو دائروں کے اندر ہی رائے امام موجود ہے لہٰذا وہ رائے امام کی حجت کا کاشف ہے۔ کیونکہ اگر یہ دونوں اقوال غلط ہوتے تو امام پردۂ غیب سے ظاہر ہو کر حق کا اعلان کر دیتا۔

۸۔ مجتہد کو امامی ہونا چاہیئے

یہ بات تو امور بدیہیہ میں سے ہے کہ مجتہد کو امامی ہونا چاہیئے کیوں کہ اس کے اجتہاد کا تعلق ہی مذہب امامیہ کے حدود تک محدود ہے۔

مستقل مجتہد کون ہو سکتا ہے؟

یہ ہیں وہ اشارات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امامیہ مجتہد کے لئے کیا شرائط رکھتے ہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ جس شخص میں یہ سارے کے سارے اوصاف پائے جائیں آیا اسے مجتہد مستقل کا درجہ ملے گا؟

مرتب کیا ہے، انہوں نے ایک روایت سے دوسری روایت کو منہدم نہیں کیا ہے۔
بلکہ طوسی تو جو پانچویں صدی ہجری کے شیخ الطائفہ ہیں یہاں تک کہتے ہیں۔
"جب دو اخبار میں جمع کی صورت نہ ہو اور دونوں اخبار ثقہ راویوں سے مروی ہوں تو پھر مذہب میں دونوں مانے جائیں گے اور دونوں میں سے کسی ایک پر عمل در آمد جائز ہوگا۔"

مذہب جعفری میں کثرت اقوال کی نعمت | مذہب جعفری میں کثرت اقوال بلا ریب بالکل اس کے شایان شان ہے۔

اس کے باعث تطبیق آسان ہو جاتی ہے اور مفتی عادل وثقہ وامین کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اقوال مذہب میں سے کسی کو اختیار کرے جس سے افتا کی دشواری حل ہو جا سکتی ہے۔
مفتی کی مثال طبیب کی سی ہے اس کے سامنے جڑی بوٹیوں کی جتنی زیادہ کثرت ہوگی مختلف امراض کے علاج میں اسے اتنی ہی آسانی ہوگی ان جڑی بوٹیوں میں سے وہ انہیں چن لیگا جو مریض کے جسم ونفس کی شفا عاجلہ وکاملہ کے لئے موزوں اور مناسب ہوں جو صحت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور ضرر سے بہت زیادہ دور ہوں کیونکہ کچھ دوائیں ایسی ہوتی ہیں جو مرض کا قلع قمع تو کر دیتی ہیں لیکن دوسرے امراض پیدا کر دیتی ہیں اور ان کا ضرر اس مرض سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جس کا علاج کیا جا رہا ہے۔

۳۔ اقالیم مختلفہ | تیسرا عامل ہے ان اقالیم مختلفہ کا وجود جن میں مذہب کو پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں عادات، تفکیر، طبیعی، اقتصادی، اجتماعی اور نفسی رجحان ومیلان کا تباین بھی مذہب کے نمو میں ساز گار ہوتا ہے۔
اصل مرسوم اور غایت مقصود کی اصل سے خروج نہ کرتے ہوئے تعدد طبائع بھی وسعت ونمو میں مدد گار ہوا کرتا ہے۔
اور مذہب میں یہ تعدد ان اشکال احکام سے حاصل ہوتا ہے، جہاں تک مجتہدوں کی رسائی ہوتی ہے۔
مذہب جعفری کی مثال اس نہر جاری کی سی ہے جو رنگا رنگ خطہائے خاک کو سیراب کرتی۔ اور ان سے رنگا رنگ مواد حاصل کرتی اپنی اصل اور عذوبت وشیرینی میں ذرا بھی تغیر کئے بغیر جاری رہتی ہے۔

مذہب اثنا عشری کا نمو

اسباب وعوامل اور محرکات وبواعث

نشو و نما کے تین مراحل کسی مذہب کے نشو و نما کے تین مراحل ہوتے ہیں:۔

۱۔ باب اجتہاد کا مفتوح ہونا یہ کہ باب اجتہاد مفتوح ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشکلات اجتماعیہ، اقتصادیہ اور نفسیہ کی دراست و تحیص کا باب بھی مفتوح ہو جاتا ہے اور ماثور سے خروج اور حلا نص سے تجاوز کئے بغیر از روئے شرایعت ان مشکلات کا علاج بھی آسان ہو جاتا ہے۔

ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ مذہب جعفری نے فقہی جہت سے دروازہ کھلا رکھا ہے جس کے باعث اس میں استمراری طور پر نمو کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اور یہ صلاحیت اس وقت تک قائم اور باقی رہے گی جب تک ایسے مجتہد رہیں گے جو جادہ شریعت، طریق مستقیم اور اتباع قرآن کریم و سنت نبویہ شریفہ پر گامزن ہیں، جو مواضع سے کلمات میں تحریف نہیں کرتے نہ عبارات کو ان کے اصل مواد سے ہٹنے دیتے ہیں، نہ غایات و ثمرات سے احکام کو جدا ہونے دیتے ہیں۔

۲۔ مشکلات کا حل مشاکل مختلفہ فقہیہ کا تدارک کرنے اور اس کی صلاحیت پیدا کرنے اور عوامل نمو میں اضافہ کا جو چیز سبب بنتی ہے وہ مذہب میں کثرت اقوال اور اختلافات کی صورت میں وسعت صدر ہے، کیونکہ ہر مجتہد منہاج مسنون کا التزام کرتا ہے اور اس غایت کا جویا رہتا ہے جس کا مقصد شریعت اسلامی کو ہر طرح کے شائبہ سے پاک و صاف کر دینا ہے۔

بلاشبہ مذہب جعفری میں اقوال مختلفہ کی کثرت ہے روایات بھی بہت زیادہ ہیں۔ مذہب جعفری کے علما نے تعارض دفع کرنے کے لئے ایک نظم قائم کیا اور ایک ضابطہ

مذہب جعفری اقالیم مختلف الالوان میں چین سے لے کر بحر ظلمات تک یورپ کی سرزمین اور اس کے ملحقہ مقامات کو چھوتا ہوا پھیلا اور پھلا پھولا اور مشکلات سے عہدہ برآ ہوا۔

علمار کی کثرت امامیہ میں

مذہب جعفری کے نمو اور ارتقا میں ہم ایک پانچواں عامل بھی شامل کر سکتے ہیں.

یہ پانچواں عامل ہے علماء کی کثرت ــــــ جو ہمیشہ بحث و دراست اور علاج مشاکل مختلفہ میں سرگرم اور مصروف و منہمک رہے.

اللہ تعالیٰ نے اس مذہب کو بہ تعداد کثیر ایسے علماء عطا کئے جو صرف اس کی دراست کے لئے وقف رہے اور مقتضائے حال کے مطابق مشاکل کا علاج کرتے رہے.

اور اگر ان میں تعصب پیدا ہوا تو یہ بھی ان کے مذہب کے لئے مفید ثابت ہوا، اور یہ حسن ڈگر پر قائم تھا قائم رہا اور ہمارے نزدیک یہ تعصب یک طرفہ نہ تھا، بلکہ جوابی تعصب تھا۔ اگر یہ دونوں تعصبات اپنی جگہ چھوڑ دیں تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مسلمان حقائق سے انحراف کئے بغیر محبت و مودت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں!

بلاد و اقالیم

جہاں مذہب اثناء عشری داخل ہوا

اماکن مختلفہ | مذہب امامی اثناء عشریہ اماکن مختلفہ میں پھیلا اور پھلا پھولا، لیکن یہ جہاں جہاں بھی گیا اور بہت سی جگہوں پر گیا کہیں بھی اس نے غالب ترین اکثریت کی صورت اور حیثیت اختیار نہیں کی

یہ مذہب جملہ بلاد امصار میں پہنچا۔

کہیں اس نے کچھ اکثریت حاصل کرلی کہیں اقلیت میں رہا لیکن کثرت وقلت ہر حالت میں اس مذہب کے متبعین نے مذہب جعفری کے فروع تک پر عمل درآمد کا سلسلہ قائم رکھا۔

امام صادق رضی اللہ عنہ کے وجود گرامی تک امامیہ پورے طور پر متفق نظر آتے ہیں ان کے بعد ان میں تفرقہ پیدا ہوا۔

اسماعیلیہ نے امام جعفر صادق کے بعد اسماعیل کو امام مانا اور اثنا عشریہ نے موسیٰ کاظم کے سر پر تاج امامت رکھا، پھر اس کا سلسلہ امامت محمد بن حسن العسکری تک برابر جاری رہا۔

امام حسن عسکری عالم ظاہر سے پردۂ غیب میں چلے گئے اور انہوں نے امام منتظر کی حیثیت اختیار کرلی۔

حقائق بالا کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر اس خطۂ ارض میں جہاں مذہب امامی داخل ہوا مذہب جعفری بھی پہنچا۔

لیکن مذہب امامیہ میں کثرت ہمیشہ اثنا عشریہ — جعفریہ — ہی کی رہی۔

ایران میں مذہب اثنا عشری کو اکثریت حاصل ہے۔

ایران | وہاں سنی بھی ہیں لیکن ان کی تعداد شیعوں سے کم ہے جو سنی مسلمان وہاں ہیں ان میں اکثریت شافعیوں کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مقامات پر شافعی مذہب کو عہد قدیم سے

درخور حاصل رہا ہے

عراق

عراق میں بھی مذہب اثنا عشری کو غیر معمولی اثر ورسوخ اور مرتبہ حاصل تھا۔ وہاں اگرچہ مذہب اثنا عشری کے متبعین کی اکثریت نہیں ہے لیکن ان کی تعداد کم بھی نہیں ہے۔

نجف

بلادِ عراق کے شہر نجف میں اثنا عشری علماء بہ تعداد کثیر موجود ہیں۔ اور بلاشبہ یہ علماء اپنی دراست اور تحقیق و تفحص کے اعتبار سے ایک خاص پایہ اور منزلت رکھتے ہیں۔

علمائے نجف کی خدمت میں جملہ بلادِ عالم اسلامی کے شیعہ طالبان علم جوق در جوق حاضر ہوا کرتے ہیں۔

نجف کی کشش کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ وہاں امام علی کرم اللہ وجہہ کا مزار ہے، جو اس الائمہ اور ابوالائمہ ہیں۔

نجف کی سرزمین پر ہر گوشے اور خطے سے امامیہ حضرات پہنچا کرتے ہیں اس کی حیثیت شیعہ کے ہاں قریب قریب وہی ہے جو روضہ شریفہ کی عام مسلمانوں کے ہاں ہے۔

کربلاء

عراق ہی میں شہر کربلا بھی واقع ہے جہاں سبط رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ شہادت پیش آیا، امام حسین شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کے روحانی تاجدار مانے جاتے ہیں اسماعیلی حضرات کا بھی امام ہمام کے بارے میں یہی عقیدہ ہے۔

زیدیہ فرقہ بھی انہی کے سایۂ امامت میں پیدا ہوا، ابھرا اور بڑھا، ——— اگرچہ زیدیہ کا مسلک اثنا عشریہ سے امامت کے بارے میں کچھ مختلف ہے، یعنی وہ ذریت و اولاد حسن رضی اللہ عنہ کے لئے بھی باب امامت وا مانتے ہیں۔

کربلا میں شیعہ بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں، بلکہ وہاں کے تقریباً تمام کے تمام باشندے شیعہ ہیں۔

وہاں علمائے اجل کی بھی ایک بہت بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

کربلاء کی طرف لوگ کشاں کشاں آتے ہیں کچھ اس لئے کہ وہاں علمائے اجل کی بہت بڑی اور معقول تعداد موجود رہتی ہے اور زیادہ تر اس لئے کہ وہاں امام حسین رضی اللہ عنہ کی قبر ہے جو شیعہ حضرات کے ہاں حضرت امام کی شہادت کے باعث مقام ماتم کی حیثیت رکھتی ہے غرض کربلا کو یہ مقام بلند شہادت گاہ امام ہمام ہونے کے باعث اور فضلائے روزگار

کی موجودگی کے سبب حاصل ہے۔

کاظمیہ

کاظمیہ میں بھی شیعوں کی کثرت ہے۔
کاظمیہ بھی مدائن عراق میں سے ایک شہر ہے اس کا یہ نام اس لئے پڑا کہ وہ امام جعفر صادق کے صاحبزادے امام موسیٰ کاظم سے منسوب ہے اور یہ امام کاظم امام جعفر صادق کے بعد اثنا عشریہ کے امام ہوئے۔

موسیٰ کاظم کے علاوہ یہاں ان کے حفید (پوتے) محمد بن الجواد بن علی رضا کی قبر مبارک بھی ہے، یہ بھی ائمہ اثنا عشریہ میں سے ایک ہیں۔

چونکہ یہاں دو امام سپرد خاک ہیں اس لئے اس شہر کی عظمت اور مرتبے میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا، لوگ یہاں جوق در جوق زیارت کے لئے آتے رہتے ہیں، اگرچہ یہاں اتنی آمد و رفت نہیں رہتی جتنی نجف اور کربلا میں رہتی ہے۔

سامرا

سامرا کا اصل نام "سر من رائی" تھا سامرا اسی کا مخفف ہے۔
اس شہر میں بھی شیعہ حضرات کی اکثریت ہے۔

اس شہر کو جو بغداد کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے، ایک خاص منزلت اور مقام اس اعتبار سے حاصل ہے کہ ائمہ اثنا عشری کے آخری امام محمد بن حسن العسکری یہیں سے پردہ غیب میں چلے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے والد ماجد کے گھر میں ایک تہ خانے کے اندر گئے اور پھر واپس نہیں آئے، اس وقت سے آج تک کہ اتنی صدیاں گزر چکی ہیں ان کا انتظار ہو رہا ہے۔

اس بات نے اس شہر کی بڑائی اور بزرگی میں اور زیادہ چار چاند لگا دئے ہیں۔

ایک حقیقت کی طرف اشارہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیعان آل بیت اقالیم اسلام میں سے دو اقلیموں — عراق اور بلادِ فارس — میں شروع ہی سے یعنی ابتدائی عہد سے سیادت رکھتے ہیں۔

ان ہر دو بلاد میں مشرق سے لے کر مغرب تک تشیع نے زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل کیا۔

لیکن عراق؟

کوفہ اور بصرہ بلاد عراق کے شہر ہیں۔

معجم البلدان میں طوس کا ذکر آیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ شہر خراسان میں واقع ہے اس کے اور نیشاپور کے مابین دس فرسخ کا فاصلہ ہے اور اس کے ایک باغ میں علی رضا اور ہارون رشید کی قبریں ہیں۔

خلیفہ ہارون رشید جب آخری بار ایک مہم کے سلسلے میں بغداد سے نکلا تو یہیں آکر بیمار پڑا اور وفات پائی۔ بعد میں امام علی رضا جب خلیفہ مامون کے ساتھ ایک سفر میں یہاں آئے تو ان کی بھی یہیں وفات ہوئی اور یہیں دفن ہوئے۔

خلیفہ مامون نے علی رضا کو اپنے بعد ولی عہد مملکت نامزد کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "پھر مامون نے ولایت عہد فسخ کردی اور کھانے میں زہر کھلا دیا جس سے ان کا انتقال ہوا، اور وہ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔"

اعیان الشیعہ کی تصریحات علامہ السید محسن العاملی نے اپنی کتاب "اعیان الشیعہ" میں ان بلاد کا ذکر کیا ہے، جہاں تشیع کو عمل دخل کا موقع ملا، وہ فرماتے ہیں!

"دولت عباسیہ میں جب ضعف پیدا ہو گیا اور بہت سے شہروں میں خروج و بغاوت کا سلسلہ شروع ہوا، اور امراء کا استبداد ان خلفاء پر اس درجہ بڑھ گیا کہ خطبۂ جمعہ میں ان کے نام کے سوا ان کے پاس کچھ باقی نہیں رہ گیا تو عراق اور فارس میں حکومت بویہ قائم ہوئی اور موصل و دمشق میں دولت حمدانیہ قائم ہوئی اور افریقیہ اور مغرب، اور مصر اور شام اور حجاز میں دولت عبیدیین قائم ہوئی تو حالت یہ ہوئی کہ بلاد اسلام کے بڑے بڑے شہر ملوک و امراء شیعہ کے ہاتھ میں آگئے اور ان مقامات میں شیعوں کی غیر اصولی اکثریت قائم ہو گئی۔

بعض شہروں میں شیعوں کی کثرت تھی، جیسے مصر اور مغرب اور بعض سواحل سوریہ و مدائن، نیز عراق کے متعدد شہر اور بعض شہر مثلاً حلب اور طرابلس الشام و جبال میں بھی شیعیت کو فروغ حاصل ہوا، یہاں کے اکثر باشندے شیعہ ہوگئے۔

بلادِ اندلس میں بھی تشیع کو سرسبز ہونے کا موقع ملا۔

بلادِ عجم میں پہلے سے جو شیعہ تھے وہ تو تھے ہی، اب نئے حالات میں ان کی تعداد اور بڑھ گئی۔

یہیں سے ملوک بنو امیہ کے خلاف جنہوں نے علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے بعد ان کی ذریت و اولاد کے خلاف عداوت اور کینے کا اظہار کیا، یلغار اور یورش کا آغاز ہوا، اور کون ہے جو امام ہدیٰ علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ بن ابی سفیان کے مابین جو کچھ گزرا اس سے واقف نہیں۔
پھر اس واقعے میں ان فاجر قاتلوں کا قتل حسینؓ اور ان کے حفید (پوتے)، زید بن علی رضی اللہ عنہم اجمعین کا حادثۂ قتل جو انہی لوگوں کی کارفرمائی تھی۔

فارس اور خراسان اور ان دونوں سے ماورا، دوسرے بلادِ اسلام میں ان علماء اسلام کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے آبسی جو اپنے عقیدے کے مطابق پہلے امویوں کے اور ان کے بعد عباسیوں کے مخالف تھے، یہ لوگ ان بلاد کے اندر بہ تعداد کثیر آ آ کر آباد ہوئے، ان کا عقیدہ انہیں اس قرار پر مجبور کر لیتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان بلاد میں ان کی تعداد یوماً فیوماً بڑھتی رہی سقوط دولت امویہ سے قبل ہی یہاں وہ بہ تعداد کثیر اقامت گزیں ہو چکے تھے۔

دعوت شیعیت

یہی وجہ تھی کہ دعوت شیعیت سے عباسیوں کے دعاۃ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا، ہر دل عزیزی، قوت، دبدبہ، شان خدمت سب چیزیں اسی بل پر حاصل کر لیں اور بالآخر انہوں نے اموی حکومت کو ختم کر دیا۔
اور ابو مسلم خراسانی وہ مظفر و منصور، غالب اور کاربر آزمودہ سالارِ عسکر تھا جس نے تاج حکومت عباسیوں کے سر پر رکھ دیا۔
اور شاید یہی وجہ تھی —— ہو سکتا ہے کچھ اور وجوہ بھی ہوں — کہ اسے ابو جعفر منصور خلیفہ عباس نے اندیشہ ہائے دور دراز کے باعث بالآخر قتل کر دیا۔

شاہان دولت صفویہ

شاہان دولت صفویہ کے عہد میں ایران کے اندر شیعوں کی تعداد اور زیادہ بڑھ گئی۔
ویسے بھی بلاد خراسان و ماوراء النہر میں شیعہ بہ تعداد کثیر آباد تھے۔
اس کثرت اور غلبے کا سبب مامون کے ساتھ امام علی رضا کی آمد تھی، جو ائمہ اثنا عشری میں سے ایک ہیں، اس سفر کے دوران میں امام علی رضا کا انتقال ہوا اور وہ طوس میں دفن کر دیے گئے جہاں ان کا مزار موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ شہر شیعی شہر بن گیا، جہاں زیارت کے لئے اثنا عشری گروہ دور دراز مقامات سے آیا کرتے ہیں۔

شاہان صفویہ کے عہد میں اس تعداد میں اور مزید اضافہ ہوا، نیز شیعیت جمیع بلادِ خراسان وما وراء النہر اور افغانستان میں عہدِ صفوی سے پیشتر ہی فروغ پذیر ہو گئی تھی، البتہ عصرِ صفویہ میں بلخ وغیرہ کے اندر ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا علاوہ ازیں بخارا، سمرقند، جرجان، کابل اور قندھار وغیرہ میں بھی شیعہ بڑھنے اور پھیلنے لگے۔

صرف یہی نہیں بلکہ بلاد ہندوستان و تبت میں بھی یہی صورت پیدا ہونے لگی۔ بلاد ہند میں دولت عادل شاہی اور دولت نظام شاہی اور قطب شاہی خالص شیعہ حکومتیں تھیں!

شیعیت یہاں برابر پروان چڑھتی رہی یہاں تک کہ شیعہ حضرات کی تعداد تین ملین سے زیادہ ہو گئی۔

اور اہل بحرین تو قدیم سے شیعہ چلے آتے ہیں!"

شیعیت کا ماضی اور حال

آج کی تاریخ اس بیان کو غیر تحقیقی اور غیر ثابت کہہ سکتی ہے کیونکہ مذکورہ بلاد میں سے اکثر کے اندر شیعیت زوال پذیر ہو کر محدود ہو گئی ہے۔ ان تمام مقامات میں مذہب سُنی نے شیعیت کا مقابلہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حلب میں بھی شیعیت مذہب افسانہ پارینہ بن کر رہ گیا، باقی لوگ جبال میں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔

سطورِ بالا سے ایسا واضح ہوتا ہے کہ جہاں جہاں شیعی حکومت قائم ہوئی، وہاں وہاں شیعوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ گویا یہ اضافہ شانِ حکومت کا نتیجہ تھا۔

لیکن حقیقت اور امر واقعہ یہ ہے کہ شیعیت بزور قوت و اقتدار نہیں پھیلی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دولت فاطمیہ نے مصر پر قبضہ کر لیا، لیکن اپنے عہدِ حکومت و سطوت میں کسی غیر شیعی مذہب کو ہدفِ ستم اور نشانۂ جور نہیں بنایا سوا مذہب حنفی کے وہ بھی اس لئے کہ یہ مذہب بنو عباس کا سرکاری مذہب بن گیا تھا۔ اس مذہب سے جنگ گویا عباسیوں سے جنگ تھی، لیکن جہاں تک مالکی اور شافعی مذہب کا تعلق ہے، ان کا اثر و نفوذ مصر کے عوام پر بدستور قائم رہا اور فاطمی حکومت نے ان سے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی اور اگر فاطمی حکومت ایسا کرتی تو اسے سخت و شدید مزاحمت سے سابقہ پڑتا جو اس کے اقتدار و صولت کے لئے

تباہ کن ثابت ہوتا، اس لئے کہ لوگوں کے انکار روآراء اور اعتقادات کو بزور قوت تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

یہی وجہ تھی کہ جب مصر سے حکومت فاطمی ختم ہوئی تو صلاح الدین نے بغیر کسی دشواری کے مصر میں شیعی مذہب کو ختم کر دیا، اور جو تھوڑے سے بہت باقی رہ گئے وہ قوت واقتدار اور سطوت سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ سعید مصر کی طرف راہ فرار اختیار کر گئے اور پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوتے ہوئے اسوان میں ٹھہر گئے اور یہیں آکر ان کی تاریخ مصر بھی ختم ہو گئی۔ آج شہر اسوان میں شاید ایک فرد بھی ان کا نہ ملے۔

شیعہ اقلیت

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ معجم البلدان نے جن شہروں میں شیعی غلبے اور آبادی کا ذکر کیا ہے، وہاں آج وہ ایک معمولی اقلیت ہیں۔ مثلاً افغانستان کہ وہاں اب ان کا کوئی اثر ورسوخ نہیں ہے، حالانکہ ایک زمانہ تھا کہ وہاں شیعیت کا پرچم لہرا رہا تھا اور وہ غیر معمولی اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ مگر اب بہت کم تعداد میں ہیں، شاید چند سو کے لگ بھگ۔

چنانچہ السید العاملی نے اس سلسلے میں لکھا ہے،

شاہان صفویہ کے عہد میں شیعیت نے افغانستان کے اندر غیر معمولی فروغ حاصل کر لیا تھا، شیعہ علماء مدرسین اور مشائخ افغانستان کے اہم شہروں ہرات کابل اور قندھار وغیرہ میں مامور تھے اور گو آج بھی افغانستان کا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں شیعہ موجود نہ ہوں لیکن تحقیقی طور پر ان کی تعداد بتانا اور متعین کرنا مشکل ہے، اگرچہ کہیں ان کی کثرت ہے تو بھی تعداد چار سو سے زیادہ نہیں ہے۔[1]"

شیعہ لبنان اور شام میں

لیکن اب بھی لبنان اور شام کے دوسرے شہروں میں خاصی تعداد میں موجود ہیں، لیکن یہ تعداد لاکھوں تک نہیں پہنچتی ہزاروں تک محدود ہے۔

لیکن یہ ہزاروں کی تعداد بھی نکمی نہیں ہے، اپنی علمی سرگرمیوں کے باعث اسے ایک

---

[1] اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۵۱۳۔

مثلاً ضیاء الدین ابو الرضا، فضل اللہ، ابن علی الحسینی کہ جو علم و زہد میں اپنی مثال نہیں رکھتے، ان کے علاوہ بھی شیعہ ائمہ، قضاۃ، فقہا، مقررین اور موذنین بڑی تعداد میں موجود ہیں جو علمی تحقیق میں مصروف رہتے ہیں۔ مناظرہ کرتے ہیں اور مذاکرات میں حصہ لیتے ہیں!"

جو شیعی بلاد علمی مرتبے کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت اور عظمت رکھتے تھے ان میں ایک شہر قم بھی تھا۔ معجم البلدان نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اس شہر کے تقریباً تمام باشندے شیعہ امامیہ ہیں اس کی تعمیر ۸۳ھ میں ہوئی کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث بن قیس حجاج کی طرف سے سجستان کے حاکم تھے، پھر انہوں نے حجاج پر خروج کیا۔ ان کے لشکر میں عراق کے سات ہزار علماء تابعین شامی تھے! جب اشعث کو شکست ہوئی تو شکست خوردہ حالت میں وہ کابل آ گئے، ان کے ساتھیوں میں سے ایک عبداللہ بن سعد تھے، ان کا ایک لڑکا تھا جس کی تعلیم و تربیت کوفے میں ہوئی تھی یہ وہاں سے قم آ گئے، یہ امامی تھے، قم میں شیعیت بھی اپنے ساتھ لائے اور اب وہاں ایک بھی سُنّی نہیں ہے!"

مجالس المومنین میں قم کے بارے میں مرقوم ہے۔

"شہر قم یہاں سے اکابر و افاضل و مجتہدین شیعہ امامیہ بہت بڑی تعداد میں نکلے بہت سے اخبار قم اور اہل قم کے فضل میں وارد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام اور امام جعفر علیہ السلام سے مروی ہیں!

امام جعفر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے:۔

خبردار ایک حرم اللہ تعالیٰ کا ہے جو مکہ ہے، خبردار ایک حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جو مدینہ ہے، خبردار ایک حرم امیر المومنین (علی) کا ہے جو کوفہ ہے خبردار میرا حرم اور میرے بعد میرے لڑکے کا حرم قم ہے، خبردار قم چھوٹا کوفہ ہے!"

خاص مقام حاصل ہے، تقریباً ویسا ہی جیسا ایران اور نجف میں حاصل ہے۔
لبنان سے مذہب شیعی کی کتب حدیث کثیر تعداد میں شائع ہو چکی ہیں اور کتنا اچھا ہو اگر اس طرح کی کتابیں خزائن خطوط (قلمی لائبریریوں) سے نکل کر زیور طبع سے آراستہ ہو جائیں کہ ان تک رسائی اور ان کا مطالعہ آسان ہو جائے لیکن احتیاط ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ طباعت میں نہیں کہ جس میں مخطوطات کی طرح تحریف و تصحیف اور تقدیم و تاخیر آسان ہوتی ہے اور ہم اس طرح کی چیزیں بکثرت دیکھ چکے ہیں۔

اس جگہ ہم یہ ذکر بھی کر دینا چاہتے ہیں کہ ماضی میں جو شہر شروع ہی سے تخریج علماء مذہب شیعی کے اعتبار سے یکتا اور منفرد رہے تھے اور اپنی علمی خدمات کی بنا پر مقام خاص پر فائز تھے اب وہ کچھ نہیں رہ گئے ہیں، مثلاً طوس!
طوس ہی سے شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی ابھرے تھے، جو اس مذہب کے بحر العلم تھے۔
ایسا ہی ایک شہر زنجان یعنی شہر آذربائیجان تھا۔ بہت سے شیعی فاضل علماء اسی شہر سے نسبت وطنیت رکھتے تھے۔
شیعی شہروں میں ایک شہر قاشان (کاشان) بھی تھا، جو اصفہان کے قریب واقع تھا، یہاں کے رہنے والے شیعہ امامیہ اثنا عشریہ تھے۔

قم کا ذکر | چنانچہ کتاب سمعانی میں وارد ہے۔

"قم کے قریب ایک شہر قاشان واقع ہوا ہے، یہاں کے رہنے والے شیعہ ہیں، جن میں ایک بڑی جماعت اصحاب علم و فضل کی ہے!"

کتاب "النقض" میں بلدہ کاشان کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے،
"خدائے تعالیٰ کا شکر ہے کہ شہر کاشان ایک منور اور مشہور شہر ہے، از ترتیب اسلام اور نور شریعت وہاں کی مساجد و مدارس سے ظاہر ہے، وہاں کے بڑے بڑے مدارس — میں منصوریہ، مجدیہ، شرفیہ اور عزیزیہ ہیں، جو زینت، آرائش اور تعداد و نفوس اور اوقات و مدرسین کے اعتبار سے حد کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے شہر تھے جنہوں نے علم امامی میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی، جن میں سے صرف چند کا ہم نے ذکر کیا ہے

ان شہروں کے علماء اپنی علمی سرگرمیوں کے باعث شہرت و قبول کے مراتب عالیہ پر فائز تھے یہ انہی کی علمی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا کہ یہ مذہب مدون طور پر تحریری صورت میں باقی رہ گیا۔ جہاں تیسری صدی ہجری کے آخر سے لے کر موجودہ زمانے تک اجتہاد کا سلسلہ جاری چلا آرہا ہے۔

مذہب شیعہ پاکستان وہند میں | مذہب امامی ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے شہروں میں اب بھی موجود ہے۔

اس طرح بلاد انڈونیشیا میں بھی شیعہ خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

جس شہر میں بھی شیعہ پائے جاتے ہیں وہاں وہ اپنا ایک مرکز قائم کر لیتے ہیں کیوں کہ طائفیت اکثر احوال میں ان کے اندر کارفرما رہتی ہے، خصوصاً جب کسی اقلیم میں وہ اقلیت میں ہوں تو اور زیادہ اپنی جمعیت کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔

یہ اندیشہ کہ کہیں ان کی انفرادیت انہیں دوسروں میں جذب نہ کر دے طائفیت کا جذبہ ابھارتی رہتی ہے۔

بلاد وسط افریقہ | بلاد وسط افریقہ میں بھی شیعہ پھیلے ہوئے ہیں، مثلاً نائیجیریا، شمالی لینڈ، بلاد سمغال اور دوسرے افریقی شہروں میں وہ پائے جاتے ہیں۔

ان مقامات کے شیعوں کی کثیر تعداد اثنا عشریوں پر نہیں بلکہ اسماعیلیوں پر مشتمل ہے، جو آراء منحرفہ کے حامل ہیں یہ اسماعیلیوں کے معتدل طبقے کے مانند نہیں ہیں، جیسے پاکستان اور ہندوستان میں بوہرے ہیں۔

ملک یمن کی اکثریت شیعہ ہے | یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ملک یمن کی اکثریت شیعہ ہے۔

لیکن وہاں بھی اثنا عشری بہت کم ہیں، وہاں زیدیہ فرقہ پوری قوت و شوکت کے ساتھ موجود ہے جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب "امام زیدؒ" میں بیان کر دی ہے

بلادِ عربیہ میں بھی تشیع موجود ہے، اور بعض بلادِ عرب میں تو ان کی اکثریت ہے، مثلاً بحرین میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

شہر قطیف | ایک اور عرب شہر قطیف ہے اس کے بارے میں "انوار بدرین" میں وارد ہے۔ "زبانِ متقدمین پر یہ شہر بلادِ خط کے نام سے معروف ہے، جس کے خطی نیزے بہت شہرت رکھتے ہیں۔ یہاں کے تمام باشندے بحمداللہ عروۃ الوثقیٰ مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں، اور ائمہ ہداۃ کی ولایت سے شادکام ہیں اور آلِ رسول ص کی محبت میں سرشار ہیں، یہاں علماء اور متعلمین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ادیبوں کی بھی کثرت ہے، یہاں کی زمین ہر اعتبار سے بہتر ہے۔!"

معجم البلدان میں قطیف کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"قطیف بحرین کا ایک شہر ہے، یہ وہاں کا بہت بڑا اور مرکزی شہر ہے۔ جب وفد عبدالقیس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپؐ نے اس وفد کے دونوں سرداروں جون (جان) اور جارود سے گفتگو فرمائی، اور ان سے ان کے شہر کے بارے میں دریافت احوال فرماتے رہے!"

ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامے میں قطیف کا ذکر کیا ہے:

"قطیف بہت بڑا شہر ہے خوبصورت اور دل آویز بھی، یہاں کھجور کے درخت بکثرت ہیں، یہاں کے باشندے عرب ہیں، یہ بڑے کٹر شیعہ ہیں، بے دھڑک اپنے مسلک کا اظہار کرتے ہیں!"

دو اہم امور | یہ ان شہروں کی طرف سرسری اشارے تھے، جہاں شیعیت پھیلی اور برگ و بار لائی، لیکن اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو باتوں کو پیش نظر رکھیں۔

(۱) اکثر بلادِ اسلامیہ میں خصوصاً ان بلاد میں جو بلادِ عربیہ سے دور ہیں، تشیع نے فروغ حاصل کیا۔ وہاں زیادہ یا کم تعداد میں شیعہ اُبھرے، لیکن ان بلادِ اسلامیہ میں مجموعی طور پر اکثریت سنیوں کی رہی۔

ہمیں امید ہے کہ سب وحدت اسلامیہ کے رشتے میں منسلک ہو جائیں گے جہاں نہ

اکثریت کا سوال ہوگا نہ اقلیت کا، سب ایک ہوں گے' ایک ہی تسبیح کے دانے' گو ان کے مذہب اور مسلک مختلف ہوں اس سے کوئی اثر وحدت ملی پر نہیں پڑ سکتا، دائرہ مقررات شرعیہ کے اندر رہتے ہوئے تفسیرات شریعت میں تعدد ہو سکتا ہے لیکن یہ تعدد حیات فکری کی دلیل ہے' البتہ طوائف میں بٹ جانا تفرق اور انقسام کی دلیل ہے اور ان دونوں میں جو عظیم فرق ہے واضح ہے۔

(۲) جملہ بلاد اسلامیہ میں سارے شیعہ اثنا عشری نہیں ہیں، بلکہ ہم تو کہتے ہیں اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرنے والے ان لوگوں میں بناوٹی لوگ بھی ہیں جن کا درحقیقت تشیع سے کوئی تعلق نہیں۔ انہیں اہل قبلہ بھی نہیں ماننا چاہیئے۔

اسماعیلی اور بوہرے

دور اور قریب کے اسلامی شہروں میں جہاں زیدیہ اور اثنا عشریہ ہیں وہاں پاکستان و ہند کے غیر منحرف اسماعیلی / بوہرے بھی ہیں۔ لیکن ایسے اسماعیلی بھی ہیں جو آرا منحرفہ کے حامل ہیں۔ یہ اپنے ائمہ میں حلول ذات الٰہی کے قائل ہیں۔ ظاہر ہے ان کا شمار اہل قبلہ میں نہیں ہو سکتا۔

خاتمۂ کلام

یہ کتاب "امام صادقؒ" ہم نے سچائی کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ ہم قربت پیدا کریں نہ کہ تفرقہ اور لوگوں کے سامنے آل بیت کے ایک ایسے امام جلیل کے حالات و سوانح پیش کریں جس کے ہم عصر علماء حکام اور شعوب نے اس کی عظمت کے سامنے سر جھکایا اور اس کے نقش قدم سے بہتوں نے رہنمائی حاصل کی، لیکن بہت سے گمراہ بھی ہوئے۔ لیکن یہ سب ایک بات پر یعنی حضرت امام کے جلال و اکرام اور احترام پر متفق ہیں۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ برادران امامیہ اثنا عشریہ کے تمام تصورات و تفکرات کو اپنا لیں یا انہیں بے چون و چرا قبول کر لیں ہمیں ان سے کہیں اتفاق ہے، کہیں اختلاف، لیکن ہمارے لب و لہجہ میں کہیں بھی صلابت اور شدت نہیں آنے پائی ہے۔

اپنے برادرانِ اثنا عشریہ سے ہمیں سب سے بڑا اختلاف سلسلۂ امامت کے بارے میں ہے، لیکن یہ اختلاف ایسا ہے کہ ہم کہتے ہیں آپ اپنی رائے اور مسلک پر قائم رہئے ہم اپنی رائے اور مسلک پر قائم ہیں اور یہ اختلاف جو کچھ ہے اس کا بڑا حصہ عملی نہیں ہے، بعض سلف کے خلاف اظہار خیال ہے۔

ہمیں امام جعفر صادق کے علم الہامی سے بھی اختلاف ہے اور ان کے علم جفر سے متعلق کلینی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ہم متفق نہیں ہیں!

اس کتاب میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض حصوں سے شیعہ خفا ہوں گے، بعض سے سُنی خفا ہوں گے لیکن ہمارے پیش نظر رضائے الٰہی ہے، صرف رضائے الٰہی!

(محمد ابو زہرہ)

سوانح ہی سوانح

امام اعظم ابو حنیفہ

تالیف: (ابو زہرہ) مصر ــ مترجم: رئیس احمد جعفری

امام ابو حنیفہ کے سوانح حیات پر جامع اور مفصل کتاب

ضخامت ــ ۷۲۰ صفحات

رنگین گردپوش طباعت دیدہ زیب اور جاذب نظر

آثار امام شافعیؒ

مصنف: ابو زہرہ (مصر) ــ مترجم: رئیس احمد جعفری

عہد امام شافعی کے فقہی رجحانات، عہد بہ عہد کے فقہی تصورات، فقہ اسلامی کے تدریجی ارتقاء اور امام شافعیؒ کے فضائل و کمالات اور مجتہدات پر ایک تحقیقی اور تنقیدی نظریہ۔

ضخامت: ــ ۵۵۰ صفحات

رنگین گردپوش، دیدہ زیب طباعت

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ

مصنف: محمد ابو زہرہ (مصر) ــ ترجمہ: نائب حسین نقوی

امام احمد ابن تیمیہ کے مکمل حالات زندگی پر جامع اور مفصل کتاب

ضخامت: ۹۰۰ صفحات بہترین ڈسٹ کور

آثار امام محمد و امام ابو یوسف

مصنف: رئیس احمد جعفری

امام ابو اعظم ابو حنیفہ کے دست راست اور شاگرد رشید، فقہ حنفی کے امام کبیر اور مجتہد اعظم امام ابو محمد اور امام یوسف کے آثار و اخبار حالات و سوانح، مجتہدات فتاویٰ کا ایک دل آویز مرقع

ضخامت: ــ ۶۰۴ صفحات

کتابت و طباعت معیاری گردپوش رنگین اور عمدہ

امام مالکؒ

مصنف: ابو زہرہ (مصر) ــ ترجمہ: عبید اللہ قدسی

امام دار الہجرت حضرت امام مالک کے سوانح حیات پر جامع اور مفصل کتاب، امام صاحب کا زمانہ، ان کے آرا و افکار اور قانون اسلام میں مالکی فقہ کی امتیازی خصوصیت اور مفصل جائزہ

ضخامت: ــ ۵۰۰ صفحات، ڈسٹ کور رنگین

دیدہ زیب کتابت و طباعت

سیرت آئمہ اربعہ

مصنف: رئیس احمد جعفری

حضرت امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ، امام مالک اور امام احمد بن حنبلؒ کے مفصل، مکمل اور مستند حالات۔

ضخامت: ــ ۶۲۰ صفحات

کتابت و طباعت معیاری

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز

۱۹۹ سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲ ۵۴۰۰۰